

گھر کے ہر فرد کے لئے

کراچی

پاکیزہ

ماہنامہ

مارچ 2019

نگارِ مٹی
معراج رسول

306 صفحات
قیمت 100 روپے

سحر ساجد و افشاں آفریدی کے دل کش ناول.....

معروف قلم کار شگفتہ بھٹی کی خوشگوار آمد.....

ناویہ احمد، رفاقت جاوید و ہاجرہ ریحان کی خصوصی تحریریں.....

منی ناول

دردانہ نوشین خان 104

اداریہ

مدیرہ 15

مجھے کچھ کہنا ہے

افسانے

باجرہ ریحان 51

افشین نعیم 61

میرجی کے لیے خدائی کا نئے دیمانور رضوان 89

کشف بلوچ 131

شایا نعیم 183

ایک دن جلالی میرجی کے ساتھ آسیہ عامر 215

سلسلے وار ناول

میرساز رنگ انارکو افشان آفریدی 18

سحر ساجد 152

ناولٹ

طوافِ آرزو طیبہ عنصر مغل 66

رفاقت جاوید 188

ایلیا علی غفار 137

خصوصی مضامین

اختر شجاعت 254

نزهت اصغر 260

شائستہ زریں 268

مکمل ناول

نادیہ احمد 218

عورت کہانی

فرحین اظفر 93

عورت و زنا



مستقل عنوانات

295	شگفتہ یاسمین	خوش الفکہ	16	ادارہ	دین کی باتیں
297	پاکیزہ بہنیں	برکات البیڑ	275	ادارہ	گوشہ ظرافت
299	ادارہ	روحانی نشوونما	277	مدیرہ	بہنوں کی محفل
301	مہ جبین	حسین نامہ راکھی	287	عظمیٰ آفاق سعید	پاکیزہ دلییری
302		ہومیو پیتھ	292	صغریٰ زیدی	میں اکثر تنہائی ہوں
			294	ادارہ	پیشہ و زندگی



(وہ وقت یاد کرو) جبکہ تم (واہی کے) نزدیک کنارے پر تھے۔ اور وہ (کافر) دور کے کنارے پر تھے۔ اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔ اور اگر تم آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کر لیتے تو تم میعاد میں ضرور اختلاف کرتے۔ لیکن (تم کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا) تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر دے جو ہونا تھا۔ تاکہ جس نے ہلاک ہونا ہو وہ حجت سے ہلاک ہو۔ اور جس نے زندہ رہنا ہو وہ (بھی) حجت سے زندہ رہے۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے (۴۲) (وہ وقت یاد کرو) جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے خواب میں انہیں کم دکھارہا تھا۔ اور اگر وہ (اللہ تعالیٰ) انہیں تجھ کو زیادہ دکھلاتا تو تم ضرور ہمت ہار دیتے اور تم ضرور اس معاملے میں آپس میں جھگڑتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔ یقیناً وہ سینوں کی حالت کو خوب جاننے والا ہے۔ (۴۳) اور (وہ وقت یاد کرو) جبکہ تم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو اس نے انہیں تمہاری نظروں میں کم دکھلایا۔ اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھلایا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کر دے جو ہونا تھا اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سب کام لوٹائے جاتے ہیں۔ (۴۴) اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ جب تم (لڑائی کے موقع پر) کسی گروہ کے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔ اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ (۴۵) اور تم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ورنہ تم ہمت ہار دو گے۔ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۴۶) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ۔ جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے ہوئے نکلے اور وہ (لوگوں کو) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے (بھی) ہیں۔ اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے احاطے میں ہے۔ (۴۷) اور جب شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لیے آراستہ کر دیا۔ اور اس نے کہا کہ آج کے دن تم پر آدمیوں میں سے کوئی غالب نہیں آئے گا، اور میں یقیناً تمہارا مددگار ہوں۔ پس جب دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کو دیکھا شیطان اپنی ایڑیوں پر پلٹ گیا، اور کہنے لگا، یقیناً میں تم سے بری ہوں۔ بے شک میں وہ کچھ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ میں تو یقیناً اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (۴۸) (وہ وقت یاد کرو) جبکہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، کہنے لگے ان (مسلمانوں) کو تو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست (اور) حکمت والا ہے۔ (۴۹) اور کاش تو اس وقت دیکھے جبکہ فرشتے ان لوگوں کو جو کافر ہو گئے (دنیاوی زندگی سے) پورا، پورا لے لیتے ہیں۔ وہ ان کے چہروں اور ان کی ہڈیوں پر مارتے جاتے ہیں۔ اور (کہتے جاتے ہیں) جلانے والا عذاب چکھو۔ (۵۰)

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ اَحْسَنَ خَلْقِ اللّٰهِ

سید کو نین، ختمی مرتبت افضل الانبیاء، رحمۃ اللعالمین، رسول اقدس حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام سیدنا اولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے۔ جس کے معنی و مفہوم سب سے زیادہ بڑھ کر، لائق تر، سب سے زیادہ بہتر کے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ نبی نائب ہے اللہ کا، کسی کا اپنی جان مال میں اپنا تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا، اپنی جان و کھتی آگ میں ڈالنی روا نہیں اور نبی حکم کرے تو فرض ہے۔

1۔ القدآن: ترجمہ: یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (پیغمبر) مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی بڑھ کر (زیادہ) حق رکھتے ہیں۔ (سورۃ احزاب آیت 6)

2۔ الحدیث: حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”ہر مومن کے لیے میں دنیا و آخرت میں سب سے زیادہ اولیٰ ہوں، اگر چاہو تو یہ آیت پڑھ لو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔

مجاہد نے کہا کہ تمام انبیاء اپنی امت کے باپ ہوتے ہیں اور اسی رشتے سے مسلمان آپس میں بھائی کہلاتے ہیں کہ وہ اپنے نبی کی دینی اولاد ہیں۔

(بخاری و مسلم)

4۔ الموائیہ: قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتا چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا اور ان سب سے بڑھ کر تھا۔

(کارلائل)

بے شک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا دین اخلاص انسانیت کے ساتھ ہمدردی اور معاشرے کے لیے اعلیٰ ترین اخلاقی ہدایت ہے، ہر لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دین تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے۔

(مگوئے)

4۔ الفضائل: جو شخص چاہے کہ اس کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور عشق پیدا ہو جائے تو ہر فرض نماز کے بعد (۳۷) مرتبہ یہ اسم پاک ”سیدنا اولیٰ“ پڑھنے پر مداومت رکھے۔

۲۔ اگر کوئی قرض کے بوجھ تلے و باہو اور ادائیگی کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ روزانہ نماز فجر یا عشا کے بعد با وضو حالت میں تین سو مرتبہ یہ اسم پاک پڑھ کر بارگاہ الہی میں دعا مانگے۔ ان شاء اللہ بہت جلد قرض کی ادائیگی کے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔

(فیصرہ حیات کی کتاب انوار اسالہ النبی ﷺ سے اقتباس)

زندگی کبھی کبھی انسان کو ایسے گردنوں پر سے اعتماد مقلزل ہو جاتا ہے۔ اس حادثے کی وجہ بعض اوقات اس کی اپنی توقعات بھی ہوتی ہیں جو وہ کسی بے نام تعلق سے وابستہ کر لیتا ہے۔ وہ جذبے جو رشتوں کے توسط سے دل میں بسیرا کریں ان کی پزیرائی تو مذہب اور معاشرہ دونوں کرتے ہیں، ان کی حق تلفی پر جواب طلبی بھی کی جاسکتی ہے مگر وہ دلی تعلق جنہیں رشتوں کی سند نہ حاصل ہو، انہیں کسی عدالت سے بھی سزا نہیں سنائی جاسکتی، سوائے ضمیر کی عدالت کے۔ جبکہ وہ رشتے جنہیں تعلق کا نام بھی دے دیا جائے کبھی کبھی وہ اپنے جائز حق سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں۔ اور ان کی جوابدہی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دنیا دار العمل ہے جہاں انسان کے دوہی امتحان ہیں، ایک شکر کا دوسرے صبر کا... مگر جب حضرت انسان حسد یا بوس کی خاطر تقدیر سے لڑنے کی ٹپان لے تو پھر اس کے اپنے فیصلے ہی اس کی آزمائش بن جاتے ہیں۔

حادثوں میں گزری ہے اس بس تباہی ہے زندگی کا چاہت میں زندگی گنوائی ہے
خواب اب نہیں میرے، نیند تک پرانی ہے عارضی محبت تھی مستقل نبھائی ہے

امیدوں، جذباتوں، فیصلوں اور احساسِ جرم پر مبنی کچھ ایسے کرداروں
کی کہانی جو دل سے دیکھتے، دل سے سنتے اور دل سے ہی سوچتے ہیں

سلسلے وار ناو

میرا سارا زندگی اتار دو

افشاں آفریدی





شیرازی دولا میں مقیم مظفر اور سائرہ کی بیٹی ردا کی منگنی اس کی مرضی سے آصف کے ساتھ ہوتی ہے جس میں یواہس اسے تین سال بعد واپس آکر مظفر صاحب کا نیم بھتیجا عکرمہ بھی شریک ہوتا ہے داوی کا ارداء زوہا کی سعد سے شادی کے بعد ردا کو اس کی شریک حیات بنانے کا تھا لیکن ردا کی مرضی نہیں تھی۔ اب عکرمہ واپس آیا تو درمکنوں کو دیکھ کر ٹھنک جاتا ہے۔ زوایا رہتا مسخ کاڑھ سے لڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ میں زخم آتا ہے وہ اپنے دوست سرفراز کے سی دیوالے اپارٹمنٹ میں زلفی، ندیم اور مولانا بخش کے ساتھ تھا۔ عکرمہ آئی کیپ میں پچھڑ رہا اور icmap میں ایونک کلاسز لینے لگتا ہے درمکنوں سائرہ چچی کی بھانجی تھی جس کی ڈوٹے داری مظفر احمد نے اس کے ماں باپ کے انتقال کے بعد اٹھائی تھی۔ عاصمہ لاج میں عاصمہ اور مہران، زوایا کو ایک دن پہلے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ زوایا جب بھی کراچی سے باہر جانے کا کہتا ہے انہیں لگتا ہے دولا ہو رہا واپس چلا جائے گا۔ ٹریپ شوٹنگ زوایا کا چشمن تھا وہ کار ساز شوٹنگ رینج میں قاصب شہرین کا بیٹا اس کے پاس آتا ہے کہ اس کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور وہ اسے پک کر لے۔ شہرین اسے بتاتی ہے کہ وہ تانگیکو اڈو دیکھ رہی ہے۔ وہ شہرین کو اس کے گھر چھوڑتا ہے لیکن اس کے بلانے پر بھی اندر نہیں جاتا۔ شہرین، میمونہ بیگم کو زوایا کے تعلق بتاتی ہے تو وہ سوچتی ہیں کہ آغا جان اور شہر یار سے بھی اس کا دل صاف ہو جائے گا۔ عکرمہ داوی سے کہتا ہے کہ چچا جان کو درمکنوں کی تعلیم شروع کر ادینی چاہیے۔ مظفر، عکرمہ سے درمکنوں کو پڑھانے کا کہتے ہیں۔ جلال انصاری، شہر یار کو کہتے ہیں کہ وہ زوایا کو کال کر لیں۔ عکرمہ رات کو گھر آتا ہے تو گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے اور درمکنوں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ داوی کو عکرمہ بتاتا ہے تو وہ اسے سکون آور دوا دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتاتی ہیں۔ شہرین، زوایا کو فون کرتی ہے تو عاصمہ ریو کو کرتی ہیں وہ انہیں بتاتی ہے کہ وہ لوگ سوا سال سے کراچی میں ہیں، عاصمہ، زوایا کے باپ شہر یار سے طلاق لے چکی تھیں۔ وہ شہرین کو اپنے دوسرے شوہر عثمان کے انتقال اور مومنہ کی شادی کا بتاتی ہیں اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتی ہیں۔ عکرمہ، درمکنوں سے پوچھتا ہے کہ اس نے پڑھائی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ شہرین، عاصمہ سے ملنے آتی ہیں تو وہ بہت اچھے سے ملتی ہیں اور شہرین کو بتاتی ہیں کہ وہ ایک اسکول چلا رہی ہیں شہرین، عاصمہ کو بتاتی ہے صنوبر خالہ کے شوہر نے نیچے نہ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کر لی تو وہ انصاری باؤس آگئیں اور جب زوایا رلا ہو رہے کراچی آگیا تو وہ ہنڈی چل گئیں۔ یہ سن کر وہ بہت دکھی ہوتی ہیں۔ شہرین، عاصمہ کو منع کرتی ہے کہ اس کے آنے کا تذکرہ زوایا سے نہ کریں۔

اب آگے پڑھیے

قسط نمبر 3

ردا کی شادی میں اب صرف دوڑھائی ماہ بچے تھے، تیاریاں زور شور پر تھیں..... تاہم چچی جان نے ابھی تک درمکنوں کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔
اس شام بھی شاپنگ سے واپسی پر ردا اور سائرہ بیگم اپنی لائی ہوئی چیزیں دیکھ رہی تھیں..... ساتھ ہی زوہا بیٹھی مہمانوں کی لسٹ بنا رہی تھی کہ مظفر صاحب اندر داخل ہوئے۔
”ہاں بھئی..... تیاریاں مکمل ہوئیں کہ نہیں..... ہذا اپنی شریک حیات کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا تھا۔

”ارے ابھی کہاں..... ابھی تو صرف جیمز کے کپڑے اور جوبلی وغیرہ لی ہے۔ جبکہ مشینری اور فرنیچر باقی ہے..... آپ اور سیف نے بھی ابھی تک کچھ ڈیڈنڈ نہیں کیا ہے..... کم از کم آپ اور سیف تو اب اشارت لیں..... کل سیڑ ڈے ہے آپ سیف کو ساتھ لے جائیے گا..... اماں تو عکرمہ کے ساتھ ہی جائیں گی.....“ مصروف سے انداز میں سائرہ بیگم نے جواب دے کر ساتھ ہی ہدایت بھی دی۔
”ہوں..... دیکھتا ہوں کل یا شاید پھر کو نام ملے تو پھر سیف کو بھی لے جاؤں گا.....“ سائرہ بیگم کے کہنے پر انہوں نے تھکے، تھکے انداز میں جواب دیا۔

سائرہ بیگم کو سب افراد یاد تھے مگر درکنون کو وہ جیسے قصداً بھول گئی تھیں۔

مظفر صاحب دل ہی دل میں کڑھنے لگے تھے..... سوچتے تھے اپنی شریک حیات کا آخر کس حربے، کس طریقے سے دل صوم کریں کہ وہ درکنون سے کم از کم انسانیت کے لئے ہی ہمدردی کر لیں۔

اب بھی اسی سوچ کا عکس ان کے چہرے پر تھا..... جسے زوہا محسوس کرتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا پاپا..... آپ اتنے پریشان کیوں ہیں.....“ ہنگامہ مند سے والد کی طرف دیکھتی زوہا ان کے لبوں پر بھی بھی مسکراہٹ لے آئی۔

”کچھ نہیں بیٹا..... بس یونہی درکنون کا خیال آ گیا تھا۔ تمہاری میسی نے اس کے لیے کچھ نہیں لیا ابھی تک..... حتیٰ کہ سوچا بھی نہیں۔“

”تو آپ سوچ لیجیے..... آپ پر پابندی تو نہیں ہے کوئی.....“ حسب توقع سائرہ بیگم یک دم ترخ کر بولی تھیں۔

”پابندی تو آپ پر بھی نہیں ہے سائرہ بیگم.....“ جواباً وہ بھی تلخ ہونے سے نہ بچا سکے تھے خود کو۔

”میرے پاس کرنے کے لیے اور بھی کئی ضروری کام ہیں مظفر صاحب..... اپنی لاڈلی کے لیے آپ ہی نکال لیں کچھ وقت۔“

”ہاں تو میں ہی نکالوں گا وقت۔ جب اس کے لیے میں ہی سوچ رہا ہوں تو وقت بھی مجھے ہی نکالنا ہوگا۔“ ان کی تیز نظریں بیوی کے چہرے پر ہلک رہی تھیں۔

جیولری کا بکس کھٹاک سے بند کرتے ہوئے وہ ٹھیک ٹھاک چراغ پا ہو چکی تھیں۔

”ہاں ٹھیک ہے..... اب جبکہ آپ کے علم میں یہ بات آ چکی ہے کہ مجھے اس لڑکی سے نہ اس کے مسائل سے

اور نہ ہی اس کی آنے والی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے تو پھر آپ بار، بار یہ دکھڑا میرے سامنے مت رویا کریں اور

پلیز مجھے میری بیٹی کی خوشی میں خوش خوش شریک ہونے دیں۔“ دو ٹوک انداز میں کہہ کر جس وقت وہ تیز قدموں

سے چلتی لوگ روم سے باہر نکلیں مگر وہ اسی وقت اندر داخل ہوا تھا..... سلام کر کے چچا جان کے پاس آ بیٹھا۔

”تم کہو..... مگر یہ کیا حال ہے.....؟“

مظفر صاحب نے کسی سوچ میں مستغرق مگر مہ کو متوجہ کیا تو وہ چونک کر سنبھلا۔

”الحمد للہ..... آپ نے جو کام کہے تھے وہ میں نے کرو لیے ہیں اور ہاں کسی بیک صاحب کا فون بھی آیا تھا

آپ کے لیے، کہہ رہے تھے کہ انہوں نے کرایہ جمع کر دیا ہے..... تاکید کر رہے تھے کہ آپ کو ضرور بتا دوں۔“

”چلو شکریہ بالآخر ان حضرات کو بھی خیال آیا.....“ وہ کچھ ریلیکس ہوئے بیک صاحب کا سن کر۔

”ویسے یہ کون سے مکان کا کرایہ ہے چچا جان..... جہاں تک میری معلومات ہیں آپ کا تو کوئی ون یونٹ

بگلائیں تھا۔“

”یہ میرا نہیں درکنون کے والد کا چھوڑا ہوا مکان ہے بیٹا..... درکنون ہمارے پاس ہے، اس لیے میں نے

اسے کرایہ پر دے دیا تاکہ وہ کچی خود کو ہمارے اوپر بوجھ نہ سمجھے..... اور لوگوں کو بھی سکون رہے کہ وہ اپنا ہی کھانا ہی

ہے۔“ مگر مہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا جس پر کچھ کئی ان کے لہجے کا حصہ بنی گئی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا..... میسی اس وقت ردا کی شادی کی خوشی اور اسٹریس سے اپ سیٹ ہیں..... اس

لیے کبھی کبھی تلخ ہو جاتی ہیں..... آپ ان کو کر دیں..... رہ گیا درکنون کا معاملہ تو اس سے میں نے کئی بار کہا ہے ساتھ

ملنے کے لیے مگر وہ تیار نہیں، گھر سے باہر جاتے اس کی جان نکلتی ہے..... دوسرے اسے ذرق برق کپڑوں سے کوئی

دلچسپی نہیں.....“ زوہا نے تردد سے باپ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ منونیت سے مسکرا دیے۔

سپس پتا چلا..... اس دسے دارو کو اٹھا کر میں دم کے ہیضہ پیری مدوی ہے حالانکہ یہ سب مہاری۔ سی زور ہا چاہیے.....“ شکرگزاری سے کہتے، کہتے وہ آزدہ ہو گئے تھے۔

”پلیز پاپا ایسی کوئی بات نہیں..... وہ میری بھی تو کزن ہے.....“ زوہانے بنجیدگی سے کہا تو وہ لب بھنج کر رہ گئے۔

”اپنی وے..... میں نے اس کے لیے ڈر سر خریدے ہیں۔ بہت ہنکے کام والے اس کی چو اس کے مطابق..... بس اب کسی دن اسے ساتھ لے جا کر ٹیلر کو دینا ہے۔“

”تو اسے آج ہی لے جاؤ..... اگر تم کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو.....“ مظفر صاحب خوش ہوتے ہوئے بولے..... کم از کم زوہا کو تو اس کا خیال ہے یہ سوچ کر وہ سرور سے ہو گئے تھے۔

”آج.....؟ ہوں..... آج بھی جاسکتے ہیں..... عکرمہ تم لے چلو گے نہیں، پاپا تو ابھی واپس آئے ہیں.....“

”تھکے ہوئے ہیں۔“

کچھ سوچ کر اس نے عکرمہ سے پوچھا تو وہ جواباً اثبات میں سر ہلا گیا۔

”مگر ذرا جلدی کرنا مجھے آج ایک کلاس لینی ہے آٹھ بجے تک۔“

”اوکے، اوکے..... میں پانچ منٹ میں ڈر کنون کو لے کر آتی ہوں.....“ گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے بجلت کہا اور چھپاک سے کمرے سے نکل گئی۔

”بہت ذتے دار اور حساس ہے میری بیٹی..... یقین کر دو عکرمہ اگر زوہا اور اماں نے میرا اور درکنون کا ساتھ نہ دیا ہوتا تو آج میں اپنے مرحوم دوست کی روح کے سامنے نہ صرف شرمندہ ہوتا..... بلکہ خود اپنی عدالت میں بھی مجرم گردانا جاتا۔“

عکرمہ نے گہری نظر سے ان کا مشاہدہ کیا۔

بہت فکر مند رہنے لگے تھے وہ درکنون کے لیے..... عکرمہ کو قدرے حیرت ہوئی کہ کیا کوئی کسی غیر کے لیے اس قدر بھی حساس ہو سکتا ہے۔

”آپ اتنا اسٹرین نہ لیں بچا جان..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان فیکٹ سب ٹھیک ہو رہا ہے..... آگے بھی سب بہتر ہوگا۔“

اس کے لہجے میں کچھ تھا..... یقین یا شاید امید..... مظفر صاحب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک دم ایک سیکنڈ کے لیے کوئی خیال ان کے ذہن میں کوئدا..... ایک امید کا شعلہ جیسے جل اٹھا تھا۔ مگر دوسرے ہی پل انہوں نے خود کو جھڑک دیا کچھ بھی تھا..... عکرمہ ان کا بھتیجا تھا اور انہیں سیف کی طرح پیارا تھا۔

ایک طویل جدوجہد کے بعد آج وہ اس مقام تک آیا تھا..... انہیں معلوم تھا کہ اماں نے اس کے لیے کتنے خواب بن رکھے ہیں۔

ایسے میں وہ اسے ”صحرا“ کا اذن سفر کیسے دیتے۔

وہ تو شاید ان کے کندھے کا بوجھ اٹھانے کو تیار بھی ہو جاتا مگر اماں کی بوڑھی آنکھوں کے وہ خواب جو انہوں نے جوان بیٹا بہو کھونے کے بعد صرف اپنے بپوتے کی خاطر سالوں سے سجا کر رکھے تھے، انہیں کیسے تاراج کرتے۔

”یا اللہ تو ہی مالک ہے..... تو ہی کوئی سنیل نکال اس معصوم بچی کے لیے.....“ تڑپ کر دل سے دعا نکلی تھی۔

سامنے بیٹھے عکرمہ نے انہیں بغور دیکھا اور ابھی کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ زوہا اسے ساتھ لے کرے میں داخل ہوئی۔

”لیجیے پاپا..... آپ کی لاؤ لی ساتھ جانے سے انکار ہی ہے۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیں۔“ مظفر صاحب کے سامنے لا کر اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے زوہا مسکرا رہی تھی۔

”کیوں بیٹا..... تم کیوں انکاری ہو؟“
درکنون کے لیے حلاوت یک دم ان کے لہجے کا حصہ بنی تھی..... وہ نرڈ سی ہو کر اٹھلیاں مسلنے لگی۔

”وہ اصل میں آج گھر میں کچھ کام ہے..... شاید مہمانوں کو آتا ہے اور.....“

”بیٹا یہ شادی کا گھر ہے، اس میں تو اب ہمہ وقت کام ہی کام ہوگا..... لوگ آتے جاتے رہیں گے مگر تمہاری تیاری بھی تو ضروری ہے ناں.....“ انہوں نے اٹھ کر قریب آتے ہوئے محبت سے سمجھایا تو وہ لا جواب سی ہو گئی۔

”لہذا البتہ کام تم ردا اور ساڑہ پر چھوڑ دو اور فی الحال زوہا کے ساتھ ٹیلر کے یہاں چلی جاؤ..... واپسی میں اپنے لیے جیولری وغیرہ بھی لے لینا..... چلو تو پھر اچھے بچوں کی طرح میری بات مانو اور زوہا کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو جاؤ.....“
شفقت سے ہونٹ کاٹتی درکنون کے لیے کوئی راہ فرار نہ چھوڑتے ہوئے انہوں نے فرمان صادر کیا تو وہ متذبذب سی پلٹ گئی۔

”جاؤ بیٹا..... وہ تیار ہو کر آجائے گی..... تم یہ چابی لے لو..... میری کار لے جانا اور پلیز خیال رکھنا اس کا۔“

اسے چابی تھماتے ہوئے انہوں نے ملتجیانہ تاکید کی تھی۔

”جی ہاں کل.....“ وہ چابی لے کر لاؤنچ میں آگیا..... جہاں زوہا موجود تھی۔

”کہاں ہیں..... درکنون.....؟“ اس نے استفسار کیا۔

”وہ ابھی برز بند کر کے اندر گئی ہے..... غالباً چادر لینے.....“ زوہا نے کہا تھا۔

زاد رید بعد درکنون اپنی بڑی سی چادر کو مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ کر زوہا کے پیچھے مرے، مرے قدموں سے چلی آ رہی تھی۔

”کہاں جاتا ہے.....“ ہپ کار اشارت کرتے ہی بنیادی سوال ہوا..... زوہا راستہ بتانے لگی..... عکرمہ نے بیک ویو مرے دیکھا..... ہونٹ کاٹتی درکنون یوں سر جھکا کر جھنجھکی گویا کسی طرف دیکھ لیا تو جیسے قیامت ہی آجائے گی۔
خوف اور سر اسکی اس کے چہرے ہی سے نہیں حرکات و سکنات سے بھی ظاہر تھی..... بہر حال ٹیلر شاپ قریب ہی تھی چند منٹوں میں وہ وہاں پہنچ گئے تھے۔

”چلو آؤری..... یہ رہی میرے ٹیلر کی شاپ۔“

اترے، اترتے درکنون کی نظر آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عکرمہ پر پڑی..... وہ جس انداز سے بیٹھا تھا صاف ظاہر تھا کہ اس کا گاڑی سے اترنے کا کوئی ارادہ نہیں۔

ایک عالم گھبراہٹ میں درکنون نے زوہا کو دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ ”کیا یہ نہیں جائیں گے ہمارے ساتھ.....“
”کچھ تھا اس کی نظر میں زوہا کے لیے اس کا مانی انصمیر سمجھنا مشکل نہیں رہا..... جبھی اس نے عکرمہ کو متوجہ کیا۔

”عکرمہ..... تم ساتھ آؤ.....“

”میں.....؟ مگر میرا کیا کام.....“

وہ خاصا حیران ہو کر مڑا تھا..... جو ابازوہا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں درکنون کی طرف اشارہ کیا۔

”تمہارا کوئی کام نہیں..... بس ہماری حفاظت کرنا..... چلو اب اتر دیجیے۔“

بلکے پھٹکے لہجے میں یہ کہہ کر اس نے عکرمہ کو تاکیدی نظروں سے دیکھا تو وہ گہری سانس بھر کر کار سے اتر آیا۔ ٹیلر کے پاس انہیں چند منٹ لگے۔

درکنون کی نظریں باہر آتے ہی اس کی تلاش میں بھیگی تھیں..... مگر اسے سامنے بیٹھا دیکھ کر کچھ سکون محسوس ہوا۔
”چلیں.....“ وہ اٹھ کر پاس آیا۔

”کیا خیال ہے درمی تمہارے لیے جیولری اور کاسٹیکس کی شاپنگ بھی آج ہی نہ کر لی جائے۔“
 ”نہیں، آج کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔۔۔۔۔ یوں بھی کاسٹیکس اور جیولری کی مجھے ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“ نہایت
 آہستہ آواز میں گردن موڑے اپنی جانب دیکھتی رہا وہ اس نے ساوگی سے کہا تو وہ بے ساختہ مسکرا دی۔
 ”بجائے اصرار فرمایا۔ تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے کاسٹیکس اور جیولری کی۔۔۔۔۔ تم ان مصنوعی سہاروں کے بغیر
 ہی انتہائی حسین ہو۔۔۔۔۔“ سناٹھی لہجہ غلوں بھرا تھا۔

جواہر میں ایک خاموشی نگاہ زد پار ڈال کر اس نے بلا ارادہ سامنے لگے بیک دیوڑھی میں اپنا چہرہ دیکھا۔
 ایک مکمل حسن تھا اس کے خدو خال میں، معصومیت اور جاذبیت کی چمک سمیت۔۔۔۔۔ مڑی ہوئی پلکوں والی
 آنکھیں کسی مقرر کی طرح قائل کرنے کے سارے رموز جانتی تھیں۔

اس پر ساوگی، آزدگی اور سراسیمگی نے مل کر جیسے اس کے سادہ حسن کو دو آئینہ کر دیا تھا۔
 بیک دم اس نے نگاہ بدل کر چہرہ دوسری جانب پھیر لیا اور کچھ اس طرح ٹپٹی کہ بیک دیوڑھی میں خود کو نہ دیکھ سکے۔
 گھر پہنچ کر کار سے اترتے ہی درکنوں نے زوہا کا شکریہ ادا کیا تھا۔
 ”کو کہ مجھے ان سب چیزوں کی نہ تو خواہش رہی تھی نہ ضرورت پھر بھی آپ نے میزے لیے سوچا یہ سب
 کیا۔۔۔۔۔ آئی ایم ریلی تھینک فل۔“

”پلیز ڈری ایسے مت کہا کرو۔۔۔۔۔ بلیوی۔۔۔۔۔ مجھے روا جیسی لگتی ہو تم۔۔۔۔۔“ اس کا ہاتھ محبت سے تھامتے ہوئے
 زوہانے اس کے شکریہ کا قصد ابرام کیا تھا۔

”یوں بھی شکریہ تو تمہیں عکرمہ کا ادا کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ جس نے ہمیں لانے لے جانے کے لیے وقت نکالا۔“
 کار لاگ کر کے قریب آتے عکرمہ کو دیکھ کر زوہانے قصد بلند آواز سے کہا تو وہ بلا ارادہ نظر اٹھا کر عکرمہ کی
 طرف دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ جو اس اثنا میں ان کے پاس آکھڑا ہوا تھا۔

”ہوں۔۔۔۔۔ غالباً مجھ سے کچھ کہتا ہے آپ کو۔۔۔۔۔؟“ اس نے تجاہل عارفانہ سے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔
 ”میں تو نہیں البتہ درمی شاید کچھ کہتا چاہ رہی تھی۔۔۔۔۔“ زوہانے بھی تبسم چھپاتے ہوئے تجاہل برتا۔۔۔۔۔ تو
 درکنوں نے دوسری ہو کر عکرمہ کو دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ جو دونوں ہاتھ ٹراؤز کی جیبوں میں پھنسائے کھڑا تھا۔

”پلیز۔۔۔۔۔ کہیے میں سن رہا ہوں۔۔۔۔۔“ اب تو وہ مکمل طور پر اس کی طرف مڑ گیا تھا۔۔۔۔۔ انداز قطعی سنجیدہ تھا۔
 ”جی۔۔۔۔۔ وہ بس۔۔۔۔۔ شکریہ آپ کا۔۔۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ ایک باز پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتا اس نے
 بجلیت الٹ، الٹ کر کہہ دیا تھا۔

زوہا اس بات پر یک دم کلکھلا کر فٹ پڑی جبکہ عکرمہ کے سنجیدہ چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔
 درکنوں مزید نرس ہی ہو کر زوہا کی طرف مڑی تو عکرمہ مسکراہٹ ضبط کرتا۔۔۔۔۔ ”اٹس۔۔۔۔۔ مائی پلیز۔۔۔۔۔“ کہتا
 اندر کی طرف بڑھ گیا۔

”ارے کم آن یار۔۔۔۔۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔۔۔۔۔ اب اتنا بھی چھچھو انہیں ہے میرا کزن کہ اتنی سی بات پر
 ”شکریہ“ نے بغیر نہ نٹے۔۔۔۔۔ وہ تو بس ہم چاہتے ہیں کہ تم سب سے محل مل جاؤ۔ باتیں کرو۔۔۔۔۔ ہنسو یلو۔۔۔۔۔ تو
 تمہیں بولنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ آئی ہو۔۔۔۔۔ تم نے مانڈ نہیں کیا ہوگا۔“ عکرمہ کے
 اندر جاتے ہی زوہانے وضاحت کی۔ درکنوں جانتی تھی اس لیے بس ممنونیت سے دیکھ کر آگے بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

”یہ لو شہرین..... سنبھال کر رکھ لو اسے.....“ نائنتی کی تینیل پر وہ اور میمونہ بیگم تھے..... اس نے آلیٹ پلیٹ میں ڈال کر اپنے سامنے رکھا ہی تھا کہ میمونہ بیگم نے ایک لغافہ اس کی جانب بڑھا دیا۔

”یہ کیا ہے۔“

”لاہور کا انٹرکٹ ہے۔“

”آپ لاہور جا رہی ہیں.....؟“ ٹکٹ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ سوالیہ ہو گئی تھی۔

”میں نہیں..... تم لاہور جا رہی ہو.....“ میمونہ بیگم نے گویا دھماکا ہی کر ڈالا۔

”میں.....؟“ اس کے لہجے میں حیرت اور تشویش دونوں شامل تھے۔

”ہاں تم.....“ میمونہ بیگم کے اطمینان میں ذرا کی نہیں آئی تھی۔

”مگر کیوں..... اب میں نے کیا کر دیا.....؟“

”کیا مطلب کیا کر دیا.....“ اب کے میمونہ بیگم کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا تھا۔

”تم تو یوں کہہ رہی ہو..... جیسے انصاری ہاؤس تمہیں سزا کے طور پر بھیجا جاتا تھا۔“

”ہاں..... تو اس میں غلط کیا ہے..... کسی کمر مثل جیسی کڑی نگرانی ہوتی تھی میری وہاں..... شاید ہی کبھی آغا

جان نے نرم لہجے میں بات کی ہو مجھ سے جبکہ زوی کے لیے کیسے پھول جھڑتے تھے ان کے منہ سے۔“

”ٹھیک کرتے تھے وہ۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو زیادہ سرنہیں چڑھایا جاتا..... ایسے ہی تربیت کی جاتی ہے ان

کی..... اگلے گھر جانا ہوتا ہے انہیں..... زوی ان کا پوتا ہے..... اور تم نواسی ہو۔“

”تو یہ کس کتاب میں لکھا ہے کہ نواسی ہونا ایک جرم ہے.....“ اس نے منہ پھلا کر کہا تھا۔ انداز ایسا تھا کہ میمونہ

بیگم کو جیسے ترس آ گیا اس پر۔

”کیا ہو گیا ہے شہری..... بچپن سے تم انصاری ہاؤس رہتی آئی ہو..... انسان اتنے سال جن کے ساتھ رہتا

ہے! نواسی ہو جاتا ہے ان سے تمہیں تو وہاں رہنا بہت اچھا لگتا تھا ناں۔“

”تب کی بات اور تھی..... تب وہاں خولہ تھی، زوی تھا، طاری بھائی تھے..... اب سب چلے گئے ہیں وہاں

سے..... میرا بالکل دل نہیں لگتا وہاں..... لے دے کر ایک عینی رو گئی ہے وہاں۔“

”اور آغا جان..... وہ بھی تو تمہیں یاد کرتے ہیں..... کتنی محبت سے بلایا ہے انہوں نے تمہیں.....“ میمونہ نے

پیارے سے سمجھایا۔

”تو آپ آغا جان سے کہیں ناں کہ وہ یہاں آجائیں۔ میں انہیں زوی سے ملانے لے کر جاؤں گی کتنا مزہ آئے گا۔“

جواب میں شہرین کا لالہ ابالی پن سے کہنا میمونہ بیگم کے ماتھے پر بل ڈال گیا۔

”وہاں درست ہے تمہارا..... آغا جان بڑے ہیں۔ اصولاً انہیں نہیں بلکہ زویا کو ان کے پاس جانا چاہیے۔“

”بس..... اسی پہلے آپ..... پہلے آپ“ میں ٹرین چھوٹ جائے گی۔ مجھے عینی نے بتایا تھا کہ آغا جان زوی کو

بہت مٹ کرتے ہیں، اکثر اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنی محبت ہے تو پھر کیا فرق پڑتا ہے اگر آغا جان

قدم بڑھالیں تو۔“

”تم رہنے دو..... یہ باتیں تمہاری سمجھ میں آنے والی نہیں..... اول تو تمہارے پاس عقل کی کمی ہے، دوسرے

جو ہے اس کا بھی استعمال تمہیں گراں گزرتا ہے.....“ میمونہ بیگم جی کو خشکیوں نظروں سے دیکھتے ہوئے عالم بیزاری

میں گویا ہوئیں۔

نتیجتاً اس کا منہ بن گیا تھا۔

”تو پھر نہ سمجھیں ناں مجھے وہاں۔“

”صنوبر آ رہی ہے لاہور اس نے بھی اصرار کیا ہے کہ تمہیں بھیج دوں وہاں۔“

”ج..... کیا واقعی.....!“ صنوبر خالہ کے نام پر وہ خوشی سے کھل گئی..... ”اب آئے گا مزہ..... آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا..... خواہ مخواہ میرا اتنا خون جلا اور بے عزتی الگ ہوئی آپ کے ہاتھوں.....“ شرارت سے ماں کو دیکھتے ہوئے وہ مزے سے بولی تھی۔

”صنوبر تمہیں سر براہزہ دینا چاہ رہی تھی..... مگر تم اس قدر فضول لڑکی ہو کہ مجھے تنگ کر کر کے آخر اگلو ای لیا۔“

”اچھا ہی ہوا..... کم از کم اب سفر تو اچھا گزرے گا ناں میرا۔“

صنوبر خالہ سے ملنے کی خوشی نے اسے گویا تروتازہ کر دیا تھا..... ماں کے گلے میں جھولتے ہوئے وہ مسرت سے کہہ رہی تھی۔ میمونہ بیگم نے مصنوعی غصے سے اسے دیکھا تو وہ گھٹکھٹلا کے ہنس پڑی۔

”سوری..... کیا کروں۔ آپ کے والد بزرگوار سے زیادہ آپ کی سویت سی بہن زیادہ اچھی لگتی ہیں مجھے.....“

”کیونکہ تمہاری لگا میں جو نہیں کستی وہ۔“

”واٹ ایور..... صنوبر خالہ دنیا کی سب سے پیاری خالہ ہیں.....“ اس کے لہجے میں خالہ کے لیے پیاری پیار

تھا..... میمونہ بے ساختہ مسکرا دیں۔

”اچھا اب ذرا جلدی سے پیسے تو دیں مجھے لاہور جانے کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔ ارے بھی آپ کی چھوٹی

بہن کے لیے گفٹ لینا ہے..... اپنے لیے تو کچھ بھی نہیں مانگ رہی میں۔“

پیسوں کی فرمائش کے جواب میں ماں کی تیوری چڑھتی دیکھ کر جھٹ بہانہ بنایا تو میمونہ بیگم اس کی چالاکی پر

اسے گھور کر رہ گئیں۔

☆.....☆.....

”بیٹا ڈر کنوں..... یہ کتابیں سنبھال لو..... نگر مرہ لایا ہے تمہارے لیے، کہہ رہا تھا آج شام چار بجے تم پڑھنے

کے لیے تیار رہنا.....“ دادی نے سائنڈ ٹیبل پر رکھے پلندے کی طرف اشارہ کیا۔

”آج سے ہی دادی.....؟“

وہ حیرت زدہ سی کبھی سائنڈ ٹیبل کے پاس آرکی اور بے خیالی میں سب سے ادھر رکھی اکٹا کس کی کتاب کو انگلی

سے چھوا..... ابھی کل ہی تو فارم بھر کر دیا تھا اس نے۔

”ہاں..... آج ہی سے..... بیٹا، وہ کہہ رہا تھا کہ امتحان میں کچھ ماہی باقی ہیں.....“ دادی نے نگر مرہ کا پیغام

بہم پہنچایا۔

”پہلے ہی کافی وقت گزر چکا ہے تمہیں انٹر کیے..... اچھا ہی ہے کہ یہ سال ضائع ہونے سے بچ جائے۔“

اس نے کتاب کھول کر چند صفحے پلٹے تو جیسے زندگی کے کئی اوراق ایک ساتھ پلٹ گئے..... یہ کتابیں یہ مضمون

اور اس سے جڑے اس کے خواب..... کیا کچھ تھا اس کی زندگی میں۔ کس قدر بھرپور ماضی تھا..... روشن اور درخشاں.....

”آہ.....“ اس کے سینے سے جیسے کوئی آہ نکلی تھی۔

گہری سانس بھر کر اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب آہستگی سے بند کر دی۔

”کیا ہوا بیٹا.....؟“ دادی اس کی طرف ہی متوجہ تھیں۔ ان کے استفسار پر وہ جیسے چونکی۔

”کچھ نہیں دادی.....“ تھکے، تھکے لہجے میں کہتی..... وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر تنگ گئی۔

”فکرمٹ کر دو بیٹا..... نگر مرہ بہت اچھا استاد ہے، ماشاء اللہ..... اس کے شاگرد بہت چاہتے ہیں اسے۔ تمہیں

بھی بہت محنت دگن سے پڑھائے گا وہ۔“ دادی عکرمہ کی تحریف میں رطب اللسان ہو چکی تھیں..... اسے بھی ساتھ ہی لٹالیا تھا اور انہیں سنتے ہوئے اسے پتا بھی نہ چلا اور وہ وہیں ان کے پاس لیٹے، لیٹے سو گئی۔
 غالباً عکرمہ کا وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی..... گھڑی سوا چار بج رہی تھی۔
 ”اوہ.....“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی..... ”کیا ہو گیا آج مجھے..... اتنا لمبا سو گئی میں۔“ ہاتھوں سے بالوں کو سیٹھتے ہوئے وہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ عجیب کسلندی سی طاری تھی..... ساتھ ہی گھبراہٹ بھی۔
 ”اوہ..... دیر ہو گئی..... دادی نے بتایا تھا کہ چار بجے پڑھنا ہے۔“
 ”چلو میں بھی اٹھوں اب.....“ اس نے خود کو گھڑا اور گھڑی ہو کر کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے دور کرنے لگی تھی
 کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

”جی.....!“

حسب توقع عکرمہ تھا۔

”السلام علیکم..... کیا حال ہے.....؟“

گرے شلوار قمیض میں لمبوس عکرمہ کے سادہ سے استفسار پر وہ محض ”ٹھیک ہوں“ ہی کہہ سکی۔

”آج پڑھائی شروع کرنی ہے یا۔“

”جی میں بس آ رہی ہوں..... وہ ان ٹیکٹ۔“

”اُس اوکے..... panic ہونے کی ضرورت نہیں..... آج کی ایونٹ کلاس آف ہے میری..... آج ہم

ہاف این آوریٹ بھی شروع کر سکتے ہیں..... آپ فریش ہو لیں، میں باہر لاؤنج میں ویٹ کر رہا ہوں۔“

آخری صدمہ

نفرت اور محبت کے محاذ پر لڑنے والی ایک ماں کی

داستان..... **نشور ہادی** کے خیالات کی پرواز

فاتح مقتول

ماضی کے پوشیدہ گوشوں..... اور بندر بچوں میں پنہاں راز و

نیاز..... تاریخی صفحات پر **زویا اعجاز** کے قلم سے

رنگ آسمان

سازشی لوگوں کی گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک

واقعات کا سنگم..... **ایے آر راجپوت** کا سحر انگیز انداز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کرہ ناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ

لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

اپریل 2019ء کا گزشتہ شمارہ ایک نظریں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیریس ڈائجسٹ
 ماہنامہ

مزید

علمی و ادبی محفل
 محفل شعر و سخن

اور

ملک مندر حیات کی تفتیش

اسی کے علاوہ

تنویر ریاض، نادیہ نور، شاہ زین رضوان، ثمر عباس،

ڈاکٹر شید شاہ سید اور منظر امام کی خوبصورت کہانیاں

میر سکون مہذب انداز تھا۔ وہ کچھ ریلیکس ہوئی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلی تو چپا چلا دادی نماز سے فارغ ہو کر باہر لاؤنج میں بیٹھی ہیں۔۔۔۔۔ اسے خاصی تسلی ہوئی۔

آج پہلی بار عکرمہ سے براہ راست بات کرنا اور پڑھنا تھا۔ وہ اندر ہی اندر ٹھیک ٹھاک نروس تھی۔ لاؤنج میں آئی تو دل جیسے کانٹوں میں دھڑک رہا تھا۔ ایسا تو اس نے جیسی محسوس کیا تھا جب پہلی بار اسکول میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے سخی انگلیوں سے بابا کے مضبوط ہاتھ کو تھا سے جب پہلا قدم اندر رکھا تھا تو بابا نے کس قدر حوصلہ دیا تھا۔ اور پھر جب نئے کالج میں داخل ہوئی تو ماں اس کے ساتھ تھیں۔

مگر آج۔۔۔۔۔ آج وہ تنہا تھی۔
”نہیں میں تنہا نہیں۔۔۔۔۔ میرا اللہ میرے ساتھ ہے۔۔۔۔۔“ کوئی اندر بولا تھا وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتی سامنے آ بیٹھی۔

عکرمہ اکناکس کی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ اس کے آنے پر سر اٹھا کر دوستانہ مسکراہٹ سمیت اس کی جانب دیکھا۔

”لیٹس اشارت۔۔۔۔۔!“ سوالیہ انداز تھا اس نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

”پڑھانے کے لیے میں فریڈلی دے پر بلیو کرتا ہوں ڈور کمٹون۔۔۔۔۔ ہم اچھے دوستوں کی طرح پڑھیں گے۔۔۔۔۔ ان فیکٹ میں آپ کو صرف گاڈ کروں گا۔۔۔۔۔ آپ کی ہیلپ کروں گا۔۔۔۔۔ یہ کوئی اسٹیریو ٹیچکل میچر اسٹوڈنٹ ریلیشن شپ نہیں ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں ڈی کی آپ کو ایک سے دو گھنٹے دے سکتا ہوں۔۔۔۔۔ 1 hope it will be enough for you مگر ضرورت پڑے تو آپ کسی بھی وقت مجھ سے ہیلپ لے سکتی ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے ماحول کو دوستانہ کرنے کی خاطر کچھ تمجید باندھی۔

”چلیے پھر بسم اللہ کریں۔۔۔۔۔ یہ لیجیے۔۔۔۔۔“ کتاب اس کی طرف بڑھاتے ہوئے عکرمہ نے اسے بغور دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک مامدی چمک لہرائی تھی۔۔۔۔۔ شاید اب بھی کہیں اندر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش کے مانند چنگاری موجود تھی۔

”میرا خیال ہے ہم اشارت کرتے ہیں۔“

اسے اب بھی خاموش دیکھ کر بالآخر اس نے کہا تو در کمٹون بے شکل خود کو کپڑوں کی رسی۔

”جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔۔۔۔۔“ مدغم لہجے میں میکا کی سا جواب آیا تھا۔

”صرف میرا سمجھنا ضروری نہیں۔۔۔۔۔ پڑھنا آپ کو ہے۔۔۔۔۔ اگر آپ کا انٹرنٹ لٹرچر میں ہے تو ہم اس سے بھی اشارت لے سکتے ہیں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔ پڑھنا تو دونوں کو ہی ہے۔ کسی سے بھی اشارت کریں۔۔۔۔۔“ لہجہ اور چہرے سے بددی اور اکناہٹ عیاں تھی۔

”یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔۔۔ پڑھنا تو ہے ہی تو پھر ایسا کرتے ہیں۔۔۔۔۔ اشارت لیتے ہیں اکناکس سے۔۔۔۔۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے ڈور کمٹون کی عدم دلچسپی محسوس کرنے کے باوجود پڑھنا شروع کر دیا۔

ماضی کے کچھ دھندلے خاکے آنکھوں کے سامنے بن اور گزرتے تھے۔ وہ بے مشکل خیالات کی یودش سے خود کو نکال سکی۔

عکرمہ کا انداز بہت سادہ مگر دلچسپ تھا۔۔۔۔۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی متوجہ ہو گئی تھی۔

پھر کچھ دن اسی طرح گزر گئے عکرمہ روز ہی گھنٹا سا گھنٹا اس کے لیے نکال لیتا تھا مگر اس کی کوشش کے باوجود

دوڑکنوں کوئی خاص رد عمل نہیں دے رہی تھی..... اسے لگتا جیسے وہ کسی جگہ سے مخاطب ہو۔ نہ وہ اس کے کسی سوال کا جواب دیتی تھی نہ خود سے ہی سوال کرتی۔

بس سامنے بیٹھی اپنے سیدھے ہاتھ کی تھیلی پر ٹھوڑی ٹکائی نظریں کتاب پر جمائے اسے سننے جاتی۔ یہاں تک کہ وہ ہی گھٹنا گزرنے کی اطلاع دیتا تو وہ جس خاموشی سے آئی تھی اسی چپ کے ساتھ کتابیں سمیٹ کر چل دیتی۔
 ”ایسا آخر تک خپلے گا..... تین ہفتے ہونے کو آئے مگر دوڑکنوں کی حالت میں کوئی سدھار نہیں.....“ اس دن دوڑکنوں کتابیں سمیٹ کر سیزر حیاں اتر گئی تو دادی متشکری اس کے پاس آئیں جیسے جو گہری سانس بھر کر کمر صوفے کی پشت سے نکاتے ہوئے اسی صحن میں سوچ رہا تھا۔

”تین سال کی گرد چھینے کے لیے تین ہفتے بہت کم ہیں دادی..... اول بات تو یہ کہ وہ پڑھنا ہی نہیں چاہتیں اور دوسری یہ کہ اسٹریس، ڈپریشن اور بہت بڑے غم سے لڑتے لڑتے وہ بحر حال ہو چکی ہیں..... چھری کند ہو جائے تو اس کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔“ دادی کے سوال پر اس نے تجزیہ پیش کیا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگیں۔
 ”میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ ان کا انٹرسٹ و ویلپ کروں مگر لگتا ہے کہ وہ آرٹس کے فیلڈ میں کمر نہیں لگائیں۔“
 اس نے تین ہفتے کا جائزہ لیا تو یہی ”وجہ“ سمجھ میں آئی۔

”تو تم اسے سمجھاؤ بیٹا..... یوں بھی سنا ہے اسے PHD کرنے کا جنوں کی حد تک شوق تھا..... اب وہ نہ کرے تو کم از کم بی کام ہی کر لے.....“ دادی نے مشورہ دیا تو وہ سر ہلاتا تھا کھڑا ہوا پھر ان کے قریب جھکا۔
 ”جی سوچ تو میں بھی بیکر رہا ہوں..... دیکھتے ہیں اگر اس ہفتے بھی یہی حالت رہی تو میں بات کروں گا۔ خیر آپ زیادہ ٹینشن نہ لیں۔“

”ہاں بیٹا..... میری دعا ہے اللہ سے کہ تمہاری اور ہم سب کی مدد سے وہ جلد ہی اس گرداب سے باہر نکل آئے، آمین۔“

”ثم آمین.....!“ کہتے ہوئے وہ مسکرایا۔
 ”چلیے..... اٹھیے..... آج آپ کو میرے ساتھ شاپنگ پر جانا ہے..... چچی جان بہت بار کہہ چکی ہیں..... اور مجھے بھی ردا کی شادی کے لیے شاپنگ کرنی ہے۔“
 ”مگر تم تو دی کے ساتھ جانا چاہ رہے تھے.....“ دادی نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہوں..... اس کے ساتھ ویک اینڈ پر جاؤں گا مگر فی الحال تو آپ تیار ہو جائیں..... میں نیچے وینٹ کر رہا ہوں۔“
 ☆.....☆.....

ابھی وہ فرنج کلاس لینے کے لیے نیلوفر کے ساتھ سیزر حیاں چڑھ رہی تھی کہ اچانک نہ جانے کیسے نیلوفر کا بچہ پھسلا اور وہ سیزر حیاں سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔
 یہ سب اس قدر اچانک ہوا کہ وہ نہ نیلوفر کو سنبھال سکی نہ اس کی مدد کر سکی۔ کتنے ہی زینے تیزی سے نیچے اترنے کے باوجود وہ نیچے کی طرف لڑھکتی نیلوفر کو تھام نہ پائی۔
 یہ سیزر حیاں بھی بہت عجیب تھیں جن کے زینے اونچے اونچے تھے..... نیلوفر کو سر پر شدید چوٹ آئی تھی، ساتھ ہی اس کا بازو بھی زخمی ہوا تھا۔

”ادھ مائی گاڈ.....“ نیلوفر کو اٹھاتے ہوئے وہ گھبرا گئی تھی۔

”آف تمہارے سر سے تو خون بہہ رہا ہے نیلی..... پلیز اسٹوڈ انٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

اودھر اودھر سے گزرتی اسنو دیکھنے کی مدد سے بہ مشکل دواسے کارٹک لالنے میں کامیاب ہوئی اور کچھ دیر بعد وہ دونوں قریبی کلینک میں تھیں۔

نیلوفر کو بینڈج کرنے کے لیے اندر لے جایا جا چکا تھا۔ وہ وینٹگ روم میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اسے کہیں نزدیک سے بڑی مانوس آواز سنائی دی۔

”ڈونٹ وری کا شف..... میں کل پھر آؤں گا..... اس بار بینڈج پہنچ کر آنے میں کوتاہی نہیں ہوگی۔“
اس نے بے ساختہ مڑ کر دیکھا..... زوایا رانصار کی کوڈاکٹر باہر تک چھوڑنے آیا تھا..... زوایا کی یقین دہانی ظاہر کرتی تھی کہ ڈاکٹر اس کا شخص معالج ہی نہیں غالباً دوست یا شاسا بھی تھا۔

”you better be careful Zawyaar..... زخم ابھی کچا ہے۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر مصافحہ کیا اور کمرے کی طرف پلٹ گیا تو زوایا نے آگے کی جانب قدم بڑھائے..... ابھی وہ قدم آگے ہی آیا تھا کہ سامنے شہرین کو دیکھ کر ڈرا کی ذرا ٹھنکا۔

”السلام علیکم زوی.....! کیسے ہو.....؟ یہاں کیوں آئے ہو..... سب ٹھیک تو ہے.....؟“ شہرین اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی تھی۔ اس کے انداز میں تردد تھا۔

”علیکم السلام! ٹھیک ہوں میں، تم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟“ اس کا لہجہ حسب توقع خاصا خشک تھا۔

”وہ ان فیکٹ نیلی کو چوٹ آئی ہے۔ میں اس کے ساتھ یہاں آئی ہوں مگر تم یہاں کیسے..... کیا ہوا ہے۔ یہ بینڈج کس لیے کرانی ہے تمہیں.....“ بجلت اپنے یہاں آنے کا سبب بتا کر وہ استفسار کرنے لگی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا ہے مجھے..... بس ایک معمولی سا زخم ہے۔ اس کی بینڈج کرانی تھی.....“ بھویں سیکڑتے ہوئے اس نے سرسری سا بتایا تھا۔

”چوٹ معمولی نہیں ہوگی..... روز بینڈج کروانی ہے..... یقیناً گہرا زخم آیا ہے تمہیں.....“ شہرین ایک دم فکر مندی سے بولی تو وہ چڑ گیا۔

”تمہیں اپنا دماغ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ نہ تم ڈاکٹر ہو نہ مریض زیادہ فکرت کرو۔“
”تمہاری بھی نہ فکر کرو تو کیا کالے چور کی کروں..... حد ہو گئی ہے زوی.....“ اس نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”کہا ہے ناں کہ ٹھیک ہوں میں..... تم اپنی فرینڈ کی خبر لو..... اسے تمہاری توجہ کی ضرورت ہے.....“ زوایا کو اس کے چہرے پر لکھی تشویش واضح طور پر نظر آئی..... تو کچھ سوچ کر بولا..... اس بار لہجہ میں قدرے نرمی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے کلینک کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔

”ہوں، اس کے سر میں بہت چوٹ آئی ہے۔ اللہ کرے وہ ٹھیک ہو جائے۔“ زوایا کے لیے اس کا وحیان نیلوفر کی طرف چلا گیا تھا۔ ”مگر تم اپنا خیال رکھنا، میڈیسن وقت پر لینا..... تاکہ زخم جلد از جلد heal up ہوں، تمہاری بہت بری عادت ہے۔ جب تک گھروالوں کو اچھی طرح بچانا نہ لو..... تم وہ انہیں کھاتے۔“
”تم زیادہ نننی (nanny) اور گرینی (granny) نہ بنو..... اپنا خیال کیسے رکھنا ہے یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں.....“ ایک عالم بیزاری میں گویا ہوا تھا وہ۔

”ہوں..... سو تو ہے..... پہلے سے بہت اسمارٹ اور اسٹراٹگ ہو گئے ہو..... خیال رکھنا تو واقعی آگیا ہے تمہیں..... مگر زوی خیال صرف اپنا ہی نہیں اپنوں کا بھی رکھا جاتا ہے.....“ سناٹکی نظروں سے دیکھتے ہوئے شہرین نے کہہ کر بچیگی اختیار کی۔ وہ جانتا تھا کہ اشارہ کس طرف ہے۔

”اپنا بیٹ کی تالی دونوں ہاتھوں سے بچتی ہے..... ڈیز شہرین مرزا.....! رشتے اگر صرف ایک جانب سے

بھائے جائیں تو ان کا لکڑا پن بہت جلد انسان کو تھکا دیتا ہے۔“

”مائی گاڈ زوی..... جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے..... تم تو انجینئرنگ کے اسٹوڈنٹ تھے ناں.....؟ یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا.....“ پتا نہیں وہ واقعی مٹا ہوا تھی یا محض ظاہر کر رہی تھی۔

”زندگی سے..... زندگی سب کچھ سکھا دیتی ہے میڈم۔“

”cool dude بہت انٹرٹیننگ گفتگو کرنے لگے ہواب۔“

”تمہاری بات مکمل ہوگئی ہو تو کیا میں جاسکتا ہوں.....؟“ اس کے سناٹے انداز پر زاویا نے ماتھے پہ تپریاں ڈالتے ہوئے پوچھا تو وہ مسکرا دی۔

”اجازت تو ایسے مانگ رہے ہو جیسے منع کروں گی تو رک ہی جاؤ گے۔“

”آئی کیسے ہو یہاں.....؟“ زاویا نے اس کا طنز واضح طور پہ نظر انداز کیا تھا۔

”خود ذرا نیو کر کے.....“ اس نے فخریہ کارنامہ بتایا۔

”کہیں تمہاری ڈرائیونگ کے نتیجے میں ہی تو تمہاری دوست یہاں نہیں پہنچ گئی.....“ اس بار طنز زاویا کی طرف سے تھا۔

”جی نہیں.....“ اس کی بات سمجھ کر منہ بنایا تھا اس نے۔

”تو پھر کیا آسمان سے کوئی آفت نازل ہوئی ہے جو یہاں نظر آرہی ہو۔“

”نہیں زوی..... میں اور نیلی انٹی ٹیوٹ کی بیڑھیاں چڑھ رہے تھے کہ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے کی طرف لڑھکتی چلی گئی..... میں کچھ کر بھی نہیں سکی۔“

اس کے استہزاء سے انداز کو وہ جیسے سمجھ ہی نہیں سکی تھی..... سادگی سے بتایا۔

”ہوں..... ہوتا ہے کبھی ایسا، ہمارے ساتھ چلنے والا اچانک گرنا چلا جاتا ہے اور ہم اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتے۔“

زاویا کی دماغی رو جیسے کسی اور طرف چلی گئی تھی..... وہ یوں بولا جیسے خود سے بات کر رہا ہو۔

”اور پتا ہے..... اس کی وجہ کیا ہے.....؟“ وہ جیسے پوچھ رہی تھی۔

زاویا نے اسے خاموشی سے دیکھا۔

”ہم ہیں اس کی وجہ، اصل میں ہمارا دھیان صرف اور صرف اپنی طرف ہوتا ہے اور اس بے دھیانی میں ہم یہ

دیکھ ہی نہیں پاتے کہ گرنے والے کو ہمارے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے.....“ شہرین کے سادہ سے انداز میں

کوئی گہرائی نہیں تھی..... مگر اس کی بات کی گہرائی زاویا کو لب بستہ کر گئی۔

”میں دھیان نہیں دے سکی تو میری دوست گر گئی..... مسئلہ صرف گرنے کا نہیں ہے اسے چوٹ بہت آئی

ہے.....“ شہرین فکر مند سی بولی تو زاویا نے اس بار غور سے اس کی جانب دیکھا۔

”تم جگٹ فیل کر رہی ہو۔“

”ہوں..... تھوڑا بہت.....“ شہرین سچائی سے بولی تھی۔

”تم نے اسے دھکا تو نہیں دیا تھا ناں..... یہاں تو لوگ دوسروں کو قبر میں اتار کر بھی ڈھٹائی سے زندہ رہتے

ہیں۔ یہ تم نے کیا غم پال لیا ہے.....؟“ اس کا لہجہ یک دم سخت ہو گیا تھا۔

سر کو ہلکے سے جھٹکتے ہوئے زاویا رانصاری نے جیسے لاشعور سے کوئی بات جھکنی چاہی۔

”گم آن زوی..... شی از مائی فرینڈ..... آج اس کو بخار بھی تھا ہلکا، ہلکا..... صرف میری خاطر اور میرے

بھروسے آئی تھی وہ یہاں۔“

شہرین فکر مند ہونے کے ساتھ، ساتھ شرمندہ بھی تھی۔

زاویا رکواس کا ہر لفظ جیسے کسی تازیانے کی طرح لگا۔

”اوپنہ.....“ ایک دم وہ طنز سے ہنس پڑا تھا..... شہرین نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”یہ بھروسہ ہی تو مرداتا ہے انسان کو..... بیوقوف لوگ ہی بھروسہ کرتے ہیں دوسروں پر اور پھر منہ کی کھاتے

ہیں.....“ وہ زہر خند ہوا۔

”نہیں زوی..... بیوقوف لوگ نہیں..... محبت کرنے والے بھروسہ کرتے ہیں دوسروں پر..... درحقیقت،

انہیں سامنے والے پر نہیں، اپنی محبت پر بھروسہ ہوتا ہے.....“ جواب میں شہرین نے کچھ ایسی رسائیت سے کہا کہ

لمبے بھر کے لیے وہ جیسے حیرت میں گہرا رہ گیا مگر اس کا اظہار نہیں کیا۔

”وٹس کول..... بائی واوے..... یہ فلسفہ کہاں سے سیکھا.....؟“ زاویا کے لہجے میں استہزاء تھا۔

”زندگی سے..... نالائق سہی مگر اسٹوڈنٹ تو میں بھی زندگی کی ہی ہوں ناں۔“

خاصا تھلا کر جواب دیا تھا اس نے مگر اس سے پہلے کہ زاویا رپٹ کر کچھ کہتا..... شہرین کو عقب سے پکار لیا گیا تھا۔

”میں ابھی آئی۔“

وہ افتاں و خیراں کلینک کے اندر چلی گئی تو اس نے لمبے بھر کے لیے رک کر سوچا اور پھر سر جھٹک کر پارکنگ کی

طرف مڑ گیا۔

☆.....☆.....

فون کی بیل کافی دیر سے بج رہی تھی مگر لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ناچار اسے ہی بڑھ کر ریسورسٹاٹنا پڑا۔

”ہیلو.....“ بیزاری بھرے تھکے ہوئے انداز میں بہ مشکل ہونٹوں سے نکلا تھا۔

”وعلیکم ہیلو..... کیا حال ہیں بھئی.....؟“

دوسری طرف جو کوئی بھی تھا بڑے فریش موڈ میں تھا..... درمکنوں کی بیزاری کے جواب میں خاصی شگفتگی بھری

بے تکلفی سے پوچھا گیا۔

”کس سے بات کرنی ہے آپ کو.....“

یہ انداز گفتگو اسے سہا دیتا تھا۔ اب بھی بڑی سراسیمگی سے سوال کیا۔

”کرنی تو کسی اور سے تھی مگر اب لگتا ہے کہ اگر آپ سے کر لی جائے تو بھی کوئی خاص مضائقہ نہیں۔“

مخاطب کی برکتی اور بے تکلفی اسے شگفتگی۔

”جی..... آپ رکیے، میں کسی کو بلائی ہوں.....“ گھبراہٹ میں کہا۔

”ارے میں نہیں، آپ رکیے..... کسی کو بلائے کی ضرورت نہیں..... میں کہہ رہا ہوں ناں کہ.....“

”یا اللہ.....“ ریسورفون کے اسٹینڈر پر پینگ کرتے ہوئے اس کا دل گویا کانوں میں دھڑک رہا تھا۔

”کسے بلائے، ابھی ہر اسان کھڑی سوچ رہی تھی کہ کڑکڑاتے بلیک شلو اور سوٹ میں لیوس عکرمہ اوپر سے

آتا دکھائی دیا۔

”سب ٹھیک ہے؟ آپ اس قدر پریشان کیوں لگ رہی ہیں.....؟“

قریب آتے ہوئے اس نے ملاحت سے سوال کیا تو اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں فون کی طرف اشارہ کر دیا۔

”کون ہے.....؟“ ریسورسٹاٹ ہونے اس سے پوچھا تو وہ لاعلمی کا تاثر دیتی تیز قدموں سے چلتی کچن

کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

”کمال ہے.....“ اس کی حد درجہ گھبراہٹ پر اس نے سر جھٹک کر ہیلو کہا تو پتا چلا دوسری طرف ولی ہے۔
 ”کیا حال ہے بھئی، کہاں ہو تم اور یہ تمہارا موبائل کیوں بند ہے کل سے.....“ اس کی ہیلو سنتے ہی ولی اشارت ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں اور موبائل میرا زوبا کے بیٹے نے کوئلہ ڈرنک سے نہلا دیا تھا..... اس لیے خراب ہو گیا ہے.....“ اس نے بتایا۔

”ہوں..... جیسی کل سے کاٹھنک نہیں ہو پا رہا تھا..... ویسے یہ فون پر ابھی کون تھا..... ردا اور زوبا کی آواز تو میں پہچانتا ہوں..... یہ کون محترمہ تھیں.....؟“ ولی نے شوخی سے پوچھا تو وہ چونکا۔ درکنون کی حواس باختگی یاد آئی۔
 یقیناً اس نے ہی کچھ کہا ہوگا۔

”وہ ڈرکنون ہیں..... زوبا کی کزن..... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو.....؟“ اس نے قدرے سختی بھری سنجیدگی سے استفسار کیا تو ولی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”ارے تقریباً ملگنی شدہ ہوں میں..... تم زیادہ وہم نہ پالو..... وہ تو موصوفہ کی آواز اس قدر خوب صورت لگی کہ تھوڑی سی چمپیز چھاڑ کر لی گروہ تو یوں بھاگی ہیں جیسے میں انسان نہیں کوئی بھوت ہوں.....“ ولی کی بے فکری اپنی جگہ قائم تھی۔ مگر مہ کے لہجے کا اس پر خاک اثر نہ تھا۔

”بھوت سے کم بھی نہیں ہو تم..... پلیز آئندہ فون کرو تو شرافت کے جاے میں رہنا۔“ اس نے گویا ٹوک دیا تھا مگر اُدھر بھی ولی تھا چکنا کھڑا.....

”جو مزاج یار میں آئے..... سر تسلیم خم ہے۔“

”گھماؤ ہو تم.....“ وہ بہ مشکل ہنسی ضبط کر سکا۔

”تم سے کم.....“ ولی پھر بولا۔

”بہر حال یہ بتاؤ میری تلاش میں کیوں تھے..... کوئی کام تھا؟“

”ہاں تم پر پریذیڈنٹ کے پی اے جو لگے ہو کہ تم سے ہی کام کہوں گا ناں میں۔“

اس کے سوال پر خلاف توقع ولی ہنسا گیا۔ اسے ہنسی آگئی۔

”پھر.....؟“

”پھر یہ کہ تم سے کچھ بات کرنا تھی۔ ان لیکٹ ایک پراجیکٹ ملا ہے مجھے، کافی انٹرسٹنگ ہے۔ بس ٹائم منیجمنٹ

اچھی ہونا ضروری ہے۔ سوچا تم سے مل کر ڈسکس کر لوں..... گھر پر مل سکتے ہو ابھی.....؟“

”ہوں ابھی تو جا رہا ہوں مگر..... ایک گھنٹے بعد گھر پر ہی ہوں گا..... تم آ جاؤ.....“ رست واپس پر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے دعوت دی۔

کراچی کی ٹریفک کا جو حال ہے وہ کسی سے چھپا نہیں..... لہذا اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود واپسی پر

اسے دیر ہو ہی گئی تھی۔ جس وقت وہ گھر میں داخل ہوا پتا چلا سیف کے ساتھ دلی ڈرائنگ روم میں منتظر بیٹھا ہوا ہے

وہ بھی اُدھر ہی چلا آیا۔

”السلام علیکم!“ اندر داخل ہوتے ہی سلام کیا۔

”وعلیکم السلام!..... ہو گیا تمہارا“ ایک“ گھنٹہ.....“ ولی کھڑے ہوتے ہوئے طنز آ بولا تھا۔ وہ مصافحہ کرتے

ہوئے مسکرا دیا۔

”بس یار..... یہ کراچی کا ٹریفک تمہیں پتا تو ہے۔“

”ہاں، ہاں، ایک ہم ہی ٹریفک کے مارے ہو۔ میں تو اُن قانون پر سفر کر کے آیا ہوں ناں..... وہ دلی ہی کیا جو ہار جائے۔“

”یہ تو ہے.....“ وہ سر کھجا کر رہ گیا۔
 ”وہ تو سیف نے مجھے پہنی دی ورنہ میری بوریت تو عروج پر تھی۔“
 ”ساتھ ہی بہترین گرین ٹی بھی پلائی..... وہ بھی تو بتائیں.....“ سیف اپنی کاوش اور تعریف پر پھولے نہیں سار ہاتھا۔
 ”ہاں یہ بھی ہے۔“ ولی کو گویا یاد آیا۔ پھر عکرمہ کی طرف دیکھ کر بولا..... ”ویسے یار دادی کے ہاتھ کی چائے کا توفلف ہی اور ہے۔“

”وہ دادی کے نہیں..... درمکنوں کے ہاتھ کی چائے تھی ولی بھائی..... دادی تو اب بچن میں کام ہی نہیں کرتیں، سب کچھ اپنی شاگردہ موصوفہ درمکنوں کو سکھادیا ہے۔“
 ”سیف غالباً یہ تمہارے کرکٹ گراؤنڈ میں جانے کا نام ہے.....“ تنہی سنجیدگی سے اس نے اسے متوجہ کیا تو وہ جیسے چونکا۔ وقت کا احساس ہوتے ہی وہ رونو چکر ہوا۔

”خیر بت، یہ سیف کو کیوں ٹوکا تم نے.....؟“ ولی اس کے جاتے ہیں پیچھے پڑ گیا تھا۔
 ”ٹوکا نہیں یاد دلایا ہے اسے.....“ اس نے رسان سے کہا۔
 ”بکومت..... میں نے تمہاری آنکھوں میں تنبیہ دیکھی تھی۔“
 ”ہاں تو..... غلط کیا ہے اس میں..... گراؤنڈ میں اس کے فرینڈز ویٹ کر رہے ہوں گے.....“ وہ مزید سنجیدہ ہوا تو ولی نے قصداً بات کا رخ موڑ دیا۔

”اوکے، اوکے..... چلو پھر تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے چلو آؤ اور پرچلیں۔“ لاؤنچ خالی پڑا تھا۔ وہ دونوں سیڑھیاں چڑھتے اوپر آ رہے تھے کہ نیچے جاتی ہوئی درمکنوں سے مٹ بھڑ ہو گئی۔ عکرمہ کو کسی اجنبی کے ساتھ دیکھ کر وہ حسبِ معمول ٹھٹک گئی۔
 ”السلام علیکم.....!“ اس لمبے ولی اخلاق کی بلندی پر تھا..... اس نے خوفزدہ نظریں اٹھا کر دونوں کو دیکھا۔
 اور جو بابا مشکل ”علیکم السلام!“ کہہ کر ان دونوں کے راستہ چھوڑنے پر تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔
 ”آنسہ درمکنوں.....؟“ سوالیہ نظروں سے عکرمہ کو دیکھ کر ولی نے استفسار کیا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے ہاتھ میں پکڑی فائل اس کے سر پر دے ماری۔
 ”سدرہ جاؤ.....“

☆.....☆.....

”دیکھیے دادی..... یہ سوٹ میں نے ویڈیو ریسپشن کے لیے لیا ہے.....“ درمکنوں پر کتنا تجھے گا۔“ اندر دادی کے کمرے میں بیٹی زوہا جوش سے بول رہی تھی۔
 ”ہوں..... ماشاء اللہ..... بہت حسین ہے..... اس کے چاند سے حسن کا بالا لگے گا.....“ دادی نہال ہی تو ہو گئیں۔
 لاؤنچ میں بیٹھے عکرمہ کو اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا..... آج زودیا، ٹیکر سے وہ سارے کپڑے لے آئی تھی جو درمکنوں کے لیے اس نے سلوائے تھے۔

”اسے پسند نہیں اس لیے میں نے بہت ہیوی کام والے سوٹ نہیں لیے مگر ان کی اسلینج ایسی شاندار کرائی ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں گے۔“
 ”ہوں..... پورے دس میگزینز میں سے یہ ڈیزائن ڈھونڈے ہیں زوہانے، اتنی جان تو میرے جہیز کے

کھڑوں کے لیے نہیں باری اس نے۔“

ردا جو قریب ہی بیٹھی اخروٹ کھا رہی تھی مزے سے بولی تھی۔

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں..... تمہارے پندرہ بہترین سوئوں میں سے دس کی ڈیزائننگ میں نے ہی تو کی ہے۔“ وہاں فوراً دفاعی انداز اختیار کر گئی تھی۔

”ہاں..... مگر وہ اس اسٹینڈرڈ کی نہیں.....“ ردا شوخی سے بولی وہ ہنس پڑی۔

”تو ٹھیک ہے ناں..... تمہاری تو شادی ہو رہی ہے۔ تم تو لگ چکی ہو ٹھکانے..... لہذا اب نمبر تو ڈیزائننگوں کا ہی ہے ناں۔ چنانچہ ساری مصدعہ کی طرف فوکس کروانا ضروری ہے..... اس شادی میں درکنون کو سب سے زیادہ ہائی لائٹ ہوتا ہے.....“ شوخ لہجے میں کہتی وہ کپڑے احتیاط سے نہ کرنے لگی تھی۔

اس اثنا میں سارہ بیگم، ردا کو ساتھ لے جانے کے لیے ادھر چلی آئی تھیں..... عکرمہ کے سلام کا جواب اشارے سے دے کر وہ بھی دادی کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

ردا نے اسے دوبارہ نہیں چھیڑا صرف مسکرا کر رہ گئی۔

”ہاں بیٹا..... سارے ہی کپڑے نہیں ہیں۔ خاص طور پر رنگ تو ایسے ہیں کہ جو درکنون کے حسن کو چار چاند لگا دیں گے.....“ دادی نے تو صغیٰ نظردوں سے سارے جوڑے دیکھے۔

”وہ تو ٹھیک ہے اماں..... مگر لباس کے جھللاتے رنگ نصیب کی سیاہی تو نہیں مٹا سکتے.....“ کمرے میں داخل ہوتے ہی دادی کی ستائش پر سارہ بیگم نے بے ساختہ کہا تو وہ خنوں ہی نہیں..... باہر بیٹھا عکرمہ بھی ناگواری محسوس کیے بنانہ رہ سکا۔

”جیسے آپ لوگ چاند کہہ رہے ہیں۔ اس میں داغ ہے اور دنیا والے ایسے داغ نظر انداز نہیں کرتے.....“ ان تینوں خواتین پر نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے حد درجہ بے دردی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا تھا۔

”بلکہ اماں میں تو آپ اور زوہا پر حیران ہوں۔ پہلے بھی کتنی بار آپ لوگوں نے اس کی شادی کی کوششیں کیں مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی جو اس کی ماضی کی داستان سنتا ہے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ تو چلو غیر لوگ تھے مگر اب یہاں شادی میں سب خاندان والے ہوں گے۔ میری تینوں بیٹیوں کے سسرال والے ہوں گے۔ تو کیا اب ان سب کو بھی ساری ”سچائی“ بتائی جائے گی۔ ذرا سوچے کہ پھر آگے کیا ہوگا..... کیا منہ دکھائیں گے ہم اور ہماری بچیاں اپنے سسرال والوں کو۔ جس بدنامی سے بچنے کے لیے خود درکنون کا ”باپ“ اسے یہاں دوسرے شہر لے آیا۔“

درکنون کے ”باپ“ کا لفظ نہایت نفرت اور حقارت سے لیتے ہوئے وہ گویا پھنکار رہی تھیں۔

”اب وہ بدنامی ہم اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔“

”پلیز میسی..... اب اس طرح بھی نہ سوچیں آپ..... دنیا کے سارے لوگ خود غرض نہیں ہیں۔ درکنون نے کوئی گناہ نہیں کیا کہ ہم اسے کال کوٹھڑی میں چھپا دیں..... اس کے اچھے مستقبل کے لیے اگر ہم کوشش نہیں کریں گے تو بھلا اور کون ہے اس کا دنیا میں.....“ زوہا صاف گوئی سے کہے بنانہ رہ سکی..... حسب معمول درکنون کے موضوع پر دونوں بحث پر اتر آئی تھیں۔

”تو کیا اس کا مستقبل بنانے کی خاطر میں اپنے بچوں کا فیوچر داؤ پر لگا دوں.....“ وہ غصے سے بل کھا کر بولیں۔ ”اول تو اس حادثے کے بعد اس لڑکی کی ذہنی حالت ہی ایسی نہیں کہ وہ شادی پر آمادہ ہو سکے..... دوسرے ڈاکٹر نے بھی منع کیا ہے اس کے ساتھ زبردستی کرنے کے لیے..... پہلے تم خود درکنون کو توراخی کر لو شادی کے لیے پھر دوسرا اسٹیپ بھی لے لیتا.....“ انہوں نے خوشگین نظروں سے بیٹی کو مورا تو وہ لا جواب سی ہو گئی۔

”یوں بھی میں نے دنیا دیکھی ہے..... ہمارے معاشرے میں کوئی مرد اتنا باخلف نہیں ہوگا کہ سب کچھ جانتے ہو جیسے ایک ایسی لڑکی کو شریک حیات بنالے۔ یہ مروخو تو چاہے نوسو سو پہ کھائے ہوئے ہوں..... پر بیوی کے معاملے میں ان کی سوچ اور ہی ہوتی ہے۔ بہر حال میں اس ضمن میں مزید اور کچھ نہیں سننا چاہتی..... مظفر کی آنکھوں پر تو اس وقت صرف ہمدردی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔ انہیں وہ سب نظر نہیں آ رہا جو میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے، اسے یوں جذباتیت سے حل نہیں کیا جاسکتا۔ میں سمجھتی ہوں ردا کی شادی کے بعد اس بارے میں سوچیں گے فی الحال وہ پڑھ لے اور اس کا علاج مکمل ہو جائے یہی بہت ہوگا.....“ یک دم انہوں نے سر دلچے میں کہہ کر گویا بات ختم کی اور دادی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اماں آپ کے دوپٹوں کی پکیوٹنی رہ گئی تھی ناں..... وہ مجھے دے دیجئے میں کرواتی آؤں گی۔“
 دادی ابھی ذرا دیر پہلے دالی گفتگو سے کچھ اداس ہو گئی تھیں..... خاموشی سے اٹھ کر الماری سے مطلوبہ شاپنگ بیک نکال کر دیا اور پھر وضو کرنے چل دیں۔

”اوکے..... پھر میں چلتی ہوں۔ زوہا تمہارے پاپا آجائیں تو دیکھ لینا درکنون نے چائے دے دی ہے انہیں یا نہیں، اوکے.....“ سارہ اسے ہدایات دیتی ردا کے ساتھ رخصت ہو گئیں تو وہ باہر لاونچ میں چلی آئی۔ جہاں عکرمہ ابھی تک براجمان تھا۔

”چاہئیں..... زندگی واقعی اتنی تلخ ہے یا ہم خود اپنی باتوں سے اسے تلخ بنا لیتے ہیں.....“ بدولی سے کہتی زوہا ابھی تک میسی کے کہے ہوئے جملوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اعجاز ایسا تاسف بھرا تھا کہ عکرمہ کو متوجہ ہونا پڑا۔
 ”ہر ایک کی اپنی سوچ ہے اور اپنا، اپنا نظریہ..... ہم کسی پر اپنا پوائنٹ آف ویو زبردستی قہو پ نہیں سکتے۔ اسی طرح ہر کسی کا ہم سے متفق ہونا بھی ضروری نہیں۔“
 ”معنی.....؟“

”معنی یہ کہ تم وہ کرو جو تمہیں ٹھیک لگتا ہے اور دوسروں کو وہ کہتے اور کرنے دو جو ان کے مطابق درست ہے.....“ زوہا کے مستفسرانہ انداز پر اس نے رسائیت سے جواب دیا تو وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہی ہو گئی۔
 ”ہوں..... تم ٹھیک کہتے ہو..... بقول شاعر

دہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے
 ہم اپنی وضع کیوں بدلیں گے

”ویل سیڈ.....“ وہ حوصلہ افزائی کی خاطر مسکرا دیا۔

”ویسے تم یہاں کیا ڈرکنون کا ویٹ (انتظار) کر رہے ہو۔“

”ہوں..... موصوف کو پڑھنا ہوتا ہے اس ٹائم پر مگر لگتا ہے آج کسی خاص مہم میں جتی ہوئی ہیں محترمہ۔“ اس نے گھڑی پر طائرانہ نظر ڈال کر کہا۔

”ہوں..... ان ٹیکٹ آج کے دن صوفیہ خالہ اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے اس کا دل نہ چاہ رہا ہو پڑھنے کا۔ بہت مس کرتی ہے وہ انہیں.....“ زوہا نے بتایا تو وہ گہری سانس بھر کر اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”آئی سی.....!“

والدین کی کمی اور ان سے پھڑنے کا دکھ اس کے اوپر درکنون کے مابین مشترک تھا اور وہ اس کی شدت اور انتہا سے بخوبی واقف تھا۔ جیسی خاموش ہو گیا تھا۔
 یک دم سنی کے رونے کی آواز پر زوہا اندر چلی گئی..... وہ بھی اسٹڈی میں جانے کے خیال سے نیچے جانے ہی

خود اعتمادی

کامیاب اور قابل فخر زندگی اور مکمل شخصیت کے لیے جس چیز کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کا اعتماد ہے۔ کامیابی کی اونچی چوٹی پر پہنچنے کے لیے خود اعتمادی ہی معاون ثابت ہوتی ہے۔ خود اعتمادی کے ذریعے سے ہی بظاہر ناممکن نظر آنے والے کام کا ممکن ہونا ایک فطری عمل ہے۔

اعتماد ہی کامیابی کی کنجی ہے۔ اعتماد کے فقدان میں تلخ، ناممکن بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اعتماد ہی ہوتا ہے جو کامیابی کو آپ کے قدموں میں لاکر نچھاور کرتا ہے۔ تاریخ پر اگر دھیان دیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ کسی شعبے میں کسی نے کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو اس کامیابی میں راز اس کا اعتماد ہوگا۔

دراصل یہ طاقت تو انسان کے اندر موجود ہوتی ہے، صرف اس طاقت کو عمل کی ضرورت ہوتی ہے جیسا آپ کا اعتماد ہوگا، ویسی طاقت آپ کو ظاہر ہوگی، ویسی آپ کی زندگی بنے گی۔

زندگی کو پرامید، پھر تیز اور چست رکھیے پھر کون سا کام ہے جو آپ نہیں کر سکتے۔ خود اعتمادی کا فقدان، کہیں میں تا کام نہ ہو جاؤں، وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا، یہ دوسرے اور ہم دلی سے باہر نکال کر پھینک دیں اور امید یقین کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ جب کوئی شخص اپنی قوت و کارکردگی کے کمزور پہلو دیکھتا ہے تو پھر اپنی صلاحیت کا اعتماد کھودیتا ہے اور وہ تا کام ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کا معلم اعتماد ہی ہے۔ دلی حکومت میں اعتمادی سپہ سالار ہے۔ تمام قوتیں اس کا حکم مان کر چلتی ہیں جو شخص خود اعتمادی اور خدا پر یقین اور بھروسے پر آگے بڑھتا ہے اسے کامیابیاں مل کر رہتی ہیں۔

از: فضلہ بٹول، بہارہ کبوتر

لگا تھا کہ ڈپر کنون کتابیں اٹھائے اوپر آتی دکھائی دی۔

سفید کاشن کے سوٹ پر سادہ سا دوپٹا اوڑھے وہ خاصی مضطرب لگ رہی تھی۔ مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھیں کافی دیر رونے کے باعث متورم تھیں۔ عکرمہ کے سامنے آنے پر وہ جواپنے آپ میں گم کسی درد میں ڈوبی چلی آ رہی تھی جیسے ایک دم چونک کر سنبھلی۔

”آ..... آپ جا رہے ہیں..... کہیں؟“

”ہاں..... یونہی اسٹڈی میں جا رہا تھا نیچے..... مجھے لگا آج آپ کا پڑھنے کا موڈ نہیں تو سوچا میں بھی کچھ اور کر لوں.....“ اس کے ہنر بڑا کر استفسار کرنے پر اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”سوری، آج دیر ہوگئی.....“ نظریں چرائی وہ صوفے کے ساتھ بڑی سینئر ٹیبل پر کتابیں رکھ کر دیں بیٹھ گئی.....

عکرمہ کو بھی تا چار واپس آنا پڑا۔

”دیسے ضروری نہیں کہ ہم آج چڑھیں..... آپ چاہیں تو آج کا دن آف بھی کر سکتی ہیں۔“

اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں کہا تو ڈپر کنون نے مڑی ہوئی گیلی پلکیں اٹھائیں۔

”کیوں؟“ کا سوال جیسے آنکھوں میں تحریر تھا۔

”اس لیے کہ آپ آج بہت افسردہ ہیں۔ بددلی سے پڑھائی کیسے ہوگی؟“

دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کیے وہ براہ راست اسے فوکس کیے بیٹھا تھا جو اس کی بات پر پلکوں کو بھگنے سے نروک سکی تھی۔

نپے ٹپ آنسو ایک تو اتر سے اس کے سنہری رخساروں کو بھگوتے سفید دوپٹے میں جذب ہونے لگے.....

آبگینوں کو گویا نہیں لگ گئی تھی..... سفید براق لباس میں وہ کس قدر مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی۔

”جیسے آپ لوگ جانندہ رہے ہیں..... اس میں داغ ہے۔“

ذرا دیر پہلے ساڑھ بیس کے کہے گئے جیلے نے اس کی ساعتوں کو زہر خند کیا۔ تو وہ سر جھٹک کر اس کی طرف متوجہ ہوا جو آنسو بہنے لگی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔

”کسی مفکر کا قول ہے کہ آنسو اگر روک لیے جائیں تو وجود کی عمارت کو سیلن زدہ کر دیتے ہیں تو پھر آپ ایسی ناکام کوشش کر رہی کیوں ہیں۔“

وہ جیسے اسے کھل کر رد کرنے کا بھرپور موقع دینا چاہتا تھا۔

”جب یہ آنسو بہہ جاتے ہیں تو سامنے کا منظر بہت صاف اور واضح نظر آنے لگتا ہے اور دکھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے۔ جب مجھے اپنی ماما جان یاد آتی ہیں تو میں خوب روتا ہوں..... ذرا سی بھی کنبوئی نہیں کرتا اور یوں میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“ بڑے شفیق انداز میں وہ گویا اپنا آپ اس کے سامنے کھول کر رکھ رہا تھا۔ دُر کنون نے تحیر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ بھلا یہ شخص بھی روتا ہوگا جو مسکراتا ہے تو ارد گرد کا سارا ماحول مسکرانے لگتا ہے۔

اس نے گویا سامنے بیٹھی لڑکی کو شرمندگی سے نکالا۔

تو وہ جو خفیف ہونے لگی تھی آ پچل سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”آپ بھی..... جبکہ دادی آپ کا کتنا خیال رکھتی ہیں۔“

بے اختیار لبوں سے پھسلا تھا..... عکرمہ اس کے بول پڑنے پر قدرے حیران ہوا مگر ظاہر کیے بغیر بولا۔

”ہماری زندگی میں ہر رشتے کی اپنی، اپنی جگہ ہے دُر کنون..... یہ سچ ہے کہ مجھے ماں، باپ کے پیار کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی کہ دادی اور چچا جان مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں مگر ماں باپ کے وجود کی کمی، کبھی کوئی پوری نہیں کر سکتا..... خاص طور پر میرے باپ کی جگہ کبھی کوئی نہیں کر سکا..... جب میں چھوٹا تھا تو ان کے کندھے پر سوار ہو کر مسجد جایا کرتا تھا اور جس دن وہ مجھے چھوڑ کر گئے پھر چچا جان کے ساتھ میں ہر بار مسجد گیا مگر نہ تو باپ کا شفیق کندھا تھا اور نہ ہی وہ ناز اٹھوانے والا بیٹا حالانکہ چچا جان مجھ میں اور سیف میں کبھی فرق نہیں کرتے.....“ وہ کسی غیر مرئی نقطے پر ٹکا ہوا تھا۔

”یہ نہیں کہ چچا جان کی محبت یا شفقت میں کوئی کمی تھی۔ بس یہ تھا کہ میں ہی ان سے دیے ڈیمانڈ نہ کر سکا جیسے کہ اپنے والد سے کیا کرتا تھا۔“

اس کے بردبار لہجے سے کچھ جھٹک رہا تھا۔ جو دُر کنون محسوس کر کے جیسے اپنے غم سے نکل کر اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

اور جب وہ چپ ہوا تو جیسے یہ طلسم بھی ٹوٹ گیا۔

عکرمہ نے خود میں واپس آتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اسے دیکھا جو بغور اسے سن رہی تھی۔

”تو سچ یہ ہے کہ ہر انسان کا ایک ماضی ہے مگر اپنے ماضی کو سینے سے لگا کر رکھنا غلط ہے۔ زندگی ہمیشہ آگے کی طرف سفر کرتی ہے۔ بلا ضرورت ماضی کے خول میں جھانکتے رہنے سے حال اور مستقبل دھندلائے لگتا ہے۔ ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔ کون جانے آگے ہمیں کچھ ملنے والا ہو۔“

”مگر یہ تو خود فریبی ہے..... لوگ ہمیں ہمارے ماضی سے شناخت کرتے ہیں۔“ اس کی طویل گفتگو کے جواب میں اپنے ہاتھوں کی ککیروں کو بغور دیکھتے ہوئے ایک عجیب سے حسرت بھرے ناامید سے لہجے میں دُر کنون نے کہا تھا۔

عکرمہ کو احساس ہوا آج وہ اسے شخص سن ہی نہیں رہی سمجھ بھی رہی ہے جیسی بات کو بڑھاتا ہوئے بولا۔
 ”خود فریبی انسان کی فطرت کا جزو ہے۔ انسان مایوسی کے اندھیرے میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتا..... جانتے ہوئے بھی انجان بن کر اپنے آپ کو تسلی اور تسکین دینے کی کوشش میں لگا رہتا ہے..... اس سے گو ہر مقصود تو ہاتھ نہیں آتا لیکن خود فریبی کی لذت، غم کی اذیت کو کچھ کم ضرور کر دیتی ہے..... اس لیے میں خود فریبی کو غلط نہیں سمجھتا۔“ اس کا انداز ناصحانہ اور فلسفیانہ تھا جبکہ لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”رہ گئی بات..... لوگوں کی تو لوگ ہمیں اسی سے شناخت کریں گے جسے ہم اپنے وجود کا حصہ بنا کر رکھیں گے۔ اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے حال کو اس کا حوالہ سمجھا جائے تو اسے اپنے ماضی سے نکل کر حال میں سفر کرنا ہوگا..... یہ ایک آزمودہ نسخہ اور طے شدہ فارمولا ہے.....“ اس نے حتی انداز میں کہہ کر گویا بات ختم کی تو ڈرتکونوں نے ایک لٹلے کے لیے اس کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا تھا۔

.....☆.....☆.....

گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ ایسی شدید تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا..... وہ بہ مشکل ٹٹول، ٹٹول کر چل رہا تھا..... کتنی ہی دیر گزر جانے کے باوجود ابھی تک وہ اس اندھیرے میں دیکھنے سے قابل نہیں ہو پایا تھا۔ آنکھوں کے آگے مانوس نے سیاہی کی چادر تان رکھی تھی کہ یوں ہی اچانک چلتے، چلتے اس کے قدم کسی انسانی وجود سے ٹکرائے تھے۔
 ”اوہ..... کون ہے.....؟“

اس پُرہیت سنائے میں گونجتی اس کی اپنی آواز اس کی دھڑکنوں کو ڈگمگا کر گئی۔

جواب نہ دار تھا۔

اس نے بری طرح گھبراتے ہوئے جھک کر اپنے قدموں تلے پڑے وجود کو لرزاتے ہاتھوں سے چھوا۔

”کون ہو..... کون ہو تم.....؟“

کپڑے کی زرباٹھوں سے زار، یار کو اندازہ ہوا کہ گرا ہوا وجود نسوانی ہے۔ بے اختیار اس نے پکار ڈالا تھا۔

تاریکی میں آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر دیکھنے کے سبب اسے اب دھندلا سا ہیولہ نظر آنا شروع ہو گیا تھا۔

نازک نسوانی وجود غالباً زخمی تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں پر انسانی خون کی چمچا ہٹ محسوس ہوئی تو اس نے سامنے

پڑے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ جو کوئی بھی تھی..... منہ کے بل سڑک پر پڑی تھی۔

اس لمحے اس نے خوف کی انتہائی شدت کو خود پر حاوی ہوتا محسوس کیا تھا۔ کہیں دور کوئی کار گزری تھی شاید جس

کی ہیڈ لائٹ نے کچھ دیر کے لیے تاریکی کو چر کر سارا منظر واضح کر دیا تھا۔

اس نے جھک کر نسوانی وجود کو سیدھا کیا تو اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک دلخراش چیخ اس کے لبوں سے نکل گئی۔

”نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا.....“ اس کی اپنی چیخ اس قدر زوردار تھی کہ نہ صرف اس کی آنکھ کھلی بلکہ وہ گھبرا کر

بیز پرائیڈ بیٹھا۔

”مائی گاڈ.....“

یہ سب خواب تھا..... وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر موجود ہے..... یہ محسوس کرنے کے باوجود حسب معمول

اس کے دل کی دھڑکن اعتدال پر نہیں آ رہی تھی..... جتنے ہی سالوں سے وہ یہ خواب ہنسنے میں کئی بار دیکھتا تھا..... مگر

آج تک وہ اس کیفیت پر قابو نہیں پاسکا تھا جو اس طرح رات کو چیخ مار کر اٹھ بیٹھنے کے بعد اس کے وجود سے لے کر

اس کی ذات تک کو مفلوج کر کے رکھ دیتی تھی۔

”کیا کروں میرے مالک..... آخر یہ سزا کب تک.....؟“

انگلیاں بالوں میں پھنسا دے وہ بدولی سے بیڈ کے کنارے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی اس کا پورا جسم پسینے سے بھیجا ہوا تھا اور حلق بری طرح سوکھ رہا تھا۔

اس نے اتھ بڑھا کر سائڈ لیپ آن کیا اور وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ گویا اسے سوئے ہوئے صرف گھنٹا ہی ہوا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر گلاس تو موجود تھا مگر پانی ندر..... اس نے منرل واٹر کی بوتل کی تلاش میں نگاہ دوڑائی تو وہ بھی غائب.....

ناچار بدولی سے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارتا وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا کرے سے باہر نکل آیا۔ کارڈیور سنسان پڑا تھا..... تاہم لاؤنج میں جلنے والی ٹیوب لائٹ کی روشنی یہاں بھی چھن چھن کر پہنچ رہی تھی..... یقیناً کوئی نہ کوئی جاگ رہا تھا۔ لیکن جانے کے لیے اسے لاؤنج سے ہی گزرنا تھا۔ پیاس کا غلبہ تھا اس لیے اسے ناگوار خاطر اس طرف آنا پڑا..... حسب امید چپس، پوپ کارن اور گرم، گرم کافی سے لطف اندوز ہوتائی وی کے آگے ڈٹا مہران اس کے سامنے تھا۔

اس نے نظر انداز کر کے لکھنا چاہا مگر مہران اس دوران اسے دیکھ چکا تھا۔

”ہیلو bro..... کیا حال ہے..... آج رات پھر جاگ گئے ہو آپ.....؟“

اس کے شوخ انداز پر مسخرگامان کرتے ہوئے انتہائی غضب سے اسے ٹھوکر جواب دے بغیر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ ”کمال ہے.....“ گو کہ مہران اس رویے کا عرصہ دراز سے عادی تھا مگر کبھی، کبھی اسے واقعی حیرت ہوتی تھی..... آخر کس مٹی سے اس کا خمیر اٹھا تھا کہ مہران کی پیہم کوششوں کے باوجود بھی وہ ایک دوسرے سے آج بھی صدیوں کے فاصلے پر تھے۔

”ویسے مانتا پڑے گا گاڈ..... بڑا ہی ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ پیس تو نے ہمیں گفٹ کیا ہے.....“ اب کے مہران کے لبوں پر بڑبڑاہٹ تھی۔

جس لمحے پانی پی کر خود کو قدرے پرسکون کر کے ”وہ“ کچن سے برآمد ہوا۔ مہران اس کے بارے میں سوچ رہا تھا اور لا شعوری طور پر اس کے باہر آنے کا منتظر بھی۔

”اتنی لیٹ نائٹ جاگ رہے ہو تم..... کل کالج نہیں جانا تمہیں.....؟“ خلاف معمول اور خلاف توقع وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے بجائے اس کے سامنے والے صوفے کی پشت پر آکھڑا ہوا تھا۔

”جاگ تو آپ بھی رہے ہو bro.....“ مہران کے لبوں پر ہمیشہ کی طرح آج بھی خوشگوار مسکراہٹ تھی ہوئی تھی۔ جواب خلاف توقع ملا تھا..... اس کی بھوسیں تن ہی گئیں۔

مہران نے جونہی اس کے ماتھے پر ٹکٹوں کا جال مٹنے دیکھا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ان ٹیکٹ میرے روم میں دو بج کم آ رہا ہے سو یہاں چلا آیا..... بالکل لیٹ ایکشن مووی ہے..... اس لیے رہا نہیں گیا..... کم آن آپ بھی جوائن کرو.....“ اس کے دوستانہ انداز میں کچھ تھا۔

وہ ایک لمحے کو چپ چاپ اسے دیکھتا رہا اور پھر نفی میں سر ہلاتا پلٹ گیا۔ ”ہاہ.....“ اس کے جانے پر مہران نے گہری سانس بھری تھی پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں صوفے پر گر گیا۔

”ٹھیک ٹھاک مسٹری ہے..... ڈیٹر مہران چلو تم بھی مٹی ڈالو اور یہ مووی دیکھو کل صبح واپس بھی کرنی ہے.....“ خود کو مشورہ دے کر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

مین گیٹ سے اندر تک درمکنون اور ردا ساتھ، ساتھ آئیں..... مکر مہ کسی سے موبائل پر بات کرنے میں روف ہو چکا تھا۔

”شکر ہے تم لوگ آ گئے..... اب تو میرا مغلظات کا کوڑہ بھی ختم ہو رہا تھا.... جو تم لوگوں کے انتظار میں، میں کافی سے زیادہ استعمال کر ڈالا ہے۔“

زوہانے انہیں دیکھتے ہی غصے سے آنکھیں نکالی تھیں۔

”مجھے کچھ مت کہنا..... ساری غلطی درمکنون کی ہے۔ یہ محترمہ بھول ہی گئی تھیں کہ صبح، صبح پایا کیا کہہ کر گئے تھے۔“

ردانے دور سے ہی ہاتھ اٹھا کر اپنا دفاع کیا..... تو تنے ہوئے چہرے سمیت قریب آئی زوہادھی پڑ گئی۔

”بلکہ محترمہ بعد تھیں کہ میں ہی اس کے لیے شاپنگ کر لوں.....“ ردانے بقیہ کہانی بھی فوراً سنا ڈالی تو اس نے تھکھڑی پشیمان سی درمکنون کے کندھے پر بازو پھیلا دیے۔

”اوہ..... کم آن دری..... ہم سب ساتھ چلیں گے ناں..... دیکھنا کتنا مزہ آئے گا۔“

وہ جوابا کیا کہتی..... محض پھسکی سی مسکراہٹ مسکرا کر رہ گئی۔

”کچھ پیو گی؟“

”نہیں.....“ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس دوران مکر مہ بھی اندر داخل ہوا۔

”تم کچھ لوگے مکر مہ.....؟“ کچن کی طرف جاتی زوہانے ہانک لگا کر پوچھا تھا۔

”ہاں..... ایک کپ چائے بنا دو۔“

لاؤنج میں پڑے صوفے پر بیٹھے ہوئے اس نے جوابا کہا تھا۔ بے خیالی میں سامنے بیٹھی درمکنون پر نظر پڑی تو غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔

غور کرنے پر پتا لگا وہ آج ہمیشہ سے زیادہ زورس تھی..... اور کچھ اپ سیٹ بھی۔

”کیا بات ہے..... آپ اتنی ٹینس کیوں لگ رہی ہیں.....“ وہ متر دسا استفسار کر گیا تو درمکنون چونک کر اپنے رے پر ہاتھ پھیر کر اسے دیکھنے لگی۔

”تو بہ..... یہ چہرہ ہے میرا یا نئون سائن؟“

”نہیں تو..... میں ٹینس تو نہیں.....“

جب سے اس نے پڑھنا شروع کیا تھا آہستہ، آہستہ اس کی جھجک کم ہونے لگی تھی۔ پہلے ہوں، ہاں سے کام لیتی تھی تاہم اب مکمل جملے بولنا شروع کر دیئے تھے۔

”ہونا بھی نہیں چاہیے..... آپ کی کزن کی شادی ہے۔ آپ کو تو بہت خوشی، خوشی اور جوش کے ساتھ حصہ لینا ہے۔ جب ہم کسی کی خوشی میں خوش اور غم میں دکھی ہوتے ہیں تو وہ بھی ہمیں دل سے قریب محسوس کرنے لگتا ہے۔“ نادانستہ طور پر ہی سہی مگر وہ پھر ناحسانہ ہو گیا تھا۔

”چچا جان آپ کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بیٹی کی شادی میں اگر آپ دل سے شامل ہوں گی تو میں بہت اچھا لگے گا..... کبھی، کبھی دل کے نہ چاہئے پر بھی ہمیں اپنوں کی خوشی میں خوش ہونا پڑتا ہے۔“

”ایسی بات نہیں..... میں ردا باجی کے لیے خوش ہوں.....“ وہ اس کی بات کو قطع کرتے ہوئے بھجٹ بولی تھی۔

”تو پھر اس بات کو ثابت اور ظاہر بھی تو ہونا چاہیے.....“ بالآخر وہ مسکرا ہی دیا تھا..... جوابا وہ لب بھینچ کر پنے ناخنوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ لو.....“ روانے بیک سے کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے..... ”یہ پاپا اور داوی نے دیے ہیں درکنوں کے لیے۔“

”تو اسی کو دینے تھے ناں.....“ زوہانے نوٹ لے کر ایک طرف رکھے۔

”تم خود ہی دینا..... میں یہاں بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے لائی ہوں اسے..... اب یہ معرکہ تم ہی مارنا سمجھیں.....“ روانے کو کیز کرتے ہوئے صاف ہری جینڈی دکھا دی تھی۔

”یوں بھی تمہاری بات اس کے داغ میں زیادہ جلدی آجاتی ہے..... دیے آج کل تو عکرمہ بھائی کی بھی سننے لگی ہے۔“

”اچھا.....“ زوہانے دلچسپی لی۔

”ہوں..... شروع میں تو مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ درکنوں پڑھائی میں انٹرسٹ لے گی مگر عکرمہ بھائی کے سوٹ اور جینل رویتے سے غیر متوقع طور پر اس میں کافی تبدیلی آئی ہے.....“

”اللہ کرے..... یہ تبدیلی مستقل بنیادوں پر ہو اور دھیرے، دھیرے درکنوں زندگی کی طرف لوٹ آئے۔“ روا کے تفصیل بتانے پر زوہانے صرف دل سے دعا کی تھی۔

(کتنا اچھا دل ہے زوہا کا..... اپنی کزن کے لیے وہ کس قدر فکر مند اور مخلص ہے، وہ بھی ایسے پُر آشوب دور میں جہاں سنگے رشتوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔)

”چلو آؤ اور چل کر چائے پیئیں۔ ابھی سے سہانے پنوں میں نہ کھو جاؤ ولین بیگم.....“ زوہانے کہنی سے ٹھوکا دے کر اسے متوجہ کیا تو وہ یک دم شگفتگی سے مسکادی۔

”خیریت.....! یہ تم دونوں کیا اسٹیجوز بنے بیٹھے ہو.....“ لاؤنج میں آتے ہی زوہانے دونوں کی خاموشی کا نوٹس لیا تھا۔

”تمہارا ویٹ کر رہے تھے..... تم چائے بنانے لگی تھیں یا پاپے لگانے.....“ عکرمہ نے حسب توقع جواب دیا تھا۔

”خیر ایسی بھی بات نہیں..... اپنی دے تم لووری۔“

”نہیں..... مجھے خواہش نہیں ہے.....“ اس نے سادگی سے انکار کیا تھا۔

”خواہش تمہیں کبھی ہوتی بھی ہے.....؟ ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں اور تم ایسے پریشان بیٹھی ہو..... جیسے ایگزامینشن ہال کی طرف لے جایا جا رہا ہو تمہیں.....“ روانے اپنا نگہ تھام کر تبصرہ کیا۔

عکرمہ نے دیکھا اس کے جملے پر وہ خفت سے یک دم گلابی ہو گئی تھی۔

”بائی داوے..... تم دونوں سسٹرز کے ساتھ شاپنگ کرنا کسی امتحان سے کم بھی نہیں..... اتنا ٹائم لیتی ہو کہ دوسرا بندہ چکر اچ جائے۔“

یک دم عکرمہ نے سب کو متوجہ کر لیا تھا۔ روا اور زوہا دونوں ناراض ہوئے نکلیں۔

”تم تو رہنے دو عکرمہ..... ہمارے ساتھ بڑے نخرے کرتے ہو..... اپنی بیگم آئے گی تو گھنٹوں اس کے ساتھ مارے، مارے پھرا کر دوگے.....“ زوہانے مستقبل کا نقشہ کھینچا تھا۔

”وہ بھی خوشی، خوشی.....“ روانے لقمہ دیا۔

”اللہ نہ کرے کہ تم جیسی ہومیری لائف پارٹنر.....“ اس نے قصد اچانے والے انداز میں کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

”ہاں مافوق الفطرت مخلوق ہوگی ناں وہ..... سیدھا آسان سے میز می لگا کر اترنے کی.....“ زوہا جل ہی تو گئی۔

”ہو بھی سکتا ہے۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولا۔

تبت سنو

آپ کے قدرتی حسن کو دوبالا کرے -
اس کے استعمال سے جلد ہمیشہ صاف
اور ملائم رہتی ہے اور چہرے پر ایک نئی
تازگی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔



تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

English

انگلش پھر سب سے آگے !



انگلش دنیا کا بہترین ڈنٹھ پیسٹ ہے۔

کیونکہ اس میں ہے ایکویٹر ٹیٹیم کے ساتھ ڈنٹھ فلورائیڈ، تاکہ آپ کے دانتوں کو
Maximum نہیں بلکہ Guaranteed Cavity Protection

A Quality Product of
Sanaulata & Sanaulata
Pakistan

@SnScore

english.toothpaste

HS
Pakistan Standards

سے تصدیق شدہ

<https://reading-caretofun.net>

تھا..... اور تیر ٹھیک نشانے پر لگا بھی۔
 ”مطلب.....؟“ وہ اٹھتے، اٹھتے رک گیا۔

”مطلب زارا آ رہی ہے..... اس مہینے ساتھ میں خولہ بھی ہے..... واوی کو اچھی لگی ہے خولہ اور.....“ زوہا کہہ رہی تھی کہ روانے جملہ اچک لیا۔
 ”اب اگر آپ کو پسند آئی تو چٹ مگنی۔“

”پٹ بیاہ.....“ زوہا نے بڑے پرجوش انداز سے کہا تو وہ سر پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔
 ”اللہ مالک ہے..... جب میں نے آج تک کسی کے ساتھ برا نہیں کیا تو امید ہے کہ میرے ساتھ بھی اچھا ہی ہوگا.....“ لیکن اس قدر نفیس ہوگی میری پارٹنر.....“ اس نے زیر لب مسکرا کر کپ میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
 درمکنون اس دوران بس سب کو مٹی دیمکتی رہی تھی..... شادی اور لائف پارٹنر کے ذکر پر عکرمہ کے لبوں پر جو سہل، سہل مسکراہٹ آئی تھی۔ روا کی آنکھوں میں جو وہ پہلے خواب سے تھے وہ ان سب خوشیوں سے کس قدر دودھمی۔
 کسی کی زندگی میں شامل ہونے اور کسی کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کا خیال..... اس سے جڑے خواب، سب کچھ کتنا خوب صورت تھا ان سب کے لیے مگر اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا یہ.....

”خوش فہمی ہے یہ تمہاری.....“ زوہا ساتھ چلتے چلتے شوخی سے بولی تھی۔
 ”اور تمہاری غلط فہمی.....“ عکرمہ نے برجستہ جواب دیا تھا۔
 ”ویکھارو..... یہ تو ابھی سے ہاتھوں سے نکل رہا ہے۔“
 ”ہاں ذرا سا برا کیا کہہ دیا عکرمہ بھائی تو طرفنداری پر اتر آئے۔“
 ”وہ تو ظاہر ہے..... عکرمہ شیرازی کی پارٹنر ہوگی..... اب کوئی ایسی دہی تو ہونے سے رہی۔“
 ”ہوں..... آئے خولہ آ رہی ہیں شارجہ سے، دیکھ لیتے ہیں۔“
 کار میں بیٹھے، بیٹھے ان تینوں کی چیمڑ چھاڑ چلتی رہی..... جبکہ ان سب کے پیچھے ست قدموں سے چلتی دو درمکنون کے احساسات سے وہ تینوں انجان تھے۔
 ”چلو اب جلدی چلو..... ویسے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے.....“ کار میں بیٹھے ہی زوہا کو وقت کی فکر ستانی تھی۔

☆.....☆.....

واوی کا lungs specialist سے اپائنٹمنٹ تھا آج۔ عکرمہ آخر کی کلاس موقوف کر کے کچھ جلدی ہی گھر واپس آ گیا۔ واوی نے کہا تھا کہ لہجہ گھر پر کر کے ساتھ نکل چلیں گے۔ واپسی میں بازار بھی جانا تھا انہیں.....
 وہ سیدھا اوپر واوی کے پاس آیا۔
 ”السلام علیکم واوی۔“

”علیکم السلام..... جیتے رہو.....“ واوی بھی اس کے انتظار میں تھیں۔
 ”آپ بس تیار ہو جائیں..... میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں۔“
 ”جلدی آنا بیٹا..... کھانا تیار ہے نیچے۔“

واوی اس کو تاکید کرتی نیچے چلی گئیں..... ذرا اوپر بعد ڈارک براؤن شلوار سوٹ میں لمبوس سیل فون پر کسی کو ٹیکسٹ کرتے ہوئے وہ اندر داخل ہوا تو واوی اسے ڈانٹنگ ٹیبل پر اپنی منتظر ملیں۔ اس نے بھی کرسی سنبھال لی۔ روا اور چچی جان حسب معمول آج بھی شاہنگ سے واپس نہیں لوٹی تھیں۔ اس نے بھویں اچکا کر دیکھا دو درمکنون بھی غائب تھی۔

’چلو ہٹا..... بسم اللہ کرو۔‘

”کچن میں ہے۔ اسے آج بھوک نہیں ہے۔“

پلاؤ کی دُش اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے اس نے گویا حکیمانہ انداز اختیار کیا تھا..... وادی نے متفق ہوتے ہوئے اسے آواز لگائی تو وہ مرے، مرے قدموں سے اندر چلی آئی۔

”کھانا کھائیں بیٹھ کر..... کھانے سے کیا ناراض ہے۔۔۔۔۔“ دادی سے پہلے وہ بولا تھا..... لہجہ حکمیہ تھا۔

”مجھے بھوک نہیں.....“ نظریں جھکائے، جھکائے اس نے کمزور آواز میں پوچھا سا بہانہ بنایا۔

”آپ کو بھوک نہیں مگر کھانا کھانے کی ضرورت ضرور ہے..... کھانا کھائیں اور اب اس بارے میں مزید کوئی بحث نہیں ہونی چاہیے۔“

سرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”ٹھیک سے کھا لیں..... اس کے بعد دوبارہ بھی لینی ہے آپ کو۔“

ریسی تھی۔ داوی نے سب سے پہلے ہاتھ کھینچنا تو درمکنون نے فوراً پلیٹ آگے کی طرف سرکائی۔ عکرمہ نے نوٹ تو کیا

”چلیں دادی..... میرا خیال ہے اب ہمیں لکھنا چاہیے۔“ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں..... میں نے کہا تھاں کہ اب ہمیں کھانا چاہیے.....“ پانی کا گلاس نیل پر رکھتے ہوئے

”میں باہر ہوں وادی..... انہیں لے کر آپ آجائیں..... گھر لاک کرنا ہے..... جائیں درمکنوں اپنی میڈیسن

سے دیکھا گزروہ بھی پوتے کی حامی نظر آ رہی تھیں۔

جباتے ہی وہ بولیں۔

لیکن تمہیں اکیلا چھوڑ کر جانے میں مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے..... سائمرہ کا تو تمہیں پتا ہے شام سے پہلے

نہیں کوئیں گی..... آج تو سیف کو بھی ساتھ لے کر گئی ہیں۔ مظفر میاں بھی شام ڈھلے ہی آتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہمیں بھی دیر ہوگئی تو خود سوچو بیٹا کس قدر پریشان ہو سکتی ہو تم.....“

دادی نے شفق لہجے میں حلاوت سے سمجھایا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی متفق ہوگئی۔ ریڈ سوٹ پر گلابی شال ڈھڑھے جب وہ باہر نکلی تو دادی عکرمہ کے ساتھ گاڑی میں اس کی منتظر تھیں..... گھر لاک کر کے وہ بھی چپ چاپ کار کی پچھلی نشست پر آ بیٹھی۔

ڈاکٹر کے کلینک سے نکل کر وہ لوگ سیدھے جیولر کی شاپ پر گئے۔ دادی کو روا کے لیے کچھ خریدنا تھا۔ ”کیا خیال ہے کہ ایک عید و بندیا بھی لے لوں روا کے لیے... سیٹ کے ساتھ، ساتھ.....“

دادی غالباً دونوں ہی سے مخاطب تھیں۔ دونوں نے ہی سر ہلا دیا۔

دادی کے کہنے پر جیولر نے تین چار ڈبے ان کے سامنے لا دھرے۔

تیس جزاؤ والی میٹروں بندیا ان کے سامنے تھیں۔ دادی انتخاب کرنے لگیں..... عکرمہ نے دیکھا دونوں ہاتھ کود میں رکھے درمکنوں گلاس دال کے پرے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سرا سبکی اور خوف کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ دیکھنے کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ سوچ اور بصارت کا تعلق منقطع ہے۔

”یہ کیسی رہے گی.....؟“ ایک دم دادی نے ایک بندیا اٹھا کر درمکنوں کے سامنے لہرائی تو وہ حامل میں لوٹی اور سامنے کی طرف دیکھا۔

”بہت اچھی ہے دادی.....“ آہستگی سے کہہ کر اس نے نظر سامنے رکھے ڈبوں پر جمائی۔

”دیکھو تو کیسی لگے گی.....“ اچانک دادی نے سر پر اوڑھا اس کا دوپٹا قدرے پیچھے سرکاتے ہوئے اس کی بیچ پیشانی پر بندیا نکادی۔ وہ اس پیش قدمی کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس لیے یکبارگی شیشا سی ٹکی۔ ”دیکھو عکرمہ..... اچھی لگ رہی ہے ناں.....!“ اب کے انہوں نے عکرمہ سے رائے لی تھی چاہی تو اس نے ایک لمحے کے لیے درمکنوں کی طرف دیکھا۔

سادہ چہرے پر محض نیچے سے ہی ایسی رعنائی اتر آئی تھی کہ دادی دیکھ کر ”ماشاء اللہ“ کہے، بتانہ رہ سکیں۔ وہ بہت دل ہو رہی تھی اسی لیے اس نے آہستگی سے نگاہیں موڑ لیں۔

”آپ کی چوائس ہے دادی اچھی تو ہوگی ہی.....“ مبہمی مسکراہٹ سمیت اس نے دادی سے کہا تو وہ جتسم ہو گئیں۔ ”چل ہٹ..... دادی کو بتانا ہے۔“

”نہیں..... یقین کریں! سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ بے ساختہ بولا تھا، لہجہ یقین والا نے پر مصر تھا۔ دادی ہولے سے ہنس پڑیں۔ ”بس پھر میری پسند کی ہوئی لڑکی کے لیے بھی اسی طرح ہاں کہہ دینا.....“ انہوں نے لگے ہاتھوں اس سے مدد لینے کی کوشش کی تو وہ شرارت سے سر کھجا کر ہنس پڑا۔

”آپ پسند تو کریں..... مایوسی نہیں ہوگی۔“

”ان شاء اللہ.....!“

دادی اس کے جواب پر سروردی ہو گئیں..... درمکنوں نے چند ٹانے کے لیے عکرمہ کے جتسم چہرے پر نظر ڈالی۔ ”شاید جن کی زندگی ایسے کرناک اور شکست درہخت سے دوچار کرنے والے حادثوں سے عبارت نہیں ہوتی۔ مستقبل کے ایسے ہی خواب دیکھا کرتے ہیں جبکہ میری آنکھیں خواب تو کیا بصارتیں بھی کھوجی ہیں جیسے..... میں بھلا بے بسنے کیسے سما سکتی ہوں.....“ کسی پروردہ لے کا ہولناک تصور اسے جبر جبری لینے پر مجبور کر گیا۔

عکرمہ نے اس کی خالی، خالی نظریں خود پر محسوس کیں تو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا..... وہ غالباً اس دوستانہ

تسم کے لیے تیار نہیں تھی..... اس لیے خفیف سی ہو کر دادی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”سر یہ غالباً آپ کی ہونے والی مسز ہیں..... انہیں یہ ڈائمنڈ رنگ دکھائیں..... یقیناً پسند آئے گی۔ ایک بہترین تحفہ ہوگا آپ کی فانیسی کے لیے.....“

اسی اثنا میں ایک نو عمر لڑکا رنگرز کا ڈبا اٹھائے چلا آیا تھا..... انداز پر وفیشنل تھا۔ عکرمہ کو متوجہ کر کے ڈرکنون کی طرف اشارہ کیا تو اس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا..... دادی اور عکرمہ بھی ایک لمحے کو چونکے اور پھر سنبھل گئے۔

”لاؤ بیٹا دکھاؤ..... میں اپنے پوتے کی دلہن کے لیے دیکھ لیتی ہوں.....“ دادی نے بڑے سجاؤ سے کہہ کر ڈبا اس بیلز مین کے ہاتھ سے لے لیا۔

ڈرکنون پر دل ہوتے ہوئے بلا ارادہ دوپٹا کھینچ کر ہاتھ تک لے آئی پھر بعد میں دادی نے رنگ اور کئی پینڈنٹ اسے دکھا کر رائے مانگی مگر وہ صرف سر ہلاتی رہی..... یہاں تک کہ دادی جانے کو انھیں۔

”چلیں.....“ اسے گویا زنداں سے رہائی ملی تھی۔

”ہاں بیٹا..... آؤ.....“ دادی کہہ کر آگے بڑھیں۔

عکرمہ ان کے پیچھے، پیچھے آ رہا تھا..... وہ بھی سچے سچ کر قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔ عکرمہ کی رفتار کے ساتھ ہی اس کے قدم اٹھ رہے تھے، رک رہے تھے۔

اس دوران دادی کو راستے میں ایک شاپ پر نہ جانے کیا نظر آ گیا تھا جو وہ رک گئیں۔

عکرمہ باہر ہی رک گیا تھا لہذا اسے بھی رکنا پڑا۔

”مشورہ ایک امانت ہوتا ہے..... جب کوئی آپ سے مشورہ مانگے تو سوچ سمجھ کر دینا چاہیے.....“ دادی کے

شاپ کے اندر جاتے ہی وہ بولا تھا۔ اس کا جملہ اتنا غیر متوقع تھا کہ گویا ڈرکنون کے سر پر سے گزرا۔

”جی.....؟“

”میرا خیال ہے دادی کی دکھائی ہوئی کسی چیز کو بھی آپ نے غور سے نہیں دیکھا اور نہ ہی دل سے رائے

دی.....“ سینے پر بازو لپیٹے وہ اس سے براہ راست مخاطب تھا..... ڈرکنون اس گوشائی پر خفیف سی ہونگی۔

”ایسی بات نہیں..... میں نے تو کوشش کی کہ اچھا مشورہ دوں مگر مجھے جیولری کے بارے میں زیادہ کچھ معلوم

نہیں.....“ ندامت سے کہتے ہوئے وہ انک انک لگتی تھی۔

”اگر معلوم نہیں ہے تو اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ ویسے کمال ہے..... ایک لڑکی ہو کر آپ کو شاپنگ اور جیولری

سے انٹرسٹ نہیں..... کوئٹ امیزنگ.....“ اس نے قہقہہ اخیر کا اظہار کیا تھا۔ وہ ایک بار پھر شرمندہ سی ہو گئی۔

”میری پسندنا پسند دلچسپیاں، خواب، میری خوشی اور ارمان سب ایک سیاہ پتلی رنگ میں ڈوب گئے ہیں۔

اے بھلے انسان تمہیں کیا معلوم کہ کبھی میں کیا تھی۔ اب تو بس یہ وجود زندہ ہے وہ بھی اس لیے کہ دل کے دھڑکنے کا

عمل میرے اختیار سے باہر ہے ورنہ کبھی وہ جو اب ”ذات“ تھی میرے اندر..... عرصہ ہوا اندر ہی کہیں دفن ہو چکی

ہے..... یہ میرا وجود تو ایک چلتا پھرتا مقبرہ ہے بس.....“

وہ اپنی انکھی ہوئی سوچوں میں الجھے جا رہی تھی..... عکرمہ نے اس کو بغور دیکھا تو احساس ہوا کہ انجانے میں

ہی کسی اس نے ڈرکنون کے زخم جھیل دیے ہیں۔ واپسی پر ڈرکنون مانند بت بیٹھی رہی تھی۔

دادی البتہ خوش تھیں کہ آج پہلی بار وہ ان کے ساتھ شاپنگ پر آئی تھی اور ان کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ عدم توجہی

اور بے دلی سے ہی کسی وہ کم از کم گھر سے باہر تو نکلی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے پوچھنے پر مشورے بھی دیے تھے اس نے۔

(جاری ہے)

محبت کے حوصلے

ہاجرہ رحمان

”میں نے بتایا تھا کہ آج صرف وہی عورت پاک باز ہے جو بد صورت ہے..... کیونکہ صرف بد صورت عورت کو ہی مرد دل لگی کے قابل نہیں سمجھتے اور پھر تم بھی تو بغض تھے کہ اسی سے شادی کرو گے کیونکہ تمہاری نظر میں ایک با کردار، ذہین عورت بے حد حسین مگر کسی کی متروکہ محبوبہ سے لاکھ درجہ بہتر بیوہ ثابت ہو سکتی ہے پھر شکل صورت کا تمہیں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر مسئلہ تو ہے اور وہ ہے کہ جس کو بھی دل لگی کرنے والا ہی



نہیں بلا ہو جس پر بھی کوئی فدا نہیں ہوا۔ جسے اسکول کالج کے زمانے میں بھی راہ چلنے کسی لڑکے نے خط جیسا کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہی نہیں پڑا یا تو پھلا وہ کیا جانے یہ عشق، عاشق کیا بلا نہیں..... اب تمہاری بیچاری بد صورت سی بیوی کیا جانے کے معشوق کی موجودگی میں کس طرح خود کو سناورا جاتا ہے اور کس طرح غیر موجودگی کو محسوس کر کے ملنے پر جتا جاتا ہے..... لہذا تمام بلا وہی غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو۔ وہ اگر تمہارے وقتاً فوقتاً ویسے گئے پھول اور تحائف لے کر خوشی کا اظہار نہیں کرتی یا پھر تمہارے ساتھ کسی مہنگے ترین ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں آتی تو یقین کرو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ تمہارے ساتھ خوش نہیں یا پھر تمہارے ساتھ ہونے پر اسے پھچلا کوئی عاشق یاد آ جاتا ہے، اصل مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس بیچاری کو معلوم ہی نہیں کہ تم یہ سب جتن اس کے عشق میں، اس کو خود سے مانوس کرنے کے لیے کر رہے ہو۔

اب وہ بیچاری کیا جانے... جچی جچی..... میرا خیال ہے کہ تم مجھے اس کے ساتھ ایک دن گزارنے کی اجازت دے دو تو میں اس کو ڈھنگ سے سمجھا سکوں گی کہ لی بی اب تم ایک جاذبِ نظر، خوب صورت اور کامیاب مروکی بیوی ہو لہذا اپنے احساسِ کمتری سے باہر آؤ اور شوہر کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے کی تھوڑی بہت جدوجہد کر لو تو کچھ نہیں جائے گا سچ ہے نا؟“

میں جانتا تھا رابعہ میری بیوی کے بارے میں کچھ اسی طرح کی باتیں کرے گی..... ایک حسین عورت اگر دوسری حسین عورت کے بارے میں قیاس آرائی کرے تو وہ اور بھی حسین لگتی ہے مگر جب ایک بیوقوف عورت کسی ذہین عورت کے بارے میں قیاس آرائی کرتی ہے تو وہ اور بھی بیوقوف نظر آنے لگتی ہے اور اس وقت مجھے اپنی بہن میری ذہین بیوی کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتی ہوئی حد سے زیادہ بیوقوف لگ رہی تھی۔ اس میں رابعہ کا بھی قصور نہیں تھا آخر کو وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور بالکل اسی جان کی طرح سوچتی تھی اور میں یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسی جان کو لیلیٰ بچپن سے ہی تاپنے لگی۔

بات تو صرف یہ تھی کہ اسی جان کو ہمیشہ سے خوش رکھنا ہی پسند تھے ان کی نظر میں اچھی شکل صورت ہی سب سے بڑی کامیابی تھی..... ان کے نزدیک تعلیم، خاندان، بڑو باری یہاں تک کہ کردار کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ صورت اچھی ہونی چاہیے، وہ خود بھی اپنی جوانی میں خاندان کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہوتی تھیں اور انہوں نے اپنی پسند سے پایا سے شادی کی تھی جو خاندان کے ہینڈسم ترین مردوں میں سے تھے اس کے بعد اسی جان نے ہمیشہ صرف ان رشتے داروں اور ملنے والوں سے رابطہ رکھا جن کی شکل صورت اچھی رہی ہو۔

اللہ تعالیٰ کی مہربانی یہ رہی کہ اس نے ہم پانچ بھائی، بہن کو بھی اسی جان اور پایا کی طرح اچھا قہار اور شکل صورت عنایت کر دی تھی لہذا میری دونوں بہنوں کے لیے بھی اچھی شکل صورت کے لڑکے تلاش کیے گئے تھے جو کہ دونوں ہی خاندان سے باہر کے تھے جبکہ کسی ایک بہن کو خاندان میں کسی بہتر اور مناسب لڑکے سے بیاہنے کا شوق میرے والد کے دل میں ہی رہ گیا تھا اور اسی کے ساتھ میری دونوں بھایاں بھی اپنی آب و تاب میں چندے ماہتاب لائی گئی تھیں۔ ہمارا پورا خاندان جب ایک ساتھ کسی شادی بیاہ میں اسجے پر فوٹو سیشن کے دوران پاسکی میز پر ساتھ ہوتا تو پورے ہال میں ہم سب جیسے بالکل مختلف بالکل الگ نظر آ رہے ہوتے اور ہر دیکھنے والی آنکھ ہم پر رشک کرتی نظر آتی ایسے میں میرا ماموں جان کی سب سے چھوٹی بیٹی لکلی کی طرف جھکاؤ اسی جان کے ساتھ رابعہ کو بھی مجھ سے ناراض کر گیا تھا۔

رابعہ مجھ سے صرف ایک سال بڑی تھی لہذا ہم دونوں میں بالکل دوستوں کی طرح کی بے تکلفی تھی اس کا شوہر اسی جان کی پسند سے ایک لمبا، صحت مند، گورا چٹا انسان تھا مگر شعیب سال کے زیادہ تر دن رابعہ کے ساتھ سرسرا میں یعنی ہمارے گھر میں ہی گزارہ کرتا کیونکہ اس کے پاس کوئی مستقل کام نہیں تھا مگر اسی جان کو پھر بھی وہ پیارا تھا اور رابعہ کو اپنے بیٹوں بھائیوں کے اپنے الگ، الگ کام کی بدولت گھر میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں تھی لہذا رابعہ اور شعیب کا واحد کام گھر میں ہونے والے ہر کام،

ہر بات اور مکمل کی منصوبہ بندی میں ہر طرح سے ٹانگ اڑاتا تھا۔ میری شادی کے سلسلے میں جہاں امی جان کو منانا مشکل تھا تو راجہ کو سمجھانا مشکل ترین کام تھا مگر میں یہ کر گزرا تھا کہ کبھی مصلحت کے ساتھ اور کبھی غصے، غضب کے ساتھ..... اس کے بعد کئی ہفتے میری اور راجہ کی بات چیت بند رہی مگر پھر لیلیٰ کی خاموشی نے مجھے پھر اپنی بہن کی طرف جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسئلہ تو یہ ہی تھا کہ میں اس کے علاوہ کون سی کیا سکتا تھا۔

شادی کے تین مہینے گزرنے کے باوجود لیلیٰ کی خاموشی سنجیدگی اور لیے دیے رہنے والی عادت سے اب مجھے ابھن ہونے لگی تھی۔ خاندان میں شادیوں کا موسم عروج پر تھا لہذا میری شادی کے بعد ہی تین، چار شادیاں قطار در قطار ہمارے لیے روز کہیں نہ کہیں جانے کی وجہ بن گئی تھیں..... مگر لیلیٰ اکثر ہی شادی، ویسے کے دن کسی نہ کسی بہانے سے انکار کر دیتی تھی، صرف یہی نہیں، میں ان دعوتوں کے علاوہ بھی لیلیٰ کی خاموشی توڑنے کے لیے اسے کئی بار اچھے سے اچھے ریٹونز لے کر جا چکا تھا۔ ماموں جان کا خاندان حیثیت میں کسی طرح بھی ہمارے خاندان سے کم نہیں تھا لہذا میں یہ تو مان نہیں سکتا تھا کہ لیلیٰ ایسی جگہوں پر جا کر بقول راجہ کسی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہوگی اور نہ ہی میں یہ مان سکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ جانا پسند نہیں آتا ہوگا۔ آخر شادی سے پہلے یہ حیثیت کزن ہم کئی بار ملے تھے اور لیلیٰ کو ہمیشہ کم کو اور سنجیدگی ہی نظر آتی تھی مگر وہ میرے سامنے آتی تھی۔ نوکروں کی موجودگی میں بھی میرے لیے جانے نا شتے، کھانے کا انتظام بھی زیادہ تر وہی کرتی تھی جس سے میں یہی سمجھا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے مگر وہ ایک شریف انفس انسان تھی۔ اس میں شوخی نام کو نہیں تھی پھر بچپن سے ہی میں اسے اپنے آپ میں گم سا پاتا تھا۔ وہ سامنے بھی ہنسی ہوتی تب بھی بات کم ہی کرتی زیادہ تر ماموں جان کے گھر کے دوسرے افراد یہ فرض ادا کرتے تھے اور میرے لیے اس کا پس میرے ارد گرد موجود ہونا بھی بہت ہوتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے کیوں پسند تھی مگر اس

کے پاس جانا اس کی دہسی اور کچھ بھی ہو مومنوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ مجھے اچھی لگتی تھی۔ راجہ اور امی جان کی نظروں میں وہ ایک بد صورت لڑکی تھی مگر میرے لیے اس کا سانولا رنگ اور نیچے نقوش ایک الگ طرح کی کشش رکھتے تھے۔ گہری سیاہ آنکھیں، جن سے کبھی، کبھار ہی اس کی بھاری پلکیں مکمل اٹھا کرتیں تو جیسے مجھے ہر طرف دھند بھری سیاہی اترتی محسوس ہونے لگتی..... میری پسند جان لینے کے بعد امی جان نے جس طرح لیلیٰ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا مجھے حیرت ہوئی..... یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی شخص کسی خاندان کے دو افراد کو اچھا یا برا لگ رہا ہو۔ امی جان کی نظر میں لیلیٰ میرے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں تھی۔ ان کے نزدیک مجھے اپنے جیسی گورے رنگ اور بھورے بالوں والی لڑکی سے شادی کرنی چاہیے، انہوں نے میرے لیے ایک سے ایک خوب صورت لڑکی دیکھ رکھی تھی یہاں تک کہ کئی ایک کوانہوں نے مجھ سے ملنے کے لیے گھر پر بھی بلایا تھا۔ اسی وجہ سے میں نے ان روز، روز کی ملاقاتوں سے بچنے کے لیے لیلیٰ کا نام لے لیا تھا اور پھر ایک لمبی اور مشکل جدوجہد کے بعد مجھے وہ حاصل ہو سکی تھی اور اب جبکہ وہ اس قدر پاس تھی تو اور بھی دور محسوس ہوتی..... راجہ اپنی بات کا جواب نہ پا کر تاسف سے سر ہلاتی اٹھی مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہی۔

”میں تو کہتی ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تم اپنی بیوی کو شوہر بن کر دکھا دو.....“

”کیا مطلب.....؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ارے بھی مطلب یہ کہ اب تک تم اسے عاشق کی طرح کسی مجبورے کے مانند اڑتے، اڑے پھرتے تھے اب ذرا اس سے شوہر کی طرح پیش آؤ، کبھی کسی بات پر غصہ کرو، عجیب وغریب سے حکم صادر کرو اور آفس سے آنے سے ذرا پہلے فون کر کے کسی مشکل سے کھانے کی فرمائش کرو اور کچھ نہیں تو آفس جانے سے پہلے اس کی پسینہ پینے کے لیے کپڑے نکالنے کا کہو اور جب وہ نکال کر رکھے تو کبھی پتلون، کوٹ کے رنگ اور کبھی ٹائی کے بے ڈھنگے ہونے پر تنقید کر کے اپنی پسند سے کپڑے نکال

کر پہن کر آؤس نکل جاؤ۔ کیا مجھے؟“ رابعہ نے
کچھ اس رازداری سے کہا کہ مجھے بے اختیار ملی آگئی۔
”ہا ہا ہا..... لگتا ہے شعیب بھائی بہت مشکل وقت
دیتے رہے ہیں میری بہن کو.....“

میری بات پر رابعہ کے چہرے پر رنگ سالہرا یا اور
وہ جڑ بڑ ہوتی تیزی سے آگے بڑھ گئی..... مگر بات وہ
پتے کی گئی تھی۔ مجھے بھی یہی لگ رہا تھا کہ لیلیٰ کو شاید
میں کچھ زیادہ ہی توجہ دے رہا ہوں اب وہ میری بیوی
ہے اور میں اس کی خوشامد کرتے، کرتے ٹھک آ گیا تھا۔
بھئی بھئی وہ بھی تو مجھے احساس دلاتے کہ اسے میری پروا
ہے، وہ مجھے چاہتی نہیں تو کم از کم مجھ سے خوش تو ہے۔
دوسری ہی صبح مجھے یہ موقع مل گیا۔ رابعہ نے تو مجھے لیلیٰ
کی پسند پر تنقید کرنے کا کہا تھا مگر بات یہ تھی کہ میں لیلیٰ
کی پسند سے نکالے گئے کپڑے پہنے کا اب تک اتنا
عادی ہو چکا تھا کہ اب اگر بھی خود نکالنے کی کوشش بھی
کرنا تو گڑبڑ اجاتا لہذا کپڑے نکالنے کے علاوہ مجھے کسی
اور بات پر تنقید یا غصہ کرنے کا جواز ڈھونڈنا تھا اور وہ
یوں ملا کہ صبح جب میں سنگار میز کے سامنے کھڑا بالوں
میں برش پھیر رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ لیلیٰ کو اپنے پیچھے
بستر ٹھیک کرتے دیکھ رہا تھا تو وہ اچانک میری طرف
دیکھے بغیر مجھ سے شانگ پر جانے کی اجازت مانگنے اور
میرے آؤس پہنچ کر گاڑی واپس بھیجنے کے بارے میں
بات کرنے لگی۔

”تم سے کتنی بار کہا ہے کہ یہ اچانک کا بتایا ہوا پلان
مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہے..... تمہیں نہیں جانا ہوا کہ
تو مجھے کم از کم دو چار دن پہلے سے بتایا کر دے تمہیں؟“
میں نے کڑا کے داراؤں میں کہا تو بستر کی چادر ٹھیک
کرتے لیلیٰ کے ہاتھ جیسے ٹھنڈ ہو گئے۔ اس نے اسی طرح
میری طرف دیکھے بغیر ہلکا سا سر ہلایا اور ہونٹ میچنے لگے۔
”اتنا کوئی ضروری نہیں، میں دو چار دن بعد بھی
جاسکتی ہوں یا پھر ابو جان کی گاڑی چھی منگوا سکتی
ہوں؟“ اس کا جواب اسی اطمینان اور حوصلے سے ملا تو اب
کی بار میں واقعی غصے میں آ گیا۔

”ہاں کیوں نہیں، ماموں جان کی گاڑی میں جاؤ“

تاکہ پھر لوگ کہیں کہ میں اتنا نااہل ہوں کہ شاپنگ پر
جانے کے لیے گاڑی تک مہیا نہیں کرتا..... کیوں یہی
مطلب ہے ناں.....؟“

مجھے جس روتے کی امید تھی دیا کچھ بھی نہیں
ہوا..... بس اتنا کہ پہلے اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر
ایک دم جیسے تھکے سے انداز میں لمبی سانس بھر کر بستر کے
کنارے ٹک گئی۔ مجھ میں اور ہمت نہیں تھی کہ آج کے
لیے اتنا ہی بہت تھا اس سے زیادہ میں کچھ کہہ ہی نہیں سکتا
کیونکہ لیلیٰ سے زیادہ تو میں خود تکلیف میں تھا..... میں
جلدی سے اپنا ڈالٹ اٹھا تاکہ اسے سے باہر نکل آیا۔

”کہاں پھنسا دیا رابعہ نے بھی..... چھوڑو یہ غصہ
بھئی..... وہ جیسی بھی ہے ٹھیک ہے بس ایسے ہی چلے دیتا
ہوں، آخر کبھی نہ بھی تو پھٹے گی؟“ میں یہی سب سوچتا
آؤس آ گیا اور اترتے ہی بہادر کو گاڑی کے ساتھ واپس
کر دیا۔ بہادر ہمارا کافی پرانا ڈرائیور تھا اس کے علاوہ
بھی دو ڈرائیور ہمارے ہاں کام کرتے تھے مگر بہادر پر
گھر کی خواتین کے لیے بھروسہ کیا جاتا تھا لہذا جب کبھی
بہنوں یا امی جان کو کہیں جانا ہوتا تو بہادر کو ہی ڈرائیوری
دی جاتی تھی۔ آؤس آ کر اپنے معمول کے مطابق میں
لیلیٰ کو فون کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا اور اس بے چینی میں
مجھے رابعہ پر اور بھی غصہ آنے لگا..... کیسا بے ٹکا سا
مشورہ دیا میری بیوقوف ترین بہن نے..... اسی سوچ
میں کہی نہ کسی طرح دوپہر کی اور جب کھانے کے لیے
میں آؤس کی کینٹین میں بیٹھا کچھ مزدوروں کے مسائل
سن رہا تھا تو اچانک پہلے تو میرے موبائل پر یکے بعد
دیکرے پاپا اور امی جان کا فون آیا اور دونوں نے ہی دو
چار تھیل دے کر بند کر دیا۔ میں ابھی ان میں سے کسی کو
فون کرنے والا تھا کہ بہادر کا فون آنے لگا..... مجھے یہی
لگا کہ وہ واپس آنے کے بارے میں پوچھنے کے لیے فون
کر رہا ہوگا..... لہذا میں نے اس کی کال کاٹ کر پہلے پاپا
کو فون ملا یا مگر پاپا نے فون نہیں اٹھایا اور بہادر کی بارہ
بار کال آنے لگی لہذا میں نے اب کی بار اس کو فون نہ لگایا۔
”چھوٹے صاحب..... وہ میں آج دن میں
چھوٹی بہو کو کل بلازہ چھوڑ کر آیا تھا۔“ دوسری طرف سے

بہادر کی گھبراہٹ ہوئی تھی آواز آئی۔

”ہاں میں جانتا ہوں، میں نے ہی تمہیں لپٹی کو لے جانے کے لیے بھیجا تھا۔۔۔۔۔ تو؟“ میں تیزی سے گویا ہوا۔

”چھوٹے صاحب۔۔۔۔۔ چھوٹے صاحب وہ۔۔۔۔۔ میں بڑے صاحب کے بلانے پر اُن کے آفس چلا گیا تھا۔ چھوٹی بہو سے بات ہوئی تھی انہوں نے دو گھنٹے بعد مکمل پلازہ کے باہر سے پک کرنے کا کہا تھا مجھے۔ چھوٹے صاحب! وہ نہ کہ آپ کے پاس کیا چھوٹی بہو صاحبہ کی کوئی کال آئی ہے؟“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو بہادر جلدی سے مطلب کی بات کرو بار۔۔۔۔۔؟“ اب کی بار میں بہادر کی گھبراہٹ سے خود بھی گھبرا گیا۔

”بھئی میں یہاں یعنی مکمل پلازہ آیا مگر یہاں قریب نہیں جانے دے رہے مطلب یہاں تو۔۔۔۔۔ یہاں تو پتا چلا کہ پوری بلڈنگ میں آگ لگنے کی وجہ سے کافی نقصان وغیرہ ہوا ہے اور کافی لوگوں کی ہلاکت بھی ہوئی۔۔۔۔۔ بہت سی ایسولینس بھی آ جا رہی ہیں مکمل پلازہ جانے والی واحد سڑک صرف ایسولینس کے لیے کھلی ہوئی ہے، یہ سب تو اب بی وی پر بھی آ رہا ہے چھوٹے صاحب، آپ کے پاس چھوٹی بہو کا کوئی فون آیا ہے کیا؟“

بہادر پتا نہیں کیا، کیا بتا رہا تھا مگر میرے حواس جواب دے چکے تھے۔ اسی وقت مجھے پاپا کینٹین میں داخل ہوتے نظر آئے۔۔۔۔۔ میں بھی انہیں دیکھ کر۔۔۔۔۔ بے اختیار ان کی طرف بھاگا۔

”جلدی کرو۔۔۔۔۔ میں نے پتا کر لیا ہے زخمیوں کو عباسی شہید اور جناح اسپتال پہنچایا گیا ہے۔۔۔۔۔ چلو وقت نہیں ہے۔“ ہمیشہ کی طرح پاپا نے اپنے جھکمانہ انداز میں اسپتال کے بارے میں بتا کر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی کسی مشکل میں آتے ہمیشہ اسی طرح مستحیض انداز میں پیش آنے لگتے۔

ہم دونوں بھاگ بھاگ باہر آئے، پاپا اپنی گاڑی خود ہی چلا کر لائے تھے مگر راستے میں انہوں نے بتایا کہ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اپنے آفس سے اسپتال کے لیے نکل گئے ہیں ان دونوں کو جناح

توبہ

انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک۔۔۔۔۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا سے رجوع کر لے اور اپنے گناہوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکو کاری کا خدا سے پکا وعدہ کر لے تو یہی اس کی توبہ ہے۔ یہ توبہ گناہ گار سے گناہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوش محبت میں ڈال دیتی ہے۔ خدا کا ارشاد ہے، جس نے توبہ کی اور ایمان صالح لایا اور نیک عمل کیے تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اقتباس از سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مصنف شبلی نعمانی

سید سلیمان ندوی

انتخاب: فریدہ ہاشمی، کراچی

اسپتال جانے کا کہہ کر ہم دونوں عباسی شہید پہنچ گئے۔ میں نے راستے میں ایک، دو بار سیلی کونون لگایا تھا اور پھر اس کی طرف سے جواب نہ پا کر پاپا کو بتایا تھا۔ اس کے بعد سے پاپا نے معلومات کروائی تھیں اور پھر بہادر کو گھر جانے کا کہہ کر وہ سیدھے میری طرف چلے آئے تھے۔۔۔۔۔ عباسی شہید اسپتال کے احاطے میں کئی ایسولینس کھڑی تھیں جن کے اندر سفید چادر میں لپٹے کئی جسم بڑھکے انداز میں لیٹے نظر آ رہے تھے اور کئی لوگ وہاں ان جسموں کے چہروں کو دیکھ، دیکھ کر ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو حادثے کے بارے میں سن کر اپنے کسی پیارے کی تلاش میں آئے تھے اور بدحواسی میں رونائیک بھولے ہوئے تھے، ایسے میں بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو

صرف تماش بین کے طور پر موجود تھے جو ایسبونس سے اترتے زنجیوں کی مدد کر رہے تھے، نہ ہی ان کے لیے اسپتال کے ایمر جنسی وارڈ تک جانے کے لیے جگہ ہی بنا رہے تھے..... بلکہ ان کے بلاوجہ اسپتال میں رش بڑھانے کے باعث ایمر جنسی وارڈ کے باہر کچھ سکیورٹی کے لوگ باقاعدہ اپنی گن تانے کھڑے تھے جب ہم لوگ قریب پہنچے تو انہوں نے پہلے تو ہماری بات سننے کے بجائے دھکے دے کر سائڈ میں گل پلازہ میں شاٹنگ کے لیے گئی تھی اور شاید یہاں پر زخمی حالت میں لائی گئی ہو۔ ہمارے پیچھے چند اور لوگ بھی آگئے جن میں کچھ خواتین بھی تھیں اور پھر ہم سب کے باری، باری شناختی کارڈ دیکھ کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے بڑے سے ہال میں معمولی زنجیوں کو جگہ دی گئی تھی..... یہاں پر اسٹریچر نہ ہونے کے برابر تھے چاروں دیوار کے ساتھ چادر بچھا کر زنجیوں کو لٹایا گیا تھا ان میں کئی ایسے بھی تھے جو ہوش میں تھے اور ہر اندر آنے والے کو غور، غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے یہاں پر اکا دکا زنجیں کچھ زنجیوں کی مرہم پٹی کرنے میں مصروف تھیں۔ میں اتنا بدحواس تھا کہ بس ایک نظر ڈال کر اندر کے ہال میں دوڑ گیا تھا جہاں پر ڈاکٹروں اور نرسوں کی فون بھاگ دوڑ کر رہی تھی یہاں پر زنجیوں کی تعداد زیادہ بھی اور یہ وہ بد نصیب تھے جن کی حالت ناؤک تھی اور کوئی بھی ہوش بدحواس میں نہیں تھا۔ میں نے ایک، ایک بستر پر جا کر دیکھنا شروع کر دیا میں آنے آج تک اس طرح کبھی اتنے سارے زخمی ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے کبھی اس طرح ایسے ارد گرد موت کو بھاگتے دوڑتے نہیں دیکھا تھا۔ ہر طرف جلنے اور خون کی بو پھیلی ہوئی تھی جس کو سچر اور اسپرٹ کی بو بھی ختم نہیں کر پا رہی تھی، کئی مریضوں کی حالت دیکھ کر میں یہ بھی بھول جاتا کہ میں یہاں کس کو تلاش کرنے آیا ہوں اور ہر بار اسٹریچر پر پڑے زخمی کو دیکھ کر آگے بڑھنا بھول جاتا۔ میں ابھی آدھے ہی مریض دیکھ پایا تھا کہ کسی نے میرے کندے پر ہاتھ رکھا۔ یہ پاپا تھے..... وہ

مجھے کندھے سے پکڑے ہوئے واپس پہلے ہال میں آئے اور دروازے سے ہی کھڑے انہوں نے ایک کونے پر اشارہ کیا۔ میرا دل وھک سے رہ گیا۔ یقیناً وہ لیلیٰ ہی تھی جو کندھے تک چادر اوڑھے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ مگر اس کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور اس کے پاس پہنچ کر اس کے قریب ہی جا بیٹھا۔ یہ سوچے بغیر کے میرے اس طرح جگہ بنائے بغیر لیلیٰ کے قریب بیٹھنے سے برابر والے زخمی کو تکلیف ہو سکتی تھی مگر میں اس وقت لیلیٰ کو دیکھ کر ہوش میں کہاں رہا تھا۔ اس کے بال اجڑے ہوئے خون میں لت پت تھے اس کے ماتھے پر پٹی کے نام پر بس ایک پتلی سی ڈوری جیسا کچھ باندھا گیا تھا جس سے اس کے ماتھے کا زخم صاف نظر آ رہا تھا جس سے ہلکا، ہلکا خون بہہ کر اس کی گردن سے گزرتا اس کے دائیں کندھے کو لال کر رہا تھا..... چہرے پر کئی خراشیں آچکی تھیں اور چادر بھی کئی جگہ سے خون آلود ہو رہی تھی مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں پھر بھی اس نے مجھے قریب آتے دیکھ کر کبھی کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نام لے کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ زنجیوں کی مرہم پٹی کرتی ایک نرس ہمارے قریب آگئی۔ ”بھگدڑ میں پیدوں تلے روندے جانے کی وجہ سے یہ سارے زخم آئے ہیں ان کو..... ڈاکٹر نے چیک کر لیا ہے کوئی ایسی چوٹ نہیں آئی جس سے ان کی جان کو خطرہ ہو مگر آپ یوں کریں کہ یہاں سے نکل کر ان کو کسی پرائیویٹ اسپتال میں بھی دکھا دیں..... باہر انتظامیہ میں جا کر اسے شناختی کارڈ کی کاپی جمع کروا کر مریضہ سے اپنا رشتہ اور گھر کا پتہ وغیرہ لکھوا کر آپ ان کو لے جائیں۔“ نرس نے جلدی میں رٹے ہوئے جملے دہرائے اور آگے بڑھ گئی۔ پاپا مجھے لیلیٰ کو لے کر آنے کا کہہ کر خود انتظامیہ کی طرف چلے گئے۔ ایسی ہنگامی صورت حال میں گاڑی تک پہنچانے کے لیے وکیل چیئر یا اسٹریچر کے بارے میں سوچنا بکا رہا تھا اور میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اس وقت لیلیٰ خود چل کر نہیں جاسکے گی لہذا میں نے اپنے ہاتھوں پر ہی لیلیٰ کو اٹھالیا اور پھر پاپا کے آنے

عالمیں کی جو نیکیاں اور برکات کا پھر

کیا آپ کو معلوم ہے کہ؟

شاہی
سفوف
شوگر نو

خون اور پیشاب میں




شوگر کی موثر ترین دوا

[illegible]

1/2 چمچ صبح 1/2 چمچ شام کھانے سے پہلے یا بعد پانی کے ساتھ استعمال کریں

☆ خواجہ میڈیکل سٹور بالقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی ☆ عرفان قادری جڑی بوٹی 10 باہر مارکیٹ لاہور
☆ کراچی ☆ رفیق ٹریڈرز اینڈ وانی مصطفیٰ دواخانہ رسالہ روڈ حیدر آباد ☆ خالد برادرز مدنی سٹریٹ سکھر ☆ سندھ
بریل ہومیو پتھ ریروڈ تھلہ سکھر ☆ کلاسک ہومیو مسجروڈ کوئٹہ ☆ راوی دواخانہ اوگی ☆ مونگا پنسار مین بازار لیاقت
آباد ☆ لاہور ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور ☆ ضیا ہومیو مسجرو سکندر پورہ پشاور ☆ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور
صدر ☆ سٹی ڈرگ سٹور جی ٹی روڈ میٹکورہ ☆ الجنت پنسار مری روڈ ایبٹ آباد ☆ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ
آباد ☆ بادشاہ وی ہیٹی بوہڑ بازار اوپلنڈی ☆ زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم ☆ / الرحمن دواخانہ 2 نور بادا
گوجرانوالہ ☆ قدیمی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا ☆ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد

مشورہ V.P. ڈیلر کے بارے میں معلومات کیلئے 0300-6389463

 Deva Herbal Health Tip
  Catrain
  Bdhdeva@yahoo.com

المجلد الثاني - ١٩٨١ - ١٩٨٢

یہ میری طرف دیکھا اور پھر لہریں اس کے آکھیں موند لیں۔ میں نے محبت سے اس کے ہاتھ تھام لیا جس میں ابھی ہی نرس دوسری ڈرپ چلا کر گئی تھی۔ اس نے آنکھ کھول کر اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کی گرفت میں دیکھا اور ہلکا سا مسکرائی۔

”آپ کو معلوم ہے جب ہم بچپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے تو میں..... میں آپ کو چھونے سے ڈرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں آپ کو چھوؤں گی تو آپ میلے ہو جائیں گے۔ کچھ ایسا ہی صاف ستمرا نکھرا ہوا سارنگ ہے آپ کا..... میں اپنا ہاتھ کسی غلطی سے آپ کے ہاتھ پر رکھتی تو لگتا جیسے کسی نے روٹی کے گالے پر کالی سیاہی کھیر دی ہو..... اور میں آپ کو بہت پسند کرتے ہوئے بھی آپ کے قریب بیٹھنے اور ساتھ چلنے سے کترانے لگی۔“ وہ بولے برائی تو کس قدر عجیب و غریب بولنے لگی..... میں گھبرا گیا۔ شاید یہ نیند کے انکیشن کے اثر میں ہے۔

”لیلیٰ؟ لیلیٰ تم سو جاؤ..... جہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ میں نے اس کی بات کو کاٹ کر جیسے اسے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی کہ وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہے، اب کی بار اس کے آنکھ کھولتے ہی آنکھوں میں ٹھہرے چند قطرے فک کر تپتے پر جذب ہو گئے..... مگر وہ چپ نہیں ہوئی بولتی ہی چلی گئی۔

”تصور آپ کا نہیں میرا ہی ہے..... مگر میں کیا کرتی؟ آپ کے رشتے سے انکار نہیں کر سکی، ہر طرح کی کوشش کے باوجود..... دل کے ہاتھوں مجبور ہوئی اور چند دن آپ کے ساتھ گزار کر ہی مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو گیا۔ کتنا سمجھا بجا کر رکھا تھا میں نے اس دل کو مگر عین وقت پر دھوکا دے گیا۔ بہت ڈرا دھکا کر رکھا تھا اسے میں نے مگر پھر بھی بغاوت کر گیا۔ کہاں آپ جیسا خوب صورت مرد کہاں مجھ جیسی کالی صورت..... میں نے جذبات میں آخر اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”لیلیٰ کیا ہو گیا ہے یا؟ اس طرح کی باتیں مت کرو تم..... تم پلیز سو جاؤ..... ورنہ تم اور بیمار پڑ جاؤ گی..... لیلیٰ پلیز..... میں..... اس کے آنسوؤں سے

ہم دونوں مشکوں سے جھوم میں سے گزرتے اسپتال کے احاطے تک آئے اور ایک بار پھر باپا جلدی سے گاڑی قریب لانے کے لیے آگے بڑھ گئے۔ ہم دونوں لیلیٰ کو لیے سیدھے ایک پرائیویٹ اسپتال آگئے کیونکہ عباسی شہید سے قریب ترین پرائیویٹ اسپتال یہی تھا جہاں پر پہلے سے ہی ہماری طرح گل پلازہ سے چند زخموں کو ان کے پیارے یہاں لایکے تھے لہذا لیلیٰ کو لے کر ایمر جنسی میں پہنچنے پر فوراً ہی ٹریسٹ مل گیا۔ باپا اسی دوران دونوں بھائیوں اور گھر پر اطلاع دے چکے تھے اور ان سب کے ساتھ لیلیٰ کے گھر والے بھی اسپتال کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ بہر حال چند ہی گھنٹوں میں ڈاکٹروں کی طرف سے ہمیں اطمینان دلایا گیا اور یوں ایک دن کے لیے لیلیٰ کو ایڈمٹ کر لیا گیا۔ امی جان اور بھائیوں کے کہنے پر بھی میں لیلیٰ کو چھوڑ کر گھر جانے پر تیار نہ ہوا بلکہ میں نے باقی سب کو گھر بھیج دیا۔ وہ سب مجھے رات میں سو جانے کے ساتھ کچھ اور ہدایتیں دے کر رخصت ہو گئے۔ سب کو وہی لیلیٰ کے لیے اس طرح پریشان اور فکر مند دیکھ کر مجھے دلی اطمینان بھی ہوا کہ ابھی تک میں اپنے گھر والوں خاص طور سے امی جان اور رابعہ کے انداز میں لیلیٰ کے لیے ناپسندیدہ ہی محسوس کیا کرتا تھا۔ لیلیٰ کو واقعی کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی پھر بھی وہ حادثے کے اثر میں تھی لہذا اس کی مرہم پٹی کر کے اسے نیند کا انکیشن دے کر سلا دیا گیا تھا اور میں اس کے سر ہانے بیٹھا ہوا اس کے چہرے پر پڑنے والی خراشوں کی تعداد گننے میں ہی لگا رہا تھا۔ رات کے آخری پہر وہ گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تھی مگر پھر مجھے قریب دیکھ کر ڈھیل پڑ گئی تھی۔

”آئی ایم سوری لیلیٰ..... پلیز معاف کر دو.....“

میں نے پہلے تو اس سے ادھر ادھر کی بات کرنے کی کوشش کی مگر جب اس کو جواب دیتے نہ پایا تو سمجھا شاید وہ مجھ سے بھیلی صبح کی بات پر ناراض ہے پھر مجھے خود بھی ایک طرح کا احساس جرم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس

”آپ کو کیا معلوم کہ ایک خوب صورت مرد کی بیوی ہونا کیسا جان لیوا ہوتا ہے خاص طور سے اس وقت جب بیوی خود معمولی شکل صورت کی ہو..... دنیا طرح طرح سے کھوجنے کی کوشش کرتی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس قدر خوب صورت مرد نے اس عورت کا انتخاب کیا..... طرح طرح کے سوال جواب کر کے عورت کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ ایک معمولی شکل صورت کا مرد اگر ایک بہت ہی حسین خوب صورت عورت سے شادی کر لے تو دنیا بہت آسانی سے ان دونوں کو اپنائیتی ہے مگر یہ سہولت ایک معمولی شکل صورت کی عورت کو خوب صورت شوہر حاصل کرنے کے بعد نہیں دی جاتی..... اور میں..... میں یہ سب جانتے بوجھتے خود کو روک نہ سکی۔ میں خود کو کیوں نہیں روک سکی.....؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایک مرد تو معمولی شکل صورت کا ہو سکتا ہے مگر عورت..... عورت یا تو خوب صورت ہوتی ہے یا پھر بد صورت..... عورت کے لیے اُن میرا سر..... بھٹ جائے گا۔“ ایک سسکی لے کر آخر کار لیلیٰ خاموش ہو گئی تھی۔

میں کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ میں اسے کیا بتاؤں، کیا سمجھاؤں..... آخر اس کو سب کچھ نظر آیا نہیں نظر آیا تو میرا اس کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرنا نظر نہیں آیا۔ میری آنکھوں میں اسے دیکھ کر جو روشنی تیرتی ہے، وہ اس نے آج تک کیوں نہیں محسوس کی۔ وہ اپنے ہی آپ میں اس قدر گم رہی کہ مجھے ایک بار بھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی اور اب وہ چاہتی ہے کہ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں؟ اور وہ مجھے یہ کیا چاہتی ہے میں اسے یہ احساس دلاؤں کہ ہاں واقعی وہ بد صورت ہے اور مجھے ناپسند ہے؟ وہ میرے ساتھ کہیں جانے سے کیوں کترائی رہی اور کیوں وہ شادی کے بعد سے آج تک مجھ سے بے تکلف نہ ہو سکی؟ مجھے اپنے ہر سوال کا جواب مل رہا تھا مگر یہ جوابات میرے دل کو بوجھل کر رہے تھے..... شاید لیلیٰ کو پھر سے نیند آگئی تھی اور میں بھی..... میں بھی اب اپنے ہوش میں کہاں رہا تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا لیلیٰ پر اس کی سوچ پر اور اس

سے ہمیں زیادہ مجھے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ اپنی محبت کی یوں رائیگاں جانے کا دکھ..... کیا وہ بھی نہیں سکے گی کہ میں نے یہ شادی محبت میں کی ہے..... کیا وہ خود ترسی میں یہ بھی بھول گئی کہ اس رشتے کے لیے پہل میری طرف سے ہوئی تھی..... اور پھر اب تک کیا سمجھی اس نے محسوس نہیں کیا کہ میں اس کے عشق میں مبتلا ہوں؟

”مگر ابھی اسے آرام کی ضرورت ہے۔“ یہ کہہ کر لیلیٰ کو صبح ہوتے ہی گھر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے تو صرف لیلیٰ مجھ سے نظریں ہرا رہی تھی اب میں بھی اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈر رہا تھا۔ گھر پر ہمارا استقبال بہت خوشی اور جوش سے کیا گیا۔ رابعہ نے ہمارا کمر پھر سے پھولوں سے سجایا تھا اور سب کے ساتھ چائے پی کر ہمیں ہمارے کمرے تک اسی جان ساتھ آئیں اور بہت سی دعاؤں دے کر لیلیٰ کو بستر پر بٹھا کر مجھے اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر چلی گئیں۔ لیلیٰ بستر پر دراز ہو کر شاید پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگی..... مجھے اچانک کچھ یاد آیا تو میں پہلی بار اس سے مخاطب ہوا۔

”تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں..... پھر تم سوجانا۔“ میں جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے سے نکل چھوٹے سے اسٹور میں چلا آیا اور جلد ہی مجھے وہ ڈبائل گیا جس کی تلاش میں یہاں آیا تھا..... درمیانے سائز کا لکڑی کا یہ ڈبائیرے استعمال میں کچھ اس طرح رہا کہ میں اندھیرے میں بھی اسٹور میں اس ڈبے کو تلاش کرتا تو مل جاتا۔ لیلیٰ میرے کہنے پر بستر کے ہیڈ سے ٹکیہ نکاتے بیٹھ چکی تھی..... میں نے ڈبائے جا کر بستر پر الٹ دیا اور اس میں سے نکلنے والی چیزوں کو پھیلا کر خود بھی بستر پر بیٹھ گیا۔ لیلیٰ بھی چیزوں کو دیکھنے لگی۔

”یہ دیکھو..... یہ ڈبکی..... (بچوں کی کھلونا گاڑی) یہ تم نے مجھے چھٹی کلاس پاس کرنے پر گفٹ کی تھی..... یاد آیا؟“ میں نے ایک چھوٹی سی پیلے رنگ کی بس ڈبکی لیلیٰ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بتایا۔

”اور یہ لکڑی کا گھر..... تم نے خود بنایا تھا اور یاد ہے تم نے یہ بناتے ہوئے اپنی انگلی پر ہتھوڑی مار لی تھی اور بعد میں مجھے دیتے ہوئے تم نے اپنی سوجی ہوئی انگلی

اور ابھی اچھا اور کہتا کہ میرے فون پر کال آنے لگی۔

صبح سے ہی جس، جس کو معلوم ہو رہا تھا وہ فون کر کے خیریت معلوم کر رہا تھا میں بہت سی کال نہیں لے رہا تھا مگر یہ میرا دوست یا سر تھا جس سے میں نے پچھلے دنوں لیلیٰ کو پاکستان کے شمال لے جانے کا پروگرام بنایا تھا مگر پھر لیلیٰ نے پروگرام کو آگے بڑھوا دیا تھا، ظاہر ہے وہ میرے ساتھ کہیں بھی جانے سے کتراتے تھی۔ میں یا سر کو اب تک مالتا رہا تھا اور وجہ بھی کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے فون اٹھایا..... ہمیشہ کی طرح یا سر اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا اور لیلیٰ کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد ہمارے پروگرام کے بارے میں بات کرنے لگا کیونکہ اس کی بیوی بھی ہمارے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی جس کے اصرار پر وہ بار بار مجھے فون کر کے لیلیٰ کو منانے کی بات کرتا رہتا تھا۔ آج بھی جیسے ہی اسے لیلیٰ کی خیریت کا پتا چلا وہ پھر سے اپنے مقصد پر آ گیا تھا۔ میں نے پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر جب اس کا اصرار بڑھ گیا تو میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے آخر کار اسے ہولڈ پر رکھ کر لیلیٰ سے پوچھ لینے میں اپنی جان بخشی تھی۔

”یا سر ہے..... وہ پوچھ رہا ہے کہ ہم لوگ کب تک شمالی علاقہ جات کے لیے لٹکے گئے..... کیا کہوں؟ کیا کہہ دوں کہ ہم نہیں جاسکتے اسے جانا ہے تو خود ہی چلا جائے؟“ میں بلند آواز میں کہہ کر جیسے لیلیٰ کے جواب کو جانتے ہوئے پھر سے فون کان سے لگانے والا تھا کہ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

”آپ، آپ کا کیا ارادہ ہے؟ آپ کو آفس سے چھٹی مل جائے گی؟“ لیلیٰ نے ہلکے سے پوچھا۔

”ہاں کیوں نہیں..... میں مالک ہوں بھی..... چھٹی لے سکتا ہوں کبھی بھی.....“ میں نے امید برآتے دیکھ کر جوش سے جواب دیا۔

”تو پھر..... آپ کہہ دیں..... اگلے ہفتے نکل چلتے ہیں۔“ لیلیٰ نے کہہ کر بکھری ہوئی اشیاء میں سے کلر پینل اٹھا کر کارڈ پر پہلے سے بنی ہوئی ڈرائنگ میں رنگ بھرنے لگی۔

اور یہ کارڈ اس میں تم نے پہاڑوں کا سین ڈرائنگ کیا مگر رنگ نہیں بھرے تھے، مجھے یاد ہے تم نے اس کارڈ کے ساتھ کلر پینل میں بھی دی تھیں اور مجھ سے کہا تھا کہ اس ڈرائنگ میں رنگ میں خود بھروں کیونکہ تم چاہتی تھیں کہ میں اس میں اپنی مرضی کے رنگ بھروں..... مگر میں نے اس کو ایسے ہی محفوظ کر لیا۔ ایک بار بھی میں نے اس میں رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میرا دل تھا کہ ایک دن ہم دونوں مل کر اس میں رنگ بھریں گے ایک دوسرے سے پوچھ کر ایک دوسرے کو سمجھ کر..... اور یہ دیکھو یہ کھڑی..... یہ تم نے ضیاء بھائی کی شادی میں پہنی تھی اور پھر اس پر پانی گر جانے پر یہ بندہ ہو گئی تھی تو تم نے اتار کر مجھے دی تھی کہ میں اس کو کسی کھڑی والے کو دکھا کر ٹھیک کر دوں۔ دیکھو میں نے اسے ٹھیک تو کر دیا مگر تمہیں واپس نہیں کر سکا..... انتظار ہی کرتا رہا کہ تم کبھی مطالبہ کر دو..... مگر تم نے ہلٹ کر اس کی خبر نہیں لی..... اور بھی چیزیں ہیں دیکھو، یہ دیکھو، یہ بھی دیکھو شاید تمہیں بھی چیزیں دیکھ کر کچھ یاد آئے؟“

لیلیٰ میرے کہنے سے پہلے ہی ہوسیدہ اور پرانی چیزوں کو اٹھا، اٹھا کر ذوق سے دیکھنے لگی تھی۔ اب میں ایک طرف ہو گیا تھا اور وہ پھلکی ہوئی اشیاء ایک ایک چیز جن، جن کر اٹھا رہی تھی میں جانتا تھا کہ اگر اسے مجھ سے واقعی محبت ہوگی تو اسے بھی ان چیزوں کے پیچھے چھپی ایک، ایک بات، ایک، ایک کہانی یاد آتی جائے گی..... اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جو وہ بار بار اپنی بھیلی سے پونچھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار بھی اسے نشوونہ نہیں تھا یا۔ ہیں وقت وہ وہی چھوٹی سی بچی لگ رہی تھی جسے میرے ساتھ بیٹھنے اور کھیلنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتا تھا..... میں جیسا چاہتا تھا کھلی ڈبے سے برآمد ہونے والی چیزوں کا ویسا ہی اثر لے رہی تھی۔

”آپ نے، آپ نے یہ سب ابھی تک سنبھال کر رکھا ہوا ہے؟“ کافی دیر چیزوں میں گم رہنے کے بعد آخر کار اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں چیزیں تو محفوظ کر لیں..... میں..... محبت ہی محفوظ نہ کر سکا.....“ میں نے بھی افسردہ لہجہ میں جواب دیا

اف میں کنیا کروں

افشین نسیم



”بی بی.....! ایسے کبھی وزن کم نہیں ہوگا تمہارا۔ کھانا تم نہیں چھوڑ سکتی ہو نہ کم کر سکتی ہو، ورزش تم سے نہیں ہوتی، پوچا فرش پر پھیرتے تمہاری جان جاتی ہے، لے دے کے ایک یہ واک پگی ہے جس کو کرتے تمہاری

”بھئی، نہیں ہوتی مجھ سے واک.....“ چوتھے چکر پر منال کی بہت جواب دے گئی۔ وہ وہیں قریب ہی نصب ایک سنگی بیچ پر یوں بیٹھی جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہو۔

ٹالیں ٹوٹ رہی ہیں۔" مٹی کو خوب ہی تپ چکی۔ اس کے اس طرح بیٹھے پر..... سوکھری، گھری سنا دیں۔
 "تم مجھے یہاں باتیں سنانے کے لیے لے کر آئی ہو....." منال نے خفگی سے خود سے دو سال چھوٹی بہن کو دیکھا۔

"نہیں، واک کرانے لائی ہوں جس کو کرتے تمہارا دم نکلے جا رہا ہے۔"

"کیا کروں.....؟ نہیں چلا جا رہا ناں مجھ سے۔" منال نے بیچارگی سے بہن کو دیکھا۔ محنتی کو بہن پر پیار بھی آیا، ترس بھی۔

"یار، کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا ناں..... معلوم ہے کل جو خواتین آئی تھیں وہ بھی انکار کر گئی ہیں کہ لڑکی بہت موٹی ہے۔" اس کے برابر بیٹھتے محنتی رسان سے بولی۔

"حالانکہ خود بھی پوری کی پوری ہتھنیاں تھیں۔ بیٹا بھی سائڈ ہو گا پورا..... لیکن لڑکی پتلی دہلی چاہیے۔" منال غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ بولی۔ محنتی کی ہنسی چھوٹ گئی اس کے انداز پر.....

"تم مجھ پر ہنس رہی ہو۔" منال کا بارہ مزید ہائی ہوا۔
 "تم پر نہیں، تمہارے تجزیے پر ہنس رہی ہوں۔" محنتی بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم خود اپنے ایمان سے تباؤ، جھٹنا اور سب گھر والے کھاتے ہیں، اتنا ہی کھاتی ہوں ناں میں؟ بس لگتا صرف مجھے ہی ہے باقی کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ مجھے تو لگتا ہے سب کے حصے کا مجھے ہی لگ جاتا ہے۔" منال سخت دھکی تھی۔

"اچھا، چلو تم ٹینشن مت لو..... کوئی اور حل نکالتے ہیں اس مسئلے کا....." محنتی نے تسلی دینے والے انداز میں بہن کا کندھا ہلکا ہتھ پتھایا۔

"میری وجہ سے تمہارا معاملہ بھی درمیان میں لٹکا ہوا ہے۔" منال نے کچھ شرمندہ، شرمندہ سے انداز میں محنتی کو دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔" اس نے شدت سے نفی میں سر

ہلایا۔ "میرا معاملہ لٹکنے کی وجہ سے ہم ہرگز نہیں ہو۔" مگر خاصا زور دیا۔

"چلو، انھو، گھر چلیں امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔" اس سے پہلے کہ منال مزید ڈپریشن میں جاتی۔ محنتی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ وہ دونوں چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی، گھر کے قریب واقع اس پارک سے باہر نکلتی چلی گئیں۔

☆☆☆

چار بہن، بھائی تھے وہ..... سب سے بڑی منال اس سے دو سال چھوٹی محنتی، اس کے بعد سیف اور پھر سمیع..... ابو سرکاری ملازم، امی گھریلو خاتون، خوش باش، مسائل سے کوسوں دور چھوٹا سا گھرانہ تھا۔

بچپن میں منال ایک صحت مند بچی تھی جبکہ باقی تینوں صحت میں خاصے مانٹھے سے تھے۔ امی، ابو ان کی صحت بنانے کے چکر میں لپکنا ہوئے جاتے۔ ان تینوں کی صحت کو تو باوجود کوشش کے بہتر نہ کیا جاسکا۔ البتہ منال کی صحت کے حالات روز بروز ترقی کرتے چلے گئے۔

میںرک تک وہ اچھی خاصی موٹی ہو چکی تھی۔ کالج میں جا کر مزید پھیلتی چلی گئی۔ اور اب تو دو سال ہونے کو آرہے تھے گریجویشن کیے بھی۔ ان دو سالوں میں وہ بے تحاشا موٹی ہو چکی تھی۔

امی، ابو کو اس کے مٹاپے سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن پریشانی تب شروع ہوئی جب محنتی کی خالہ نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ محنتی بچپن سے ہی اپنے خالہ زاور ریحان سے منسوب تھی..... اب جبکہ ریحان.... برہر روزگار ہو چکا تھا تو خالہ کی خواہش تھی کہ اس کے سر پر سہرا سجاوایا جائے۔ انہوں نے بہن سے تذکرہ کیا۔

بہن نے رسماً کچھ وقت مانگا۔ خیال تھا کہ پہلے منال کی شادی ہو جائے پھر محنتی کے بارے میں سوچا جائے اور سارا مسئلہ یہاں سے شروع ہوا۔ خاندان میں کسی نے منال کے لیے عندیہ نہ دیا۔ مجبوراً رشتے والی خالہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ رشتے والی اب تک کم سے کم پانچ فیملیوں لاپچی تھیں منال کو دکھانے کے

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



مارچ کے موسم کی رنگینیاں
جاسوسی کے شمارے کی دلفریبیاں

وبائی دہشت

جرم کی شاندار منصوبہ بندی میں پوشیدہ ہولناک
جہاں کا ایک اور منصوبہ..... سنسنی خیز ناول کے
پے در پے واقعات..... **امجد رئیس**
کے قلم کی جادو بھری روانی.....

انکارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا استقامت۔ محبت اور جنگ کے نصف میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلیاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پر کارنہ جوان کی سرگزشت.....
عبد الرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

زندگی کی الجھنوں میں گرفتار ہو جانے
والوں کا لہر۔ سرورق کی پہلی کہانی

وقت کی طغیانیوں پر چلنا آسان نہیں..... وہ درجہ چال
کوڈ حال بنارہا تھا..... سرورق کی دوسری کہانی

جینی نکتہ جینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

سلسلے میں..... خواتین آئیں، کھاتی چھتیں اور ہاتھ جھاڑ
کر یہ کہہ کر چلتی بنیں کہ ”لو کی موٹی بہت ہے۔“
اب کے سچ معنوں میں منال اور امی، ابوسمیت
سب کو اندازہ ہو رہا تھا کہ معاملہ کتنا پیچیدہ ہے۔

منال ڈہرے احساس جرم کا شکار تھی۔ ایک طرف
اسے لگتا کہ جینی کی شادی میں تاخیر کا سبب محض وہی ہے۔
دوسری طرف امی کی پریشانی، ہر وقت چہرے پر
لکھی نظر آنے لگی۔ اس نے اپنے تئیں وزن کم کرنے
کی کوشش کرنا چاہی مگر اس سے کسی بھی طریقے پر ٹھیک
طریقے سے عمل ہونے لگا۔

ڈائٹنگ بہ مشکل تین دن کر پاتی۔ پوچھا پھیرنے
کی کوشش کی تو دو دن ہی میں ہمت جواب دے گئی۔
ورزش کی تو بغض بھرتا گلوں کا درد ہی ٹھیک نہ ہوا۔ آخری
حرے کے طور پر جینی نے اسے گھر کے قریب واقع
پارک میں روز آدھے گھنٹے کی داک کے لیے راضی کیا۔
چند افسوس، وہ چند دن بہ مشکل دس منٹ واک کر
پاتی اور دوبارہ آنے سے انکار کر دیا۔

تو مسئلہ حل ہو تو کیونکر ہو.....؟

☆☆☆

”میری اتنی سکھڑ بیٹی، ایک سے ایک بہترین
کھانا بنانا جانتی ہے۔ گھریلو امور میں طاق ہے۔ گھر کو
سجائے سنوارنے سے لے کر سلائی کڑھائی تک وہ کون
سامان ہے جو اس میں نہیں ہے اور بس ایک مناپے کو
جواز بنا کر لوگ کیسے بے دردی سے انکار کر جاتے
ہیں۔“ وہ خاصی آزرده تھیں۔ رشتے دالی آپا کے
سامنے اپنی تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں۔

”شیخ بہن! آپ فکر نہیں کریں، اس بار اللہ نے
چاہا تو بات ضرور بن جائے گی۔ میں نے ان لوگوں کو
بتایا ہے کہ لڑکی تھوڑی موٹی ہے، انہیں کوئی اعتراض نہیں
ہے، بس آپ دعا کریں اور اللہ سے اچھا گمان رکھیں۔“
رشتے دالی آپا کی تسلی نے ان کے اندر دم توڑتی
امید کو از سر نو زندہ کر دیا۔

”بس آپا! اللہ آپ کی زبان مبارک کرے.....“

بات چٹھ اس تیزی سے آئے بڑی کہ سب خاتون کو ہڑ بڑا کر رہ گئیں۔ صرف تین ماہ بعد شادی طے پا گئی تھی۔ کہاں تو بات کہیں جتنی جتنی اور ان کی راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی تھیں اور کہاں یہ حال کہ بات اس تیزی سے بڑھی کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ رات، دن بازار کے چکر لگنے لگے۔ رشتے داروں، محلے داروں، دوست، احباب سب تک رشتہ طے پانے کی منٹائی بھجوائی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ جلد شادی کی خبر..... کچھ نے خوشی کا اظہار کیا، کچھ جل بھن کر کباب ہو گئے۔

دوسری طرف منال تھی جو شادی طے پاتے ہی ایک طرف تو دل و جان سے ڈانٹنگ میں مصروف تھی ساتھ ہی ساتھ صبح شام واک کے ساتھ ورزش بھی شروع کر دی تھی۔ تمنی اسے دیکھ، دیکھ کر تمنی۔

”یار، یہ تو کوئی جادو نہیں ہو گیا۔ کہاں تو تم کچھ بھی نہ کر پاتی تھیں، کہاں یہ عالم کہ واک، ایکسرسائز، ڈانٹنگ سبھی کچھ ایک ساتھ شروع کر دیا ہے۔“ اور منال جواباً بات بے بات مسکرائے جاتی، آج کل تو مسکراہٹ ہی اس کے ہونٹوں سے جدا نہ ہوتی تھی۔

☆☆☆

”حیران کن، انتہائی حیران کن، مجھے یقین نہیں آرہا اونو۔“ (I can't believe) تمنی آنکھیں پھاڑے ویٹ مشین کو دیکھ رہی تھی۔ جو منال کا وزن بارہ کلو کم بتا رہی تھی۔

”میرے خدا، منال اس امیزنگ یار..... تم نے صرف دو ماہ میں بارہ کلو وزن کم کر لیا ہے، اور منال اس کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا تھا۔

”میں تو زیادہ سے زیادہ پانچ، چھ کلو تو قے کر رہی تھی، اتنا تو میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔“ وہ خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

اب اسے انتظار تھا اپنے ہونے والے شریک حیات کی فون کال کا جس کا نمبر اسے اس کی ہونے والی نندے دیا تھا۔ اور اس کا نمبر اپنے بھائی تک پہنچا یا تھا۔

کام بن گیا تو ان شاء اللہ میں آپ کو حوس کر دوں گی۔ وہ جوش سے بولیں۔

”ان شاء اللہ، ان شاء اللہ.....“ اس بار اللہ آپ کو مایوس ہونے نہیں دے گا۔“ شمع بیگم نے صدقہ دل سے آمین کہا۔

☆☆☆

وہ دو خواتین تھیں، ایک لڑکے کی ماں، دوسری ان کی بہن یعنی کہ لڑکے کی خالہ..... لڑکی کی ظاہری خوب صورتی سے زیادہ انہیں سلیقہ مندی اور سکھڑا پاور کا ر تھا۔ جس کا رشتے والی آپانے انہیں سو فیصد یقین دلایا تھا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے، بیٹھے انہوں نے بڑی باریکی سے صفائی ستھرائی کا جائزہ لیا اور تو اور لڑکے کی والدہ بہانے سے ہاتھ روم تک کی صفائی دیکھ کر آگئیں۔ راستے میں پڑے پودوں کے گیلے اور اس کے پیچھے والی جگہ کا اپنی باریک بین نگاہوں سے خوب ہی اکتھرے کیا۔ یوں ہی غیر ارادی طور پر (لیکن ارادتا بطور خاص) بظاہر چمنٹ اور دیواروں کا معائنہ کیا۔ (کہیں کوئی جالے والے تو نہیں لٹک رہے) ہر طرف سے سو فی صد مطمئن ہو کر بہن کے کان میں کچھ کھسر پھسری پھر باقاعدہ بات کا آغاز کیا۔

”بہن، آپ کا گھرانا اور بچی دونوں ہی ہمیں بہت پسند آئے ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ بات کو آگے بڑھایا جائے۔“ شمع بیگم نے خوشی سے میاں کی جانب نگاہ کی جو چپ چاپ ان کی بات سن رہے تھے۔

”اگر آپ لوگ برا محسوس نہ کریں تو میرا بیٹا باہر گاڑی میں بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا ہے، اسے بلوایتے ہیں، آپ بھی ایک نظر اسے دیکھ لیجیے..... اور وہ بھی ایک نظر چچی کو دیکھ لے۔ آخر زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔ ویسے بھی شرع میں اس کی اجازت ہے۔“ بات مکمل کر کے انہوں نے جواب طلب نظروں سے شرع کو دیکھا۔ شمع نے میاں کو..... دونوں کی نظریں ملیں اور شمع کو جواب مل گیا۔

☆☆☆

”یا دے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے تم میں
کیا بات پسند آئی تھی؟“

”جی.....“ وہ بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔
”تو سنو.....“ تیمور نے تھوڑا توقف کیا۔

”مجھے تمہاری صحت پسند آئی تھی۔“ تیمور نے گویا
اس کے حواسوں پر بم گرایا۔

”یعنی کے مناپا.....؟“ اس نے تقدیق کے
لیے پوچھا۔

”ہاں.....“ اس نے قطعی لہجہ میں کہا۔

”دنیا کی نظر میں ہوگا مناپا، مگر میں اسے صحت کہتا

ہوں۔ میں نے امی سے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ

میرے لیے کوئی کمزور، لاغر، فاقوں کی ماری ہوئی لڑکی

یعنی کہ دنیا والوں کی نظر میں سلم و اسارٹ حسینہ

ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے قابل رشک

صحت کی حامل لڑکی بطور بیوی چاہیے۔“

منال بے ہوش ہوتے، ہوتے بچی۔

”یہ شاید دنیا کا واحد مرد ہے جس کی پسند اتنی

مختلف ہے۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی۔

”دیکھو، مجھ سے کبھی ہنسی مذاق میں بھی ایسی بات

دوبارہ مت کرنا۔ ویسے، کہیں تم نے واقعی میں اتنا وزن کم

تو نہیں کر لیا.....؟“ وہ بات جو سب سے پہلے پوچھنی

چاہیے تھی اسے سب سے آخر میں اس کا خیال آیا۔

”نہیں، نہیں، یونہی مذاق گر رہی تھی میں تو.....“

منال نے تھوک نگلا۔

”گڈ..... ایسا سوچنا بھی مت.....“ اب وہ کوئی

اور بات کر رہا تھا۔

دوسری طرف منال سوچ رہی تھی کہ وہ وزن جو

اس نے دو ماہ میں کم کیا تھا وہ اس ایک ماہ میں دوبارہ

بڑھ چائے گی۔ تیمور جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا جبکہ منال

کی سوتی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ وزن، وزن، وزن، ٹن،

ٹن، ٹن..... بات ختم کر کے اس نے موبائل فون آف
کیا۔ اب اس کا مشن تھا وزن بڑھانا۔

وہ ہر ویک اینڈ پر کم سے کم دس سے پندرہ منٹ
بات کرتے تھے۔ تیمور نے اسے پہلی ہی کال میں یہ
بات بتائی تھی کہ اس کی والدہ کو ان لوگوں کے گھر کا
سلیقہ بہت پسند آیا تھا کیونکہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پھوپھ
پن سے بہت تنگ تھیں۔

”اور آپ کو.....؟“ یونہی اس کے منہ سے بے ساختہ
ہی نکل گیا تھا ساتھ ہی زبان دانتوں تلے ڈاب لی تھی۔

”مجھے.....؟“ اووں..... بعد میں بتاؤں گا۔“

تیمور کی فون کال ریسیو کرتے ہوئے اسے یونہی پہلی

منگٹو یاد آگئی۔

”ہیلو، کہاں گم ہیں محترمہ.....؟“ تیمور کی آواز

اسے سمجھ کر حال میں لے آئی۔

”کہیں نہیں..... نہیں ہوں.....“ وہ خوشگوار مسوڈ

میں بولی۔

”آپ سنائیں کیسے ہیں؟“

”بالکل ٹھیک ہوں۔“

”اچھا سنو، اس اتوار ای، بھابی وغیرہ تمہارے

کپڑے، جوتوں کا ناپا لینے آ رہی ہیں۔“

”ہم، ہم، ہم..... اچھا سنیں، اگر میں آپ کو

ایک بات بتاؤں تو آپ کو یقین آجائے گا۔“ (وہ اپنی

خوشی شیئر کرنے کو بے چین تھی)

”اگر بات یقین کرنے والی ہوگی تو ضرور آجائے

گا۔ ویسے کوئی خاص بات ہے کیا؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ میرا ایک نہ دو

پورے بارہ کلو وزن کم ہو گیا ہے تو آپ کو کیسا لگے گا؟“

”کیا.....؟“ وہ اتنے زور سے چیخا کہ منال کو

بے ساختہ اپنے کان پر ہاتھ رکھنا پڑا۔

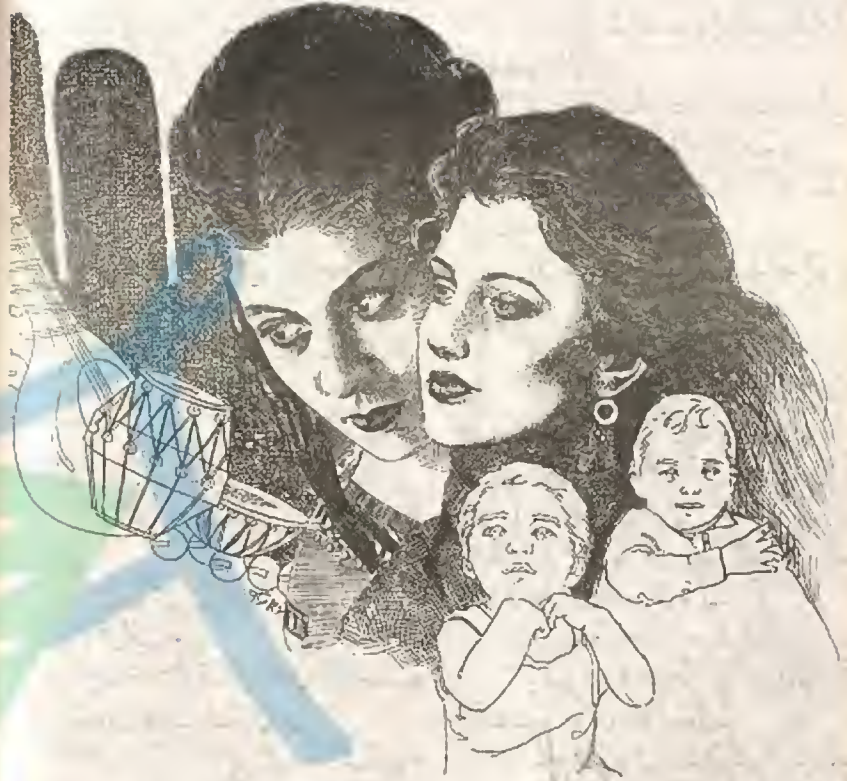
اتنا شدید جھٹکا..... وہ بے ساختہ ہی ہنسی۔

”مجھ سے دوبارہ مذاق میں بھی کبھی ایسی بات

مت کرنا۔“ تیمور کی فحش سے بھری ہوئی آواز اس کی

سماعت سے ٹکرائی۔

اب کے منال کچھ کھکی، کچھ تھاس کے انداز میں.....
”کیا مطلب.....؟ میں سمجھی نہیں۔“



ناولٹ

طوافِ آرزو

طیبہ عنصر معن

دوسرا حصہ

رمل کا آج عمر حسن کے آفس میں پہلا دن تھا۔
تھوڑی گھبراہٹ تو فطری امر تھا لیکن تعلیم نے اس کے اندر
اعتماد کوٹ، کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنی
پوری محنت سے عمر حسن کی امیدوں پر پورا اترے گی۔
آج رمل کا ہی نہیں ارمان کا بھی پہلا دن تھا آفس
میں اور ارمان کا دماغ کچھ اور ہی منصوبے بنارہا تھا کہ

جتنا ہو سکے برا ایمریشن ڈالنا ہے پاپا پر تاکہ آفس سے تو
جان چھوٹے۔
اب ہر روز اس کی کارکردگی کا تقابل مس رمل کے
کام سے کیا جارہا تھا، ہر روز کی جھاڑ کے بعد اس کا بس
نہیں چٹا تھا کہ اس رمل نام کی چیزیل کو وہ اپنی فرم سے
اٹھا کر باہر پھینک دے۔



عمر حسن کے سامنے لار میں۔ انہیں تو پہلے ہی اس کے کام پر بھروسہ تھا۔ اب جب تمام فائلز کو وہ چیک کر چکے تو انہوں نے اس کے سامنے ارمان کو سخت ست سنا دیں اور ساتھ ہی رمل کی دور اندیشی کی داد بھی دی جو ارمان کو سرتاپا سلا گئی۔

”تو مشر ارمان حسن آج یہ تمام فائلز اور ان کا کمپیوٹر ورک جو خود آپ کے ہاتھوں پہلے ملایمٹ ہو چکا ہے، آج کی رات آفس میں رہ کر ہی بالکل درست طریقہ کار سے تیار کرنا ہے۔ اور صبح مینٹنگ کے لیے بھی تیار رہیں۔ یہ پریزنٹیشن اب پیش بھی آپ کو خود ہی کرنا ہوگی۔“

”اور مس رمل حسن آپ اطمینان سے جا سکتی ہیں۔“ متانت بھرے انداز میں کہتے ہوئے وہ اب رمل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ”یہ کنٹرکٹ ہمیں ملے پر آپ کو ڈبل پردہ موٹن ملے گی۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں کہ آپ کی احتیاط پسندی کی وجہ سے ہم مکمل پیدا ہونے والی مشکل سے بچ گئے۔“ رمل نے ایک فاتحانہ نظر ارمان کے چہرے پر ڈالی تو اس کا جی چاہا کہ اس لڑکی کے حسین چہرے پر بھری مسکراہٹ کو جس نہس کر دے۔

☆☆☆

عمر حسن کے سینے میں صبح سے جھٹن کا سا احساس تھا لیکن انہوں نے کوئی خاص پروا نہیں کی کیونکہ آج ایک خاص مینٹنگ تھی جسے وہ ہرگز نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ارمان کو بھی آفس کے کام سے آؤٹ آف ایشیون گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اب جبکہ وہ کام کے لیے خاصا سنجیدہ ہو گیا تھا اور پورا وقت آفس کو دیتا تھا تو عمر حسن کو کافی تسلی ہو گئی تھی۔ آفس میں اپنے آدم میں بچھ کر معمول کے انداز میں کافی منگوائی تو رمل بھی حسب معمول بریفنگ کے لیے آگئی۔ اس سے بریفنگ لیتے ہوئے وہ ان کی بدلتی کیفیت پر چونکی۔ عمر حسن کے چہرے پر شدید تکلیف کے آثار اور ماتھے پر پسینے کے قطرے پہلی نظر میں محسوس ہو گئے تھے۔ رمل نے دوڑ کر بانی کے چک میں سے گھاس بھرا اور انہیں پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن وہ پانی پی نہیں پار رہے تھے انہوں نے اب اپنے سینے کو مسلنا شروع

کرتا تھا۔ اس حرکت سے معاملہ کچھ یوں تھا کہ دونوں عمر حسن کے آفس میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ ارمان جھکے سر سے بھی رمل کو کھانا جانے والی نظروں سے دیکھ ہی لیتا تھا جبکہ رمل کا چہرہ بھی غصے سے تپا ہوا تھا لیکن وہ ارمان کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ عمر حسن اپنے سامنے پڑی فائلز پر نظر آتے حروف اور ہندسوں سے نظر اٹھاتے اور دونوں کو جا چکی نظروں سے تولتے، ان کے چہرے پر گہری تنہید کی تھی۔

در اصل فائلز ورک مکمل کر کے رمل کو کمپیوٹر سیکشن میں دینا تھا اور اس نے دن رات ایک کر کے تندی سے پریزنٹیشن تیار کی تھی اور ارمان نے پوری تک دو سے اس کے کام کی ایسی کی تھی کہ ڈالی تھی۔ یہ پریزنٹیشن کل کی مینٹنگ میں عمر حسن نے ارمان اور رمل کے ساتھ مل کر پیش کرنی تھی۔

ارمان نے منصوبے کے مطابق سارا الزام رمل کے سر ڈال دیا تھا۔ شروع دن سے پایا کہ منہ سے رمل کے کام کی تحریکیں ارمان کو تھوڑی ہی بٹھائے رکھتی تھیں۔ اوپر سے اس کے کام میں سے نقصان (جو وہ جان بوجھ کر کرتا تھا) کا خلاصہ بھی عمر حسن، رمل کے سامنے ہی اکثر کیا کرتے تھے۔ اس وقت رمل کی آنکھوں میں ناچتا مسخر اور ہنسی ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ پڑتا چہرہ اسے مزید چڑا دیتا تھا۔ آج کے منصوبے کا رزلٹ اسے پکا لگ رہا تھا کہ رمل کی بے عزتی کی جی ہے کیونکہ عمر حسن کام کے معاملات میں بہت سخت تھے۔ وہ اپنے سامنے پڑی فائل پر سے نظر اٹھا کر اب دونوں کو ناقدانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور پھر خلاف توقع انہوں نے رمل کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ باپ کی آواز پر ارمان جو باہر کھسکے کو بالکل تیار تھا ایک دم رک گیا۔

رمل کی ایک اچھی عادت آج اس کی خوش قسمتی بن گئی تھی۔ وہ سارے فائل ورک کی ایک کاپی اپنے پاس لازمی رکھا کرتی تھی۔ اور آج جب سارا الزام ارمان نے رمل پر ڈالنا چاہا کہ رمل کے فائل ورک کی غلطی کی وجہ سے کام خراب ہوا ہے تو رمل نے اپنے پاس موجود فائلز باس

کر دیا۔ دل کے دماغ میں نورِ اختر سے کی گئی تھی، اس نے جلدی سے ایبویٹنس کال کی اور دیگر کولینز کو بلوایا۔ ایبویٹنس کے آنے تک آفس ورکرز نے عمر حسن کو ابتدائی طبی امداد دینے کی کوشش جاری رکھی۔ دل نے ان کے گھر پر اطلاع دی اور ایبویٹنس میں ان کے منتقل کیے جانے پر وہ خود بھی اس ایبویٹنس میں ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ وہ خطرہ اری انداز میں عمر حسن کے شفیق چہرے کو دیکھ رہی تھی جو اب نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے۔

انہیں انجاناً کا ایک ہوا تھا بروقت اسپتال پہنچنے اور بروقت تشخیص نے ان کا علاج ممکن بنایا۔ دل اللہ کی رحمت کی صورت اگر انہیں فوری اسپتال نہ لاتی تو شاید وہ جانبر نہ ہو پاتے۔ شائل تو اطلاع ملتے ہی اسپتال آگئی تھی۔ تھوڑی دیر تک زریں آپا، منائل اور مشعل بھی آگئی تھیں۔ آئی سی یو کے باہر ان چاروں کے ساتھ دل بھی دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں وعائیں پڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے، زریں آپا نے استفسار انداز میں شائل سے اس کے بارے میں پوچھا۔ شائل جو ایک دود فدر دل سے مل چکی تھیں جب عمر حسن سے کام کے سلسلے میں اسے گھرا تا پڑا تھا۔ آج تو وہ اس کی احسان مند تھی کہ وہ بروقت انہیں اسپتال لے آئی تھی۔ تین دن انہیں آئی سی یو میں رکھا گیا تو وہ تقریباً مسلسل یہاں تھی۔ بس تھوڑی دیر کو گھر جاتی۔

تین دن بعد عمر حسن کو کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ دل نے بعد اصرار شائل کو گھر بھیجا کہ وہ تھوڑا آرام کر لے۔ ”آئی سی یو گھر جائیں، آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے یہاں میں ہوں اور منائل، مشعل بھی آجاتی ہیں۔“ وہ رسانیٹ سے شائل کو سمجھا رہی تھی اور یہ کہتے ہوئے شائل کو وہ بالکل منائل جیسی لگ رہی تھی۔

شائل گھر چلی گئی تھیں۔ عمر حسن اس وقت دواؤں کے زیر اثر خودگی میں تھے۔ جب ارمان نے دروازہ کھولا تو دل کرسی پر بیٹھی ادگھ رہی تھی۔ ایک کتاب اس کی گود میں اونگھی رہی تھی شاید وہ بہت دیر سے اسی حالت میں بیٹھے، بیٹھے سوئی تھی۔ ارمان دبے قدموں پا پا کے

پاس گیا، ان کے ہاتھ پر پیار کر کے تھوڑی دیر انہیں غور سے دیکھا اور ہاؤر پھر آہستگی سے ان کے بالوں میں ہاتھ بھیرا اور پھر ایک بے ساختہ نظر دل پر ڈالی۔ کرسی پر بے خبر ... بیٹھی یہ لڑکی اس کے دل میں اترنے لگی، بند آنکھوں سے اس کی دراز پلکس اس کے گالوں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ کالے سیاہ بال اس وقت اٹکھے ہوئے تھے لیکن دوپٹے سے لگی دراز چوٹی کرسی سے نیچے لٹک رہی تھی سادہ اور شفاف چہرہ کسی بھی قسم کی مصنوعی آرائش سے پاک تھا۔ گلابی ہونٹ آہستہ، آہستہ لرز رہے تھے بل میں ارمان کے دل کی دنیا پلٹ گئی۔ نظروں کا ارکاڑ تھا کہ دل نے ہڑ بڑا کر اپنی گھور کالی آنکھیں پٹ سے کھول دیں۔

”آپ..... آپ کب آئے ارمان سر.....؟“ دراصل مجھے پتا نہیں چلا اور میں شاید سوئی تھی۔ سوری سر.....“ اس کے جملے بے ربط تھے۔

اس سے پہلے کہ ارمان کوئی جواب دیتا منائل دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور ارمان کو سامنے دیکھ کر جھٹ اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ارمان پیار سے اس کا سر تھیک رہا تھا۔ دل دور کھڑی اس منظر کو دیکھی اور حسرت سے دیکھ رہی تھی رشتے کتنے خوب صورت ہوتے ہیں اور زندگی میں ان رشتوں کا ہونا کتنا حوصلہ دیتا ہوگا۔ اس نے دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہہ کر منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

علی حسن بھی کینیڈا سے واپس آگئے تھے اور ان کی تینوں بیٹیاں میکے آکر ان کی پٹی سے لگ گئی تھیں۔ صدقے دیے جارہے تھے، علی حسن ایک ہیڈنٹ ہونے کی وجہ سے بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہے تھے وہ تو بھلا ہوا اس ایک پاکستانی نوجوان ارمان کا کہ اس نے انہیں اسپتال پہنچایا اور علی حسن کے نایاب خون کے لیے اپنے خون کا فوری عطیہ بھی دیا۔ یوں تو علی حسن کے اپنے گاڑو زخمی تھے لیکن پردیس میں ارمان نے جس طرح سے اپنے بیٹوں کی طرح ان کا خیال رکھا تو جہاں ان کے دل میں جگہ بنائی وہیں اس خواہش نے مزید شدت اختیار کر لی کہ کاش ان کا بھی کوئی بیٹا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ

نہا، ہم کی کوکھ سے تین بیٹیوں کو ان کی جمہولی میں ڈالنا تھا لیکن اولاد پزیرینہ سے محروم رہے۔

سجّل بے شک ان سے دور تھی، وہ اس کے بعد اس سے نہیں ملے تھے لیکن یہ بات وہ جان گئے تھے کہ محل کے ہاں بھی ایک بیٹی ہی نے جنم لیا ہے۔ گو انہوں نے اس دن اس سے کبھی نہ ملنے کا عہد کیا تھا لیکن اس دل کا کیا کرتے..... اپنی طرف سے تو اس کے دل میں اپنی نفرت اتار آئے تھے لیکن اپنے دل سے وہ اس کی محبت کو نہ نکال سکے۔ ان دنوں جب وہ انگلینڈ کے سرکاری دورے پر تھے تو واپسی پر اُن کو پتا چلا کہ جس بچّے میں انجمن آ رہی تھی وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔ بتانے والوں نے بتایا کہ اس

جنگل میں رہنے والے تمام افراد جنگل کے ساتھ ہی جل کر رہ گئے تھے لیکن علی حسن کے خاص آدمی الطاف نے انہیں بتایا کہ ”سائیں دو لڑکیوں اور دو ہی مردوں کی لاشیں ملی تھیں۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر علی حسن کو اطلاع دی اور ساتھ ہی اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی شرط پر بتایا کہ دراصل وڈے سائیں نے اس معاملے کو بہن پر ڈن کر دیا تھا اور پولیس فائل بھی بند کر دادی تھی۔ الطاف کے اس بیان نے علی حسن کے چہرے کا رنگ بدل کر رکھ دیا۔ ضبط کی شدت سے آنکھوں میں سرخی آ گئی۔

”الطاف کھوج لگاؤ اس سارے معاملے کی کہ جو

زندہ ہیں وہ کہاں ہیں الطاف۔“
”جو حکم سائیں“ کہہ کر وہ اٹے قدموں
دروازے سے باہر نکل گیا۔
الطاف نے اس دن سے معلومات لینی شروع
کر دیں اس کی معلومات کے مطابق مرنے والی دونوں
لڑکیاں نانمہ اور رائنہ تھیں۔ انجمن آرا زخمی حالت
میں اسپتال میں زیر علاج تھیں۔ اس کا چہرہ مجلس کر

☆ ☆ ☆
وقت کا پہیار کتنا نہیں ہے چلتا رہتا ہے اور مٹی یعنی
رمل اب جوانی کی دہلیز پر پہنچ چکی تھی کہ انابی کی اچانک
موت نے آہستہ، آہستہ نکل کی جے جی کی برف کو پھلاتا
شروع کر دیا تھا۔ وہ حالات سے سمجھوتا کرنے کی کوشش

کرنے لگی تھی۔ گزرتی دقت نے یادوں کے آئینے پہ دھول جمائی تو اس نے زخموں پہ بھی مرہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ رمل جب تک خیریت سے گھر نہ آ جاتی تھل کو ایک عجیب بے چینی گھیرے رکھتی اور جب رمل گھر آ جاتی تو رمل اپنے آفس کی اور دوستوں کی باتیں کرتی اور اس کو بھی بولنے پہ اکساتی..... کل تھوڑی بہت باتیں کرتی اور دھیرے، دھیرے مسکراتے ہوئے اس کی سستی رہتی۔

آج جب رمل نے اسے اپنی دوست کی منگنی میں چلنے کو کہا تو وہ صاف انکار کر گئی..... اس کی چپ نے رمل کو ہر اسماں کر دیا اسے لگا کہ وہ پھر سے اپنے خول میں واپس چلی گئی ہے تھل نے بیٹی کے چہرے پر اتنی مایوسی اور ملال کو دیکھا تو اس کے دل میں اچانک ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اس نے دھیرے سے رمل کو گلے سے لگایا تو وہ بھوٹ، بھوٹ کر رو دی..... اور تھوڑی دیر بعد تھل کے آنسو بھی رمل کے بالوں کو نم کرنے لگے۔ بہت دیر تک دونوں کے آنسو نہ تھے لیکن ان آنسوؤں نے تھل کے اندر جے بے جی کے کلیہ شکر کو پگھلادیا۔

”چل ہٹ پگلی..... ضرور جاؤں گی تیرے ساتھ..... اٹھو اپنے اور میرے کپڑے پر لیس کر دو.....“ تھل نے اپنے آنسو صاف کرتے اس کا سر تھپکا۔

”جی اماں.....“ رمل نے جلدی سے ماں کے سینے سے سر ہٹایا اور بے یقینی سے بولی۔ اس کے چہرے پر بارش کے بعد کی قوس قزح کے رنگ بالکل دیے ہی تھے جیسے تھل کی آنکھوں میں اترے تھے۔



بڑا شاندار سا گھر تھا..... اگرچہ علاقہ بہت ہی ایلینٹ کلاس کا نہ تھا..... لیکن اچھا صاف ستھرا ناؤن تھا..... گھر کے باہر بہت سی گاڑیوں کے ساتھ رمل نے اپنی (آفس سے ملنے والی) گاڑی پارک کی اور ماں کے ساتھ سچ، سچ قدم اٹھا کر گھر کے اندر داخل ہوئی۔

اگرچہ فی الحال منگنی کی تقریب تھی لیکن اندر باہر شادی جیسی چہل پہل تھی۔ رمل کی دوست ماہین نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔ تھل خاموشی سے بیٹھی خوب

صورت سے بچے لاؤنچ کا جائزہ دے رہی تھی۔ چھوٹی سی تقریب تھی بس گھر کے افراد تھے۔ ماہین نے تقریب دوستی کی وجہ سے رمل کو انوائٹ کیا تھا۔ تھل کی ملاقات ابھی گھر والوں سے نہیں ہوئی تھی۔ اتنے میں.. جب وہ دقت گزاری کے لیے لاؤنچ میں جی تصویروں کو دیکھتی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی اچھٹی نظریں دم ایک تصویر پر آ کر رک گئی۔ یہ ایک مسکراتے ہوئے نوجوان کی بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ جس نے اس کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ دیر وہ دور سے تھل کی باندھے تصویر کو دیکھتی رہی۔ اتنے میں ماہین کی ماں کی آواز نے اس کا رنکاز توڑا۔

”یہ تصویر جس کو آپ اتنی محویت سے دیکھ رہی ہیں۔ یہ میرے تایا سرسفر از احمد کی ہے بیچارے جوانی میں ہی جان لیوا حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے اور.....!“ شاید وہ اور بھی کچھ بتا رہی تھیں مگر تھل تو دیس صوفے پر بے ہوش ہو کر ڈھیر ہو گئی۔

”ماہین ڈاکٹر کو بلا لو.....“ رمل، ماں کے ہاتھ پیر مسل رہی تھی۔ ہوش میں نہ آتی ماں کو دیکھ کر وہ چلا گئی۔

”ارے بلانے کی ضرورت نہیں ہے، ڈاکٹر گھر میں ہی موجود ہے۔“ ماہین کا تایا زامیر اپنا فرسٹ ایڈ بیک لے کر جلدی سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”آپ تھوڑی دیر کو ساڑھ ہو جائیں تو میں آنٹی کو چیک کر لوں۔“ اس نے رمل کو کہا۔ رمل نے بادل ناخواستہ ماں کا ہاتھ چھوڑا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سمیر نے تھل کو چیک کیا اور پھر ایک انجکشن لگا دیا۔ مڑ کر رمل کے ہوائیاں اڑتے چہرے پر نظر ڈالی اور تسلی آمیز لہجہ میں بولا۔

”کافی کمزور ہیں اور لگتا ہے کہ کسی اچانک شاک نے انہیں بے ہوش کر دیا..... آپ فکر مت کریں ابھی ہوش میں آ جائیں گی۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا لیکن اس کا سارا دھیان رمل کے ستے ہوئے معصوم چہرے پر تھا۔

”پلیز آپ لوگ میری امی کو گاڑی تک پہنچا دیں تاکہ میں ان کو گھر لے جا سکوں..... ماہین کا فنکشن میری وجہ سے خراب ہوئے بہت برا لگے گا مجھے۔“ رمل نے سمیر

سے اٹھائے۔ سچے ہیں اہل۔
 ”کیسی غیروں جیسی بات کر دی تھی تم نے دل..... ہم
 آنٹی کو اندر بیڈروم میں لٹاتے ہیں اور کوئی فنکشن خراب
 وراپ نہیں ہو رہا۔ ایسا تو گھر میں کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا
 تھا تو کیا گھر والوں کو باہر نکال دیتے۔“ ماہین نے دل کو
 گلہ آمیز انداز میں ڈانٹا۔

دو دنوں نے مل کر کل کو بیڈ پر لٹا دیا اور دل، ماں کے
 پاس بیٹھ کر بے تاب سے ان کے ہوش میں آنے کا انتظار
 کرنے لگی۔ ماہین نے بھی کہا کہ رسم سے پہلے تک وہ بھی
 دل کے ساتھ ہی رہے گی۔ کل کو ہوش آیا تو ماہین کی کمی بھی
 وہیں محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک گہری نظر کل پر ڈالی۔ ایسا لگتا
 تھا کہ وہ کچھ، کچھ بھڑھری ہیں۔ خدا، خدا کر کے کل کو ہوش آیا
 تو اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور شرمندگی سے اٹھنے کی
 کوشش کرنے لگی لیکن کمزوری نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

”ارے، ارے لپٹی رہیے ابھی آپ کو آرام کی
 ضرورت ہے۔“ لیکن کل کو یک دم جیسے کچھ یاد آ گیا تو اس
 نے بے تاب سے دل سے اپنا پرس مانگا۔ دل نے حیرانی سے
 ماں کو دیکھتے ہوئے ان کا پرس اٹھا کر پکڑ دیا۔ کل نے بہت
 بے تابی سے پرس کو کھول کر اس میں سے جلدی سے ایک تصویر
 نکال کر ماہین کی کمی کو پکڑائی۔ اب کی بار سکتے میں جانے کی
 باری ان کی تھی۔ تصویر میں سرسبز فراز احمد کے ساتھ انابی، یعنی
 عالیہ ظفر دہن کے روپ میں مسکرا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆
 ”عمر! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے جس کا جواب
 آپ پر ادھا رہا ہے۔“ اب کے وہ ذرا خشکی سے بولی تھی۔
 ”سن لیا پیاری بیگم.....! لیکن لگتا ہے کہ آپ اب
 بوڑھی ہو گئی ہیں دماغ کے ساتھ، ساتھ آپ کی قریب کی
 نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔“ عمر کے لہجے میں مصنوعی تشویش
 بھری تھی۔ جبکہ ارمان وہاں اس طرح بیٹھا کھانا کھا رہا تھا
 جیسے اس کی نہیں محفل والوں کی بات ہو رہی ہو۔

”اس میں بھلا میری نظر کی کمزوری کہاں سے آگئی
 عمر۔“ شائل نے انہیں حیرانی سے دیکھا۔
 ”بھئی سیدی سی بات ہے یہ جو محترمہ اکثر ہمارے
 گھر بائی جاتی ہیں اور آپ کو تو اتنی پیاری ہو چکی ہیں کہ اگر
 دو دن بھی آپ ان کا دیدار نہ کریں تو بولاؤ، بولاؤ پھرتی
 ہیں، مجھے تو لگا کہ آپ کو ارمان کے لیے جوتی چٹانے کی
 ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ اور وہ بہت مناسب لگی ہوں گی
 آپ کو ارمان کے لیے..... کیوں میاں صاحبزادے؟“

☆ ☆ ☆
 ”جی، جی مجھ سے کچھ کہا آپ نے؟“ ارمان نے
 بوکھلا کر باپ کی سمت دیکھا۔
 ”آف، آپ دل کی بات کر رہے ہیں عمر؟“ شائل نے
 پرجوش ہو کر کہا۔ ”آپ نے تو میرے دل کی بات جان لی۔“
 ”دیکھ لیجیے بیگم صاحبہ، ہم تو آپ کو اتنا ہی زیادہ
 جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ویسے پھر یہ لڑکیاں دیکھنے کا کیا
 سلسلہ ہے؟“ انہوں نے مسکراتے ہوئے شائل کو پیار

تویں بھی ہوتا ہے کہ ایک ڈرامائی موڑنے والا آخر
 سب کو اپنے گھر تک، اپنے باپ کے گھر تک پہنچا ہی دیا۔
 آئی تو وہ دل کی سہیلی کی سہیلی میں تھی لیکن قسمت نے اس کو
 اپنے باپ کی سہیلی سے ملوا دیا تھا۔ اتنا تو سرسبز فراز کے بھائی
 بھی جانتے تھے کہ سرسبز فراز نے ایک عالیہ نام کی لڑکی سے
 کورٹ میرج کی تھی لیکن اس کے آگے کی کہانی سے وہ
 بے خبر تھے کیونکہ اس کے بعد سرسبز فراز کی لاش ہی گھر آئی تھی
 اور اس کے بعد انہوں نے وہ عجلہ بھی جلد ہی چھوڑ دیا تھا۔
 لیکن کل کے چچا اب دل کو گلے لگائے رو رہے تھے اور
 دل حیرانی سے سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ چچا نے

دو دنوں نے مل کر کل کو بیڈ پر لٹا دیا اور دل، ماں کے
 پاس بیٹھ کر بے تاب سے ان کے ہوش میں آنے کا انتظار
 کرنے لگی۔ ماہین نے بھی کہا کہ رسم سے پہلے تک وہ بھی
 دل کے ساتھ ہی رہے گی۔ کل کو ہوش آیا تو ماہین کی کمی بھی
 وہیں محسوس ہوئی۔ انہوں نے ایک گہری نظر کل پر ڈالی۔ ایسا لگتا
 تھا کہ وہ کچھ، کچھ بھڑھری ہیں۔ خدا، خدا کر کے کل کو ہوش آیا
 تو اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور شرمندگی سے اٹھنے کی
 کوشش کرنے لگی لیکن کمزوری نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

☆ ☆ ☆
 ”عمر! میں نے آپ سے کچھ کہا ہے جس کا جواب
 آپ پر ادھا رہا ہے۔“ اب کے وہ ذرا خشکی سے بولی تھی۔
 ”سن لیا پیاری بیگم.....! لیکن لگتا ہے کہ آپ اب
 بوڑھی ہو گئی ہیں دماغ کے ساتھ، ساتھ آپ کی قریب کی
 نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔“ عمر کے لہجے میں مصنوعی تشویش
 بھری تھی۔ جبکہ ارمان وہاں اس طرح بیٹھا کھانا کھا رہا تھا
 جیسے اس کی نہیں محفل والوں کی بات ہو رہی ہو۔

آیا۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور پھر اس کا راز
پر بیٹھ کر وہ گہرائی میں نظر آتے اسلام آباد اور تاحہ نظر
بکھرے بزرگ زاروں کو دیکھ کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگی۔۔۔۔۔
وہ ان حسین نظاروں میں شاید گھٹنوں کھولی رہتی۔ جیسی اس
کی حیویت کو ”اسلام علیکم“ کی آواز نے یک دم توڑ دیا۔ اس
نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی پشت پر ارمان کھڑا تھا۔ ارمان،
کا یہاں ہوتا مل کے لیے معمول کی بات تھی ظاہر ہے کسی
بھی میٹنگ میں اس کی شمولیت ضروری امر تھا۔ وہ باس کے
احترام میں کھڑی ہوئی تو ارمان نے اسے جلدی سے بیٹھنے کا
اشارہ کیا۔ اور خود بھی اس کے مقابل کرسی پر بیٹھ گیا اور بلا
تنبہ شروع ہو گیا۔

”دیکھیے محترمہ! اگر آپ کسی غلط فہمی میں ہیں کہ
ابھی اس میٹنگ میں کسی تیسرے کی تشریف آوری متوقع
ہے یا کوئی چوتھا فرد بھی اس میٹنگ کا حصہ ہوگا تو آپ کی
غلط فہمی میں پہلے ہی دور فرما دوں کہ ایسا سین ہرگز کوئی
نہیں ہے۔“ وہ سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔

”تو پھر یہ کون سی میٹنگ ہے جو صرف ہم دونوں
کے درمیان آفس میں نہیں ہو سکتی تھی اور آپ کو مجھے یہاں
بلا تا پڑا؟“ رمل نے بھوئیں اچکا کر سختی سے جواب دیا۔

”یار! میں اپنے والد محترم کے خلاف باضابطہ طور پر
بغاوت کرنے والا ہوں اور ان کی تمام جائیداد پہ جلد قابض
ہو جاؤں گا، اس سلسلے میں تمہارے ساتھ مل کر سازش کرنی
تھی اس لیے آپ کو یہاں بلانے کی سنگین غلطی سرزد
کر بیٹھا۔“ وہ تپتے ہوئے لہجے میں سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”کیا۔۔۔۔۔ آپ یہ کرنے والے ہیں اور اس سب
میں آپ نے مجھے شامل کرنے کا سوچا بھی کیسے؟ آپ کا
خیال ہے کہ اس گھٹیا کام میں، میں آپ کا ساتھ دوں
گی۔“ رمل۔ انکار سے جباتے ہوئے لہجے میں کہتی اٹھ
کھڑی ہوئی۔

”میم۔۔۔۔۔ پلیز بیٹھ جائیں یہاں کوئی سین کرسی
ایٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، میں ہی گھاسڑ ہوں جو
دو جمع دو پڑھنے والی محترمہ کو پورپوز کرنے کے لیے ایک
یا دوا رو میٹنگ جبکہ کا انتخاب کر بیٹھا۔“ یہ کہتے ہوئے اس

جمہری نظروں سے دیکھا۔
”ارے وہ تو میں نے محض تمہید باندھی تھی ورنہ میں
ہی کیا مناہل اور مشعل بھی رمل کو ہی منتخب کر چکی ہیں۔“
شمال نے غلٹ دکھائی۔

”لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات ہم بلا ہی بالا طے
کر ڈالیں۔ رمل اور ارمان کو خود ایک بار مکمل کر بات کر لینی
چاہیے تاکہ رمل اپنی آبادگی سے اپنی والدہ کا عندیہ لے لے،
تو ہی ہم اس کا تھاہ مانگیں گے۔“ عمر نے شمال کو بھجایا۔
”جی بالکل! آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ شمال
کو شوہر کی بات مناسب لگی۔

”تو کیوں صاحبزادے؟ آپ رمل سے بات تو
کر لیں گے نا؟“

”بالکل پاپا! آپ فکر مت کریں۔۔۔۔۔ صرف بات
نہیں کروں گا بلکہ ہاں لے کر ہی دم لوں گا۔“ وہ جلدی،
جلدی بولا تو دونوں نے اسے گھورا اور پھر یک دم مل کر
قبضہ لگایا تو ارمان نے منظر سے غائب ہونے میں ہی
عافیت بھی۔

☆☆☆

آج آفس میں آنے کے بعد رمل کو میٹنگ کے
لیے منال ریسٹورنٹ کال کیا گیا۔ لچک ٹائم شیڈول تھا وہ
فوراً روانہ ہو گئی۔

برائے میں دامن کوہ کے خوش کن نظاروں سے
لطف اندوز ہوتے، ہوتے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب
وہ سرسبز داؤی کی بلند یوں پہ واقع اس خوب صورت
ریسٹورنٹ پہ پہنچ گئی۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ شاید
ریسٹورنٹ کا اندرونی ڈاننگ ہال میٹنگ کے لیے
ریزروڈ ہوگا لیکن ویرا سے دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا۔

ویرا کی معیت میں وہ اوپن اتر سائٹ پر حیرانی
سے بڑی تو ویرا نے ایک کارنر پہ ریزروڈ کے کارڈ والی
ٹیمبل کی طرف اشارہ کیا۔ ٹیمبل اس وقت بالکل خالی تھی۔
آس پاس کی کرسیوں پہ کوئی براجمان نہیں تھا۔ اس نے
کندھے اچکائے۔

”شاید میں جلد آگئی ہوں ابھی تک کوئی بھی نہیں

میں ابھی ایک گلاب کی ادھ کھلی کلی نکال کر میز پر پھینکے کے انداز میں رہی۔

رمل ایک جھٹکے سے کرسی پر گرنے والے انداز میں بیٹھی۔ یہ بات تو کر کبھی اس کے دماغ میں نہیں آسکتی تھی کہ ”مسٹر ارمان حسن بقول رمل کے سزاوار، رمل کو پر دپوز کریں گے اور وہ اتنے درمیں ایک انداز میں..... اس کا دماغ سائیں، سائیں کرنے لگا اور پھر تھوڑی ہی دیر لگی اسے اپنا پسندیدہ خُفّیل جاری کرنے میں..... یعنی..... اب حال یہ تھا کہ وہ زور شور سے آنسو بہا رہی تھی اور ارمان نشو باکس سے ٹٹو نکال، نکال کر اسے پکڑا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ متوجہ ہو جاتے، ارمان نے غصے میں اس کا بازو پکڑا اور کھینچتے ہوئے لے جا کر اپنی گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بٹھا۔ رمل مزاحمت کرنے کے بجائے ساکت ہوئی تھی۔ روانی سے بیٹھتے ہوئے آنسو بھی رک گئے تھے۔ ارمان دروازہ ایک جھٹکے سے بند کر کے دوسری طرف سے گھوم کر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی کو ادھیں اسلام آباد کی جانب موڑ دیا۔

رمل جو دوبارہ سے سسکنے لگی تھی ایک دم رک گئی۔ ”میری گاڑی وہ تو دوپہر رہ گئی.....“ وہ منمنائی۔ ”کچھ نہیں ہوتا رمل بی بی آپ کے ہوائی جہاز کو..... میرا ڈرائیور لے آئے گا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ مجھے اتنا پسند کرتی ہیں۔“ اس نے غمگینی ڈیبا کوڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسا نہیں ہے، میں آپ کو اتنا نا پسند نہیں کرتی۔“ رمل نے بیچارگی سے جواب دیا۔

”ادھ.....! اس کا مطلب ہے کہ آپ مجھے اتنا انفارمیشن.....“ وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

”نہیں، نہیں میرا مطلب یہ ہے کہ میں آپ کو بالکل بھی نا پسند نہیں کرتی ہوں۔“ وہ روپاکی ہوئی۔

”تو یوں کیسے کہ آپ مجھے پسند کرتی ہیں۔“ اس نے دبی شرارتی مسکراہٹ کو اپنے بھرے، بھرے

ہوں میں سچ کر چھپایا۔

”تمی میرا مطلب یہی ہے۔“ رمل نے بے ساختہ کہا۔ ”تو ملا میں ہاتھ.....“ ارمان نے اس کی طرف

یوں بے نیازی سے ہاتھ بڑھایا گویا شادی کی بات نہ ہو کوئی مذاق ہو جس کی وہ تائید چاہ رہا ہو۔ رمل نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ارمان جو اس کا ہاتھ تھامنے والا تھا اس کا ہاتھ خلاص ہی رہ گیا، رمل نے جھپٹ کر ٹھٹکی ڈیبا کوڈیش بورڈ سے اٹھایا اور جھپٹ سے پرس میں ڈال لیا۔ ارمان نے ڈھلوانی سڑک پر ایک دم گاڑی کو بریک لگائے اور ٹھٹک کر رمل کو دیکھنے لگا۔

رمل نے اس سے نظریں ملانے کے بجائے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر دونوں اسی پوزیشن میں بیٹھے رہے، رمل ٹھٹکی باندھے بظاہر بے نیازی سے گاڑی سے باہر کے مناظر میں گم تھی اور ارمان کو آنسوں ہو رہا تھا کہ وہ اتنی بار اس کے سامنے آتی رہی اور اس نے اس کے دیدار سے فیض کیوں نہیں اٹھایا۔

ضد ہی ضد میں اس کو بی چالا کو، بی جالو اور چچی کے خطاب دینے والا ارمان آج تو کیا بہت پہلے ہی اس خوب صورت ترین لڑکی کی معصومیت پر دل بار بیٹھا۔ اب جبکہ برداشت نے جواب دے دیا تو اس نے رمل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ رمل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو ارمان کے چہرے پر چاہتوں کا ایک جہان آباد تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی کے رنگ نے رمل کے چہرے کو گلاب کر دیا۔ اور اس نے شرما کے سر جھکا دیا۔

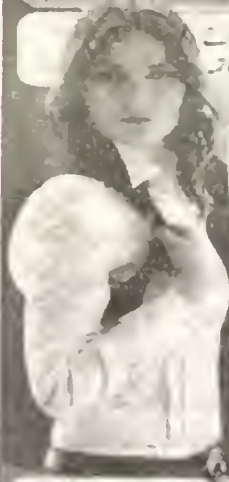
”تو پھر میں سمجھ جاؤں کہ لڑکی نے ہاں کر دی.....“ ارمان گنگنایا، رمل نے نامحسوس انداز میں ارمان کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

”میرے خیال میں یہ باتیں بڑوں کے درمیان طے پائیں تو زیادہ اچھا ہے اور..... اور میں اپنی امی سے بات کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔“

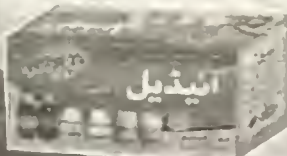
”اچھا! تو لڑکی پھر میری انگوٹھی واپس کر دو کس خوشی میں اپنے پرس میں ڈال لی ہے چورنی.....“ ارمان نے اس کے پرس کے اسٹریپ پہ ہاتھ رکھا تو رمل نے

برت انگیز نسخہ جات سے **موتاپے** سے مکمل نجات پائیے

ایک ماہ 30 پانڈوز کم 6 کمر کم



ملوث کو اس سے استعمال کے بعد ہیروین سے
دوا کی جاتی ہے جو موتاپے کا سبب بنی ہیں ان کا مکمل خاتمہ



موتاپا
یقینی ختم

ایڈیل سائنگ کورس

فری ہوم ڈیلیوری

HR کورس جو کچھ کے چرے ہو جسم
کے تمام حصوں کے ساتھ یہ دوا
کے جسم کو تازہ کرتی ہے
کے جسم کو تازہ کرتی ہے
کے جسم کو تازہ کرتی ہے
کے جسم کو تازہ کرتی ہے
کے جسم کو تازہ کرتی ہے
کے جسم کو تازہ کرتی ہے

ایچ-آر کورس



شوگر کا مکمل علاج
چہرے کیل مہاسے داغ و جھوٹا خاتمہ
ایڈیل چھوٹی کورس

سلیٹ آپ نسوانی حسن اضافہ ایڈیل
ہائٹ گرو

پاکستان ہومیو پیتھک کلینک
042-37470123
042-37470128
0300-4370496
E-mail: pakisannhomeoclinic786@gmail.com Web: www.pakhtc.com

جلدی سے پرس کو دبوچ لیا۔

کے لاکھ اصرار پر بھی رمل کے باپ اور اس کے خاندان کے بارے میں تفصیلات نہیں بتائیں۔

”تو یہ ہے کہ کتنے گنجوں ہیں آپ چیز دے کر داپس نہیں لینے۔“ رمل نے کھسکا کر کہا۔ دونوں پرس کو اپنی طرف کھینچنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ نتیجتاً اسٹریپ ارمان کے ہاتھ میں اور پرس رمل کے ہاتھ میں رہ گیا۔ تھوڑی دیر کو دونوں ساکت ہوئے اور پھر دونوں کے مشترکہ قہقہے پر خوب صورت مناظر، پہاڑوں اور فضاؤں نے بلامیں لیں۔

☆☆☆

”ای آپ اتنی خاموش کیوں ہیں آپ کو اگر اعتراض ہے تو میں سر ارمان کو منع کر دوں گی، وہ اپنے والدین کو ہمارے گھر بھی نہیں لائیں گے۔“ رمل نے بکل کو کم صم بیٹھے دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

اس نے ارمان کے پرد پوزل کے متعلق ماں کو بتادیا تھا۔ بکل نے کچھ بھی کہنے کے بجائے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ حالانکہ اب وہ دونوں پہلے کی طرح دور، دور نہ تھیں بلکہ بہت بہ تکلف ہو چکی تھیں۔ بکل اپنی سکون میں تھی کہ اسے اپنے خون کے رشتے بھی مل گئے تھے اور رمل کو ان کی طرف سے ایک اچھے علاقے میں مقول گھر بھی مل چکا تھا۔ زندگی میں کچھ ٹھہراؤ اور سکون در آیا تھا۔

”میرا خیال ہے رمل اب وہ وقت آ گیا ہے کہ کچھ سچائیاں اور بھی ہیں جو میں تمہیں بتا دوں جن کا جانا تمہیں ہی نہیں ارمان کے لیے بھی ضروری ہے اور اس کے والدین کے لیے بھی۔“ بکل کی آواز اتنی کمزور اور پست تھی کہ لگتا تھا وہ کسی گہرے کنوئیں سے بول رہی ہو۔

رمل نے اپنا ہاتھ ماں کے ہاتھ پر رکھ کر یوں تپتہ تپایا جیسے وہ اس کو یقین دہانی کروا رہی ہو کہ وہ اس کے سچ کو پورے سچ کی صورت سننے اور ارمان تک پہنچانے کو تیار ہے۔ یہ الگ بات کہ انجانے راز جب راز سے آگاہی تک کے درمیان ہوں تو انسان برزخ میں کھڑا ہوتا ہے۔

بکل نے انہیں آرا سے اپنی ماں اور اپنی ماں اور باپ کی تمام داستان اس کے گوش گزار کر دی لیکن رمل

ارمان ایک پتھر کی صورت بنا اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ جذبات جن کو ختم لینے ابھی زیادہ وقت بھی نہیں گزرا تھا۔ لگتا تھا کہ ان پہ برف پڑ گئی ہو۔ تھوڑے دن پہلے اسی جگہ جہاں اس نے رمل سے پہلی بار محبت کا اعتراف کیا تھا اور اس کو پایا تھا اگر معلوم ہوتا کہ آج اسی جگہ وہ اسے کھونے جا رہا ہے تو کبھی رمل کی فرمائش پر آج منال ریسٹورنٹ نہ آتا۔ بلکہ آج آتا ہی کیوں؟ وہ ساکت نظروں سے رمل کے حسین چہرے کو دیکھ رہا تھا جو بس بولے جا رہی تھی۔

”میں نہیں چاہتی ارمان کہ ہم کوئی بھی بات ایک دوسرے سے چھپائیں۔ اور بعد میں پتا چلے کہ ہماری زندگی بے اعتباری کی نذر ہو۔ ہم ایک دوسرے سے نظر چرائیں۔“ رمل نے اپنی ذات سے وابستہ سچائیاں پر تدر پر ت ارمان کے سامنے رکھ دی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ ارمان کے لیے ان کا جاننا بہت ضروری ہے۔

”زندگی میں محبت بہت ضروری ہوتی ہے بہت اہم لیکن عزت تو زندگی ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنی ماں کی طرح میں بھی ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹوں۔“ اس نے دھیرے سے ارمان کے ہاتھ پہ پٹھانا زک سا ہاتھ دھرا۔

”ارمان!..... تمہارا جو بھی فیصلہ ہوگا مجھے بغیر شکایت کے منظور ہوگا۔ لیکن یہ بات تمہیں ابھی ڈیسا ایڈ کرنا ہوگی کہ تمہاری زندگی میں کس چیز کی اہمیت ہے، میری محبت کی یا دنیا کی باتوں کی۔ اپنی ترجیحات کا تعین ابھی کر لو تو ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔ کوئی بھی سچ کسی جھوٹ کے رنگوں سے ڈھانپا نہیں جاسکتا۔..... جھوٹ کے کچے رنگ پہلی پھوار سے ہی اتر جاتے ہیں ارمان..... میں تمہیں آزاد چھوڑتی ہوں۔ اس بات کے لیے کہ تم محبت اور دنیا میں سے جسے چاہو جن لو.....“ رمل نے اپنے گرم ہاتھوں کے نیچے ارمان کے لمحہ بہ لمحہ سرد ہوتے ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں چھوڑ دیا لیکن ارمان کی طرف سے پڑامید نظروں سے دیکھا۔

جیسے ابھی وہ لپے گا۔ ”مختصر یہ ہے اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا کیا کہتی ہے، رمل یہ زندگی ہم نے گزارنی ہے، اس کے سچ لوگ کہاں سے آگئے۔ فارگیت اٹ!“ کہہ کر واپس اس کے ہاتھ تمام لے گا ہمیشہ کی طرح۔۔۔۔۔۔

لیکن ارمان.....! ارمان تو گویا ایک پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ لفظ کہیں کھو گئے تھے لیکن اس کے چہرے پر پچھلے سرد تاثرات رمل کو وہ باتیں بھی سمجھا گئے جو ارمان کے ہونٹوں نے ادا بھی نہیں کی تھیں۔ اس کی خاموشی اور جاہد خاموشی رمل کے ہر سوال کا جواب دے گئی۔

یہ جو تم کو سارے سوال آتے ہیں ان کا واحد جواب میں ہی تھا۔ رمل نے جلدی سے بیک سے ٹھٹھی ڈیبا نکالی اور میز پر رکھ کر ارمان کی جانب کھسکا دی۔ ارمان کی نگاہیں خلاؤں میں تھیں، چہرے پر لمبی تسکین کا احساس تھا۔ لیکن اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر ٹھٹھی ڈیبا کو دیکھا لیکن چپ تھی کہ ٹوٹ نہیں رہی تھی۔ رمل نے جلدی سے کرسی کھسکا کر خاموشی سے اٹھتے، اٹھتے ایک مہرجانی ہوئی کٹی بھی نیپل پر کمری اور پیچھے دیکھے بغیر چلتی چلی گئی۔ آنسو آنکھوں کے کناروں پر بے تاب کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے کالا چشمہ چڑھایا اور جلدی سے ریٹینوٹ سے نکل کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اب وہ مکمل کے روکتی تھی اور آج اسے سارے کا سارا دل لیتا تھا تاکہ پھر وہ کبھی زندگی میں ارمان کے لیے نہ دے، محبت کے لیے آنسو نہ بہائے۔۔۔۔۔۔

☆☆☆

بشاکل تو کم صم سر پکڑے بیٹھی تھیں اور ارمان کے چہرے پر سختی کے آثار تھے۔ محبت تو دل سے رخصت ہوئی تھی یا نہیں مگر یہ کیا تھا کہ نفرت بھی نہیں جاگی تھی۔ تو پھر وہ کیا تھا جو محبت پر حاوی ہو رہا تھا۔ وہ اب بھی شاید۔۔۔۔۔۔ وہ محبت کی کشتی کو ڈوبتے دیکھ کر بھی کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسے بس یہ پتا تھا کہ اسے طوائفوں سے شدید نفرت تھی۔۔۔۔۔۔ اور عورت کا یہ روپ اس کے لیے ہمیشہ سے بہت بد صورت رہا تھا۔

”میرے خیال میں ارمان جتنا جذباتی ہوئے بغیر

سوچو کہ آپ بہتر انداز میں فیصلہ کر سکتے ہو، مجھے اچھا لگا رمل نے تمام سچائی آپ کے سامنے رکھ دی تھی۔ سوچو کتنا مشکل رہا ہوگا اس کے لیے یہ سب تمہیں بتانا۔ وہ چاہتی تو یہ باتیں آپ سے چھپا بھی سکتی تھی اور ضروری نہیں تھا کہ آپ کو ہر بات کا خود ہی علم ہو جاتا لیکن اس نے پوری دیانت داری سے کام لیا۔“ عمر حسن نے ارمان کو سمجھانا چاہا۔

”لیکن پاپا میرا دماغ یہ بات قبول ہی نہیں کر رہا کہ اس کی ماں ایک طوائف کی بیٹی بن کر پہلی اور رمل کی پیدائش بھی اسی طوائف کے گھر پر ہوئی، کب ل آنٹی ایک شریف خاندان کی بیٹی ہیں میں ماں بھی لوں تو رمل کا باپ کون ہے یہ بات آخر رمل کی امی کیوں بتانے پر تیار نہیں ہیں۔ ایسے میں رمل کو اپنی زندگی کا سا بھی چٹنا میرے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے۔“ ارمان نے اپنے اندر کی ٹھن کو باہر نکالا۔ اب کے شامل نے کسمسا کر ارمان کو دیکھا۔

”ارمان یہ اپنے بس کی بات نہیں ہوتی کہ ہم نے کس کے گھر پہ پیدا ہوتا ہے، اب یہ تمہاری چواں نہیں تھی کہ تمہیں عمر حسن کے گھر پیدا ہونا ہے یہ ہمارے بھی بس کی بات نہیں تھی کہ تمہیں دنیا میں لاتے یہ طے کرتے کہ ہمیں ارمان حسن چاہیے یا منائل یا مشعل حسن۔۔۔۔۔۔ یہ وہ فیصلے ہیں جو قدرت نے ہمارے لیے طے کر دیے ہوتے ہیں اور ہم۔۔۔۔۔۔ ان معاملات میں بے بس ہیں۔“ بشاکل جو کم گو تھیں اس وقت دھواں، دھواں چہرے کے ساتھ دلائل دیتے ہوئے ان کی آواز زندہ لگتی تھی۔ عمر حسن نے پُرستاش انداز میں بیوی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

”لیکن مجھے کچھ وقت چاہیے۔۔۔۔۔۔ میرا دماغ اس سب کو قبول نہیں کر رہا ہے، مجھے آپ لوگ اکیلا چھوڑ دوں تاکہ میں بغیر کسی دباؤ کے سوچ سکوں۔۔۔۔۔۔“

”بالکل! لیکن صاحبزادے ہر نفرت کا کوئی جواز بھی ہوتا ہے۔ ہم تم پر کوئی زبردستی نہیں کر رہے ہیں جب دل سے اور دماغی طور پر تم اس رشتے کو نہیں اپناتے ہم تمہیں اپنے فیصلے کا پابند تو نہیں کرتے لیکن یہ یاد رکھنا کہ بہر حال اس گھر کی بہور رمل ہی بنے گی ورنہ تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔“ عمر حسن کے لہجے میں قطعیت اتر آئی تھی۔

میاں ہم نے واپس کیا۔“ یہ واقعہ ختم ہو گیا تھا اس دن..... لیکن ارمان کے معصوم ذہن پر یہ سب جیسے چھاپ چھوڑ گیا۔ اس کے لیے دنیا میں اگر عورت کا کوئی بد صورت ترین چہرہ تھا تو وہ بھی طوائف.....

شاید عمر حسن جان گئے تھے کہ غلطی کہاں ہوئی تھی۔ ☆☆☆

”پھوپھی جان اب آپ کی صحت بہت بہتر ہے، آپ کا بلڈ پریشر بھی بالکل نارمل ہے، چلیں آج کہیں کھونٹے چلتے ہیں۔“ سمیر نے محبت سے نکل کو دیکھتے ہوئے بٹاشٹ سے کہا۔ محل نے ایک پیار بھری نظر سمیر کے چہرے پر ڈالی اور ایک شغنی آہ بھر کر..... بے نیازی سے ٹی وی دیکھتی رمل کو دیکھا۔

”ارے بیٹا میں گھر میں ہی کچھ اچھا سا بناتی ہوں، باہر جا کر کیا کروں گی۔“ محل اٹھتے ہوئے بولی۔

”ارے نہیں پھوپھی جان آج ہم تینوں باہر جائیں گے، آپ کی بالکل نہیں چلے گی۔ میں تو چاہتا تھا کہ آپ دونوں بھی ہمارے ساتھ رہیں لیکن رمل کی ضد نے کام خراب کر دیا۔“

ملکبے کپڑوں اور نکھرے بالوں میں بھی رمل کا حسن دو آتشہ تھا۔ وہ اس وقت ٹی وی پر نظریں گاڑے ہوئے تھی لیکن دماغ میں وہ دشمن جان ارمان براجمان تھا، کبھی جھگڑتا تو کبھی مدھم سرگوشیاں کرتا۔ اپنے نام پر ہڑبڑا کر اس نے سمیر کی طرف دیکھا۔

”کہاں گم ہو رمل..... جلدی سے فریش ہو جاؤ پھر راول جھیل چلتے ہیں۔“ سمیر نے مسکراتے ہوئے اس کے حسین چہرے کی بلانیں لے ڈالیں۔

”میں امی کو اکیلا چھوڑ کر کہیں نہیں جا رہی۔“ وہ قہقہے سے روکھے لہجے میں بولی۔

”اوہ..... تو آپ ٹی وی میں اتنی گم ہیں کہ آپ کو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ پروگرام تو بنائی آپ کی امی کے لیے ہے تو کیا خیال ہے چلنا پسند کریں گی۔“ سمیر نے امید بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

رمل نے تھکے، تھکے انداز میں ماں کے چہرے پر

کھائیں، عمر حسن کے چہرے کی طبیعت کو دیکھ کر کچھ کہتے، کہتے رک گئی اور ایک شغنی سانس بھر کر اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند غرتیں بلا جواز آپ کے دل میں ڈیرا جماتی تھکتی ہیں، ارمان بھی تینائی میں وہ جواز ڈھونڈ رہا تھا کہ اسے اتنی نفرت کیوں تھی طوائف زادیوں سے۔ اور یہ ڈھونڈنے کی بات تھوڑی تھی، یہ بات تو اس کے سامنے دھری تھی۔ پھوپھو کا آنسوؤں سے تر چہرہ..... پھوپھا کی بے اعتنائی اور عمر حسن کے جتن اور ان سب پر حاوی اس عورت کا چہرہ جو بظاہر بہت حسین تھا لیکن درحقیقت بے حد مکروہ..... یوں تو اس واقعے پہ وقت کی دھول پڑ چکی تھی۔ پھوپھو اب اپنے گھر میں خوش و خرم تھیں لیکن ارمان کے بچپن میں ہونے والے اس واقعے نے پھاس کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اسے بہت اچھی طرح یاد تھا کہ کس طرح پھوپھو حال سے بے حال اپنے بچوں کے ساتھ ان کے گھر آگئی تھیں۔ سال بھر وہ اپنے بھائی کے در پر پڑی رہی تھیں تو اس کی وجہ ایک طوائف ہی تھی جس کے جلوؤں کے دام میں الجھ کر پھوپھیاں اپنی باوقافیوں کو بھلا بیٹھے تھے..... پھر وہ..... بد صورت دن جب پھوپھو کو نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا تو عمر حسن نے اس طوائف کو بالائی بالا ڈھیروں پیسے دے کر پھوپھا کی جان چھوڑنے کا وعدہ لیا تھا اور یہ سب ارمان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جب وہ عمر حسن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر شیطانی منواری تھی تو اس کے مکروہ انداز ایسے تھے کہ پردے کے پیچھے کھڑے ارمان کا دل گھبرا ہوا تھا کہ کہیں عمر حسن کو وہ اپنے دام میں نہ پھانس لے۔ اس کا بے ہودہ انداز اور گندالبا سب ارمان کی برداشت سے باہر تھا۔ پھر جب عمر حسن نے اسے پیسے دیتے ہوئے پھوپھا کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جانے کو کہا تو اس عورت کا ناز و ادا سے یہ کہنا کہ ”ہم طوائفوں میں ایک بات بڑی اچھی ہے کہ ہم وعدے کی پکی ہوتی ہیں۔ جائیں صاحب آج سے آپ کی بہن کا

اب ایڈوانس سیلری حاصل کریں 20 لاکھ روپے تک!



خصوصیات:

- بارگت میں اپنی حساب دینے
- کوئی پیشہ و چارہ نہیں
- محو چودہ اور دو بارہ سہولت حاصل کرنے کے خواہشمند صارفین کیلئے
- خاص رعایت
- آسان اقساط
- تیز ترین پروسیجر
- حکومتی کے بعد فوری ہرجا

اہمیت:

- NBP کا کثرت رکھنے والے وفاقی رسوبداری تنظیم پر جاری قلموں اور خود بخود کاروباروں کے ملازمین
- NBP کے دلچسپ اپنی کتبوں میں وصول کرتے ہیں۔

DON'T WAIT TO LOSE WEIGHT

وزن گھٹائیں
خوبصورت و تندرست ہو جائیں

ہر دس میں سے دو افراد
موتا پے کی وجہ سے دل کی بیماریوں
میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔



ہر دس میں سے چار افراد
موتا پے کی وجہ سے ذیابیطس کا
شکار ہو جاتے ہیں۔



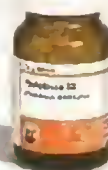
ہر دس میں سے چار افراد موتا پے کی وجہ سے
کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔



Phytolacca e baccis 10 drops thrice a day



Phytolacca americana 3x
1 tablet thrice a day



Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.



Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt.) Ltd

Original Medicines of Schwabe Germany, easily available
now at all Homoeo Pharmacies

<https://reading-carrot.in>

کھلتی مسکراہٹ کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
 ”بس دس منٹ میں فریٹش ہو جاؤں گی۔“ اس
 نے اپنے لیے کوڑ بردستی خوشگوار بنایا۔
 ”واہ بھئی! ایسی خاتون پہلی بار دیکھی جو دس منٹ
 میں فریٹش ہو سکتی ہیں۔“ سمیر نے ہنستے ہوئے اسے
 چھیڑا۔ تو کھل اور رمل دونوں ہنس پڑیں۔ اور سمیر اس کی
 سی کی جلتے رنگ پر ہنسا رہا ہوا گیا۔

☆☆☆

سمیر کا آنا جانا روز کا معمول بن گیا تھا اور اب تو
 رمل کو بھی لگتا تھا کہ سمیر کا شوخ انداز اگر گھر بھر میں خوشی نہ
 پھیلاتا تو شاید وہ ڈپریشن کا شکار ہو کر بیمار ہو جاتی۔ وہ غیر
 محسوس انداز میں گھر کے فرد کی صورت اختیار کر گیا تھا۔
 جس دن نہ آتا کھل فوراً اس کے گھر کا پروگرام بنالیتی۔
 لیکن یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سمیر کے
 والدین اس کا رشتہ طلب کر لیں گے۔

”رمل میں جانتی ہوں کہ پیار کو دل سے رخصت
 نہیں کیا جاسکتا اور عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی
 ہے لیکن بہر حال عورت کو زندگی گزارنے کے لیے ایک
 ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے اور جب کوئی مرد عورت کو
 عزت سے اپنا بنانا چاہے وہ بھی اپنے والدین کی رضا و
 رطب سے تو سمجھو کہ وہ عورت دنیا کی خوش قسمت ترین
 عورت ہوتی ہے، مجھے لگتا ہے کہ سمیر تمہارے لیے بہترین
 جیون ساتھی ثابت ہوگا۔“ کھل نے رمانیت سے رمل
 کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔

رمل ہنستا آنکھوں میں دبے آنسوؤں کو روک نہ سکی تو
 کھل بھی اپنی گود میں گرتے ان آنسوؤں کی کمی سے بے خبر
 نہ رہ سکی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ گود میں سر رکھے لیٹی بیٹی
 کے آنسوؤں کی گود کو نم نہ کرتے، بے بسی سے کھل نے
 آسمان کی طرف دیکھا اور وہ آہ بھری۔ محبت کے دکھ سے
 نا آشنا کبھی وہ جو ان آنسوؤں کو سمجھ نہ پاتی۔

☆☆☆

آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر تپتے میں جذب
 ہو رہے تھے، زندگی اتنی مشکل کیوں ہے، ہم نہ چاہتے

ہوئے بھی دوسرے کے راستے دشوار کر دیتے ہیں، انابی
 کے ایک غلط قدم نے مجھ سے ہی نہیں، میری رمل سے بھی
 اس کی خوشیاں چھین لی ہیں، کاش وہ ایسا نہ کرتیں، یہ
 داغ، داغ چادر نسل در نسل منتقل ہو رہی ہے جس چادر کو
 انابی نے اوڑھا تھا۔ آج رمل جو اتنے سالوں سے ان
 کے لیے ایک ماں کی طرح سایہ بنی رہی صابر و شاکر، آج
 وہ ان کی ضدی بیٹی بن گئی تھی۔ آج جب انہوں نے اس
 کو بتایا کہ وہ سمیر کے لیے ہاں کرنے والی ہیں تو وہ روئی
 نہیں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فقط اتنا بولی۔

”مجھے ہی سزا کیوں؟ آپ نے جو یہ محبت کا لمبا
 جوگ رکھا ہے اس کا کیا؟ آپ کیا سمجھتی ہیں محبت صرف
 آپ پر واجب تھی جو میں نے کی اس کا کیا؟“
 ”میرا معاملہ اور تمہارا رمل..... میں اسکی نہیں تھی
 میرے ساتھ تم تھیں میری بیٹی..... اور تم سمیر اور ارمان
 میں سے ایک کو چننے میں تامل کیوں کر رہی ہو، ارمان تو
 تمہارے ماضی کو جان کر منہ موڑ گیا جبکہ سمیر سب جان کر
 بھی تمہیں اپنا نا چاہتا ہے، پیار کرتا ہے تم سے، خون ہے
 وہ میرا۔“

”تویوں کہیں ناں ارمان کہ وہ آپ کا بھتیجا ہے اس
 لیے آپ کا دوٹ اس کی طرف ہے، آپ نے ساری عمر
 خود غرضی میں گزاری ہے اور اب نبی آپ صرف اپنے
 فیصلے پر ہی عمل کر داری ہیں تو ٹھیک ہے میں ہاں کر دیتی
 ہوں لیکن میں اپنے دل کو اپنے داغ کے تابع نہیں کر سکتی تو
 آپ کے باپ کے تابع کیسے کروں گی..... نہیں زور چتا
 میرا اس پر..... نہیں مانتا ہے دل میری بات..... وہ صرف
 ارمان مانگتا ہے، صرف ارمان۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ،
 پھوٹ کر رو دی تھی۔ کھل نے اسے چپ کر دینے کی کوشش
 نہیں کی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

محبت تو کب سے روٹی ہے
 سانسوں سے مہک نہیں جاتی
 ابھی لفظوں میں جادو ہے
 کیوں چاہت بکھر نہیں جاتی

ہے۔ بے رحم کی، بے عرس ہوئی ہے، سن سے اس کو مطلب نہیں ہوتا میرا صاحب یہ بھی مشرک نہیں ہوتی، یہ بھی وحدانیت پر یقین رکھتی ہے۔“ وہ بول رہی تھی اور سمیر شگتہ قدموں سے باہر کی طرف جا رہا تھا۔ مرد کو شراکت کہاں راس آتی ہے؟ نہیں ناں!.....!

☆☆☆

پروین کو رمل نے پچھلے دنوں ہی ملازم رکھا تھا۔ ڈور تیل کی آواز پر وہ کچن سے نکل کر باہر کی طرف لپکی۔ کچل کی طبیعت پچھلے کئی دنوں سے خراب تھی، رمل نے آفس سے چھٹی لٹی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ اپنے کمرے میں آنکھیں موندے نیم دراز تھی۔ جب پروین نے اسے کسی خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ بے دلی سے اپنے کپڑوں کی سلوٹوں کو ہاتھ سے درست کرتی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔ بالوں کو ہاتھ پر لپیٹ کر جوزے میں سمیٹا۔

”یقیناً اماں کی کوئی واقف کار ہوں گی۔“ وہ سوچتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو شائل آئی کو دیکھ کر خوشی سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”اوہ مائی گاڈ! شائل آئی آپ یہاں.....؟“ (وہ ارمان کے اس دن کے روئے کے بعد شائل آئی سے بھی ملنے نہیں جاسکتی تھی۔) وہ ہرگز ارمان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن آج انہیں اپنے گھر پر دیکھ کر خوشگوار کیفیت طاری ہوگئی تھی اس پر۔

”رمل تم بالکل بھی اچھی بیٹی نہیں ہو، اچھی بیٹیاں ایسے تھوڑی کرتی ہیں کہ اتنے ڈھیر سارے دن شکل بھی نہ دکھائیں۔“ رمل کو پیار کرتے ہوئے شائل نے شکوہ بھی کر ڈالا۔

”سوری آئی! میں بس آج کل میں چکر لگنے کی والی تھی۔ اصل میں امی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔ بس تب سے کہیں آنا جانا ہی نہیں ہوا۔“ تھکی، تھکی آواز اور آنکھوں کے گرو حلقے اس کے غم کی داستان شائل کو بتا رہے تھے۔

”ارے تو کم از کم نوں پر اطلاع تو کرو دیتیں مجھے کہ تمہاری امی بیمار ہیں۔ چلو مجھے اُن کے پاس لے چلو ان کی عیادت بھی کروں اور ان سے ملاقات بھی

وہ یہی اٹھوں سے رمل کی کسی ہوئی تصور کو نوں پر دیکھ، دیکھ کر زربل پڑھے جا رہا تھا۔ آخر کو ماضی کے ایک گم گشتہ قصبے کا موازنہ وہ اس معصوم لڑکی سے کیوں کر رہا تھا۔ یہ لڑکی جو کسی جھینے سی مقدس تھی اس کا تقابل وہ اس عورت سے کر رہا تھا جو عورت کے نام پر گالی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا مجھے کہ میں نے اسے اس جرم کی سزا دی جو اس کی ماں کا بھی نہیں تھا۔ آخر اتنا قصور کیوں ہو گیا تھا میں۔“ اگلے بل اس کا ہاتھ رمل کے نمبر پر ٹیکسٹ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا وہ اس کی کال کبھی انیڈ نہیں کرے گی۔ لیکن وہ بے خبر تھا اسے نہیں پتا تھا کہ جس وقت وہ اس کو ٹیکسٹ کر رہا ہے اسی وقت وہ اس کو کال کر رہی تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔

☆☆☆

رمل کی نظریں نی دی پر تھیں لیکن سوچیں کہیں اور کا سفر کر رہی تھیں۔ وہ سمیر کو اپنے اور ارمان کے بارے میں سب سچ، سچ بتا چکی تھی اور اس کو کہہ چکی تھی کہ اگر وہ اس کو ارمان کی سوچوں سمیت قبول کرنے کو تیار ہے تو اس کی طرف سے ہاں ہے، سمیر کو لگا ایک بل میں اس کی رگوں سے خون نچر گیا ہو، ایسا تو وہ خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ محبت میں شراکت مرد کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی بھی صرف عورت میں رکھی ہے، اسی لیے تو مرد کو بھی چار شادیوں کی اجازت ہے۔ سمیر کو تو کچھ لمحے لگے فیصلے کرنے میں.....

”میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں رمل، کاش تم یہ سب مجھے نہ بتاتیں تو کیا ہو جاتا..... ارمان تو یوں بھی تمہاری زندگی سے جا چکا تھا۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔ تو رمل چیخ پڑی۔

”کس نے کہا وہ جا چکا ہے، وہ میرے دل میں ہے، واماغ میں ہے، اس کی یادیں میری رگوں میں لہو بہن کر دوڑتی ہیں، اگر تم اعلیٰ ظرف نہیں ہو تو میں بھی منافقت بھری زندگی پر اہستہ جھنجھتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ بھی کسی اور کا کبھی نہیں ہوگا۔ محبت ایسی ہی ہوتی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ سرگزشت

شمارہ مارچ 2019ء
کی جھلکیاں

محسن اردو

وہ غیر مسلم تھ لیکن اس کا حکم تھا اسلامی کتب چھاپنے
سے پہلے تمام مزدور و مشور کریں۔ عبادت کی دنیا میں
انقلاب برپا کر دینے والے کا زندگی نامہ۔

شہنشاہ جذبات

قلمی دنیا کے ایک تابندہ ستارے کی داستانیں جسدِ

اتفاق

لوگ جسے بد قسمتی سمجھتے ہیں وہی ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے

کالا جادو

یورپ میں کالا جادو کس طرح مقبول ہوا، کچھ معلومات

کرب آشنائی

وہ سفید خون والے رشتے داروں میں گھری ہوئی تھی

ایک نوجوان

بہت سی جج بیانیوں، سچے قصے اور تاریخی حقائق۔

ایسی تحریریں جو سرگزشت کی پہچان ہیں

بس ایک بار سرگزشت پڑھ کر دیکھیں آپ خود

گردیدہ ہو جائیں گے۔

ہو جانے کی اسی بہانہ..... یہ تو آج میں تمہارا پیار
میں یہاں نہ آ جاتی تو تم نے تو ہمیں بالکل ہی پرایا ہی کر
ڈالا تھا رمل.....

”ہمیں آنٹی، ایسا کچھ نہیں ہے بس موسم بدل رہا
ہے تو بخار ہو گیا تھا۔ میں آپ کو بتا کر پریشان کیا کرتی،
چلیے میں آپ کو امی سے ملوانی ہوں۔“ شامل کو ساتھ لے
کر وہ بکھلے کمرے میں داخل ہوئی۔

”امی شاید واش روم میں ہیں، آنٹی آپ بیٹھیں میں
ابھی آتی ہوں۔“ وہ کمرے سے نکل کر پچن میں آئی تو پروین
دہان نہیں تھی۔ یقیناً نماز پڑھ رہی ہوگی سوچ کر وہ جلدی سے
ٹرائل سیٹ کرنے اور چائے کا پانی رکھنے میں مصروف ہو گئی۔

”ادھر کمرے میں سے رمل کے جاتے ہی بکھل واش
روم سے وضو کر کے نکلی تو سامنے صوفے پر بیٹھی شامل نے
سلام کرنے کو منہ کھولا تو آدھا سلام منہ میں ہی رہ گیا۔
”ادھر شامل کا سلام ادھر اوتا تھا ادھر بکھل کی آنکھوں میں بھی
ششاسانی کی چمک ابھری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی
طرف بڑھیں اور رُپ تپاک انداز میں گچھے لگ گئی تھیں۔

رمل نے جلدی سے کباب اور کنکش فرائی کیے۔
بکھل اور ایک پیس ٹرائل میں رکھ کر نافذ انداز میں ٹرائل
کا جائزہ لیا تو ہر چیز مکمل تھی۔ ٹرائل لے کر جب وہ بکھل کے
کمرے میں داخل ہوئی تو حیرانی سے دونوں خواتین کو
دیکھا جنہیں دیکھ کر لگتا تھا برسوں پرانی سہیلیاں ہوں، وہ
مسکراتے ہوئے۔

”مجھے پورا یقین تھا شامل آنٹی اتنی ہی فریڈی
ہیں، اب تک آپ کو دوست بنا چکی ہوں گی۔ اسی لیے
مجھے تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔“ وہ
بیتے ہوئے شامل کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بولی تو
شامل نے بھی محبت سے اسے گلے لگا لیا۔ اندر کے ملاں
زود موسم کی کٹھن میں کچھ امید کے بادل نظر آنے لگے تو
تینوں کی آنکھوں میں برسنے والی بارش کے قطرے بھی
جمع ہو رہے تھے۔

☆☆☆

”میں ایک بات سب کو بالکل صاف طور پر بتا رہی

... منہ پر سے ہاٹ سانس مہار کی گھر سے بیٹے کی بات
وہ بھی ماں ہو کر.....“ زریں پھوپھو جو مشعل کی بیٹی کو سلا رہی
تھیں شرارت سے ارمان کو دیکھتے گفتگو میں حصہ لیا۔
”واہ پھوپھو! آپ تو کمال کی چہرہ شناس ہیں۔“
منائل نے حیرانی سے منہ کھولا۔

”منائل میں سمجھی نہیں تو پتا ہوگا شمر..... (منائل کا
شوہر) نے مجھے بتایا کیا دکھایا تھا جب میں اس کے ساتھ
کلینک گئی تھی تو پتا چلا کہ ارمان میاں تو بڑھی پر گول گئے
کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی ہیں، بھی پھوپھو کو تو ز
کھلائے ارمان میاں۔“ پھوپھو نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔

”ارے پھوپھو آپ بھی ناں.....!“ ارمان نے سر
کھجایا لیکن دونوں بہنیں اپنی، اپنی جگہ سے اٹھ چکی تھیں
ہاتھوں میں ایک، ایک کیشن بھی تھا اور اب ارمان کو اس
کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ باہر کودوڑے لیکن یہ کہہ
ہرگز نہیں بھولا۔

”میری شادی ذرا جلدی کروادیں امی زریں پھوپھو
فیس بک والی پھوپھو کی طرح میری جاسوسی کر رہی ہیں، یہ نہ ہو
میری شادی درمیان میں رہ جائے۔“ وہ باہر کو لپکا، پیچھے
خواتین کی کلک کھلاہٹ کو بھی تو بچوں نے رونا شروع کر دیا۔

☆☆☆

ارمان کے ہونٹوں پر دھیمی مسکان تھی اور نظر ہاتھ
میں پکڑے قیمتی موبائل کی اسکرین پر تھی۔ وہ جو کافی دیر
سے دل کو دالہا نہ بیچ کیے جا رہا تھا ان کے جواب میں وہ
بس منہ چڑانے والے ایسوجی بھیج رہی تھی اور اب جبکہ
اس نے اس سے ملنے کے لیے ضد کی تو اس نے خوب
صورت نظم لکھ بیچی.....

ابھی وہ وقت نہیں آیا

تم کرنا تعریف جی بھر کر

میرے عارض پلکوں کی

کبھی رخسار کی جاناں

کبھی پھولوں سا انہیں کہنا

کبھی گھنیری زلفوں کی

انہیں تاگن بھی کہہ دینا

ہوں لڑن تک میں نے ہرے کے لئے میں کن مانی
نہیں کی نہ ہی مدخلت کی۔ لیکن ارمان کی شادی اگر ہوگی
تو صرف دل سے..... میں اس گھر میں کوئی اور بہو نہیں
لاؤں گی۔“ مشعل نے قطعیت سے کہا تو منائل اور مشعل
نے بھی ماں کی تائید میں سر ہلایا۔

”سن چھو! تجھے اتنی اچھی لڑکی تو گھاس بھی
نہیں ڈالتی یہ تو سمجھو تو تمہاری نیک بہنوں کی دعائیں
ہیں کہ گھر بیٹھے ایک بہترین لڑکی بیوی کی صورت مل رہی
ہے۔“ منائل نے اسے گل گو تنے سے بیٹے عبداللہ کو کھانا
کھلاتے ہوئے کہا۔ جو کھانا کم کھا رہا تھا اور گرا زیادہ رہا تھا۔
”اپنا چھو تو آپ کا بیٹا ہے اب آپ فیصلہ کر لیں
یا تو مجھے چھو کہہ لیں یا میری شادی کروائیں۔ اگر چھو کہہ
کر ہی شادی کروانی ہے تو اپنے اس صاحبزادے کی
کروادیں۔“ ارمان نے منہ بنا کر بھانجے کو دیکھا۔

”ارمان خرمے مت دکھاؤ اور ہمارے ارمانوں کا گلا
گھونٹنے کی کوشش مت کرو۔“ مشعل نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔
”اگر تم دل سے شادی کے لیے نہ مانے تو امی تو
تمہاری شادی کریں گی ہی نہیں اور ہمارے ارمان تو
دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ اکلوتے بھائی ہو کچھ
شرم کرو۔“ مشعل رو ہانسی ہوئی۔

”جی، جی بالکل! آپ کے کہنے، شرارے، غرارے
یہ سب آپ کے ارمان ہی تو ہیں جو الماریوں میں دھرے
ہوں گے اور میری شادی کے منتظر ہوں گے۔“ ارمان جو
پہلے ہی ماں چکا تھا اور روٹھے ہوئے صنم کو منا بھی چکا تھا۔
اب ماں بہنوں کو محض چڑا کر لطف اٹھا رہا تھا۔

کتنے جن کر کے تو دل کو اس نے منایا تھا۔ حتی کہ
ہاتھ پاؤں جوڑے اور کان تک پکڑے تھے۔ گول گئے
کھلائے تھے وہ بھی ریزمی پر کھڑے ہو کر اور خود بھی
زندگی میں پہلی بار کھائے تھے۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ کتنے
پاڑ پیلے تھے، اس نے دل سے معذرت کرنے اور اس کو
راہی کرنے کے لیے یہ تو ہی جانتا تھا۔

”ارے تم سب تو یونہی دل جلا رہی ہو، لڑکا تو
راضی ہے کب سے اس کی بی پھوپھو ہوں خیر سے، ماشاء اللہ

اپنے، اپنے سہماؤں کی جی، جی مہر تیار کر رہے تھے..... وہاں ارمان کی فہرست تو سب سے طویل تر تھی۔ اس لسٹ میں ایک وفاقی وزیر کا نام بھی شامل دیکھ کر عمر حسن کو تھوڑی بے چینی کا ہوا۔

”ارمان، سیاسی شخصیات کی شمولیت سے پروٹوکول کا مسئلہ ہو جاتا ہے بیٹا اور آپ نے تو ان کو نکاح پہ بھی مدعو کیا ہوا ہے۔“ انہوں نے کچھ فکر مند لہجے میں اس سے کہا۔

”نوباوا! وہ بہت ہی ساواہ انسان ہیں، پروٹوکول کیا ان کے ساتھ تو ان کا کوئی فیملی ممبر بھی شاید نہ ہو..... دراصل یہ ان ہی کی خواہش ہے میری شادی میں شمولیت کی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ناں ابراؤ میں وہ ایک ایکسڈنٹ میں شدید زخمی ہو گئے تھے تو میں ان کو بلڈ بھی دیا تھا۔ بس جب سے انہوں نے مجھے اپنا بیٹا بنالیا۔ ویسے وہ بہت اچھے انسان ہیں۔“

”اوکے صاحبزادے، تم نے انوائٹ کیا ہے تو یقیناً کچھ سوچ کر ہی کیا ہوگا۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

ارمان کے نکاح کا جوڑا ان کے رواج کے مطابق ارمان کی بہنیں اور پھوپھو لاری تھیں..... اور جوڑے کا تو محض نام ہی رہ جاتا تھا۔ دراصل اتنا تام جھام ہوتا تھا کہ حد نہیں..... سارے گھر کے قیمتی لباس؟ زیورات، دیگر تحائف، ارمان کے سرایلوں کے لیے بھی قیمتی گفٹ شامل تھے۔

اور آج ارمان دلا بھلا نور بنا ہوا تھا، پھولوں، خوشبوؤں اور روشنیوں سے سجا ہوا لان اپنی مثال آپ تھا۔ جگہ جگہ ستون بنا کر ان کو سفید پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ان پر رنگ برنگے بلب لگا کر روشنی کی گئی تھی۔ لان میں پھولوں کی بہتات تھی لیکن اس وسیع و عریض لان میں جگہ جگہ پھولوں سے سجے گیٹ بنے ہوئے تھے، بیچ میں مصنوعی فوارے تھے جن میں فوارے سے روشنیوں کا عکس تھا اور بیچ بیچ میں براؤنڈ ٹیبلو کو سرخ اور سفید امتزاج سے سجایا گیا تھا اور کناروں پر اسٹینڈ میں شمعیں روشن تھیں، لان کے بالکل سامنے سرخ و سنہری رنگ کے امتزاج کا بڑا سا اسٹیج سجایا گیا تھا۔ درمیان کی روش میں سرخ قالین تھا جس پر چل کر دولہا، دلہن کو اسٹیج تک آنا تھا۔

جی خوشبو سٹک پیسٹہ دینا کبھی آنکھوں کو جگنو سے کبھی کا جل کو بادل سے کبھی آنسو بنا دینا جگنو کا جسم کا جس قطرہ کبھی چمکتی کمر کو تم ہرن کی چال کہہ دینا لدی پھولوں کی ڈالی ہو یوں ہی سرگوشی میں کہہ دینا کبھی ناؤ بنالینا میری آنکھوں کی جھیلوں میں اترنے کو ہاں.....

سب باتوں کو دھرا نا محبت میں تم ڈھل جانا ہر دوری مٹا دینا مگر اتنا بتا دوں میں ابھی وہ وقت نہیں آیا ابھی محرم نہیں، ہم تم ابھی آداب واجب ہیں ابھی دوری ضروری ہے ابھی رشتہ اوصور ہے سب کہنا مگر ایجاب ہونے دو

لازم اسباب ہونے دو اس نے دل کے تصور کو آنکھوں کی چٹیلوں پر اتارا اور آنکھیں سکون سے بند کر لیں۔ کیونکہ ایجاب کا وقت دور کہاں تھا۔

☆☆☆

شادی کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں..... شاپنگ، ہال کی بکنگ لیکن عمر حسن کا خیال تھا کہ ہندی کی رسم سے پہلے قریبی دوستوں اور رشتے داروں کو ارمان ولا میں ہی مدعو کر کے لان میں ہی رسم نکاح کا اہتمام کر لیا جائے۔

شادی کی تقریب کے لیے گھر کے سب افراد

نکاح کے بعد دل کو اس طرح پر لایا جاتا تھا..... اس لیے گھر کے اندر دل کو جس جھولے پر بٹھایا گیا وہ جھولا بھی پھولوں سے لدا تھا اور کمر بھی بھر پور سجا ہوا تھا۔

زریں پھوپھو جو ابھی اپنی شہلی، نوکروں کی فوج اور پینڈے باجے کے ساتھ سب سے ہونے نوکروں کی قطار لیے جو نوکروں نے اٹھارے تھے بڑی شان اور راج و راج سے گیٹ میں داخل ہوئیں اور اندر آ کر چیزوں کو ترتیب سے رکھوانے لگیں۔

تھوڑی دیر میں ارمان ان ہی کی لائی کا مدار کارل والی بلیک شیر والی اور آف وائٹ پاچاہہ پہن کر کسی مغلیہ شہزادے کی آن بان کے ساتھ آج پر براہمن تھا۔ میروں رنگ کی منفرد سی پگڑی میں اس کی سرخ و سفید رعکت کھل رہی تھی۔ میر نے ارمان کی طرف دیکھا تو دل ہی دل میں ایک ملال سا جاگا لیکن جلدی سے اس نے رمل اور ارمان کی دائمی خوشیوں کی دل سے دعا کی۔

ارمان کے خاص مہمان علی حسن کے آنے کی اطلاع ملنے پر ارمان، عمر حسن، پھوپھا صاحب اور دونوں بہنویوں کے ساتھ، ساتھ بھل کے چچا بھی ان کے استقبال کو گیٹ پر آگئے تھے۔ سب نے علی حسن کا والہانہ استقبال کیا۔ علی حسن ہی کا انتظار تھا جو واقعی وعدے کے مطابق پروڈوکول کے بغیر آئے تھے، ذاتی گاڑی گاڑا ڈالہ ساتھ تھا۔

ارمان کا نکاح ہوا تو سبیل اور شائل دونوں ہی ایک دم سے پیار کرنے کو آگئے۔ فیصلہ مشکل تھا کہ دونوں میں سے کون..... پہلے پیار کرے.....

☆☆☆☆

علی حسن جو بھل کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ پہچان بھی چکے تھے اس وقت اغطر ابی انداز میں اپنی ٹھیکوں کو کھول اور بند کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت محض اسے چھو کے گزر گیا ہو، وہ تو ویسی ہی دلربا اور حسین تھی دل میں اتر جانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔ ہلکے گلابی سوٹ میں تازہ گلاب لگ رہی تھی۔ یہ عورت جو آج بھی ان کی بیوی تھی پر اس وقت کتنی اجنبی لگ رہی تھی۔ بھل نے ایک سرسری نظر مردوں کی ٹیکلو کی طرف

دیا تو جیسے سحر پھتا بیوں کی سی۔ اسے ایسے رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ اسے لگا جیسے وقت رک گیا ہے یا شاید پلٹ آیا ہے۔ درمیانی برس جو صدیوں کے برابر تھے..... ایک لمحے میں گزر گئے تھے۔ یوں لگتا تھا درمیان میں تو کوئی وقت آیا ہی نہیں تھا۔ یہ شخص جو چند قدم کی دوری پر بیٹھا تھا۔ وہ اس کا محرم تھا سب سے اپنا..... جس کی محبت اس کی رگوں میں خون کے ساتھ، ساتھ بہتی تھی، کبھی روٹھ جاتی تھی لیکن رخصت نہیں ہوتی تھی..... لیکن وہ کیسا اپنا تھا جس کے اپنے ہونے کا وہ کسی کو بتانے سے بھی قاصر تھی۔ اسی سوچ نے اسے ہوش کی دنیا میں لا پٹا۔

ارمان اب آج سے اتر کر سب سے مل رہا تھا۔ ارمان کو علی حسن کے گلے لگتے دیکھ کر بھل کی آنکھیں نم ہوئیں تو عمر حسن سے گلے ملنے کے منظر نے شائل کو رلا دیا۔ بے ساختہ بھل اور شائل نے خوشی سے لبالب آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور گلے مل کر مشترکہ خوشیوں کو بانٹ لیا۔ عمر اور علی آپس میں رکھی مبارک باد کے سلسلے میں گلے مل رہے تھے جبکہ بھل اور شائل کی مبارک باد میں کتنی آگاہی اور کون سی مشترکہ خوشیاں پوشیدہ تھیں وہ صرف وہی دونوں جانتی تھیں۔

سچ ہے کوئی نہیں جانتا مشیت ایزدی نے کب..... تارالعجب کی حیثیت سے رازوں کو پوشیدہ رکھنا ہے اور کب وہ ہر راز کو طشت از با م کرنے والا ہے۔ اس کی مصلحت وہ ہی جانتا ہے۔ انسان تو محض ایک خاک کی پتلا ہے جس کی ہر ڈور ہلانے پر اللہ کی ذات ہی قدرت رکھتی ہے اور اس نے لمحہ موجود کو اس بات کے لیے جن لیا تھا۔

سب کے سب حق وق کھڑے تھے جب ایک مفلوک الحال کریمہ چہرے والی بڑھیا علی حسن کے گریبان کو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ کسی کو بھی آگے بڑھنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی کیونکہ اس کے منہ سے نکلے الفاظ کوڑوں سے بھی بدتر تھے یوں لگتا تھا کہ اس بوڑھی جادوگر نے جادو کی چھڑی سے سب کو پتھر کر دیا تھا۔ (باقی آئندہ)

پچھی کا دن تھا۔ وہ آپس کی فائلز نیل پر پھیلانے سانسے لیپ ٹاپ رکھے کام میں مشغول تھا۔ لیپ ٹاپ پر مسلسل اس کی انگلیاں متحرک تھیں۔ ”شہر یار! تمہیں اب تنیدگی سے اس بارے میں سوچنا ہوگا۔“ حکیمہ بیگم لان میں قدم رکھتے ہی حکیمہ بیگم کی آواز پر شامکدہ کا پراٹھا پلٹنے ہاتھ تیز گرم توے پر لگا تھا۔ لیوں سے سی کی آواز نکلی تھی۔

”یا اللہ پاک! مجھے اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دے۔“ اس کی آنکھیں اشکوں سے بالاب بھر گئی تھیں اور سامنے کا منظر دھندلا سا لگتا تھا۔

”اماں جان! آپ مجھے کیوں مجبور کر رہی ہیں۔“ شہر یار بے بس سا بولا۔

”اللہ جانے ایسی کون سی محبت ہے۔ نہ جانے اس لڑکی نے کیا گھول کر پلادیا ہے۔ ایسی کیسی بیوی

میرے لیے خدائی کافی ہے

ریمسا نور رضوان



ابن جان! اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہوں۔“ شہریار نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔
 ”شہریار! بچوں کے بنا زندگی ویران ہوتی ہے۔“ حکیمہ بیگم دھیرے سے بولی تھیں۔
 ”اماں جان! شاملہ اور میں، ہم دونوں صحت مند ہیں۔ بس یہ اولاد دینا نہ دینا سب باری تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے جیسے چاہے نوازے۔ ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی ”کُن“ کے منتظر ہیں۔ اور ابھی تو ہماری شادی کو محض تین سال کا عرصہ گزرا ہے اسپتال جا کر دیکھیں لوگوں کو دس سال، بارہ سال بعد بھی اللہ پاک اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔“
 شہریار دس دفعہ کی کمی ہوئی بات و ہر ار ہا تھا۔

☆☆☆

”ہمارا بندھن
 کبھی تسبیح کو دیکھا ہے!
 سب ہی دانے الگ ہو کر بھی
 ہر دم ساتھ رہتے ہیں
 یہی تعلق ہمارا ہے
 بد ظاہر میں الگ ہوں لیکن
 ہم دلوں میں ساتھ رہتے ہیں
 سدا ایک دوسرے کے نام کی تسبیح کرتے ہیں
 اسی کو روح کا بندھن
 اسی کو چاہ کہتے ہیں

اسی کو دوستی اور.....

اسی کو ساتھ کہتے ہیں“

شہریار نے شاملہ کو وائس ایپ پر شاعری بھیجی تھی۔ شاملہ پڑھ کر مسکرا دی تھی۔
 ”ہیلو!“ کافی دیر گزرنے کے بعد شہریار کا پیج آیا تھا۔

آیا تھا۔

”ہولو۔“ شاملہ نے بھی شرارتی انداز میں لکھ دیا تھا۔

”اے لڑکی!“ ایسوجی کے ساتھ اسے پکارا گیا تھا۔

اس نے بھی کان والا ایسوجی بھیج دیا تھا۔

”شاملہ! تنگ نہ کرو یا۔“ وائس پیج موصول ہوا تھا۔

”میں نے کب کیا تنگ.....؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

شہریار نے اب ویڈیو کال کر لی تھی۔

”اماں جان! میں تو اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوشگوار زندگی بسر کر رہا ہوں۔“ شہریار نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے مسکرا کر کہا تھا۔
 ”شہریار! بچوں کے بنا زندگی ویران ہوتی ہے۔“ حکیمہ بیگم دھیرے سے بولی تھیں۔
 ”اماں جان! شاملہ اور میں، ہم دونوں صحت مند ہیں۔ بس یہ اولاد دینا نہ دینا سب باری تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے جیسے چاہے نوازے۔ ہم تو اس بات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی ”کُن“ کے منتظر ہیں۔ اور ابھی تو ہماری شادی کو محض تین سال کا عرصہ گزرا ہے اسپتال جا کر دیکھیں لوگوں کو دس سال، بارہ سال بعد بھی اللہ پاک اولاد کی نعمت سے سرفراز فرما دیتا ہے۔“
 شہریار دس دفعہ کی کمی ہوئی بات و ہر ار ہا تھا۔

”اے ہمارے دور میں اسپتال تھا نہ ہی میاں لگو بنے بیوی کے چیک اپ کروانے جاتے تھے۔ اب تو نیا ہی رواج چل اٹھا ہے۔ ہم تو واسیہ سے علاج کراتے تھے۔ ساس، نند، جیٹھانی، پڑوس کوئی بھی اس حالت میں سہارا بن جاتی اور مشکل وقت نکل جاتا۔ اب تو صبح اپائنٹ لو تو شام کو چیک اپ کروانے جاؤ۔ ساتھ میں میاں کا بھی چیک اپ، عجیب دور آگیا۔“

وہ عجیب انداز سے کہہ رہی تھیں۔ شاملہ ویسے ہی ان کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ بھی تو ان کی مرحومہ بہن کی بیٹی لیکن انہیں تو اپنی شایان شان بہو چاہیے تھی جو کہ شہریار کی ضد کی وجہ سے نہ مل سکی تھی۔ شاملہ، شہریار کی بچپن کی مانگ تھی۔ اور وہ اسے بچپن سے جانتا تھا۔

”اماں جان! زمانے کے انداز بدل جاتے ہیں وقت کا تقاضا ہے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔ وقت کی بات ہے آپ کے دور میں ایسا نہ تھا تو کسی کا قصور تو نہیں۔ آج کا دور ایسا ہے۔ ماحول کو دیکھ کر جدید تقاضوں کے حساب سے چلنا ہوتا ہے۔“ وہ مہذب سے انداز میں بولا تھا۔

”آج کی تعلیم یافتہ نسل نے تو بے شرمی و بے حیائی پھیلا رکھی ہے۔“ وہ اپنی بات پر ہی ڈٹی ہوئی تھیں۔

”شمارہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔“ وہ پراعتماد لہجے میں بولا تھا۔

”وہ تو ہو لیکن بھائی بھائی سے کہہ دیں گی کہ میں سارا دن آپ سے باتوں میں مصروف رہتی ہوں۔ گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔“ وہ تنکھرتھی۔

”شمارہ! بی بیو۔“ شہریار مسکرا کر بولا۔

”آپ کو نہیں معلوم کہ...“ وہ بری طرح لب بھینچتے ہوئے کچھ کہتے، کہتے رک گئی تھی۔

”شمارہ! شہریار خان! یہ ڈرنا اور ناچھو ڈو، جان شہریار جینا سیکھو۔“ وہ اذلی محبت بھرے انداز میں گویا ہوا تھا۔

شمارہ جھینپ کر ہلکا سا مسکرا دی۔

”دنیا کا کوئی بھی انسان لڑکیوں کو درپیش مسائل کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بن ماں باپ کی بچیوں پر آنے والی بھابیوں کس کس طرح ظلم و ستم روا رکھتی ہیں۔ یہ تو وہی جان سکتا ہے جو اس ظلم کو سہتا ہے۔“ وہ محض سوچ کر رہ گئی تھی۔ بولی کچھ نہیں۔

شہریار خان اور شمارہ دونوں خالہ زاد تھے۔ شمارہ اس کی بچپن کی ماگ، اس کی محبت تھی اور اب تو نکاح بھی ہو چکا تھا۔

”شمارہ! میں اماں جان سے رخصتی کے لیے کہتا ہوں۔ لیکن یہ اماں جان بھی ناں انہیں... تم میں عیب نظر آنے لگے ہیں۔ بہر حال میں انہیں راضی کر کے ہی دم لوں گا۔“

شہریار نے یک دم ہی ایک فیصلہ کیا اور اپنی بات منوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اور پھر محض ایک ماہ میں ہی اس کی شادی ہو گئی تھی۔ زندگی میں چاہنے والے ہم سفر کا ساتھ ہو تو ہر پل پھولوں جیسی خوشبو و زماہٹ بھرا ہوتا ہے۔ شمارہ کی بھی اذواجی زندگی پر سکون و شادماں سی گزر رہی تھی۔ شادی کو ایک

ساتھ کر رہنے کے بعد بیوی سوئی کودیہ کریمہ بیگم اب اسے مختلف ڈاکٹروں کے پاس لے جانے لگی تھیں اور اس کے تمام ٹرینٹ کے بعد ایک ہی بات سامنے آئی جسے انہوں نے دیدہ دلیری سے جھٹلایا تھا۔ حکیمہ بیگم کے من میں یہ بات کنڈلی مارے بیٹھی تھی کہ شمارہ بانجھ ہے۔ درحقیقت ایسا نہ تھا۔ وہ بانجھ نہ تھی بس اللہ پاک کے حکم کا انتظار تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی صحت مند تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ شاداں و مسرور تھے۔ بس حکیمہ بیگم ہی بچوں کی رٹ لگائے رکھتی تھیں۔ شمارہ کے دل پر کیا گزرتی تھی انہیں اس کا احساس تک نہ تھا وہ سرعام اسے بانجھ کہہ دیتی تھیں اور یہ کہتیں کہ وہ اپنے اکلوتے لاڈلے سپوت کی دوسری شادی کریں گی تاکہ ان کی نسل چلے۔ اس گھر کو وارث ملے۔ وہ لیوں پر قفل لگائے چپ چاپ ہر بات سنتی رہتی اور رب کی بارگاہ میں دعا کرتی ”اے میرے رب پہلا آسرا سہارا تو ہے تیرے بعد میرا شوہر میرا سائبان ہے۔ اسے سلامت رکھنا۔ میاں بیوی کا رشتہ سلامت رکھنا۔“ وہ ہمہ وقت دعاؤں میں مشغول رہتی تھی۔

☆☆☆

حکیمہ بیگم اپنی بات کسی طور منوانہیں پا رہی تھیں۔ وہ بیٹے کو ہر طرح سے قائل کرتی تھیں لیکن وہ بڑے خوب صورت انداز میں ان کی بات رد کر دیتا تھا۔ انہیں گھر کا سناٹا کھٹتا تھا۔ اتنے بڑے بیٹنگلے میں تین نفوس رہتے تھے وہ چاہتی تھیں کہ اس گھر کے سناٹوں کو بچوں کی قلکاریاں تو ڈریں۔ ان کی خواہش بھی ناچازہ نہیں تھی۔ اب انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ اس موضوع پر بات نہیں کریں گی۔

تو اب تھک ہار کر پڑوسن (حالیہ بیگم) کے ساتھ کسی پیر صاحب کے پاس جانے لگی تھیں۔

حالیہ بیگم کسی پیر صاحب کا ذکر بڑی محبت و عقیدت سے کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب نے تعویذ دیے تو اس کی شادی چند ماہ میں ہی ہو گئی۔ بیٹے کی جاب نہیں لگ رہی

تو اب تھک ہار کر پڑوسن (حالیہ بیگم) کے ساتھ کسی پیر صاحب کے پاس جانے لگی تھیں۔

حالیہ بیگم کسی پیر صاحب کا ذکر بڑی محبت و عقیدت سے کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب نے تعویذ دیے تو اس کی شادی چند ماہ میں ہی ہو گئی۔ بیٹے کی جاب نہیں لگ رہی

تو اب تھک ہار کر پڑوسن (حالیہ بیگم) کے ساتھ کسی پیر صاحب کے پاس جانے لگی تھیں۔

حالیہ بیگم کسی پیر صاحب کا ذکر بڑی محبت و عقیدت سے کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب نے تعویذ دیے تو اس کی شادی چند ماہ میں ہی ہو گئی۔ بیٹے کی جاب نہیں لگ رہی

تو اب تھک ہار کر پڑوسن (حالیہ بیگم) کے ساتھ کسی پیر صاحب کے پاس جانے لگی تھیں۔

حالیہ بیگم کسی پیر صاحب کا ذکر بڑی محبت و عقیدت سے کرتی تھیں۔ ان کی بڑی بیٹی کی کہیں شادی نہیں ہو رہی تھی۔ پیر صاحب نے تعویذ دیے تو اس کی شادی چند ماہ میں ہی ہو گئی۔ بیٹے کی جاب نہیں لگ رہی

تھوڑا پرسن ہو گیا ہے۔ یہ دیکھ کر معلوم ہوا کہ اب وہ ان کے سامنے کچھ نہ کہتی تھیں بس پیروں کے پاس چکر کاٹی رہتی تھیں اور گھر کے نہ جانے کتنے کونوں میں نہ جانے کس، کس چیز کے تعویذ دفن کیے ہوئے تھے اور نہ جانے کتنے ہی وہ شاملہ کو گھول کر پلا چکی تھیں کہ شاملہ ہی طلاق کا مطالبہ کر دے۔

☆☆☆

بہر حال دن گزرتے رہے دونوں کے معمول اپنی، اپنی جگہ جاری تھے۔ کچھ دنوں سے شاملہ ست، ست سی ہو رہی تھی، کھانا بھی نہیں رہی تھی اور ایک روز تو وہ چکر کر گئی تو حکیمہ بیگم جھٹ اسے قریبی لیڈی ڈاکٹر کے کلینک لے گئیں اور کچھ دیر کے ٹیسٹ کے بعد انہیں جو خبر ملی تھی تو وہ شاکڈر گئی تھیں۔ وہ ڈاکٹر سے الجھ رہی تھیں کہ یہ تو بانجھ ہے، یا ایسے کہنے سے بچ سکتی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دے رہی تھی۔ ”اماں یہ سب رب العالمین کے کام ہیں آپ خوش ہوں۔ وہم نہ کریں۔ بے شک اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

شاملہ اسپتال میں بیڈ پر لیٹی دل ہی دل خدا تعالیٰ کا شکر ادا کر رہی تھی۔ اس کے رخسار بھیسے ہوئے تھے۔ اس کی صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور قرآنی آیات کے وظائف کے پڑھنے سے اس پر رب کی رحمت شادی کے ساڑھے چار سال بعد مہربان ہو گئی تھی۔ اسے تو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی طبیعت میں تبدیلی کس وجہ سے آ رہی ہے۔ وہ جتنا شکر ادا کر رہی تھی آنکھیں اتنی ہی بھیگی جا رہی تھیں۔ واقعی خوشیاں، اولاد، عزت، دولت، شہرت، سب دینے والی ذات وہ رب کریم کی ہے ہم بندے ہی غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس سے کوئی لگاتے مانگ کر دیکھیں تو رب الکریم بندے کی سوچ سے بڑھ کر نوازتا ہے۔۔۔۔۔ بے شک وہ بڑا مغفور الرحیم ہے۔

کی تو جاب لب لکی۔ اسی طرح کے ہی مسائل بقول ان کے ان پیر صاحب نے حل کر دیے تھے۔ شاملہ بیگم کا ایمان اتنا کمزور تھا کہ اللہ پاک سے لو لگانے کے بجائے باباجی سے امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

باری تعالیٰ تو فرماتا ہے تم جیسا گمان کرو گے مجھے ویسا ہی پاؤ گے۔ وہ پیر صاحب کے آستانے پر بیٹھ کر اللہ پاک سے دعائیں کرتیں تو دعائیں مستجاب ہو جاتیں۔ انہیں کیا معلوم کہ ہر کام کا ایک وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر کر رکھا ہے۔ ان کی سوچ اس بچ پر نہ جاتی۔ پیر صاحب کے تعویذ تو دکھادا ہوتے جس سے کوئی اثر نہ ہوتا۔ انہوں نے تو باباجی کو اپنے حلقہ احباب میں اتنا بڑھا چڑھا کر بتایا کہ سب ہی ان کے پاس جانے لگے تھے۔ باباجی کی تو آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا۔ اب حکیمہ بیگم نے بھی سوچا کہ بچے کو دوسری شادی کے لیے رضامند کرنے کے لیے کوئی تعویذ لے لیتا چاہیے اور اس چکر میں نہ جانے کتنے ہی روپے انہوں نے برباد کر دیے اور ان کے تعویذ گنڈے سے کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا۔ حکیمہ بیگم ایک پیر صاحب کو چھوڑ دوسرے کے پاس جا رہی تھیں اور اپنے بیٹے کی خن حلال کی کمائی دونوں ہاتھوں سے جھلی پیروں پر لٹا رہی تھیں۔

☆☆☆

”شہر یار! اٹھے سحری کا وقت نکلا جا رہا ہے۔“ دونوں اولاد کے حصول کی خاطر یک شینے کا روزہ رکھ رہے تھے۔ انہیں کسی پارسا بزرگ نے بتایا تھا اور کچھ وظائف بھی پڑھنے کو دیے تھے اور یہ کہ وہ دونوں میاں بیوی چاند کی تیرہ، چودہ اور پندرہ تاریخ کو روزہ رکھیں اور عصر سے مغرب تک اسم الہی کا ورد کریں اور اس ورد پاک کو دودھ سے بھرے گلاس اور گھجوروں پر دم کر کے آدھا، آدھا دونوں میاں بیوی کھائیں گے۔ دونوں یہ عمل صدق دل سے کر رہے تھے۔

شاملہ باری تعالیٰ کی شکر گزار تھی کہ شہر یار صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا۔ انہیں لگتا کہ وہ اولاد کے حصول کے لیے وظائف پڑھ رہے ہیں تو حکیمہ بیگم کا مزاج بھی

عورت و ڈھال

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر بستی ہے... مگر یہی کمزور اور کم تر بستی صنف مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تبجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

شروع کر دیتا ہے۔ کھڑکی کو معلوم ہے۔ وہ ایک ڈھال کی طرح درستی کے چوکھٹے میں فٹ ہے۔... ساکت و جامد۔... بلے ٹوئیں معلوم کہ کھڑکی کے پیچھے اور کیا، کیا ہے۔ پر وہ یہ ضرور جانتا ہے کہ کسی، کسی کھڑکی کے کواڑوں میں جھریاں ہوتی ہے۔ جہاں سے جھانک کر پتا چلا جا سکتا ہے کہ کیا اور کتنا، کیسے اور کتنی آسانی سے مل سکتا ہے۔

عورت ایک کھڑکی کے مانند ہوتی ہے۔ ایک ہند کھڑکی اپنے پیچھے اندرون خانہ تمام راز و خفاپ کے رکھتی ہے۔ دیواروں کے نقش اور روغن کی چمک بھی، راہدار یوں کی لمبائیاں اور دروازوں کے قد و قامت بھی۔... مرد ایک بھوکے بلے کے مانند ہے۔ جو ہر کھڑکی پر اپنا منہ لگا کے بوسہ نکھتا پھرتا ہے پھر جہاں کہیں سے ماس کی باس اس کے تھنوں سے گمراہے وہیں بچے رگڑنا



گھڑی کو نہیں پتا کہ جھانکنے والا لگتا زور آور ہے پر بے
کوہتا ہے کہ کچھ کھڑکیوں کی کنڈیاں بہت کمزور ہوتی ہیں۔

☆☆☆

”امی.....!“ اندھیرے میں ابھرنے والی معصوم
سرگوشی بہت خوفزدہ تھی۔

”ہمم.....م.....م.....“ سرگوشی کا جواب بہت
میٹھاتا تھا۔

”ابو.....“ وہ رکی، چپکائی..... جیسے بولنے میں
کوئی امر مانع ہو۔

دو مہربان بازوؤں نے اسے خود میں سمیٹ کر
کچھ اور نزدیک کیا۔ اس کی ہمت بڑھی۔

”ابو..... آج بہت غصہ ہو رہے تھے۔“

”ہم.....م.....م.....“ ایک گہری سانس بولی۔

”ابو اتنا غصہ کیوں کرتے ہیں؟“

”وہ مرد ہیں ناں.....“

”تو کیا سارے مرد ایسے ہی غصہ کرتے ہیں۔“

”نہیں سب تو نہیں۔“

”پھر ابو.....“

”آج میری بیٹی بہت ڈر گئی کیا۔“ اس نے سر
جھکا کے اپنی بیٹی کا سہا ہوا چہرہ دیکھا۔

”مجھے تو ہر وقت ہی ڈر لگتا رہتا ہے ابو سے۔“

”ارے کیوں..... تمہیں تو کچھ نہیں کہتے وہ۔“

”پر آپ کو تو کہتے ہیں ناں..... آپ کو ان سے
ڈر نہیں لگتا؟“

”نہیں میری جان..... بس یہ سمجھ لو، جو ابو زیادہ
غصہ کرتے ہیں۔ وہ پیار بھی زیادہ کرتے ہیں۔“

”یہ کیسا پیار ہے؟“

”نکھی گڑیا کو یہ پیار کا انداز نہ بھایا نہ سمجھا آیا۔“

”آپ کیوں پریشان ہو۔ آپ کے پاس تو میں ہوں ناں!“

اس نے بیٹی کو خود سے لپٹا کے ایک محبت میں بھیجا

بوسہ اس کی پیشانی پہ رکھ دیا۔ گویا وہ اس کی ڈھال تھا

جس کی آڑ میں گریبانے سکون محسوس کیا۔

☆☆☆

سالار حسن اور سامعہ کی شادی، ایک دور کے
عزیز کے توسط سے طے پائی تھی۔ دونوں میں عمر کا
تفاوت بہت زیادہ تھا سالار، سامعہ سے عمر میں کم و بیش
پندرہ سال بڑا تھا۔ اور فقط سترہ برس میں سامعہ کی شادی
نکھی بوجھ کو اتار بیٹھنے والا معاملہ تھا۔ ایسی بالی عمر میں
تیس سالہ مرد اور وہ بھی ایک بچی کا باپ کس لڑکی کا
آئیڈیل ہو سکتا تھا سوا اس کا بھی نہیں تھا مگر زندگی میں
آئیڈیل کب ملتے ہیں۔ زندگی میں تو حقیقت ملتی ہے
اور حقیقت یہ تھی کہ سالار ہر لحاظ سے اچھا ہونے کے
باوجود کہیں نہ کہیں برا بھی تھا۔ کہیں نہ کہیں برا ہونے کی
عادت ہی اس کی اچھائیوں کو کھارہی تھی لیکن اسے اس
کا ادراک نہیں تھا۔ اس کی پہلی شادی جس وجہ سے بھی
ختم ہوئی اول آخر گڑیا کی ڈتے داری اسی پہ آن پڑی
جسے فوری طور پر منہج کرنے کے لیے جو بھی اور جیسی بھی
کی بنیاد پہ اس نے سامعہ کو اپنی زندگی میں شامل کیا
تھا۔ ورنہ شاید وہ اپنے سامنے بچی کی طرح تلکٹی اس لڑکی
کے لیے انکار ہی کر دیتا۔

سامعہ کی اوپر تلے چھ بہنیں تھیں۔ جن کے
پھاری بوجھ تلے ماں باپ کو سانس بھی رک، رک کر آتی
تھی۔ ایسے میں کھاتے پیتے، خوش شغل، پڑھے لکھے
داماد کا رشتہ ایک بیٹی کے دم چھلے کے ساتھ کوئی اتنا برا
بھی نہ تھا۔ اور برا تو کچھ بھی نہیں تھا یا شاید قسمت ہی
ماٹھی تھی کہ سامعہ کو جب سب سیٹ ہونے کی شنوائی ملی
تب پہلی بار اس کی ذات کے بندر وازے کسی پرانی،
انجیان، ٹانائوس دستک سے آشنا ہوئے۔ دستک اتنی
زوردار تھی کہ اس کی پوری ذات ہی تھرا کر رہ گئی۔

☆☆☆

اور آوارہ، بھوکے نذیرے بٹے جانتے ہیں کہ کون
سی کھڑکی کمزور ہے کون سا دروازہ صرف دکھانے کو بھڑا ہوا
ہے۔ بچوں کا ذرا سا دباؤ کاواٹ پائوں پاٹ کھول دے گا۔
وہ دروازہ بھی کمزور تھا۔ چونکھٹ سے بس نام کو جڑا
ہوا۔ دکھاوے کو بھڑا ہوا۔ ذرا سے دھکے سے کھٹا چلا گیا۔

☆☆☆

دل کی دھڑکن اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

درمیان کے چہرے پہ پیر رکھتے ہی اس وجود میں حرکت ہوئی۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ اور اتنی ہی تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

وہ اپنی جگہ جم سی گئی۔ بالکل ایسا لگا جیسے وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بس میں کر لے گا۔ قریب تھا کہ اس کی چیخ ہی نکل جاتی لیکن اسی وقت بالکل اسی وقت کوئی بے حد تیزی سے بیڑھیاں اترتا ہوا ان کے سر پہ آپہنچا تھا۔

اس کی طرف بڑھنے والا ایولا ایک سیکنڈ میں زن سے اس کے برابر سے نکل کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے آنے والے کو بغور نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس سے پہلے کو.....

☆☆☆

گڑیا کے ساتھ سامعہ کی توجہ و محبت کی ایک ہی وجہ وہ محرومی تھی جو اسے اپنے ماں، باپ کے گھر جھینٹی پڑی۔ چھ بہنوں کے بعد منٹوں مرادوں سے دنیا میں آنے والا اکلوتا بھائی ہی اس کے ماں باپ کی اصل دنیا تھا۔ باقی بڑی اولادیں انہیں بھلا کیا فائدہ دینے والی تھیں۔ بلکہ اور اوپر سے شادیوں کی فکریں اور جہیزوں کے خرچے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کرنے والے تھے۔

اس کے ماں، باپ کی بھی وہی روایتی سی فرسودہ سوچ تھی جو معاشرے کے ہر غریب ناخواندہ ماں، باپ کی ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے۔

اوپر تلے پیدا ہونے والی بیٹیوں کے بوجھ سے جھکتے سر اور کمر..... وقت سے پہلے بالوں میں اترتی چاندی، ضرورت سے زیادہ اور وقت بے وقت کھایا جانے والا ترس اور بھول کی طرح چھیتی ٹھارت..... ماں، باپ کو اس حاشیے سے آگے کچھ سوچنے کی اجازت دیتے ہیں اور نہ ہمت، بیٹی، بوجھ..... بیٹا بازو.....

سامعہ بھی انہی جہلوں کی ماری، دل میں بہت پہلے سے تہیہ کیے بیٹھی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کو کبھی ایسے بد صورت، نا انصاف رویے کی بحیثیت نہیں چڑھائے گی۔ کبھی بوجھ کی طرح سر سے اتار کر نہیں پھینکے گی جیسے اس کے ماں، باپ نے اسے ڈھو دیا اور سب سے بڑھ

سرو دھندلا سیرھیوں پہ دن میں بھی چوڑی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس نے ذرا کی ذرا رک کر اپنے پیچھے دیکھا۔

”ای۔“ ایک نرم اور قدرے سہمی ہوئی سی پکار بے آواز لبوں پہ آگے دم توڑ گئی۔

اوپر کی سیرھیوں سے کوئی تیز، تیز اترتا نیچے آ رہا تھا۔ اس نے آخری زینے پہ براجمان سیاہ ہیولے کو دیکھا۔ اندھیرے میں حرکت کرتا ہوا ایک ننھا سا شعلہ اس کی مصروفیت کا گواہ تھا۔ اس کے اندر ہمت نہیں تھی کہ خود سے قدم بڑھا کے نیچے چلی جاتی۔ جیسی اوپر سے آواز گونگی۔

”بیٹے آپ چلو گاڑی میں، میں آ رہی ہوں کچھ بھول گئی ہوں اوپر۔“

نیچے آتی سامعہ اب اوپر ہی رک کر اسے کہہ رہی تھی۔ وہ نیچے کھڑی یہ سن کر بھی اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھی۔ اسے سامعہ کا انتظار تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی۔

زینے کے وہ چند قدمچے پار کر کے دوسری طرف مڑنا، گڑیا کے لیے آگ کا سمندر پار کرنے جیسا ہی تھا۔ ہیولے میں کوئی حرکت نہیں تھی لیکن سامعہ کی آواز نے اس میں جان ڈال دی۔ اس نے مڑ کر گڑیا کو دیکھا۔

نیم اندھیرے میں بھی وہ جیسے اس کی چمکتی آنکھوں میں سے جھانکتے اس عجیب سے احساس کو پڑھ سکتی تھی۔ اس نے بے ساختہ اپنی نظریں جھکا کے ان سے باہر جھانکتا خوف چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں اترتی لرزش کا بھرم بھی اسی ڈوبی، ڈوبی روشنی نے رکھا تھا۔ اس نے گہری سانس لے کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ وہ وجود جو اسے سیرھیوں کے آخر میں بیٹھا کوئی بھوت دکھ رہا تھا، اب واپس گردن موڑ کر سابقہ مشغلے میں مصروف ہو گیا۔

سامعہ کا انتظار ہمیں رک کے کرنا بے وقوفی تھی۔ گڑیا کو نہیں بتا تھا، وہ اوپر کیا چیز بھول آئی تھی..... اور اسے ابھی کتنی دیر لگتی تھی۔ اس نے پھر خود کو سنبھالا دیا اور بے حد آہستگی سے قدم، قدم اترتی اس ہیولے کے برابر تک پہنچی،

موسیقی نے سہاں باندھ رکھا تھا۔ بڑے سے لاؤنج میں کوئی مجبور قص تھا۔

اس نے دروازے کی جھری میں سے جھانک کے شباخت کا مرحلہ چوری چھپے طے کرنے کی کوشش کی۔
مورنی..... نہیں..... مورنی ہوا کے دوش پہ ایسے چکر نہیں کھاتی تھی۔

پری..... نہیں، پریاں از سکتی ہیں لیکن ایسے بل کھا، کھا کے سیدی نہیں ہوسکتیں.....

تھوڑی دیر وہ یونہی رقص کرتی بل کھاتی اس عورت کو دیکھتی رہی جو کم از کم اس وقت اس زمین کی نہیں لگ رہی تھی۔

سانچے میں ڈھلا جسم، بے حد اجلا اور بے وارغ تھا۔ جسم سے چپکے ہوئے کپڑے خوب صورت شیب و فراز کو یوں واضح کر رہے تھے گویا آج سے پہلے کبھی ایسا خوب صورت وجود و حرکتی نہ تھا۔

کالی آستینوں میں لپٹے ہوئے ہاتھ بل کھاتے ناگوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ پیر کبھی اٹھتے، کبھی زمین پہ نکتے اور کبھی بچوں کے بل معلق ہو جاتے۔ اس لہراتے جسم کے نچلے اور اوپری وڑھڑ میں الگ، الگ طرز کی حرکات دسکنا تھیں۔ کبھی اگلا حصہ ساکن تو پچھلا متحرک اور کبھی اس کے متضاد..... پھر بھی پورے وجود میں ایک عجیب سا آہنگ تھا..... ربط تھا ہنسنا تھا۔

وہ سانس روک کر سفید غرطی انگلیوں والے ہاتھ، سفید پنڈلیوں اور آنکھیں جھپکے بنا تپکی کر کو دیکھ رہی تھی۔ موسیقی تھی تو اس طرز کی جیسے اسی رقص کے لیے بنائی گئی ہو اور وہ رقص تھا تو اس انداز کا گویا اس ساز کو سن کر ہی ایجا و کیا گیا ہو۔

اس پورے منظر میں ساکن اور متحرک تمام جاندار اور بے جان چیزوں کے درمیان ایک وجوہ ایسا بھی تھا جو تھا تو جاندار لیکن اس وقت بالکل بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

آنکھوں میں سرور، چہرے پہ غرور اور لبوں پہ داو ویتی مسکراہٹ، جو قاصدہ کے کن اور مہارت کو عروج پہ لے جا رہی تھی۔ ساز میں تیزی آ رہی تھی اور مجبور رقص

کر بیٹے کے چکر میں بنیوں کی لائن نہیں لگائے گی۔ میزنگ سے آگے اسے پڑھنے نہیں دیا گیا۔
ووستیاں، سہیلیوں کا کوئی تصور نہ دیا۔ چھوٹے سے گھر کی جوتم بیزار سے، اس سچے بنے خوب صورت فلیٹ میں آ کر چند دن تو زندگی بڑی سہانی ہی لگی تھی۔

گڑیا بے حد فرمانبردار اور من موہنی صورت کی بچی تھی۔ اس کی گنتی جلدی اس سے کتنی گہری دوستی ہو گئی اسے خود بھی پتا نہ چلا۔ بس کوئی بگاڑ تھا تو وہ سالار کا مزاج..... جو بیس برس میں ازدواجی زندگی کے جھگڑوں سے نمٹنے، نمٹنے چونسٹھ سال کا ہو گیا۔

سامعہ کی باتوں میں، اوادوں میں بانی عمر کا بائگن جھلکتا۔ اس کا پچھلی ڈال سا جسم بل کھاتا، گھر میں یہاں وہاں گھومتا پر سالار کو دکھائی نہ پڑتا۔ وہ اپنے شوہر سے جس محبوبانہ قسم کے رومان آمیز سلوک کی متقاضی تھی۔ منہ پھاڑ کر اس کا مطالبہ تو نہ کر سکی البتہ بہک ضرور گئی پھر بیوی، خادمہ، خدمت گزار کے لیلیوں سے الگ کر کے جس نے بھی سب سے پہلے اسے اس کی ذات کا مان بخشا، اسی کی سمت کھینچتی چلی گئی۔ وہ قصور وار تھی کیونکہ کبھی تو وہ بھی سب کچھ ہی تھی۔ سچ اور غلط اپنے تمام تر ابہام اور ان کی تشریحات سمیت اس پر بھی اتنے ہی واضح تھے۔ جتنے کسی بھی شادی شدہ عورت پہ ہوتے ہیں۔ اور وہ شاید اتنی قصور دار بھی نہیں تھی کیونکہ اس کے چاہے جانے کے جبلی اور فطری تقاضوں کو پورا کرنے میں سالار نا کام ہو گیا۔ اس نے سترہ سال کی... نا بچہ لڑکی کو ستائیس تو کیا۔ نینتیس سالہ تجربے کا رعبور پہلے دن سے ہی سمجھ لیا۔

البتہ اس سمجھنے اور نا سمجھنے کے بین، بین گڑیا پر سارہ کی توجہ اور التفات چٹا رہا۔ جو گڑیا کا حق تھا وہ اس نے اسے بخوشی دیا۔ لیکن اپنا حق صحیح جگہ سے لینے کے بجائے جہاں سے ملا وہاں سے وصول کر لیا۔
اور یہیں سے غلطی کا آغاز ہوا۔ یہیں سے بگاڑ کی ابتدا۔

☆☆☆

گھر کی خاموش فضا میں ایک خاص طرح کی

ابھی اسے یہ ڈاکس کسی اور کو بھی دکھانا تھا۔

☆☆☆

”آپ کیا بھول گئی تھیں، جو آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔“ گاڈی میں اس بیوے سے بچنے پر اس نے سکون کی سانس لی پھر پوچھا۔

”وہ میں اپنا آئی ڈی کارڈ اندر ہی بھول آئی تھی پھر خیال آیا ایسا نہ ہو وہاں ضرورت پڑ جائے۔“ وہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ بند کرتے ہوئی تھوڑی دیر باتیں کرتے ہوئے اس نے یونی پاؤچ کھولا تو اس کا آئی ڈی کارڈ اوپر ہی تھا۔

باقی تمام وقت الجھی، الجھی رہی۔ کارڈ کی ضرورت پڑی نہ وہاں ذکر نکلا۔ اس کا مارشل آرٹس انشٹیٹیوٹ میں اینڈ مشن ہو گیا۔

یہ اینڈ مشن ہی اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ کوئی ایسی مار و حار ڈالی لڑکی نہیں تھی۔ وہ تو دبو، ڈرپوک اور بزدل قسم کی لڑکی تھی۔ پتا نہیں اس کی ماں کو اسے اینڈ مشن دلانے کی کیا سوچھی۔ خود ہی فیصلہ کیا اور اس کے باپ سے منوانے کے لیے ڈٹ گئی۔ حالانکہ یہ بات منوانا آسان نہیں تھا۔ وہ خود کون سا راضی تھی لیکن.....

”تم بہت ڈرپوک ہو گڑیا۔ میں چاہتی ہوں تم تھوڑی اسٹراٹجک بنو۔ اور ایسے گھر میں بیٹھ کر تم بالکل ہی دبو ہو جاتی رہو۔“

اور بہت سی باتوں کی طرح اسے اس بات کی بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ بھلا اس کے بزدل ہونے میں برائی کیا تھی۔ کتنی لڑکیاں جو اپنے گھروں میں رہتی ہیں ڈرپوک ہی ہوتی ہیں اور وہ تو خود کا کردیج کو کتنی بارتقہ اجل بنا چکی تھی۔ اس کے خیال میں اتنی بہادری کی کافی تھی مگر اب سامعہ نے اسے بہادری کی نئی ڈیفینیشن سے متعارف کروا دیا تھا۔

وہ خود بھی اس نامی گرامی ادارے سے رقص سیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کی اس وسیع انٹنٹری پہ جتنی بھی حیرت ہوتی کم ہی تھی۔

ایک بات طے تھی۔ کئی سالوں کی بے زبان

وجود میں اسے قدم تیزی سے دائیں بائیں بڑے سے کمرے کے طول و عرض میں یہاں وہاں تھرک رہے تھے۔

سانے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے، ہاتھ سینے پہ باندھے جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس کھڑا تھا اور گویا پورا جہاں موجود ہو۔

دفعتاً میوزک ہلکا ہوا، رقص کرتے وجود نے تین چکر کھائے، چکراتا ہوا وہ دیوار کے پاس گیا ٹیک لگایا ہوا شخص سیدھا ہوا۔ میوزک دھیمہ ہوتے ہوتے اچانک رکا۔ ناچتے ہوئے وجود نے رک کر اپنی بانہیں پھیلائیں اور ایک عجیب ناز سے بھرے انداز میں وہ اس قدر آواز دے کر ہول میں بھول گیا۔ اس شخص نے بڑے موقع سے اس کو تھام لیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فضا میں کھلکھلاہٹ ابھری اور چاروں اور پھیل گئی۔ اس نے جس طرح دروازے میں جھری کھول کر جھانکا تھا اسی انداز میں آہستگی سے بند کر دیا۔

اس کے اپنے لبوں پہ بھی مسکراہٹ تھی۔ اسے ان دونوں پر عجیب طرح کا فخر ہوا۔ وہ دونوں اس منظر میں کتنے مہمل تھے۔ ایک اس کا باپ اور دوسری اس کی ماں.....

”بس بھی کرو، تم نے تو اپنے آپ کو بالکل ہیرو دیکھ ہی سمجھ لیا ہے۔“ بازوؤں میں تھا مے وجود کو چھوڑ کر وہ کچھ جھینپا، جھینپا سا بول رہا تھا۔

”تو..... کیا میں لگ نہیں رہی تھی ہیرو دیکھ جیسی خوب صورت.....“ اس نے پھر ایک ادا سے اس کی طرف دیکھا۔ جواباً وہ مسکرایا۔

”اچھا شوق پورا ہو گیا ہو تو پہنچ کر تو کھانا ملے گا آج؟“ اس کے ہاتھ، قدم سب کچھ ست پڑ گیا۔

”ایک لفظ..... تعریف کا ایک لفظ تک نہیں..... کیا ہوا جو میں ڈانس کر رہی تھی۔ بیوی ہوں تمہاری کوئی غیر تو نہیں۔“ دل میں سر اٹھاتے شکوے کو دباتے ہوئے اس نے سانے رکھا موبائل اٹھایا اور اپنی ویڈیو کو محفوظ کر لیا۔

خدمت کے بعد سامع نے اپنے توبہ کے دل میں ای
جگہ تو بنائی تھی کہ اس سے اپنے مطالبات کسی حد تک
منوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

اس کے رخص اور گڑیا کے مارشل آرٹس کا قصہ بھی
ایسا ہی تھا۔ کئی دن کی بحث اور روٹھنے منانے کے بعد
یہ نوبت آئی تھی۔

گڑیا کو اپنے باپ سے اس سخاوت کی امید تو
نہیں تھی لیکن سامعہ کا جیت جانا اس بات کی گواہی تھا
کہ اس نے اپنی خدمت سے بالآخر اس گھر میں قدم
جما ہی لیے تھے۔

کھاتے پیتے لوگوں کا علاقہ تھا۔ جم، فٹنس،
دوسرے شارٹ کورسز کے انسٹیٹیوٹ، کالج، یونیورسٹی
اور پڑھائیاں لکھائیاں اکثر گھروں میں چلتی رہتی
تھیں۔ اس لیے ان ماں بیٹی کا ایڈمشن بھی کوئی بڑی
بات نہیں تھی۔ بڑی یا چھٹی کی بات تھی اس کے باپ کا
مان جانا اور یہ یقیناً سامعہ کی ان سالہا سال کی محنتوں
کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ جس کا وہ خود کبھی تصور بھی
نہیں کر سکتی تھی۔

اس کی زندگی کی کہانی شروع ہی سامعہ کی آمد
سے ہوئی۔ سگی ماں کون تھی کہاں تھی اور وہاں کیوں نہیں
تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، اس بارے میں اس کا
ذہن خاموش تھا۔ سامعہ کی آمد سے پہلے کا اگر اسے کچھ
یاد تھا تو صرف اپنے باپ کا چٹکھاڑتا ہوا وجود..... اس کا
غصہ جیسے ایک شعلہ تھا جو راکھ تلے دبائے سلسل سلگتا رہتا
اور ہل میں بھڑک اٹھتا۔

وہ خود ایک سکڑی، سمنڈی ڈری، ہنسی پٹی تھی۔ ہنسنا نہ
بولنا نہ اپنے جیسے بچوں کی طرح ضدیں نہ کوئی لاڈ.....

اس کی دہائی دہائی شخصیت کو دن رات کی محنت
سے اگر کسی نے سجایا سنوارا تھا تو وہ بھی سامعہ..... اس
کی غنی ماں.... نے جیسے خود پہ لگا سوتیلی کا لیبل کھرچ
ڈالا تھا۔ کسی کو یاد بھی نہ تھا کہ سامعہ اور گڑیا میں کوئی
سویتلا رشتہ ہے۔ وہ ایک دوسرے کا سایہ بن چکی تھیں
بلکہ وہ تو گڑیا کی ڈھال تھی۔ شاید اس کی ایک بڑی وجہ

گڑیا کے بعد اس کے کسی اور بھائی کا دنیا میں نہ
سکتا بھی تھی۔ سامعہ کے دل میں اس بات کی نشی
حسرت تھی اس کا اندازہ اسے کبھی نہیں ہو سکا کیونکہ
سامعہ نے اس کے سامنے کبھی اپنی طرف سے ایسی کسی
خواہش یا حسرت کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں البتہ سامعہ اور
سالار کے درمیان کبھی کوئی بات ہوئی بھی تو سامعہ نے
گڑیا کو اس کی ہوا نہیں لگنے دی۔ وہ اپنے اور سالار
کے معاملات سے گڑیا کو بڑی حد تک دور ہی رکھتی تھی۔
وجہ وہی تھی..... سالار کا مزاج جو اگر بگڑ جاتا تو اس کی
زد میں کون، کب اور کس حد تک آ جاتا، اس بات کا
سالار کو کبھی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

سامعہ نے ان کی زندگیوں میں آکر بہت کچھ
بڑی حد تک بدل ڈالا تھا بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ سنوار
ڈالا تھا تو چنداں غلط نہ ہو گا مگر کچھ چیزیں اب بھی اپنی
جگہ پہ پوری شد و مد سے قائم تھیں۔ جن میں سے ایک
سالار کا غصہ تھا تو دوسری اس کی بزدلی..... جس سے وہ
چاہے کچھ بھی چھٹکارا نہیں پاسکتی تھی۔ سامعہ اس کو اس خامی
سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ مارشل آرٹ انسٹیٹیوٹ سے
ایڈوائس کورس کے بعد کو ایجوکیشن کالج میں داخلہ بھی
اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

سال پہ سال گزرتے گئے۔ وقت کا پیچھے اپنے پروں
سے کتنے ہی نئے رنگ پھینکتا ان کو رنگتا، اڑان بھرتا چلا گیا۔

☆☆☆

تینتی دوپہر کی بھید بھری تنہائی میں اسے اچانک ہی
کسی ناخوش احساس نے چونکایا تھا۔ کمرے کے باہر وہ
سالار کی آواز ہی تھی جو بند دروازے کی رکاوٹ کو عبور کرتی
ہوئی اس تک پہنچ کر اسے سوتے میں ہوشیار کر گئی تھی۔

صاف اور واضح الفاظ تو سمجھ نہیں آ رہے تھے البتہ
یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے آج پھر کسی بات پہ
ٹپش پڑھا تھا۔

اس کا دل یک دم تاسف میں گھر گیا۔ وہ شعور کی
اتنی سیزھیاں پھلانگ چکی تھی کہ اب اسے کبھی اپنی
ماں کے بے ضرر وجود پہ ترس بھی آنے لگتا تھا۔ ہلکی

غزل

بادل ہوں تو سرسرائی ہوا گدگدائے مجھے
نکل کے بر سے بوندوں سے گدگدائے مجھے

بن کے برسوں ساون کی ایک لمبی جھڑی
خشک مٹی ہوں نم ہوا آ کے گدگدائے مجھے

ہوں اگر خوشبو بکھرا دے ہواؤں میں یونہی
ہوں جو غنچہ تو ہر تھلی گدگدائے مجھے

بن کے گر گھاس بچھوں سبز غالیچہ سالکوں
اوس میں بھیکے ہر صبح گدگدائے مجھے

ہر اماوس میں بھی نکلے وہ قمر بن جاؤں
بن کے چاندنی کانفوں چھاکے گدگدائے مجھے
شاعرہ: طیبہ غفر مغل، راول پنڈی

اس کی سبک بہتی ذہنی رونے زبردست جھٹکا
کھایا۔ آواز بلند تھی اور اتنی بلند تھی کہ کدروں کے بند
دروازوں میں دراڑیں ڈال گئی تھی۔

وہ ڈر کے مارے وہیں اچھل کے رہ گئی۔ خوف
سر سے پاؤں تلک اس کے وجود سے سرسرا ہوا نکلا۔
”جھوٹ..... سب جھوٹ..... بکواس..... اپنا
منہ بند کرو.....“

اسے کچھ چڑھنے لگی۔ اس نے باپ کو اس سے
پہلے بھی بے شمار بار غصے میں دیکھا تھا۔ ان کی آواز بھی
سنی تھی مگر آج..... آج کچھ تھا اس آواز میں..... جس
نے برسوں بعد اسے اس طرح خوفزدہ کیا تھا جیسے وہ کبھی
بچپن میں ہو جایا کرتی تھی۔

”یا اللہ.....“ کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے بے حد
آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔

آواز میں منمنائے کے صفائیاں پیش کرتی عورت اس ماں
سے کتنی مختلف تھی جو اس کی ہمت بندھاتی اسے روزنت
نئے چیلنجز کا سامنا کرنے یہ اسکا ہی تھی۔

گزرنا اسکول سے میٹرک کے بعد اس نے سامعہ
کے کہنے پہ پی کوا بکچیشن میں انڈیشن لیا تھا۔

دو سال ہو گئے تھے وہاں اور اب وہ پہلے کی طرح
بات بات پہ گھبرا جانے والی بچی نہیں رہی تھی۔ وہ بہت
بدل گئی تھی، بے حد خود اعتماد ہو گئی تھی۔ اپنے کالج کے
تقریری مقابلوں میں حصہ لینے لگی تھی۔ گوکہ میٹ ڈیپٹر
نہیں تھی لیکن اس کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ اب کراؤڈ کا
سامنا کر سکتی تھی۔ اسپورٹس میں بھی اس کا نام تھا۔ لڑکوں
کو دیکھ کر پہلے کی طرح اس کے سینے نہیں چھوٹتے تھے۔

اپنے بچپن میں وہ جس نام نہاد ہیولے سے خوف
کھاتی تھی وہ کب کا وہاں سے شفٹ کر گیا تھا۔ اب
اس بلڈنگ میں کوئی بندہ ایسا نہ تھا جس کی موجودگی
اسے آتے جاتے ہر اسال کرتی اور یہ سب سامعہ کی
وجہ سے ممکن ہوا تھا لیکن سامعہ..... کبھی، کبھی اسے لگتا وہ
اول روز سے اس گھر میں اسی مقام پہ کھڑی تھی جہاں
سے اس نے اپنا ازدواجی سفر شروع کیا تھا۔ سالار کی
بیوی کی حیثیت سے معاشرے میں اس کا مقام اور
عزت سالار کے ہی ہاتھوں خاک میں مل جاتی تھی۔

اس کا دل کیا کہ جائے باپ کو روکے یا کچھ بھی نہ
کہے بس اسے اپنی موجودگی کی خبر دے دے تو شاید اس
کی تیزی سے چلتی زبان کو جوان اولاد کا لحاظ آجائے۔
وہ خیال کر کے ابھی بھی مگر پھر کسی خیال نے
اسے تھام لیا۔ ہو سکتا ہے سامعہ کو یہ بات پسند نہ آئے۔

کچھ معاملات میں اس نے اول روز سے اسے
دور، دور ہی رکھا تھا۔ گڑیا کو اب یہ بات عجیب محسوس
ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا ایسا کر کے سامعہ اسے گھریلو
الجھنوں سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ جو یقیناً صرف اور
صرف اس کے باپ کے حوالے سے ہی ہو سکتی تھیں۔

بھلا اس کے علاوہ اور کیا.....

”بکواس بند کرو.....“

”اوہ.....“ حیرت کی زیادتی سے اس کے روتے کھڑے ہو گئے۔

سالار، سامعہ کو باہر کی طرف تھپتھپ رہا تھا۔
”یا اللہ..... آج کیا ہو گیا ابو کو.....“ پاگل ہو گئے ہیں بالکل.....“

اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا لیکن یہ حقیقت ہی تھی..... شاید آج..... آج کوئی ایسی بات ہو گئی تھی جس میں سامعہ واقعی تصور وار تھی۔

سالار کے ہاتھ میں سامعہ کا موبائل تھا۔ جس پہ بیل ہوئی۔ مدھر سی رنگ ٹون گونجی۔

سالار نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑا اور اپنے ہاتھ میں تھا موبائل پوری قوت سے زمین پر پٹا۔ نازک سا سیل فون ایک چھنا کے سے کئی حصوں میں بٹ گیا۔

گڑیا کا دل الجھل کے حلق میں آ گیا۔ ایسی نوبت تو کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ اب دوبارہ اسے باہر کی طرف کھینچ رہا تھا۔ سامعہ اس کی منتیں کر رہی تھی۔

یہ منظر بہت بد صورت ہونے کے باوجود اسے عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا۔ ہمیشہ کی طرح سالار کے بگڑنے پہ سامعہ کے لبوں پہ مسکراہٹ ہوتی

اور زبان پر حرفائیاں پھر آج، ایسے چتیں کرنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی تھی۔ کیا آج سچ سچ اس سے کوئی... ناقابل معافی قسم کی غلطی ہو گئی تھی۔

اس کی پھلی ہوئی پٹیوں میں کئی منظر ایک ساتھ ابھرے۔

☆☆☆

”عامرہ کا لنگ“ کے الفاظ بہت دیر سے موبائل اسکرین پہ چمک رہے تھے۔ مسلسل بجتی بیل اس کی پڑھائی میں غلغل ڈال رہی تھی۔

”امی..... کب سے فون بند رہا ہے۔ ہلینڈ دیکھ لیں۔“ اسے سامعہ کا فون اینڈ کرنے کی عادت نہیں تھی۔ نہ ضرورت تھی لیکن اس سے بڑھ کر اسے اجازت بھی نہیں تھی۔

اس نے سامعہ کے محبت بھرے روتے سے اسے اپنا سب کچھ مان کر کبھی اس سے بحث کرنے کی کوشش

ماہنامہ پاکیزہ مارچ 2019ء 100

نہیں کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سامعہ کی طرف سے براہ رویہ کے نام پہ لگی گئی یہ معمولی پابندیاں کبھی بری لگتیں نہ محسوس ہوتی تھیں۔ ویسے وہ جب چاہے ضرورت پڑنے پر اس کے فون سے کال کر سکتی تھی۔ لیکن عام حالات میں سامعہ کے فون پہ ہمیشہ پیئرن یا پاس ورڈ ہوتا تھا۔ جو اس کا خیال تھا کہ سالار کے ظلم میں تو ہو گا ہی.....

”سوری بے بی میری وجہ سے آپ ڈسٹرب ہوئیں۔“ نہاد جو کے نکلی تھری ترو تازہ سامعہ نے بڑے شگفتہ انداز میں اس سے کہہ کے فون اٹھایا۔ گڑیا جو اس کا سر ابا دیکھ کے سوچنے لگی تھی کہ امی میری امی کہیں سے نہیں لگتیں۔ اس کی بات سن کر مسکرا گئی۔

تجھی اس کے مسکراتے لب بالکل اچانک سکر گئے۔ فون کے دوسری طرف سے کسی کے بولنے کی بہت لمبی سی آواز آئی تھی۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ اسپیکر آف ہونے کے باوجود کبھی، کبھی دوسری طرف کی آواز سنائی دے جاتی ہے۔ مگر گڑیا کے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ آواز کسی مرد کی تھی۔ جبکہ فون پہ عامرہ کا لنگ کے الفاظ اس نے خود پڑھے تھے۔

☆☆☆

زندگی کی بہت میں کہیں، کہیں کوئی گرہ غلط لگ جاتی ہے۔ ہم بے دھیانی میں بننے چلے جاتے ہیں اور جب سارا ڈیزائن الجھ جاتا ہے تب سلجھانے بیٹھیں تو پتا چلتا ہے کہ صرف ایک ٹیکس کئی ایک گرہیں الٹی ہیں۔

کہیں غلط بل کہیں بے ضرورت گھر پھندے ڈالے ہوئے ہیں۔ ان کو سلجھانا کتنا تکٹھن ہوتا ہے یہ وہی جان سکتا ہے جو الجھنوں اور سمجھنوں کے اس جوہم سے گزرا ہو، اک ذرا سی بے پروائی وقت کے کھوڑے کو سرپٹ دوڑا کے کہیں سے کہیں لے جاتی ہے۔

اس سے بھی بے دھیانی ہوئی، بے پروائی ہوئی..... ایک نہیں کئی بار.....

جب بہت سال پہلے مارشل آرٹس میں ایڈمشن کے وقت سامعہ کا آئی ڈی کارڈ اس کے اپنے بیک میں ہی تھا تو وہ کیا لینے اور پرک گئی تھی؟ اس نے دھیان نہیں

carefotun ne

معا فیال ما گھر رہی تھی۔

اس کی ماں، جو اس کی ڈھال تھی۔ جو کم عمر تھی اگرچہ وہ اس کی سگی ماں نہیں تھی لیکن اس کے لیے سگی سے بڑھ کر تھی۔

اس کے قدموں نے میکا کی انداز میں حرکت کی اور جا کے باپ کے سامنے ٹھہر گئی۔

سارا منظر ٹھہر گیا۔ الفاظ چپ، گہری خاموشی، سناٹا..... بس چند لمحوں کے لیے۔

پھر آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا.....

☆☆☆

کچھ حادثات انسان کی زندگی میں باہر جتنی خاموشی سے ہو گزرتے ہیں، اندر اتنی ہی جاتی جاتے ہیں۔

اس کی زندگی کے قریب ترین دونوں رشتوں اور خود اس کے اندر بھی اتنی ہی اٹھا پٹھ ہوئی کہ اعصاب جواب دے گئے۔ صرف اس کے اپنے لیے نہیں اس کے باپ کے لیے بھی یہ گمان رکھنا کہ ان کی زندگی میں سب سے نزدیک موجود عورت بے ایمان بھی پا سکی بھی معاملے میں ان دونوں کے علاوہ بھی کسی کی راز دار تھی، ایک بیدار قیاس امر تھا..... پھر اسے حقیقت تسلیم کر لینا اور بھی مشکل۔

اس گھر میں رہنا، آتے جاتے ملنے ملانے والوں کی نظروں اور معنی خیز فقروں کا سامنا باپ بیٹی کے لیے محال ہو گیا۔ غلطی کسی اور کی جینا ان کا حرام ہوا۔ گھر چھوٹا، پڑھا لی چھوٹی۔ سارے رنگ پھلکے پڑ گئے اور سب سے بڑھ کے وہ خود کتنی اکیلی رہ گئی۔

دن بھر تنہا گھر، نئی جگہ پر خود سے لڑتے جھگڑتے، اسی ادھیڑ بن اور خود کو یقین دلاتے گزرتے کہ وہ جسے ساری زندگی برا سمجھتی رہی، وہ اس کا باپ تو صرف ظاہر ابرا تھا کیونکہ وہ مصروف غصے کا تیز تھا۔

”اور سامعہ..... میری ماں.....؟“

اس کے بے سست دوڑتے خیالات میں کہیں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ ایک دل کہتا کہ نہیں، انہوں نے میرے ساتھ کیا برا کیا۔ میرے لیے تو وہ اچھی ہی تھیں۔ اسی لمحے کوئی پکار اٹھتا کہ برا کیا تب ہی بری بنی تیں.....

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

دیا۔ اپنے آپ ہی توجہات دے دلا کہ خود کو مطمئن کر لیا تھا۔ اسی طرح ایک اور وقت جب سامعہ سالار اور وہ کہیں سے واپس آئے تو دروازے پر کچھ اڑا تھا۔ سالار کو یہ بات سخت نا پسند تھی۔ اس نے وہیں دروازے پہ ہی سامعہ سے جواب طلبی کی۔

”میں نے آج گڑیا سے کہہ دیا تھا۔ یہ شاید بھول گئی۔“ اس کی آنکھیں پھٹنے والی ہو گئی تھیں۔

سامعہ نے اسے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ صفائی کا کام بلکہ زیادہ تر گھر کے کام خود ہی کرتی تھی۔ وہ تو اسے اکثر سالار کی ڈانٹ سے بچا لیا کرتی تھی پھر اس نے یہ حرکت کیوں کی تھی۔ وہ تو اس کی ڈھال تھی پھر کیوں اسے خود ہی سے وار کے سامنے کر دیا تھا۔

”دروازے پہ کھڑے ہو کر ابو مجھے ڈانٹتے آپ کو اچھا لگتا کیا؟“ بعد میں سامعہ نے معصومہ سامعہ بنا کے اس کے پوچھنے پہ الٹا جو سوال کیا، اس سے گڑیا کے دل سے ساری شکایت جاتی رہی۔

”کیا ہوا جو امی نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ذرا ساجھوٹ بول دیا۔“

لیکن یہ ذرا ساجھوٹ اس کے سامنے نہیں کسی اور کے سامنے انسلٹ سے بچنے کے لیے بولا گیا تھا۔ گڑیا کو کبھی پتا نہیں چل سکا کہ وہاں کوئی اور بھی تھا۔ وہیں ان کے درمیان، ان تینوں کے بیچ اور بہت قریب..... صرف ایک دبیز کاہی تو فاصلہ تھا۔

آمنے سامنے کے دو دروازوں اور دو چوکھٹوں کے درمیان فقط تین قدموں کے فاصلے پہ گھات لگائے بیٹھا..... ایک آوارہ بلا جو کمرور کھڑکی کے ملتے قبضوں سے اٹھ کر آتی تازہ گوشت کی باس پا گیا تھا۔

یہ تو اسے آج معلوم ہوا تھا۔ اتنی دیر سے، اب..... اب کہیں جا کے.....

اس کی سیدھی سادی زندگی الجھ گئی تھی۔ سارے ٹانگے لٹے پڑ گئے تھے۔

اس کا باپ چلا رہا تھا۔ اٹھکھا، اٹھا، اٹھا کے اس طرف اشارے کر رہا تھا۔ اس کی ماں رو رہی تھی،

شوہر، گھر اور بچی کے ہوتے ہوئے کسی اور مرد کے ساتھ..... اس کے لیے پوری بات سوچنا ہی ممکن نہ تھا۔

☆☆☆

قصہ مختصر کہ وقت سے بڑا بے وفا آج تک دریافت نہ ہو سکا کہ یہ کسی کے لیے رکنا نہیں۔ نہ دوسری کے لیے، نہ دل جوئی کے لیے، نہ شدید حیرت کے سے پر، نہ گہرے دکھ پر اور خوشی کی شکل دیکھ کے تو ویسے ہی سر پٹ بھاگتا ہے۔

سامعہ..... سالار اور گڑیا کی زندگی میں جیسے خوشبو کے جھوکے کے مانند آئی تھی ویسے ہی آوارہ بادل کی طرح کہیں چلی گئی۔ کہاں، اسے معلوم نہ ہو سکا۔ نہ جانے اور کھوجنے کی ہمت ہی بڑی۔ اسے آج بھی اپنے باپ سے خوف آتا تھا۔

سامعہ کے جانے نے اس کی شخصیت پر دوسری بار گہرا اثر چھوڑا۔ پہلی بار اس کے آنے پہ اس نے مسکرایا۔ سیکھا تھا۔ خوف بھگاتا سیکھا تھا۔ اب اس کے جانے نے اسے سنا سکھا دیا۔ وہ ننھی بچی کی طرح ڈری ضرور لیکن اس خوف پر خود کو حاوی کرنے کے بجائے اک خول میں سمٹ گئی۔ باپ بیٹی ایک ہی جھت تلے مانوس اجنبیوں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ اس نے خود ہی دل بہلانے کے لیے بڑھائی دوبارہ شروع کر دی۔

آنرز کے بعد تنہائی میں یہاں وہاں پھرتی سوال کرتی پر چھائیوں سے تنگ آکر جاب ڈھونڈ لی۔

وہ سوال ہوتے ہی اسنے اوق تھے کہ وہ ان کے جواب ڈھونڈ کر خود کو ہلکان کرنے کی ہمت خود میں ہی نہیں پاتی تھی۔

ایک عورت اپنے شوہر کو دھوکا دے سکتی ہے؟

کتنے سال تک.....

قصور کس کا تھا.....

احساس محرومی انسان کو کتنی ہستی تک لے جاسکتا ہے۔

کیا بلندی پہ بھی لے جاسکتا ہے.....؟

مردوں کو معاشرے میں اتنی کھلی چھوٹ کیوں ہے؟

اس دوسرے کو کبھی کسی نے دھکا مارا ہوگا.....

اس پہ بھی انگلیاں اٹھیں ہوں گی.....
میری ماں کو کیا کچی تھی، کون سی محرومی تھی.....
مرد عورت سے کیا چاہتا ہے.....
صرف مرد کے لیے زندگی بھر کا ناتا توڑنا اتنا آسان ہوتا ہے.....

عورت کیا چاہتی ہے مرد سے.....
اُف..... اُف..... اُف..... کتنے سوالات اس کے معصوم ذہن میں گھبراتے رہتے۔

☆☆☆

”محترمہ باس آپ کو یاد کر رہے ہیں۔“
”کیوں؟“ صبح پٹی، کی کیا ضرورت آگئی ہے۔
”شاید آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔“
”لیکن کیوں؟“ اس عجیب سے جواب پر حیرانی کم پریشانی زیادہ تھی۔

”آپ بھول رہی ہیں کہ آپ کے اپائنٹ کے وقت باس ملک میں نہیں تھے۔ وہ سارے نیوکمرز کے ساتھ میننگ کر چکے ہیں۔“
”اوکے.....!“ جائے بنا چارہ نہ تھا۔

ایسی چوڑی میز کے دوسری طرف جو ہستی تشریف فرم تھی اگر وہ رتی برابر جانتی کہ یہ باس ہیں تو یہاں کے بجائے سیدھا باہر کارخ کرتی۔

وہ مرد تو اسے نہ پہچانتا لیکن وہ خوب پہچان گئی تھی۔ وہ بھول بھی کیسے سکتی تھی وہ چہرہ جس نے اس کی زندگی تلپٹ کر کے رکھ دی تھی۔

ملاقات تسلی بخش نہیں رہی تھی۔ اس کا دماغ اس قدر ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی بات کا ٹھیک سے جواب نہیں دے سکتی.....

باس کی بھی اس کے بارے میں رائے اچھی نہیں رہی۔ کمرے سے باہر نکلنے وقت وہ یہ جاب چھوڑنے کا مکمل ارادہ کر چکی تھی۔ اس نے اسی روز سے دوسری جگہوں پہ دیکھنا اور اہلائی کرنا شروع کر دیا۔ آفس میں اس کا سنجیدہ رویہ مشہور ہوتا تھا، وہ کچھ اور لیے دیے رہنے لگی۔ اس کی ایک وجہ باس کی آفس میں شہرت بھی

بناوٹ آمیز تھا۔

”کوئی خطا ہوگئی ہم سے..... آپ کہیں..... ہم ابھی تلافی کیے دیتے ہیں۔“

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور بس..... اسی لمحے فیصلہ ہو گیا۔ اس نے بے حد سختی سے اس کا ہاتھ جھٹکا..... اور دوسرے ہاتھ کا زوردار پینچ اس کے جڑے پہ رسید کر دیا۔ برسوں پرانی کرائے کی پریکٹس جو کسی بے مہر کی مہربانی تھی، کب جا کے کام آئی تھی۔ اس کا گڑیا کو اندازہ نہ تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ کرسی وکیل کر دوسری جانب سے کھڑی ہو چکی تھی۔ وہ مخالف سمت میں ہلکا سا جھٹکا کھا گیا۔ لمحے بھر میں اس کا منہ سرخ ہو گیا۔

”سالی تیری اتنی ہمت.....“

زخمی بھیڑیے کی طرح وہ بل کھا کے پلٹا۔ وہ پہلے ہی تیار تھی۔ وہ اس پہ لپکا۔ گڑیا نے جھٹکا دے کے جھٹ سے اس کا بازو پکڑ کے پیچھے کی طرف موڑ دیا۔

بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمری تک آتے، آتے بڑا فرق آ جاتا ہے۔ اس سے دونوں ہی نے اس فرق کو محسوس کر لیا۔

”میں اس سے زیادہ بھی ہمت بھی کر سکتی ہوں۔ مجھے سامعہ بھگنے کی غلطی ہرگز مت کیجیے گا۔“

دُور سے ہوتے وجود کو گھسنے کی مدد سے آگے کی سمت دھکیلے ہوئے اس نے بائیں ہاتھ سے ایک ہلکی ضرب اس کی گردن کی پشت پر لگائی۔ وہ آگے کی جانب دھکا کھا کے پلٹا تو اس کے چہرے پہ تکلیف اور حیرت ایک ساتھ نمایاں تھی۔

اس نے بنا کچھ کہے اپنا بیک اٹھایا اور تیر کی سی تیزی سے باہر نکلتی چلی گئی۔

بہت سے سوال اب بھی آنکھیں کھولے اس کی راہ تک رہے تھے لیکن ایک بات کا انکشاف آج خوب ہوا تھا۔ اگرچہ اس کی ڈھال سامعہ خود ڈکار رہی تھی لیکن جاتے، جاتے اسے اپنی حفاظت کرنا سکھا گئی تھی۔

تھی۔ اکثریت کے خیال میں وہ ایک فکرتی آدمی تھے۔ ان کے شراب و شباب کے شوق کا آدھا انشاف گواہ تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بات بھلا اور کون جان سکتا تھا۔ اس کا تو گھر اسی نے ڈس لیا تھا اور اس کے زہر کی نیلا ہٹ سالوں گزر جانے کے بعد بھی اس کے خوابوں کو بد رنگ کیے ہوئے تھی۔

عمر میں اضافے کے ساتھ بالکل معمولی سے بیماری جسم کے ساتھ اس شخص میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔

”پتا نہیں امی کیسی اور کہاں ہوں گی..... ظاہر ہے۔ اس دھوکے باز شخص نے ان سے شادی تو نہیں کی ہوگی۔“

اسے رہ، رہ کر اس بندے پہ طیش آئے جاتا۔ اتنے عرصے بعد اسے دیکھنے پہ اس کے زخم کھرچ سے گئے تھے۔ اوپر سے آئے دن کا بڑھتا القات..... اس کا دل چاہتا کہ اس کی بیتی تو ڈر ہاتھ میں رکھ دے۔

اس نے کتنی ہی بار اس بے اختیار خواہش کو دبایا تھا۔ لیکن پھر ایک دن تو حد ہو گئی۔

وہ اس کے پاس تھے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس کے مالک ہی بن جاتے۔

”سر پلیز اگر کام کی بات کرنی ہے تو کریں..... ورنہ پلیز حیرانم ویٹ مت کریں۔ مجھے سب کام

وانڈاپ کرنا ہے آج ہر حال میں۔“

اس کا لہجہ تلخ تھا لیکن اس پہ رتی برابر اثر نہ ہوا۔

”ارے مس، پتا نہیں آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے۔ کبھی ہمارے لیے بھی ٹائم نکال لیا کریں۔“ ایک

اعزاز و لبرانہ سے کہتے ہوئے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے بالکل برابر میں ٹیبل پہ ذرا ٹک گیا۔

اس کی سانس چڑھنے لگی۔ ٹیڈ گلاس وال گلوٹانے کی لپکا وجہ تھی کہ وہ سب کو دیکھ سکے لیکن کوئی اسے نہ دیکھ پائے۔

”اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں مس تبسم!“

اس نے دل میں پہلی بار اپنے نام سے شدید نفرت محسوس کی۔

”میں ریڈائن کر رہی ہوں ابھی اسی وقت.....“

”اوہو، ہو..... اتنا غصہ.....“ اس کا تعجب



اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا..... آس پاس ٹھہرے
مردوں کا رویہ مڑا بانہ ہو گیا اور وہ ایک طرف ہونے
لگے۔ پانی کی ڈولی شانہ اور صفہ کو ملی تو دنیا کی عظیم ترین
مہمان نوازی یہ تازہ، زرخیز، زرخیزہ کر دینے والا پانی لگا۔
عورتیں جو اکٹھی ہوئی تھیں وہ واپس نہ گئیں بلکہ
ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ہندو عورتیں، مسلم
کتابی، سب ملی جلی ہوئی تھیں یہ تو بعد میں شہر یا رستگروں
نے ان کے علم میں اضافہ کیا کہ مقامی لوگ روٹی پانی
کی خاطر مشریوں، این جی اوز یا کسی بھی دیا لو کے بن

وہ پرنسپل محترمہ عائشہ صبیحہ انزہری تھی؟ جیسے ایک
نا محسوس تصدیق سب کو الہام ہوئی ہو..... صفہ کو یاد
آ گیا۔ وہ قدم بوسی، چرن چھوٹا، ناپسند کرتی تھیں ہمیشہ
ایک مکمل سلام..... ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ.....“
برسوں پیچھے سے صفہ کی آواز زمانہ موجود میں لوٹی۔
اس جھونپڑی میں واحد کشش پانی سے گیلا لال
دکا (گھڑا) تھا جو چھینکے میں دھرا ہوا تھا۔ (عالمی ہوا
لگ کر شہنشاہ ہونے کو) اس کے اندر کوری مٹی کی ڈولی
ڈال کر اماں نے اپنے ہاتھ سے اذان، منکر یو کو پانی دیا



وہ جنت ہے۔“

تھری باشندے کو لفظ پانی کی سمجھ آئی تو آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر پھر جنگلی کی طرف اشارہ کر کے ڈوہرائے لگا۔ ”پانی، پانی“ مگر بونے اس کا کندھا تھکا دوونوں مسکرائے پھر وہ واپسی، بڑول اور کھانے پینے کی اشیاء کے کارشن کی بات کرنے لگے۔۔۔۔۔ جیپ کی طرف صفہ کے کہنے پر پانی والی اماں نے اسے مرید بچے (جو اصل میں مروتے) حفاظت کے لیے روانہ کر دیے تھے۔ اب ہلکی، ہلکی ہوا چلنے لگی تھی جو گرم نہ تھی بلکہ خوشگوار تھی جسے رات کے گزرتے ہر پہر کے ساتھ شہنا ہوتا تھا۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ چاند اور تاروں کی ضو کا پہلی بار احساس ہو رہا تھا۔ تھری باشندہ کھانا لینے چلا گیا تھا۔ بھوک سے آنتیں قل حوالہ پڑ رہی تھیں۔ شہنا اپنی چادر کو خود پر پھیلا کر بچتے اذان کے ساتھ لیٹ رہی تھی۔ مگر یو کو نیند کی جھپکیوں میں روٹی کا انتظار سونے نہ دیتا تھا۔

صفہ تو پانی والی اماں کے ہاتھ سے مٹھی بھر بھجوریں، آب خورہ بھر پانی لے کر ایسا پڑ پاش ہوئی کہ وہیں فرش پر گہری نیند سوئی۔ یہ نیند اڑھائی گھنٹے کی تھی۔ وہی اڑھائی گھنٹے جو شہنا، اذان اور مگر بونے اینٹھ، اینٹھ کر کھانے کے انتظار میں گزارے۔ جب جو کی روٹیاں، خشک گوشت کا شوربہ اور دودھ پر مشتمل کھانا آیا جو کہ غریب بستی کی طرف سے ممکن حد تک مہمان واری تھی تو وہ نندیدوں کی طرح اپنے حصے، اپنی تھالی پر ٹوٹ پڑے۔ ویسے یہ دستور بھی خوب تھا کہ بندوں کے حساب سے رکابیاں چار اور روٹیاں بارہ تھیں۔ تین، تین روٹیاں مردوں کے لیے، دو، دو مہمان عورتوں کے لیے۔۔۔۔۔ ایک اماں اور ایک اس کی بھلی کے لیے، پانی والی اماں نے دودھ کا کنوا اور روٹی، بھلی کو شوربہ روٹی پہ مل دیا۔ (یہ ان کا معمول ہوتا ہوگا) سب کھا چکے، جس نے پسند کیا دودھ پیا، صفہ نے پانی کا آب خورہ بھر کر ساتھ رکھ لیا۔ اب بستی کی طرف سے ایک چار پانی بھی لا دی گئی تھی (جو دونوں مہمان خواتین

جائے پھر چھوڑ دیتے، اس اول بدل میں پوجا پات دل مل گئی تھی۔ اول پیٹ پوجا پھر کوئی کام وجوہ قانون فطرت تھا۔ ان کے درمیان بستے ہوئے انسان کا ورد۔۔۔۔۔ انسان کی مدد اور مدد ادا سب سے بڑا آئین تسلیم ہونے لگا، وہاں دور سے آنے والے مہمانوں کی آمد کو روپوں کی تقسیم، فلم، فوٹو، کے عمل کا ڈھراؤ سمجھ کے خنجر جھولیاں اور تارکتی آنکھیں کھل جاتیں۔ مگر ”پانی والی اماں“ نے اپنے کسی انداز و الفاظ میں بتا دیا کہ یہ ان کی خاص مہمان ہیں۔۔۔۔۔ اور اب وہ مؤدب اور مرعوب ہونے لگیں۔ اور پھر نے لگیں۔ یوں بھی شہنا اور صفہ ساز و سامان والی پھر تیلی فیشی نہ لگیں۔ شام ڈھل گئی تھی۔ کھوریت اب پاؤں تلے مہربان ہو گئی تھی۔ جمپوڑی کے باہر ایک بڑے کھولے پر درسی بچا دی گئی جہاں اذان اور منکر یوٹا بھلیا کر لیتے تھے۔ کوئی پانی والی اماں کا معتقد ان کی ٹانگیں و بار ہا تھا اور قسے سنار ہا تھا ان کی روٹی پانی کا بندوبست بستی کے اندر کسی کے گھر ہو رہا تھا۔ کیونکہ جنگلی کے قریب بنا ہوا اینٹوں کا چولہا بے جان پڑا تھا۔ اس میں پڑی تھوڑی سی راکھ اپنے منہ بولی تھی کہ اس کے جلنے کی نوبت کبھی کبھار آتی ہے۔

شہنا اذان کی طرف آگئی وہ کچھ پریشان ہو رہی تھی۔ ”یہاں کوئی چار پانی نہیں ہے، لگتا ہے ہمیں نیچے سونا ہوگا، میں بہت تھک گئی ہوں، بھوک بھی لگی ہے۔“ اذان نے پاس رکھے ایک برتن کا ڈھکن اتارا اور شہنا پھپھو کو بڑھایا اس میں بھجوریں تھیں۔ ”نہیں، مجھے روٹی، سالن چاول والی منہ بھر کھانے کی بھوک لگی ہے۔“ انکار کر کے بھی اس نے چند بھجوریں اٹھالیں اور کھانے لگی۔ منکر یو آسمان پر مٹے، مٹے تارے کھوجتے ہوئے شکر سے لبریز آواز میں بولا۔

”خدا کی قسم۔۔۔۔۔ ہمیں تو اللہ نے دنیا میں جنت دے رکھی ہے، کسی محنت، کسی تھکاوٹ کے بغیر اتنا سایہ، ٹھنڈک، پانی ہم مائیں یا نہ مائیں جہاں ہم رہتے ہیں

ہوتی ہے کہ جس کا ڈر ہنسنے نہ دے، سب سے بڑا خوف پانی سے ترس کے مرنا ہے، یہاں کی عورت کو سارے دن میں ایک کام کافی ہے، پانی لانا، پانی سنبھالنا اور پھر پانی لانا..... دو تین گھڑے پانی جو پیاس کے مارے گھر پہنچتے تک پی لیا جائے..... مگر اسے بچا، بچا کے گھر لانا ہے کیونکہ وہاں جگر گوشے راہ تک رہے ہیں..... سیکینہ نے بتایا کہ کوئی جو بڑی رئیس زادیاں ہیں وہ گدھا ریزھے یا گدھے کی پشت پر پانی کے گھڑے رکھ لاتیں اور گھٹنی ایسی ہوتیں جو انہیں رنگ کی نگاہ سے دیکھتیں، بارش برس جائے تو بارش کا پانی سونے کے زیور سے زیادہ قیمت سنبھال کے رکھا جاتا ہے۔ مینہ کا کیا ہوتا ہے بھلا..... جس میں مینڈک تیرتے ہیں، کیڑے کوڑے ہوتے ہیں جس کا دلہنی رنگ ہوتا ہے اس کو کیڑے سے چھان کر چھینکے میں برتن رکھا جاتا ہے اس بجھے اس بچی سیکینہ نے..... چھوٹے ہوتے سنا تھا..... کسی کو ایک گلاس پانی پلانا تو نفل ثواب ہے..... یعنی وہ پانی جو چند قدم تک گھر میں صاف ستھرا موجود ہے۔ پیاس کے جنگل میں پانی کا پیڑ لگانا..... میرا جی کل اٹھا۔ باغوں، باغوں ہو گیا..... مگر صفہ..... اس راہ میں ایک نہیں، دو نہیں، ان گنت رکاوٹیں تھیں۔“ وہ دونوں مست خرام تھیں، صحرا کی روٹیں چل رہی تھیں۔ شفاف آسمان پر چاند چل رہا تھا۔ لائق رات چل رہی تھی۔ مجید بھری ہوا چل رہی تھی۔ مگر سناٹا ایسا تھا کہ اپنی سانسوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔

”یہاں کوئی آواز نہیں ہے.....“ صفہ نے کہا۔
 ”اب تو یہاں رب کا فضل ہی فضل ہے۔ جانور پرند آتے ہیں..... فخر سورے تمہیں کنویں پہ لے جاؤں گی۔“
 ”آپ نے کیسے کھدوا لیا؟“

”اللہ نے میرے ذریعے کھدواتا تھا۔ اللہ..... میری حیات ترا سجدہ..... میری سانس..... تیرا سجدہ..... ہنوں، ہنوں..... کتنا ہنوں..... روؤں، روؤں..... کتنا روؤں..... جتنا ہنوں ترا شکر ہناتا،

کے لیے تھی) شانہ تو اس پر لیتے ہی سو گئی۔ صفہ عشا کی نماز ادا کرنے لگی۔ ایک اندھیا راسکوت، سیاہی مائل، نیلا آسمان، تاجہ نظر لہریہ ریت..... یہ نماز جدا گانہ احساس تھی کبھی بلند یوں کی طرف تاجہ نظر کبھی قدموں کے آگے تاجہ نظر..... مگر حد نظر تھی ہی کیا؟ سلام پھیرا ہی تھا کہ تھری نمائندہ آواز وہی ”پگلی“ کی آواز دور سے آنے لگی۔ وہ اب کہیں دور تھی۔ ”پار کردی پدمنی..... اور..... پیہا..... پانی“ کے لفظ سمجھ آتے تھے۔ یہاں بھی حسن کے گیت، مور، پیہا کی رنگوں اور آواز میں خوشیوں کی بشارتیں تلاش کی جاتی تھیں۔ پانی کا لفظ تو ولوں کی تراوت سے اوا ہوتا تھا۔ اللہ کے راز بندہ کیا جانے، اس نے برف سے لدے پہاڑ بنائے۔ سبز سبز علاقے سجائے، پانیوں کے جھاگ اڑاتے دیا بہائے، اور ترستی پیاسی ریت کے تاجہ قدم صحرا بچھائے۔ اللہ کی مخلوق ہر جا بہستی ہے، یہاں بھی بہستی ہے..... مگر مرشدی عاتشہ صبیحہ یہاں کیوں آجائیں؟ یہ راز کیا ہے؟ آگے خلوتوں بھری رات تھی۔ یاران نکتہ داں کی ملاقات تھی، کئی کبھن کوس پار کر کے اضطراب لایا تھا۔ یہی وہ پہر تھا جو نایاب تھا۔ وہ دونوں بیٹھی تھیں..... سر کے اوپر نیلا ہٹ ہی نیلا ہٹ..... پاؤں کے نیچے سرمئی ریت..... نیلا ہٹ ایک گمان تھا..... سرمئی رنگ ایک سراب تھا۔ جو سوال صفہ کے ہونٹوں پر ابھی آیا نہیں تھا وہ آنکھوں سے پڑھ لیا گیا۔

”تو سنو..... درس گاہ میں ایک طالبہ سیکینہ ساند مٹی شلح سے آکر داخل ہوئی تھی..... میں اس کو دیکھتی، وہ پانی کو کبھی زمین پر گرنے نہیں دیتی تھی۔ پانی پیتی تو بچا ہوا قطرہ سر میں چمک لیتی..... خالی گلاس کو آنکھوں پر پھیرتی، ایک دن میں نے اسے بلا کر پوچھا۔

”سیکینہ..... غلام غلام..... سیکینہ بی بی کر بلا..... کہاں سے آئی ہو؟“ اس کی آنکھیں چمک پڑیں..... جو حال سنایا وہ میری آنکھیں کھول دینے کو کافی تھا۔ اس کا یہ کہنا کہ ہم تو کھاتے پیتے لوگ شمارے ہوتے ہیں مگر کھانا پینا ہوتا کیا ہے، یہ مجھے شہر آکر پتا چلا۔ بھوک وہ

جتنا روؤں ترا شکر ملے لانا۔۔۔“ وہ خود کھلم ہو گئیں۔ صف
نے پھر متوجہ کرنے کی جرات کی۔

”پھر بھی آپ نے اکیلے کیسے کر لیا مرشدی؟“
”سیکنڈ سائنڈ کی باتیں سن کر میرا دل منبر، محراب کی
شوکت سے اٹھ گیا بلکہ ایک احساس زیاں نے روح کو گھیر
لیا۔۔۔ صف۔۔۔ یاد رکھ۔۔۔ بہت مشکل ہوتا ہے۔۔۔ خود
کے لیے یہ جانچنا کہ جو ہم اچھا کر رہے ہیں، وہ اچھا
بھی ہے۔ کبھی، کبھی موٹے بادام کے اندر سے سوکھا سزا
بادام نکلتا ہے ناں۔۔۔ وہ ایک سڑی دوپہر کو روزے کی
حلق میں اتری پیاس تھی جس نے مجھ سے فیصلہ کر لیا اور
میں نے سیکنڈ سائنڈ کو کہا۔۔۔ مجھے تیرے تھر کے بٹھر میں
پانی پہنچانا ہے۔۔۔ وہ حیران ہو کے تنکنے لگی۔۔۔ ”تم
میری کیا مدد کر سکتی ہو؟ روپے پیسے کی مدد نہیں چاہیے۔“
وہ سوکھی سانولی پیاری بھی بولی۔ ”میں آپ کی ہر
ممکن مدد کر سکتی ہوں۔“ اس کا ایک بڑا بھائی جعفر ایفل
انجینئر جگ پڑھا تھا۔ پڑھائی والا گھرا تھا۔ اس کا نام
سلیم سائنڈ تھا۔ اس کو اپنے علاقے کی محرومی کا درد تھا۔
اس کو بدلے اس کی پیاس مٹانے کے خواب تھے تجویزیں
تھیں۔ وہ ہم جوادر باہر شباب تھا مگر وسائل نہ تھے۔
میں پیسے والی بڑھیا تھی۔۔۔ پھر میں نے اپنا گھر بیچ
دیا، زیور بیچ دیے، سب کچھ ڈال دیا۔۔۔ میں
بولی۔۔۔ ”سلیم سائنڈ چل آگے بڑھ۔۔۔ عثمان غنیؓ کی
پیروی کر۔۔۔ اس نے کمر کس لی۔۔۔ ہم لے کے ہستی،
بستی معائنہ کر لیا۔۔۔ ادھر پانی کی امید نکلی۔۔۔ دو سو فٹ
کھدائی ہوئی۔۔۔ کوئی پانی نہیں۔۔۔ تین سو فٹ
کھدائی۔۔۔ جدید اسارٹ مشین مگر۔۔۔ مزدوری تو
مزدوروں نے کی، مفت کھانا دیتی، ہر دوسرے دن
اونٹ ریڑھے اگلے پڑاؤ تک جاتے، سلیم سائنڈ
مزدوروں کو کہتا کہ جو تھک گیا پلٹ جائے نہادھو کہ پھر
لوٹے۔۔۔ مگر غربت اتنی ہے کہ وہ میس کرتے، نہانا تو
بارش کے بارش ہوتا تھا، ٹوبے کے پانی پر نہانے میں
جھگڑے ہوتے۔۔۔ چراگاہ کا یہاں تصور
نہیں۔۔۔ مریل بھیڑیں، ادھ موٹی بکریاں، اونٹ بھی

لاچار سے۔۔۔ گردوں کی پتھری یہاں عام بات
ہے۔۔۔ ہڈیوں کی ٹوٹ پھوٹ۔۔۔ کبڑا ہوجاتا، آبی
لاچاری، میں نے ساٹھ سال کی عمر میں نہ دیکھی تھی جو
یہاں آکے دیکھ لی۔۔۔ سائنڈ کہتا۔ ”اماں یہاں 70 فیصد
اسکیسین فیل ہوجاتی ہیں۔“ میں ہمت دلاتی، موقع
دینے والا موقع بند نہ کرے پاس ہم ہو کے دکھائیں
گے۔۔۔ چانس باقی رہے امید باقی رہے ناں۔۔۔ خدا تو
آزمانے کے ہزاروں طریقے رکھتا ہے۔ ہم جن کے
خلیے پانی سے تر ہوتے ہیں پیٹ چھل، چھل پانی سے
بھرے، ہم پر چھوٹی سی تنگی آئے تو بڑی دلیری سے سوال
کرتے ہیں۔ ”یا اللہ میں نے کیا گناہ کیا؟“ انسان نے
اگر کوئی بھی گناہ نہ کیا ہو تو بھی اتنا گناہ کافی ہے کہ وہ
دوسرے دکھی انسانوں سے بے پروا رہے۔۔۔ وہ دونوں
اب ریت کے ایک ٹیلے پر بیٹھی تھیں۔

”صف۔۔۔ جس دن مجھے خبر ملی۔۔۔“ اماں ہم پانی
تک پہنچ گئے۔“ تیری یہ گناہ گار، پیاس سے
خائف۔۔۔ استاد جیل پڑی، ادھر آکے جھکی لگالی۔۔۔
جینے کے لیے ایک چھت، ایک گھڑا، مٹھی بھر نہ تو تھملا
بھرا ناچ اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ تو ہم بندوں نے
کھڑاگ پھیلا لیے۔۔۔ میں یہاں آگئی۔۔۔ ریت مٹی
ہو کے جینا آگیا۔ دستارِ فضیلت چھوڑ دی۔ علم جتنا تھا
وہ تو ساتھ تھا۔۔۔ بھلا اسے کون لے جاتا (بیج بات ہے
علم سے بڑا کوئی خزانہ نہیں) اب سن صف۔۔۔ میری
پاکیزہ شاگردہ۔۔۔ نیلی، نیلی بالٹیاں تھیں، نئے
ڈیزائن کا کنواں تھا۔۔۔ جب بالٹیوں میں جھاگ دار
شخاف پانی بھرا تا تو پیاسے لبوں کے منہ میں پانی بھر
آتا۔۔۔ کئی اینٹوں والے قسطے پر رکھے گھڑوں کی قطار
بھرتی جانی۔۔۔ پانی کے تھکنے سے جو آس پاس ریت
گیلی ہوتی اس پر چٹے ہوئے پتے پاؤں انسان رکھتے
تھے اور۔۔۔ ان کے دھنسنے ہوئے گال ہستے تھے۔۔۔
سونڈھی، سونڈھی گیلی مہک تھنوں میں بھرتے۔۔۔ وہ
سوکھے ڈھانچے جن کی دھنسی ہوئی مرجھائی آنکھیں
تھیں۔۔۔ اور ہڈیوں پر منڈھی کھال والے چہرے

تھے..... وہ خوش ہو کر بہتے تھے، تو میری رنگ،
 رگ میں اللہ ہنستا تھا..... آسمانوں سے رحمتیں نازل
 ہوتی اور رگ جان میں تیرتی محسوس ہوتی تھیں..... کوئی
 غرض نہیں کہ وہ بندے..... واحد رب کی پوجا کرتے
 تھے یا..... نادان، بے علم تھے، وہ بندے تھے، خالق تو
 ایک ہی تھا، سمجھو، سمجھو ار مخلوق تو اسی کی تھی..... کہاں،
 کہاں سے کتنے کوس سے مور اور دیگر پرندے اڑتے
 گرتے آن پہنچتے تھے۔ پانی کی خوشبو پلاتی تھی.....
 سانپ، کچھوے، مینڈک، حشرات جو بھی آئے پانی کی
 تراوٹ کو اپنا حق جانے..... آئے، سوئے، گائے،
 ناچے، جی بسم اللہ..... یہ بگی جونیلوں، نیلوں میں
 ماری، ماری پھرتی ہے اور گاتی ہے، اس کے چھہ بچے
 تھے، چھہ کے چھہ خط، فاتے اور پیاس سے باری، باری
 سر گئے..... خاوند اس کا عمر کوٹ نکل گیا تھا۔ بولا تھا باریں
 آئیں گی تو لوٹ آؤں گا..... اے بھی بولا کہ نکل چل
 یہاں سے..... یہ اپنے بچوں کی ہڈیوں کو چوستی
 رہی..... بھوک پیاسی ادھ موٹی ادھر پڑی
 رہی..... جب کھدائی شروع ہوئی (ہستی) دہتی کی دہتی
 بھاگی چلی آئی..... جانے والے امید کو پلو سے باندھے
 لوٹ آئے..... تو یہ بھی آئی..... اس کے
 پوچھن (دوہنے) کے پلو میں دو مٹھی باجرا دھان
 تھا..... بھوک سے جان نکلنے لگتی تو چپا لیتی..... اس کا
 خاوند عمر کوٹ کے گھن گاتا، وہ مونگ، تل، باجرہ لایا
 تھا۔ نینو ارام آشرم پر بھات کھاتا رہا تھا، سنت نیتو رام کا
 دم بھرتا تھا۔ پانی نکلا تو یہ پانی دیکھ کر چکر کھانے ناچنے
 لگی۔ پلو کھول کے سارا باجرا کی جگہ پر رکھ دیا اور اپنے
 بچوں کے نام پکارنے لگی۔ ”مکھن، برکھا، ولہر، اکوار،
 بادل، بنی آجا آجا۔“ پرندے اترنے لگے تو تالیاں
 بجانے لگی۔ ”آگیا..... آگیا..... آگیا آگیا۔“ درودوں
 کی ماری بھلی نظر آتی ہے۔ یہ بھلی نہیں ہے، یہ درد جذبات
 کر کے لا دوا ہو گئی ہے، دعا ہو گئی ہے۔ پہلے تو معلوم
 نہیں مسلمان تھی، عیسائی تھی یا ہندو مگر ساتھ ساتھ رہ کر
 اللہ، اللہ بہت کہتی ہے۔ گیت گاتے گاتے گیت چھوڑ کر

اللہ اللہ اللہ ایسی لوگ لگتی ہے کہتا ہے دھرتی اس کی اسی
 ہوئی انگشت شہادت کے محور پر گھومنے لگی ہے، یہ خود بھی
 محور کا پتھر بن جاتی ہے۔“

نیلے کی اونچائی پر اماں عائشہ صبیحہ اور ان سے
 نیچے صف بخاری بیٹھی تھیں۔ محترمہ عائشہ صبیحہ زہری جن
 کے ابلے سفید لباس سے گلاب کی دھیمی مہک آتی تھی
 جن کا اتنا دبدبہ اور وقار تھا کہ کسی کو ان کی موجودگی کے
 دیوار پار اونچا بولنے کی مجال نہ تھی۔ وہ ہر وقت با وضو
 رہتیں، تصوف کی پہچان استاویں تھیں، منتظم اعلیٰ تھیں۔
 طالبات کے ہاسٹل کی نگران اعلیٰ تھیں..... مگر وہ وقت
 موجود میں ایک ملکی سفید سردالی بڑھیا تھیں جس کے
 سفید بالوں کی لٹیں دھاگوں کی چوٹی میں بندھی ہونے
 کے باوجود دائیں بائیں نکل کر لہرا رہی تھیں۔ جس کی
 کمر میں خم پڑتا تھا، پیرانہ سالی کے کسی ہند سے میں
 اسے فٹ کیا جاسکتا تھا۔ جس کے ہاتھ جھریوں والے
 اور کھر درے تھے جن کا چھبنا کہ وہ دور کی سمت دیکھتی
 تھی۔ پاؤں ریت سہہ، سہہ کرمقای بوڑھوں جیسے تھے
 وہ تو آج سے تیس سال پہلے بھی عابدہ، زاہدہ، صابرہ،
 ساجدہ تھی پھر اس نے کیوں خود کو اتر حال میں ڈالا؟
 اب اتنے سوال کرنے والے ہوں، اتنی چٹمنیں اٹھانی
 ہوں تو وقت کی قیمت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ یوں تو
 دونوں عادی شب بیدار تھیں مگر لیا سفر کرنے کی
 تھکاوٹ صف کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ ناٹیں پھیلا لے۔
 بھانپنے والی آنکھ بھانپ گئی اور کہا۔

”جنگلی میں جا کے پھوڑی (پرانی چٹائی) لے
 آؤ۔“ صف اٹھی اور لے آئی۔ پھر کہا۔

”اس کو بچھاؤ، آرام کر لو.....“ صف کو مجبوری
 میں معذرت کرنا پڑی۔

”میں یہ بے ادبی نہیں کر سکتی، آپ کی موجودگی
 میں سو رہوں۔“

”صف بخاری، یہ تیس سال پہلے کا زمانہ نہیں
 ہے..... ان حفظہ مراحت کی اب خوب نہیں رہی..... تم لیٹ
 جاؤ، اب تم بھی اتنی جوان نہیں رہیں، تمہاری ہڈیاں

”جی ہاں..... میں بہت بوڑھی ہوگئی ہوں.....
یہ سچ ہے۔“ صفہ نے چٹائی پر اپنا جسم دھیرے سے
سیدھا کیا۔ کزور جھریوں والے چہرے پر جو دو آنکھیں
تھیں وہ آج بھی اتنی روشن تھیں جتنی تیس برس پہلے جن
میں دیکھنے کی تاب نہیں ہوتی تھی۔ وہ دو با علم آنکھیں
صفہ کو دیکھ رہی تھیں۔ صفہ کو ایک دم کچھ اہم ترین یاد
آیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔
”محترمہ عالیہ.....“

”نہیں..... اماں، پانی والی اماں!“

”پانی والی اماں، مجھے دعا چاہیے..... خنبہ کے
لئے۔“ انک، انک کر بہت کم لفظوں میں خنبہ کا بتایا، بتا
بھی چکی مگر پانی والی اماں جیسے ابھی تک سننے کی کیفیت
میں تھیں۔ آنکھوں پر کچھ بد بداتے ہوئے ایک سمت کو
سر جھکا کر دور کی آواز سننے کی کوشش کرتے ہوئے.....
صفہ خاموش رہی، دور سے تو جھلی کی جھلی، اللہ، اللہ، اللہ کسی
جھینگر کی ہلکی آواز کی طرح سنائی دیتی تھی..... شاید وہ
رک، رک کرتا ہی بھی بجاتی تھی۔

صفہ کی سوچ کا زاویہ بدلا یہاں عورت اتنی محفوظ
ہے، ایک پگلی جدر منہ کرے چلی جائے تھن کی ترقی
نے انسان کا اخلاق زوال پزیر کر دیا۔ یہاں عورت کو
انہوں نے ہر کسی کا ج کرتے دیکھا تھا۔ درختوں کے
اوپر چڑھی بکریوں کے لیے پتے چھانٹتی، محترمہ مرشدی
نے یہاں شروع میں مشکلات تو بہت سہی
ہوں گی..... پھر اسے سلوک، اخوت سے دل جیت
لیے اولیا کرام بھی کچھ کرتے چلے آئے..... صفہ کے
لب دا ہوئے ایک دم بولتی چلی گئی۔

”آپ نے جو کام کرنا تھا..... کر دیا..... اب
آپ واپس چلی جائیں، اپنا علم پھیلائیں، اپنے آپ کو
آرام دینا آپ کا حق ہے..... آپ کے یہاں سے
جانے کے بعد بھی یہ کونواں چن رہے گا..... آپ یہاں
مکرم نام نہ ہوں.....“

”تم مجھے یہ بتاؤ، تجھوڑا کو..... پہلے تم نے خنبہ کے

لئے دعا کی بات کی..... اس کام نے مجھ سے جواب
سنا؟ تم اتنی جلدی میں کیوں ہو؟“

”وقت کم ہے..... میرے ساتھ آنے والوں کا بڑا
احسان ہے، میں ان کو بخیر واپس پہنچانا چاہتی ہوں..... آپ
امید کر سکتی تھیں کہ آپ کی برسوں پرانی، بھولی برسی بوڑھی
شاگرد..... آپ کی یہاں ڈھونڈ لے گی؟“

”یہ ایک اور سوال.....؟“

”معاف کر دیجیے گا یہ مجھ سے ہوتا چلا جا رہا ہے،
صبح روانگی کا وعدہ ہے، خنبہ کی روک ٹوک مل جائے تو کیا میں
کچے کروں کی روشنی، شغذک، رشتے، رواج، نفسی سماجی
دباؤ سے آزاد ہو جاؤں گی؟ میں کیوں ڈرتی ہوں؟“

”لڑکی..... چپ..... جب تک میں نہ کہوں
اب ایک لفظ نہ بولوگی۔“
وہ سہم کر چپ ہو گئی، وہ تو چپ ہوئی مگر یہ بھی
چپ ہو رہیں..... سکوت چھا گیا، پگلی نے بھی گویا چپ
کا حکم سن لیا تھا۔ تادیر صفہ نے نظریں جھکائے، کان لگائے،
برہنہ ہواڑے بیٹھے رہنے کے بعد اب کن آنکھوں سے
دیکھا..... کیا ہوا ہے یہ کیوں نہیں بولتیں..... ساکت
وجود ہلا، آواز آئی۔

”تمہارے پاس بھی اللہ کی بندیاں دعا کروانے
آتی تھیں، آتی رہی ہوں گی..... تم ان کو سمجھایا کرتی ہوگی
اللہ سب کا ہے..... (صفہ حیرت کے ساتھ عداوت
میں ڈوب گئی) صفہ..... جو دکھی ہوتا ہے، وہ اپنے تئیں ہر
ممکن تدبیر سے دکھ کی خلاصی چاہتا ہے، البتہ یہ ہر ممکن
تدبیر بعض اوقات اسے غلط راہ پر بھی لے جاتی ہے.....

ہر بندہ اپنے خیال میں اپنے سے اچھے سے دعا کروانا
ہے..... یعنی جسے وہ اچھا خیال کرتا ہے، اللہ کس کو اچھوں
میں رکھتا ہے یہ بندہ نہیں جانتا، تم نے مجھے کہا..... یہاں
مجھ سے اچھا بھی ہے، میں اسے کہوں گی۔“

”ان سے اچھا اور یہاں؟“ صفہ کا دل نہ
مانا۔ پھر رک کر حکم دیا۔

”صفہ..... اندر چھپکے میں گھڑولی رکھی ہے، مجھے
پانی پلاؤ..... خود بھی پی لو.....“ صفہ نے اندر قدم رکھا

ہی تھا کہ نیند سے جھوکی شبنام آئی دھلائی دی۔
 ”پانی، پانی.....“ دو خشک گھٹے سے کھائیں رہی تھی۔
 ”میں دیتی ہوں۔“ صفہ نے کھڑولی اتاری،
 آب خورہ بھر کر شبنام کو دیا اس نے کھڑے، کھڑے خالی
 کر دیا..... ایسی وحشت کی پیاس تھی کہ یہ تک نہ کہا میں
 خود بھر لیتی ہوں حالانکہ وہ بخاری باجی کے ہاتھوں سے
 پانی لے کر بھی نہ پیتی..... پانی پی کر کہا۔

”اذان کو بھی دینا ہے..... لاؤ میں یہ لے جاتی
 ہوں۔“ کیسے پیاس انسان کو خود غرض کرتی ہے یہ بھی
 نہ سوچا صفہ یہاں کیا لینے آئی تھی۔

”ظہر، شبنام..... میں اماں صاحبہ کے لیے نکال لوں۔“

”کوئی اور پانی نہیں ہے اور..... اند میرے

میں چاہی نہیں چلتا..... مجھے اتنی پیاس ہے کہ میں سارا

پانی پی لوں.....“

”یہ..... میں نے ایک ڈولی اماں کے لیے نکالی

ہے..... باقی لے جاؤ..... مگر دھیان سے برتنا..... ہم

اس پانی کے مالک نہیں ہیں۔“

شبنام نے منہ ہی منہ میں کوئی ہاں نہ کی اور کھڑولی

لے کر چلتی بنی..... اذان نے پانی مانگا تو پانی لفظ کان

بڑتے ہی منگرو نے بھی یا نگ لیا۔ صفہ کے لیے پانی

نہیں بچا تھا۔ مگر ایک تلی تھی کہ صبح کنوئیں پر جاتا ہے،

اماں نے پانی پیا اور چٹائی پر لیٹ رہی، وہ ایک انگلی

کھڑی کر کے آسمان کی طرف ہلاتی رہی..... صفہ سمٹ

سمٹا کے پاؤں کی طرف بیٹھ رہی۔

”ذرتو مدت ہوئی نہیں لگتا، ڈر کو قنب لگانے کے

لیے کزور مقام چاہیے ہوتا ہے، میرے پاس نہیں جانے کا

کچھ نہیں ہے، بڑھی پھوٹیں غریبی، دستارِ جطر، جبہ، بجا جاز

ہے..... مگر فکس ان میں بھی کمر مار کر دیک جاتا ہے۔“

صفہ کے اندر سے آواز آئی۔ ”کچھ پانی مل جاتا۔“

”سب کو کہہ رکھا ہے..... حکم دے رکھا ہے،

میں مر جاؤں تو اس ریت کے ذروں میں شامل ہونے

دینا..... جو کسی نے جھنڈا گاڑا، نشان بنایا تو کنواں سوکھ

جائے گا.....“ اپنی دھمکی پہ وہ خود نہیں۔

کنواں سوکھ جائے گا کہہ آیا؟ ان کو اندازہ ہی
 نہیں پیاس کیا ہوتی ہے۔“ صفہ اپنی مرشد کی پیاس سے
 پیاس نہ ملا سکی۔

”بھگوان والے بولے بھگوان نہ کرے..... جنم

والے بولے اللہ نہ کرے..... صلیب والوں نے سینے پر

صلیب کھینچی..... اچھی عورتیں ہیں بیچاری، کام میں جی

رہتی ہیں نمود و نمائش نہیں..... نیت سیدھی ہے، راضی

برضا..... تھوڑے پر قانع، رحمت کی آس پاندھے رکھنے

والیاں، اب دیکھو بارش کی دعا کون نہیں مانگتا، بندے تو

بندے چرند پرند، جھاڑ گھاس تک مانگتے رب کی طے شدہ

رمز میں ایک رمز جنرافہ بھی ہے..... اس میں تبدیلی عقل اور

عمل سے لائی جاتی ہے..... رب چاہتا ہے کہ اب وہ عقل

استعمال کر دو جو میں نے دی..... اور عمل کرو۔“

پیاس کا صحرا کر بلا، کتنے پیارے، رب کے

پیارے، نبی کے پیارے، جگ کے پیارے، ننھا سا

پیارا، جوان سا دلدار، اندر والیاں، باہر والے، کاش

ایسا نہ ہوتا، پانی تو ہوتا..... صفہ کی سوچیں پانی کھوجتی

اس مرکزی بیج تک جا پہنچیں..... اسے خود خبر نہ تھی اور

اس کی دونوں آنکھیں آنسو برسا رہی تھیں..... کسی نے

کندھے سے بلایا۔

”اے..... اے.....“ وہ ڈر کے

چوکی..... ہلکی تھی..... پانی کی بوتل لیے کھڑی تھی۔ اس

کی طرف بڑھا کے بولی۔ ”لو.....“ اور اب صفہ نے

بالکل شبنام کی طرح لپک کر بوتل لی اور غنا غٹ پینے

لگی..... نہیں سوچا کہ پانی والی اماں سے اجازت

لوں، پانی لا کر دینے والی کا شکریہ ادا کروں..... اور یہ

بھی نہ سوچا کہ اس کو خیال کیونکر آیا..... ہلکی اب آرام

سے اماں کے پیچھے جگہ بنا کے سو بھی گئی تھی۔ اب اماں

سے نظری، عجب طرح سے وہ مسکرائیں۔ جیسے کہہ رہی

ہوں ”مجھ سے اچھی مل گئی ناں؟“ پھر کہا۔

”صفہ، اتنی باتیں، رات بھر میں کبھی کرتی

نہیں..... تم بہت دور سے آئی ہو..... تم باہر نکلنے والی

نہیں ہو۔ شاید ہم پھر کبھی نہ ملیں۔ میری بات سنتی

طبیات، تابعیات (اطاعت کرنے والیاں) مبشرات..... یہ خوشبو چاروں اودر پھیلی ہے.....“

”یا آقا مرشدی..... میں کس میں ہوں؟“

”تمہارے آس پاس چاروں خوشبوئیں ہیں۔“

”چاروں؟“ (ہم تو تین ہیں) صفہ نے بہت

سوچا، دور تک سوچا۔

”مبشرہ تو ہو جاتی ہے کوئی با نصیب.....“ پھر

ایک دم لہجہ معمول پر آ گیا۔ ”ناشتا کرو..... تمہیں دیر نہ

ہو تو بہتر ہے۔“

منکر یو بھی کہہ رہا تھا جتنی جلدی ہو سکے واپسی کا

سزا اختیار کر دو..... ناشتا آ گیا تھا۔ کھجور کی چمڑیوں سے

سنے روئی دان میں روٹیاں، لسی کا جگ، رکابی میں ملی

جلی دال تھی، ناشتا لانے والی مقامی عورتیں مہمانوں کو

دیکھنے کے شوق میں بیٹھ گئیں۔ اماں صاحبہ نے انہیں

بھی کھانے کی دعوت دی مگر انہوں نے ہاتھ باندھ کر

انکار کر دیا۔ شاید یہ شکر ہے کا اشارہ تھا۔ بجلی کی اوٹ

میں بیٹھے مردوں میں کوئی مقامی مرد سرائیکی سندھڑی

رہی لی بولی میں بول رہا تھا۔

”تھرو دی پچان چار چیزاں، ریت، اونٹ،

اکوڑ، زقوم۔“

”اکوڑ کیا؟“ اذان کے پوچھنے پر بتانے لگا وہ

پھول جو انہوں نے کنویں کے گرد دیکھے ہوں گے

(سفید پھول بینٹنی کنارے)

”کنویں والی جگہ کتنی اچھی ہے، ٹھنڈک اور

سکون..... مگر دھوپ تو وہاں بھی آ جاتی ہوگی۔“ لسی پی

کر گلاس رکھتے ہوئے شبانہ کی آواز نے متوجہ کیا۔

”صحرائے دور روپ ہیں مجھتی جہالی، بھسم کر دیے

والا جہالی۔“

اماں صاحبہ نے دو کھونٹ بھر کر لسی کا گلاس رکھا۔

وہاں پینے والی چیزیں ٹھہر، ٹھہر کر پیتے تھے، صفہ نے ان

کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”میں یہ لے لوں؟“

”اوں ہوں..... تم ایک دفعہ لے چکی ہو.....“ یہ

اشارہ کب اور کس طرف تھا۔ صبر دہ دونوں جانیں

تھیں۔ پھر وہ شبانہ کو مخاطب میں شامل کر کے بولیں۔

”یہاں کچھ عورتیں رلی، جازم، قالین بناتی ہیں

مٹھی میں بیچتی ہیں۔ وہ لیتی جاؤ، سیکہ نہ ساند کو پچھا دیتا۔“

شبانہ نے تین زریاں خود خریدیں۔ منجہ باجی، بخاری

باجی اور عبد اللہ کے لیے..... ”عبد اللہ، منجہ؟“ یہ نام

کان پڑے تو جیسے صفہ کو بہت اہم بات یاد آئی..... اماں

صاحبہ نے اسی وقت ہلکی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر صفہ کی

طرف اشارہ کر کے کہا۔

”دعا کر.....“

ہلکی نے اپنا پھنا پرانا پوچھٹن (دو پٹا) پھیلا دیا

جیسے خیرات مانگتے ہیں۔ یہ نہ پوچھا کہ کیا دعا کروں؟

”مجھ سے اچھا بھی یہاں ہے میں اسے کہوں گی۔“ کانوں

میں گونج اٹھا۔ اب صفہ کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر

تھا۔ اماں صاحبہ اس کے کان کے پاس منہ لا کر جانے کیا

کہہ رہی تھیں اور وہ آنکھیں بند کیے مل رہی تھی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے..... کون کس کے لیے دعا

کر رہا ہے.....“ شبانہ کے چہرے پر سوال تحریر تھا۔ اور

یہ عام تمام سی میلی عورت جو کچھ نہ کچھ گاتی رہتی ہے، یہ کیا

دعا مانگے گی، دنیا عجب خانہ ہے، شبانہ کی تربیت ایسی

تھی کہ دخل اندازی یا مذاق اڑانے کا تصور نہ ہوتا تھا۔

اسے صفہ بخاری کی معرفت کا یقین تھا۔

وقت رخصت آ گیا تھا۔ شہر یار منکر یو نے

بحفاظت سفر کی دعا مانگ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی

تھی۔ شبانہ اب مقامی عورتوں سے ملنے لگی۔ صفہ کو چند

آخری پل راز و نیاز کے مل گئے۔

”مرشدی..... اس کا مقام کیا ہے؟“

”میں نے ایک ممبر کیا تھا..... اس نے چہ

کے.....“ اب پوچھنے کو کچھ تھا بھی تو وقت نہیں تھا۔ صفہ

نے دہ پوچھا جو مزید کا وقت دیتا۔

”اب کب ملیں گی آپ؟“ یہ سوال ایک آنسو تھا۔

بے ڈھنگے، بے رنگ ملیوں میں سفید بالوں والی

بڑھیا نے اپنے جیسے بے رنگ چوٹے والی ”جوان

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء (113)

پہلی بار عطا ہوئی مگر ان لفظوں کے ساتھ۔
 ”صفہ..... ہم تم رخصت ہوئے۔“
 بعد کوئی چیز گری، ٹھکنے کے آواز نے سکوت توڑا۔
 ”اچھے لوگ ہیں مہمان نواز.....“ منکر پوچھا۔
 ”اللہ کی شان ہے، پانی نے بستیاں ببار بھی پڑیں
 اس لقمہ دہن میں....“ اذان کی آواز آئی۔
 ”مجھے تو ایسی گہری نیند آئی، صبح اٹھ کے اتنی
 شرمندہ ہوئی، آپ نیچے سوئی تھیں، اماں صلیب نیچے
 سوئیں۔“ شبانہ، صفہ سے مخاطب تھی۔
 ”زمین پر نہیں سونا چاہیے، سانپوں کا خطرہ ہوتا
 ہے۔“ اذان نے کہا۔

صفہ، شبانہ کے جواب میں بے جا ہی مسکرائی۔
 دل اتنا ادا اس کبھی نہیں ہوا تھا۔ دل جیسے پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ
 یونہی باہر دیکھے جا رہی تھی۔ پہلی بار ایک ریت کہیں، کہیں
 خود رو جڑی بوٹیاں، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ..... پانی کے
 لیے جاتی عورتیں..... آتے اور جاتے ہوئے وہی ایک
 سی زندگی تھی..... شاید زندگی ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے۔
 پھر وہ جگہ آئی جہاں انسانوں کی لمبی قطار ایک
 رے کو پکڑ کر کھینچتی تھی۔ دن کے نو بج رہے تھے اور نوکری
 دوپہر کا راج شروع ہو گیا تھا۔ جیب کو گزرتا دیکھ کے
 لوگ رک کر دور تک دیکھتے تھے۔ گرم خشک سفر بھی، کبھی
 کسی بات اور زیادہ تر خبر کی دعا کے ورد کے ساتھ جاری
 تھا۔ مٹی کے قریب موبائل کے سکلنز ملنے لگے..... کچھ
 اور واضح ہوئے تو شبانہ نے عبد اللہ کو فون ملایا.....
 عبد اللہ کے طویل جوابات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ خوش
 اور پر جوش ہے، آواز تک بھی جاتی تھی۔ اس لیے شبانہ
 نے مٹی سے نکل کر کال ملانے کے وعدے پر بات ختم
 کر دی۔ مٹا کی بیاشت نے شبانہ کو تر و تازہ کر دیا۔
 قصبہ مٹی آگیا۔ یہاں جیب نے بھی اور جیب
 کے سواروں نے آرام کرنا تھا۔ لیکن ساند تک
 امانتیں پہنچانا تھیں..... اس کا ہاتھ منکر پو کے پاس تھا مگر
 پہلے وہ کسی ڈھنگ کی جگہ رک کر خود کو تر و تازہ کرنا
 چاہتے تھے۔ چند گھنٹوں کے لیے ہوٹل کے دو کمرے
 بک کر آئے، دونوں خواتین نے خود کو مہاسے آزاد کر

دل ایسے دھڑکا جیسے ٹھکانا چھوڑ دے گا..... بھونچکا
 بے روح، بے حس و حرکت کھڑی رہیں۔ پاؤں اپنی جگہ
 سے آگے حرکت کرتے تھے نہ پیچھے..... کوئی واضح عندیہ
 دے دیا گیا تھا۔ صفہ نے شبانہ کی طرف رخ کر کے ابھی
 کہنا ہی تھا کہ ”میں نہیں جاؤں گی، تم جاؤ..... مجھے بھول
 جاؤ۔“ کہ محترمہ عائشہ صبیحہ کے لہجے میں حکم آیا۔
 ”صفہ تم جاؤ.....“

اس کا رخ ادھر سے ادھر مڑا۔ حکم رخصت کا تھا
 قیام کا نہ تھا..... اور وہ لانا لٹکانے ہو کے جھکی کو پلٹ گئی تھیں۔
 وہ پشت کر کے جانتی تھیں یہ رو رہی ہے، یہ پشت دیکھے
 جانتی تھی مرشد غم زدہ ہے..... دونوں کو حکم نقدیر تسلیم کرنا
 تھا..... شبانہ نے بت بنی صفہ بخاری کو متوجہ کیا۔
 ”آئیں بخاری باجی..... آئیں..... دھوپ چڑھ
 جائے گی۔“ وہ گاڑی تک آگئی۔ شبانہ اشیائے ضروریہ،
 پانی، کھانے کی فراہمی کے متعلق پوچھ رہی تھی۔ صبح کی
 چمک گرد و نواح کو واضح کرنے لگی تھی۔ صفہ کی گردن پیچھے
 دیکھتے، دیکھتے پلٹی نہ تھی۔ جیب اشارت ہو گئی تھی۔ وہ
 سامنے وہی بھٹی ”پانی واری ما“ بالکل ویسے کھڑی تھیں
 جیسے آتے سے انہوں نے دیکھا تھا۔

”کھڑی ہوں میں بیکڑی.....“ ہر آواز بیکڑی
 ہے..... ہر ہندی بیکڑی ہے..... ہر روح بیکڑی ہے۔
 وہ جا رہے تھے یا آ رہے تھے؟ صحرا آوازیں دیتا
 تھا، صحرا کی آواز اور باس الگ ہوتی ہے، صحرا میں جیسے
 خدا بولتا سنا کر دیتا ہے، صحرا حریص نہیں اس میں لو بھ
 نہیں، اس میں حسد نہیں، شوق، چڑھت نہیں اپنے
 آپ میں مست، مگن رہتا ہے، مبرور مبر..... کھنن در
 کھنن..... تنہا جینے کا سبق پڑھانے والا، تارک الدنیا
 کا من پسند سیارہ، گم کروینے والا..... سراب در
 سراب..... سراب واقعی ہوتا ہے دور کے دیکھے پر
 بھروسہ کرنا سکھانے والا..... جیب میں مکمل خاموشی

ڈالا..... اور بھی جو چمچ ان کے پاس تھا چمچ ڈالا۔ سلیم بھائی کو بھی جنون تھا، اللہ کا شکر ہے ہمارے گھرانے میں دھوکا، غریب، بے ایمانی نہیں ہے، سلیم بھائی کی اسی وجہ سے تو محترمہ اماں صاحبہ اتنی قدر کرتیں۔ یہ ان کا بڑا پرن ہے، عظیم تو اصل میں وہ ہیں..... آپ مل کر آ رہی ہیں! آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا..... پیاسوں، غریبوں کے لیے خود کوریت، مٹی کر ڈالا۔ کنویں کی کامیابی ہو گئی..... الحمد للہ

..... میں نے اتنی منت سماجت کی یہاں میرے پاس مٹھی آجائیں، مدرسے میں طالبات کو میں تجوید، تفسیر، حدیث پڑھاتی ہوں، دو استانیات اور بھی ہیں، ناظرہ قرآن والے بچے بہت ہیں..... میں انہیں صدر معلمہ کی پیشکش کرتی رہی مگر.....“

”مکرمات تو سیدھی ہے سیکنہ ساند اگر انہوں نے ملازمت جاری رکھنا ہو تو اتنی بڑی درس گاہ کیوں چھوڑیں۔“

”سبحان اللہ.....! آپ نے خوب کہا مگر میری دینی بہن! علم والے کو علم کا چشمہ جاری رکھنا چاہیے۔“

دنیا کے اصولوں کے موافق وہ درست کہہ رہی تھی۔ صفہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ پانی والی اماں صاحبہ کے روحانی مقام سے آگاہ نہیں، ایک بچی ”امی“ بلاتی ہوئی اندر آئی۔ شبانہ نے روک کر پیار کیا۔

”آپ کی بیٹی ہے ماشاء اللہ.....!“

”الحمد للہ..... میری دو بیٹیاں ہیں، یہ چھوٹی ہے۔“ سیکنہ نے اس کا اسکارف کھینچ کر ماتھے پر درست کیا۔ شبانہ کا لایا ہوا بڑا اشاپرکھول کر چادریں وغیرہ مگن کر الماری میں سنبھالنے شاپر تک یہ لگا کر اندر کھنے کے بعد الماری کو تالا لگا کر اس نے مدرسہ دیکھنے کی پیشکش کی۔

مدریس والے کمرے کی دیوار پر باہر کی طرف ”مدرسہ البنات“ لکھا تھا۔ آنگن میں چھجور کا جڑواں درخت تھا۔ اس کے چھدرے سائے میں چپائیاں پکانے کا تنور تھا۔ مٹی کی پرات تنور پر اونٹنی رکھی تھی کیونکہ یہ روٹی کا وقت نہ تھا۔ تنور کے ساتھ والی دیوار پر ایک کوا کائیں، کائیں کر رہا تھا۔ کیونکہ تنور کے پاس سوچی روٹی کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ سیکنہ ساند نے ٹکڑا اٹھا کر

کے منہ پکھا کھول کر آرام کیا۔ کھانے پینے کی سادہ شے نہ رہی۔ ایسی گہری نیند آئی کہ دستک پر ہی آنکھ نمکی۔ دو کھٹے گزر گئے تھے اذ ان کھانا لایا تھا۔ انہوں نے وضو کیا نماز ظہر ادا کی۔ کھانا کم ہی کھایا گیا۔ اب وہ سیکنہ ساند کے گھر جا رہے تھے۔

وہ ایک درمیانہ درے کا پکا مکان تھا۔ جس کے باہر درخت بھی تھا۔ استانی سیکنہ ساند کا نام یہاں اکثر جانتے تھے۔ وہ دروازے پر کے، تدریس والے کمرے میں صفہ اور شبانہ جبکہ بیٹھک میں مردوں کو بٹھا گیا۔

سیکنہ ساند سانولے رنگ کی دہلی پتل چھتیں ساہ شادی شدہ عورت تھی۔ محبت اور تپاک سے مٹی۔ ایک لڑکی ٹھنڈے شربت کے گلاس رکھ کر سلام کر کے چلی گئی۔

شبانہ نے اپنا اور صفہ بخاری کا تعارف کرانے کے بعد سستی سے بیجا گیا مال اس کے حوالے کیا۔ صفہ بخاری کے بارے میں یہ جان کر کہ وہ محترمہ عائشہ حبیبہؓ کی شاگرد رہی ہے، وہ بہت خوش ہوئی۔ اور زیادہ تر بات چیت اس سے کرنے لگی۔ شادی اور بچوں کی تعداد جیسے سوالات سے گریز کے پیش نظر شبانہ نے پہلے ہی بتا دیا کہ وہ بیوہ ہے اور بخاری بی بی غیر شادی شدہ ہیں۔

”کیا آپ بھی معلمہ ہیں؟“ صفہ کا جواب سیکنہ ساند کے لیے کچھ حیران کن تھا۔ وہ یقین کر رہی تھی کہ محترمہ کی یہ ذہین شاگرد سینئر معلمہ ہوگی بہر حال جب موضوع سخن محترمہ الاذہری کی پانی والی اماں بن جانے کی طرف پلٹا تو سیکنہ ساند کی دلچسپی، احترام اور ستائش بھر پور تھی۔

”انہیں دیکھ کے مجھے شروع دن سے لگا تھا کہ وہ الگ سی ہیں۔ ان کا وہ بے تو بہت تھا، سادہ اور نرناثیر رہتیں اور بوتیں..... چنانچہ کیسے انہوں نے مجھے دیکھ کر پہچان لیا میں تھر سے آئی ہوں..... مجھے بلا کر بات کی۔ میرے علاقے کا سن کر مسائل پوچھے..... پانی کی کمی، پانی کے وسائل یہ میرے انجینئر بھائی کی فیلڈ تھی..... بس انہوں نے اچانک ہی کنواں کھدوانے کا ارادہ کر لیا۔ ان کا کراچی میں اچھی خاصی مالیت کا گھر تھا۔ وہ بیچ

میں حاضر رہا۔ یہ سبھی اسی جذبے نے سکون گری اور سفر کی جھلکوں، آرام کی خواہش، کسی کا اچھا خواہ وہ خوراک ہو، تعلق ہو، مکان ہو، اپنا گھر اپنا ہو..... بے معنی سا ہوا۔ پانی کے گلاس... سب کرواتے ہوئی شبانہ نے اس سے پانی کا پوچھا جواب نہ پا کر گلاس سامنے کیا۔

”پانی پی لیں.....“

پانی پی کر واپس کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔
”کتنی دیر ہے؟“ گلاس تھا۔

”بس ایک گھنٹے کا سفر اور ہے.....“ انسان کو یہ منزل پر پہنچنے کی خوشی اور جلدی ہوئی ہے لیکن جسم سے شدہ منزل کے قریب ہونے کے خیال میں ہولناکی ہے ایسے میں کوئی آگے بتائے کہ بس ایک گھنٹے کی مسافت تو کیلچا منہ کو آجائے گا..... بچارہ انسان..... غیب کی رات تمام کے کیسے دن رات کرے وہ تو حاضری حیات کے پیدا ہوا ہے۔ اللہ افس کو معاف کر دیجو..... معاف ہو جائے کتنا ٹھنڈا ٹھنڈا آسودہ لگتا ہے۔

”آپ کس بات پر مسکرائیں بخاری باجی؟“
”ٹھنڈا پانی جو پیا ہے۔“ یہ بھی سچ تھا، شبانہ مسکرائے گی۔

”ہاں جی..... اور غیبہ باجی، عبد اللہ سے ملنے کی خوشی بھی تو ہے۔“ اب جیب گھر والی گلی کی جانب مڑ رہی تھی۔ صفحہ مسجد کے گنبد نظر آنے لگے تھے، مغرب کی اذان کی صدا..... ”آؤ نماز کی طرف.....“ شبانہ کے ذہن میں جو سوچ آتی کہہ دیتی تھی۔

”بخاری باجی..... اذان سننا کتنا اچھا لگ رہا ہے..... اذان کے بغیر دن خالی، خالی لگتا ہے۔“
”ہاں، شبانہ پیاری بہن.....“ پھر وہ اگلی سیٹ والوں سے مخاطب ہوئی۔

”منگرو بیٹا میں نے ماما جی کو فون کر دیا تھا۔ کھانے کا انتظام ہے، واپسی میں جلدی نہ کرنا..... نہانا آرام کرنا، رات گزار کر صبح جانا۔“

”ہاں جی بھوجی، اب تو بٹنے کی بھی سکت نہیں

کنوری کسی شاگرد لڑکی کو دے کر کہا۔“ پانی ڈال رکھو.....“ ہر علاقے کا ایک تمدن ہوتا ہے، زندگی جہاں بھی ہو کشش رکھتی ہے۔ مدرسہ دیکھ چکے کے بعد صفحہ نے مدرسے کے لیے، سب آبادیوں، بستیوں، گھروں، اداروں، لوگوں راستوں کے لیے پُر خلوص دعا کی۔ ہاتھ اٹھا کر شبانہ، سیکینہ ساند اور کچھ طالبات نے ساتھ دیا۔ چندہ بکس میں صفحہ نے نوٹ ڈالے، نوٹ نکال کر گئے نہ دیکھے، جتنے ہاتھ میں آئے والٹ سے نکال کر ڈال دیے۔ یہی وہ وقت تھا جب سیکینہ ساند کے چہرے پر سمجھنے کی کوشش اور آنکھوں میں متاثر ہونے کا عکس تھا۔ مزید سوالات کی نوبت نہ آئی۔ صفحہ نے اجازت لی۔ شبانہ کو سیکینہ ساند کا نمبر لے کر محفوظ کرنے کو کہا۔
”پانی والی اماں کی خیریت سے آگاہ کرتی رہیے گا..... اللہ جزا دے گا۔“

”انشاء اللہ العزیز.....“

ان کا بتایا سفر شروع ہوا۔ اب خشک بے آب و مکیاہ ریتیلے علاقوں سے رفتہ درختوں، کھیتوں اور آبادیوں کی طرف پیش قدمی تھی۔ جاتے ہوئے ہر کلو میٹر پر خود کو استقامت دلانے کی کاوش تھی، آتے ہوئے ہر کلو میٹر پر شکر ہی شکر تھا۔ اذان نے اپنے گھر فون کر کے خیریت کی اطلاع دی۔ پھر منگرو کا فون بجنے لگا۔ اپنوں میں لوٹ آنے کی اسٹگ نے سفر کی رفتار میں جوش سا پیدا کر دیا۔ شیشے کے پاس ہنسنے بستے آباد شہروں کو دیکھتے صفحہ نے گہری سانس لی۔ مل آنے کا احساس رگب جاں میں تقویت کا گھر وندا تھا۔ پھر ایک اخروی احساس کہ جب نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا، بندہ خوشی، خوشی اہل خانہ کی طرف آئے گا..... کیسا، کیسا خوش ترین وقت ہوگا..... ابدی تسلی اور..... اہل خانہ..... ایک بھرا، بھرا سا جذبہ اندر اترے..... جگر کے غم کو چھوڑ دو، ملنے کی مسرت چھوڑ دو، اس جگہ میں بس معاف کر دو..... سچ نکلے..... معاف کرتی جاؤ، غیب کے حاضر بننے سے پہلے غیب

”خالہ کی صحت کیسی ہے؟ ملے آئی ہوں گی۔“

صفہ نے پوچھا۔

”امی کی صحت ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے، ہماری جائیداد کے حسابات رچتے تھے کچھ اثاثے سیل کرنا چاہتی ہیں، ملنے تو آئی تھیں مگر پھر آبائی گھر چلی گئیں۔ سب کچھ منہ کرا آئیں گی۔“

”وہ تمہارے متعلق فکر مند ہوں گی ناں.....“

صفہ بولی۔

”تو بتا تو میرے متعلق کیا کہہ رہا تھا۔“ شبانہ، عبداللہ.... کو کہنی مار کے چکی۔

”ہاں عبد اللہ چاند، میں خوش ہوں، ہم سب خوش نصیب اور اللہ کے نوازے ہوئے لوگ ہیں، ہمیں اندازہ نہیں کہ اللہ نے ہمیں کتنا کچھ بنانا سکے دے رکھا ہے اور دے رہا ہے، مانگنا تو کجا ہمیں اس کا اور اک بھی نہیں ہوتا غیبہ باجی، ان دونوں زبان اور حلق ٹھنڈے پانی کو ترس گئے تھے۔ تازہ بے دریغ پانی سے نہانے دھونے کو ترس گئے تھے۔ پھر چولستان دیکھ لینے کے بعد پانی بہت قیمتی لگتا ہے۔“

عبد اللہ کے ہاتھ سے رخ بستہ بوتل پکڑی نہ گئی۔ اس نے دھیرے سے واپس رکھ دی۔ غیبہ منہ نکال ہو گئی، کہنے لگی۔

”تاریخ میں پڑھا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام حسینؑ کے فرزند حضرت امام زین العابدینؑ کے سامنے جب بھی پینے کو پانی آتا، اشکبار ہو جاتے۔“

”لا اکھوں درد و آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر.....“

”مجھے اپنی نماز کی جگہ پر لوٹنا شاد ماں کر گیا۔“

صفہ ٹپٹپ گئی۔

”خالہ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟ کیا کہتی تھیں؟“ شبانہ نے غیبہ سے برتن لیتے ہوئے پوچھا۔

”عبد اللہ کو سامنے پا کر حیران ہو گئیں..... کہنے لگیں یہ تو ننھا مولوی لگتا ہے۔ مگر جب اس نے انگلیں شروع کی اور لا کی باتیں کیں تو پھر کبھی نہیں بننا بنایا

”شبانہ، آج تو کھانے دے، عید یاراں ہے.....“

ایک چھوٹا بچہ لیا ہے۔ دلے میرا ہاضمہ کچھ بہتر ہو رہا ہے۔“

”تو، تو بہت اچھی بات ہے..... مگر احتیاط کرو۔“ صفہ نے سلا دلیا۔

”اس سے بھی بڑی خوشی کی خبر ہے میرے پاس۔“

”لیس ماما..... آپ وہ تو بتائیں۔“ عبد اللہ کولڈ ڈرنک کی بوتل کھولنے لگا۔ شبانہ نے اس کا ہاتھ روکا۔

”یہ چار دن میں شہزادے نے نئی، نئی عادتیں بنالیں۔ کولڈ ڈرنک کھانے کے ساتھ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ آپ تو جانتے ہو بیٹا۔“

”جی امی..... مگر آج تو آج ہے، سارے کام آج روٹین سے ہٹ کر ہو رہے ہیں، صفہ خالہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔ ماما نے ساکن لیا ہوا ہے اور آپ.....“

”اور میں کیا؟“

”ایک تو خوشی کی یہ خبر ہے کہ شبانہ کے لیے عربی بول چال کے پتھر کا انتظام ہو گیا ہے۔“ غیبہ جو سلا دلے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی۔ اس نے بات ٹوک دی۔

”میل بچہ ہے؟“

”ہاں صفہ..... مگر ادھیڑ عمر شریف بندہ ہے، ماہر مضمون ہے۔“

”نہیں غیبہ..... شبانہ کسی جماعت میں ہوتی تو حرج نہ تھا۔“

”ماما..... یہ گڈ نیوز تو آپ کی شوں ہو گئی.....“

عبد اللہ ہنسنے لگا۔

”میٹھا لے آئیں۔“ امیر بی بی کو جھوٹے برتن پکڑاتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

”میٹھا بھی ہے؟“ کہیں سے آواز آئی۔

شبانہ اور صفہ بھی اب دسترخوان سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں۔

”ماما..... اب دوسری گڈ نیوز بھی سنا دیں۔“ عبد اللہ نے یاد دلایا۔

”میری امی آئی ہوئی ہیں جرمنی سے۔“

جدا ہوا۔ پھر دروازہ پر پہنچا۔ دروازہ کھلا۔ وہ خاموشی سے اگلی اور لاؤنج کے صوفے پر جا بیٹھی۔ منشی
 ماما، عبداللہ کے ساتھ کھنکھار کے داخل ہوئے، دعا دے کر
 کونے میں منہ کر کے بیٹھ رہے، مسجد کے رنگ دروغن اور
 ہاتھ رومز کی مرمت کے متعلق تفصیل بتایا۔

”ایسٹلن کے کلرز کارڈ لایا ہوں..... رنگ آؤٹ
 ڈور کے لیے پسند فرمائیں۔“ کارڈ عبداللہ کو دیا پھر کہا۔
 ”ایک بات اور ہے پچھلے دنوں کوئی وکیل آیا تھا،
 آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں بی بی کا
 مختار عام ہوں اور بی بی گھر پر نہیں ہیں۔ اس نے ایک
 فائل دکھائی، عرصہ پانچ سال پہلے..... آپ کو شاید یاد
 ہو..... چودھری واصف فوت ہو گیا تھا۔ حادثے میں
 فوت ہوا تھا۔ چک نمبر ایک سو چھیالیس ایل میں اس
 نے چار کنال اراضی مسجد صفہ کے نام
 کرائی..... حادثے سے پہلے ہی کرائی..... اس کا
 موجودہ ریٹ تقریباً تین، چار کروڑ ہے، مرحوم کے تین
 بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ دارشین خاموشی سے یہ رقبہ
 آپس میں بانٹ لینا چاہتے تھے کہ ایک بیٹی نے یہ بات
 مشہر کر کے آؤٹ کر دی..... وہ بچی جو ہماری شبانہ کو
 انگریزی سکھانے آئی تھی ناں کیا بھلا سامنا تھا؟“
 ”طارم.....“ عبداللہ نے یاد دلایا۔

”مرحوم کی وہ بیٹی طارم کی..... سہیلی تو خیر
 نہیں، کالج والی تھی۔ تو..... اس کا مطلب ہے طارم نے
 کہیں مسجد یا بی بی کا ذکر کیا ہوگا۔ یوں دیکھا جائے تو وہ
 بیٹی انیس سال کی ہے ماؤٹنگ کرتی ہے۔ یہ اسی وکیل
 نے بتایا..... اس کے بھائی بہن مسجد کا حق ہڑپ کرنا
 چاہتے تھے، وہ اس کو بے غیرت کہتے اور بول چال
 نہیں تھی۔ اللہ جس کے دل میں نیک کام کی تو فیض ڈال
 دے اس کی مرضی.....“

”منشی ماما! مسجد میری ملکیت نہیں ہے، اسے
 ٹرسٹ چلاتا ہے۔“
 ”جی بی بی..... ٹرسٹی بھی آپ اور خجہ بی بی ہیں،
 باہم مشورہ کر لیں آپ.....“

بدرست رہے۔ آپ دروازے سے اگلی اور لاؤنج کے صوفے پر جا بیٹھی۔ منشی

اگلے دن اذان اور منگرو کو موسیقی پھلوں کی
 پیٹیاں و دیگر تحائف کے ساتھ محبت و شکر سے
 رخصت کیا۔ یوں یہ ہڑپ مکمل ہوا۔

فرصت پا کر منشی ماما نے سلام عرض کرنے کی
 اجازت طلب کی۔ منشی ماما اگرچہ کافی بوڑھے ہو چکے
 تھے، وہ ستاون سالہ صفہ بخاری سے ایکس بائیس سال
 بڑے تھے۔ مگر صحت درست تھی کسی قسم کی جسمانی
 معذوری عین تازگی نہ تھی۔ نگاہ کم پڑنے لگی تو کلمت پڑھت
 چھوڑ دی پھر بھی حافظہ اتنا اچھا تھا کہ یہ نیک بتا دیتے کہ
 پچھلے سال کس بارخ سے کتنا پھل اتر ا تھا، عشر کتنا
 بنا..... موجودہ گزشتہ میں نفع یا نقصان کیا ہے، عمر بھر
 دیانت داری سے کام کیا تھا بلکہ مٹا ل کھایا تھا اور بخاری
 صاحب مرحوم کی بیٹی سے با احترام وفاداری کی تھی۔

آنے والے جمعے سے مسجد صفہ میں رنگ دروغن کا
 کام شروع کر لیا جا رہا تھا۔ اس ضمن میں بھی منشی ماما کی
 بات چیت متوقع تھی۔ ادھر سفر سے واپسی کے بعد شانہ
 کو بخار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ منشی
 ماما، عبداللہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ صحن میں رکھی
 کھٹولی پر بیٹھا تھا کہ چھوٹا گیٹ کھلا۔

”شانہ ہے؟“ کسی خاتون نے جھانک کر پوچھا۔

”وہ بیمار ہے سو رہی ہے۔“ سر اٹھائے بغیر منشی ماما
 نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر تک مذبذب میں ٹھہری پھر کہا۔

”ان سے کہہ دیجئے کہ طارم کی امی آئی تھی۔
 ویسے مجھے خالہ غسالہ بھی کہتے ہیں..... (وہ ہنس پڑی)
 پھر آؤں گی۔“ وہ چلی گئی۔

منشی ماما کو اس کے نام سے دلچسپی تھی نہ آنے
 جانے سے۔ عبداللہ کے آتے ہی اسے بلایا۔

”پتر ادھر آ..... جا کے اپنی بخاری خالہ کو خبر
 کر دے کہ منشی ماما حاضری کی اجازت مانگ رہا ہے۔
 وہ اجازت دے، دے تو پھر آ کے میرے ساتھ چل۔“
 عبداللہ نے کتا بیس میز پر رکھیں اور منشی ماما کا فرمان

”میں تو یہ سوچتا ہوں کہ مرنے والا اپنے لیے جاریہ نیکی کے تحت یہ فیصلہ کر گیا۔ اس پر عمل ہونا چاہیے..... رقم کافی بڑی ہے، مسجد کیوں رو کرے۔“

”ہاں جی صفہ خالہ..... مسجد کو سنٹرل ایئر کنڈیشنڈ کروالیں گے اور دائیں طرف والے نور انصاری اگر مکان بچیں تو شامل کر لیں گے۔“

”عبداللہ، آپ خاموش رہیں یہ منصوبہ بندی قبل از وقت ہے۔“ صفہ کے منع کرنے پر وہ چپ ہو کر مٹی ماما کو دیکھنے لگا جو پہلے ہی خاموش تھا۔

”بھئی ماما..... آپ کی طبیعت کیسی رہتی ہے؟ راتوں میں آپ کو اکثر کھانسنے سنتی ہوں..... آپ بہتر علاج کرائیں رُم کا مسئلہ نہیں۔“ بات پلٹ دی گئی تھی۔

”بخاری بی بی..... اس عمر میں کھانسی آثار زندگی ہوتی ہے، ویسے میں ٹھیک ہوں..... کھانا بس جینے جوگا..... پیٹ کو سہولت، سانس کو سہولت.....“

”آپ کا ساتھ ایسا احسان ہے جس کا بدلہ میں نہیں دے سکتی۔ اللہ دے گا۔“

”اللہ مہربان ہے، اللہ آپ کی دعا سے مجھے بخش دے..... اچھا بی بی پھر میں چلتا ہوں، آپ مشورہ کر کے مجھے حکم دے دینا۔“ بھئی ماما سلام عرض کر کے چلا گیا۔

صفہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی جیسے کسی کی تلاش ہو، وہاں تو ایک چار بائی تھی، نیچے ایک ایسی جا نماز جس کے پاؤں رکھنے کی جگہ سے تیلیاں گھس گئی تھیں، دو کرسیاں اور ایک میز، میز پر قرآن پاک، رحل میں رکھا ہوا، پانی کا گلاس، پانی کی بوتل..... ”پانی والی اماں، پانی والی اماں..... میں آپ کی گود میں سر رکھ کر رونا چاہتی ہوں۔ اس رونے پر رونا چاہتی ہوں کہ میں کیوں نہ روئی.....“ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئی..... مجھے تو اماں، جان کے زانو پر سر رکھ کے سوتا ہے سو جانا ہے..... میرا خالہ کہتی ہیں الماری کھول کر نیلے ڈبے کے پیچھے سے اٹھا لو..... وہ میرا پیلا دوپٹا تھا..... جب وہ میرے

پاس بیٹھتا تو وہ دھچکا بخورتا..... میری اماں جان کو مجھے حشر میں بھی گود میں سر رکھ کے روتے نہ دیں گی۔ جب تک مجھ سے اس کا جواب طلب نہ کر لیں..... مگر میں نے تو بھلا دیا تھا۔ بھلا دینا بہر حال سچ نہیں ہوتا..... میری ساری حیاتی اس ایک دوپٹے پر رک گئی..... وہ دوپٹا ایک واقعہ بن گیا جس کے محور پر عمل، رُو عمل کا تانا بانا بنا جاتا رہا..... تو یوں مقدر رقم ہوتے ہیں..... ایک مرکزہ اور..... زوال و عروج، بعد و مابعد..... اماں جان اور میرے درمیان یہ دیوار کب تک ہے..... کتنی دیر کے لیے ہے..... جتنی دیر میں اوپر نہیں اُٹھتی..... جتنی دیر دیوار نہیں گرتی..... جتنی دیر درمیان وقت ہے۔ کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک دے کر عبداللہ نے جھانکا۔

”صفہ خالہ..... میں شبانہ امی کو لے کر کلینک جا رہا ہوں.....“ اس نے سر ہلا دیا۔ پیچھے ہی نخبہ آگئی۔

”یہ نہیں پوچھا..... کس کی گاڑی میں؟“

”کس سے پوچھوں؟“ وہ ذہنی طور پر حاضر نہ تھی۔

”عبداللہ اور شبانہ گاڑی میں ڈاکٹر کے کلینک جا رہے ہیں۔“ نخبہ نے مکمل وضاحت کی۔

”کیوں.....؟“

”صفہ.....“ نخبہ حیرت سے پکاری، گلاس میں پانی ڈال کر بڑبڑایا۔

”پانی؟ پانی تو نہیں مانگا.....“ اس نے گلاس لے کر رکھ دیا۔

”شبانہ کو بخار ہو رہا ہے تیز.....“ نخبہ نے پھر اطلاع دہرائی۔

”میں دیکھتی ہوں.....“ وہ اٹھنے لگی۔

”کیا دیکھتی ہوں پیاری بہن..... وہ ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔“

صفہ نے گلاس اٹھایا آنکھوں پر پانی کے چھینے مارے پھر کہا۔

”میں نے عبداللہ بیٹے سے کہا تھا کہ شبانہ امی کی دوائے آؤ.....“

شبانہ بن کر مل گئی۔

”یہی تو عبداللہ بتائے آیا تھا۔“

”اتنی لاڈ بھری باتیں سن کر شبانہ ای خوش ہو گئی ہیں۔“

”شبانہ..... سر بیض کی دعا قبول ہوتی ہے، تم خنبہ

کے لیے دعا کرو، عبداللہ کے لیے دعا کرو، میرے لیے

دعا کرو..... فشی ماما کے لیے دعا کرو۔“

”میں ان سب کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں باجی۔“

”کیا کھایا ہے؟“

”میری زبان کا ذائقہ بہت کڑوا ہے..... کچھ

اچھا نہیں لگتا۔“

”سیب کاٹ دیتی ہوں، کوئی پھل جو کھو منگوادوں؟“

”اگر آپ کہتی ہیں تو سیب کھا لیتی ہوں.....“ عبداللہ

... لپک کر سیب تھالی میں رکھ کر چاٹو لے آیا..... وہ چاہتا

تھا صف خالہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہیں شبانہ نے خود

کاٹنا چاہا مگر صف کے روکنے پر اسے کاٹنے دیا..... سیب

کی قاشیں بناتے ہوئے صف شیریں گفتار ہوئی۔

”حضرت ام العلاء بیان کرتی ہیں کہ میں بیمار تھی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کو تشریف

لائے اور فرمایا اے ام العلاء خوش ہو جاؤ کیونکہ مسلمان

کی بیماری کی وجہ سے اللہ اس کے گناہ اس طرح ختم

کروتا ہے جس طرح آگ سونے اور چاندی کی میل

ختم کر دیتی ہے.....“

”جراک اللہ..... آپ نے مجھے دُہری خوشی

دی، آپ نے میرا خیال رکھا، مجھے حدیث سن کر خوش

کیا..... سچ میں، میری آدمی بیماری ختم ہو گئی۔“ پھر فشی

ماما کی کھٹکیاں اور چاٹ سنائی دی تو وہ اٹھ گئی۔ فشی ماما

نے آن کر بیٹھی کا حال پوچھا۔

”پتری، تمہیں بی بی نے چودھری داصف مرحوم

کے عطیے کی بات بتائی ہے؟ مجھے یقین ہے نہیں کی

ہوگی۔“ شبانہ کی لاعلمی کے اظہار پر انہوں نے تمام

بات کہہ سنائی۔

”مسجد کا پیسہ پائی، پائی کے حساب سے مسجد پر

ہی خرچ ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے قبول کر لینا چاہیے۔“

”ماماجی..... قانونی طور پر رقم ٹرسٹ میں آئے گی۔“

”ابو نے لے گیا ہوگا.....“ ان کی پرانی گاڑی پرانا بوزھا

ڈرائیور جس کو کبھی، کبھار گاڑی چلانے کا موقع ملتا تھا۔

”مما جب آنی تھیں تو ہمارے لیے نئی گاڑی

کیراج میں چھوڑ گئی تھیں۔ پرانی والی کو لے گئیں.....

کہا تھا اسے بکوا دوں گی۔“

”نئی ہو یا پرانی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لو

جی صف کو اس بات کی پروا تک نہیں ہوئی۔ لوگ نئی

گاڑی کی خوشیاں مناتے ہیں۔

”دب آنس گی ماما؟“

”پرسوں آئیں گی۔“

”شبانہ جب آئے مجھے کھلوا دیتا۔ میں اب نہانا

چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھ گئی۔

”شبانہ کا بھی یہی حال تھا، سفر سے آ کر دن میں

دو دو دفعہ نہاتی ہے وہ، اب تو موسم خاصا خشک

ہے..... گیزر چلوادوں۔“ وہ انکار میں سر ہلا کر مسکرائی۔

شبانہ کی طبیعت اب بہتر تھی، وہ اپنے کمرے

میں لیٹی تھی، برابر والے بیڈ پر عبداللہ بیٹھا انگریزی

پہیلیاں بچھوارہا تھا۔ پہیلیاں کیا تھیں ادھوری سطریں

اپنی مرضی سے بامعنی الفاظ کا کرملل کی جاتیں۔ شبانہ

تھوڑی دیر ساتھ دے کر تھک گئی۔

”بیار ماں کو تھکا رہے ہو..... کوئی آسان ٹیم کھیلو۔“

ہنستے، ہنستے عبداللہ دروازے کی طرف دیکھ کر ختم سا گیا۔

شبانہ کی نگاہ نے تعاقب کیا۔ صف اندر داخل ہو رہی تھی۔

”صف خالہ..... زبے نصیب۔“ عبداللہ ایک دم

شرارتی ہو گیا۔ وہ مسکرائی۔ صف نے شبانہ کی پیشانی پر

بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اشارہ دیا۔ وہ اٹھنے لگی تو منع

کیا۔ اس کے بستر کی پائنتی پر بیٹھنے لگی تو شبانہ خوب انھی۔

”بخاری باجی، پلیز مجھے گناہ گار نہ کریں۔“

”تم کیوں گناہ گار ہو گئی، یہ باتیں گناہ نہیں

ہوتیں، اللہ تمہیں صحت عطا فرمائے۔ تم میری بہت

بیاری بہن ہو، تم ہی تو اس آنگن کی چکار ہو.....“ اچھی

اور امید والی لطف باتیں تیار داری کا حصہ ہوتی ہیں،

کے۔“ پھر وہ بتانے لگا کہ اذان کو بھی بخار ہو گیا ہے۔

”اور ہاں سندر کی کا فون آیا تھا۔ تم تو جانتی ہو وہ بات کیسے کرتی ہے۔۔۔۔۔ مجھ سے بگڑنے لگی آپ تو بڑے بڑھے ہیں، آپ ہی سمجھداری کر لیا کریں۔ قتل صحرا میں میرے بچے کو بیچ دیا۔۔۔۔۔ پتا نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے بخاری باجی نے ایک تم نوکر ہو، دوسری شبانہ۔۔۔۔۔ زندگی اس کے تانے لگاکے بیٹھی ہے، تیسرا اذان تیار ہو رہا ہے۔“

”یوں کہہ رہی تھی وہ؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ یہی الفاظ تھے۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”کیا کہتا۔۔۔۔۔ خیر ہے، گھر بیٹھے بھی بخار ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ ایسے بات نہیں کرتے، سمجھایا اسے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔۔۔۔۔ رہی بات میری۔۔۔۔۔ تو میرے لیے صفہ بخاری اپنوں سے بڑھ کر ہے وہ میری ماں، بہن، بہن سب کچھ ہے پھر میرا یہ اونہار تاجدار پیارا بیٹا ہے۔ یہ میرا سہارا ہے، مجھے یہاں کیا نہیں ملا۔“

”اللہ اسے نیک صالح بنائے۔۔۔۔۔ پترتی۔۔۔۔۔! میں نے سنا ہے تم عبداللہ کے ساتھ مصر چلی جاؤ گی۔“

”قادر،“ منشی ماما جان۔۔۔۔۔ میں جامعہ الازہر میں ایڈمیشن لوں گا، میں لائسنس قانون پڑھوں گا۔۔۔۔۔ ہر مذہب کا لا۔۔۔۔۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر یہ جھلی وہاں کیا کرے گی؟“

”ماماجی۔۔۔۔۔ میں اب جاہل جھلی نہیں رہی۔۔۔۔۔ عربی سکھاتی ہے۔۔۔۔۔ پھر میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔“

”پھر بھی۔۔۔۔۔ تو کرے گی کیا؟ تو بھی جامعہ میں داخلہ لے گی؟“ دونوں کو منشی ماما کی سادگی پر ہنسی آگئی۔

”میں اپنے بچے کا خیال رکھوں گی۔۔۔۔۔ اس کی گارڈین (سرپرست) ہوں گی۔“

”رہی ناں جھلی۔۔۔۔۔ بچہ تو ہاشل داخل ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تو کیسے خیال رکھے گی۔“ اس سوال کے جواب پر شبانہ نے غور نہیں کیا تھا۔ اسے یہی پتا تھا کہ بخاری باجی بیسے گی تو بہتری کے لیے ہی ہوگا۔

”آپ کیوں چلتے ہیں، سوتے تو آپ جلدی نہیں ہیں، منشی ماماں جان۔۔۔۔۔“ عبداللہ اپنی کتابیں سیٹ کر رہا تھا۔

”آرام تو کر لیتا ہوں کمر سیدھی کر کے۔“ وہ چلے گئے۔

”شبانہ امی۔۔۔۔۔ آپ بھی سو جائیں۔۔۔۔۔ میں

یہ ٹیبل لیپ جلا کے لائٹ آف کر دیتا ہوں۔“ شبانہ نے کردٹ بدل کر کبل اور پر کھینچ لیا۔

☆☆☆

اب موسم خشک ہو چکا تھا۔ اسے کی بند ہو گئے تھے، پتھروں کی البتہ ضرورت رہتی، نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔ نخبہ نے آج خیرات کے طور پر بریانی کی دیکیں اتروائی تھیں۔ امیر بی بی حملہ بھر میں جاننے نہ جاننے والوں میں بانٹ رہی تھی۔ گاڑوں سے نئے موسم کا تازہ ساگ کاٹنے، دھونے، ابالنے کے مراحل کے بعد بھیجا گیا تھا۔ شبانہ اسے دیکھی تھی، سوکھی مریج کا بگھار لگا رہی تھی۔ نخبہ کو کاموں میں دلچسپی لیتا دیکھ کر صفہ ایسے خوش ہوئی جیسے ڈاکٹر اپنے مریض کی صحت یا بی بی پر مطمئن ہو، خوش ہوئی صفہ اس وقت زینے پر بیٹھی جو اس کا کبھی، کبھی ٹھکانا بنتا تھا۔ سفید ردا کا ہالہ اس کے چاندی جیسے چہرے کے گرد تھا۔ کلانیوں تک آتے آستین سے نکلنے کزور ہاتھ میں گل ریحان کی خوشبودار پتیاں تھیں۔ جنہیں بے دھیانی میں مسلتے ہوئے سونگھ لیتی اور کوئی معطر ساورد زبان پر رہتا۔ چھوٹا گیت کھول کر طارم کی ای نے جھانکا۔۔۔۔۔ پھر اندر قدم رکھا۔

”آئیں۔۔۔۔۔ تشریف لائیں۔“

اسکارف سے ڈھانپے سر اور کزور نقابت زدہ چہرے والی نخبہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ وہیں قریب بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان احوال پرسی کا تبادلہ، شبانہ کا اندر سے جوس کا گلاس لا کر دینا پھر اس کا کوئی لباسا حال سنانا، نخبہ کا سر ہلاتے ہوئے ہنسنے رہنا۔ شبانہ کا آتے جاتے ایک آدھ بات کر لینا۔ امیر بی بی کا بڑی ٹرے میں تھالیاں بھر، بھر کر کھنا ان کو ابلے دسترخوان

”طارم کی ای؟ یہ کوئی نئی جہانی ہے۔“ اب شبانہ متوجہ ہوئی۔

”طارم کی ای تو صفہ بخاری سے بہت متاثر ہیں بتا رہی تھیں کہ پہلے مجھے بخاری لی لی سے چڑھتی تھیں نے اس سے ٹھکار بھی کی تھی کہ میری بیٹی کو ملانی بنا دیا ہے۔۔۔۔۔ زمین جو عطیہ دی گئی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ چوہدری مرحوم کے بیٹوں نے دبا رکھی تھی۔ مرحوم کی بیٹی حاجی جو ماڈلنگ کرتی ہے اس نے یہ خبر آؤٹ کی۔۔۔۔۔

سے ڈھانپ کر اٹھانا جانا آنا، صفہ کی سرسری نظر پڑی رہی، کسی تجسس یا کرید کے بغیر۔۔۔۔۔ اس کی سانسوں کی آمد و رفت میں اسائے حذر رہے ہوئے تھے، اب تو وہ زبان سے ادا نہ بھی کرتی تو قلب تسبیح کرتا۔ طارم کی ای اب جا چکی تھیں۔ خیرات کی ایک دیگ خالی ہو گئی۔ باقی تنظیم خانے اور مدارس کو بھجوا دی گئیں۔ منجہ بہت تھک گئی تھی اپنے کمرے میں معمول کی ڈھیر ساری دوائیں کھا کر لیٹ گئی۔ بہت دیر بعد شبانہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اب وہ بیدار ہو چکی تھی۔

”فارغ ہو گئی ہو۔“ منجہ نے روکا۔

”جی۔۔۔۔۔ آپ کو کچھ کاجوس نکال دوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں ڈیئر۔۔۔۔۔ آؤ بیٹھو۔۔۔۔۔“

”طبیعت کیسی ہے تھک گئی ہوں گی۔“

”کام تو تم میرے بعد گھنٹوں کرتی رہی ہو۔۔۔۔۔

ہاں مگر میں تھک گئی۔۔۔۔۔ شبانہ، تم نے چوہدری واصف کے مسجد کے لیے عطیہ کا مجھے نہیں بتایا۔“

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی۔۔۔۔۔ مگر ماما جی نے بخاری باجی کو بتایا ہوا ہے، وہ بھی میری طرح آپ کو بتانا بھول گئی ہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔“

”مگر عجیب سی بات ہے۔“

”کون سی بات؟ مسجد کے لیے عطیہ دینا؟“

شبانہ کے سوال میں تعجب تھا۔

”چوہدری واصف کا قصہ یاد ہے ناں؟ صفہ بخاری کے لیے رشتہ دیا تھا۔۔۔۔۔ پھر اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ مگر عطیہ تو جیتے جی دیا ہو گا ناں!“

”میں کیا کہہ رہی ہوں کہ مرنے کے بعد دیا ہے۔

شبانہ تم شبانہ ہی رہو گی۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تو پھر آپ اس پر اتنا غور کیوں کر رہی ہیں؟“

”مجھے اس مرحوم کی سمجھ نہیں آتی۔“

”آپ کو ماما جی نے بتایا ہو گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے تو طارم کی ای نے بتایا ہے۔“

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوس ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 نیو ایسٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں کوئی روڈ مارکیٹ

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سیم....." شبانہ نے بھی ہوں انگریزی میں کہا۔

"wao a daily women can speak such a noble english"

کشور جہاں نے اسے تیں تحسین کی مگر نخبہ جانتی تھی کہ شبانہ کو ڈیلی دومن (یعنی ننخواہ دار ملازمہ) کے معنی معلوم ہیں اور یہ تو ہیں آئیز ہے، فوراً انماں کوٹو کا۔

"مما..... آپ پلزی کسی کے بارے میں جانے بغیر رائے مت دیں۔ یہ عبد اللہ کی امی ہے، عبد اللہ آپ کے الفاظ سے بہت رنجیدہ ہوگا....." پھر شبانہ کو بلا کر ساتھ بٹھاتے ہوئے وضاحت کی۔

"مما جان..... جب آپ کی بیٹی کو ڈاکٹروں نے لاعلاج بتا دیا تھا، میرے تین سالہ بچے کو اس نے ممتا کی محبت دی۔ اتنی کہ میں عبد اللہ کی جانب سے مطمئن اور بے فکر ہو گئی۔ یہ وہی شبانہ ہے جس کے متعلق آپ سے باتیں کرتی رہی تھی..... جب پچھلے دنوں آپ آئیں تو یہ اور صفہ یہاں نہیں تھیں۔ اب صفہ بھی آگئی ہے۔"

"سوری سویت شبانہ....." کشور جہاں کی معذرت پر غلط تھی۔

"میری اچھی ماں..... صفہ بھی اب، وہ میری کلاس فیلو صفہ نہ جائے گا اسے وہ معرفت، روحانیت کے مقام پر ہے۔ اور خیال رکھیے گا۔"

"ہاں، ہاں ضرور ملوں گی..... دعا کروں گی۔"

شبانہ اجازت لے کر چائے کا انتظام کرنے چلی گئی۔ عبد اللہ اپنی گریڈ ماکے پاس آ بیٹھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور وہ گھر پر تھا۔ وہ اپنے ماموں زاد بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔

"تم تو میرے ساتھ چلو..... گریبی کی بات مان لو..... پاکستان میرا بھی وطن ہے، میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں مگر تم اپنا کیرئیر بناؤ..... یہاں کیا ہے؟"

"گریبی، میں Egypt پڑھنے جاؤں گا..... جامعہ الازہر..... میں ایڈمیشن لوں گا اور یہ اتنا ایزی نہیں ہوتا..... دعا کریں ایڈمیشن ہو جائے۔"

ماجی ظاہر کی مائیں بک فرینڈ ہے۔

"نخبہ باجی..... ہماری صفہ بخاری کی شہرت کہاں، کہاں تک ہے۔"

"کہاں، کہاں تک کوئی نہیں..... ہماری صفہ بخاری تو مجذوبہ بندی ہے۔ مجذوبہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم جو اس کے اتنے قریب ہیں، ہم پر بھی ظاہر نہیں ہے۔ اصل میں وہ ہے کیا؟"

☆☆☆

تہجد سے اشراق، چاشت تک جاگتے رہنے کے بعد صفہ کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ وہ سو رہی تھی جب گھر کے باہر بڑی سی گاڑی آرکی..... شو فرنے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سفید بال مگر بوائے کٹ، لوز لائیک شرٹ اور جینز..... یہ نخبہ کی امی کشور جہاں تھیں جن کی عمر لگ بھگ اسی کے قریب تھی۔

پہلے امیر بی بی سٹشدر ہوئی پھر شبانہ حیران ہوئی، یہ حیرانی اور پریشانی عبد اللہ کے اچانک نکل کر آنے اور گرینی کے نعرے سے دور ہوئی۔

"اچھا..... یہ نخبہ باجی کی مما ہیں....." شبانہ نے بے آواز بلند سوچا۔ امیر بی بی ایک بار پھر دیکھنے لگی۔ شبانہ آگے بڑھ کر ملی اور رہنمائی کرتی ہوئی نخبہ کے کمرے تک لائی۔

نخبہ جو اپنے بیڈ پر نیم دراز تھی خوشی سے ایک دم اٹھی پھر بائے کر کے کمر تھام لی۔

"بیٹھی رہ..... بیٹھی رہ..... اس کی ممانے اسے تھام کر بٹھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

شبانہ نے سکھ کی سانس لی کہ یہ اردو بول لیں گی۔ "نمکد گاؤ..... کیا حال ہو گیا ہے ترا..... سچ میں تجھے چھوٹنے، سامنے بٹھا کر دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اب بڑس کے بقایا معاملات نمشا کر آئی ہوں....." پھر ادھر، ادھر دیکھ کر بولیں۔

"پتا نہیں، کیسا مزاج ہو گیا ہے، مجھے تو گری لگ رہی ہے۔"

"آپ یہاں کے موسم کی عادی نہیں رہیں گی۔"

شاہناہ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”مجھیں آج آکھ چوٹی کہینے ہیں، اگر آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا تو ہم شاہناہ پر جائیں گے۔“
 ”شوہر۔ اگر میں آپ کو ڈھونڈ نہ سکا تو؟“
 بیوی۔ بیار سے بولی۔ ”جانو! ایسا نہ کہو میں دروازے کے پیچھے تو چھپی ہوں گی۔“
 مرسہ: پردین افضل شاہین، بہاول نگر

کا خوف میرے تعاقب میں تھا اور وقت کی پونجی ختم تھی۔ یہ نہ پوچھا صفہ نے..... کیوں آئی ہو؟ کیوں میری حویلی میں رہنا چاہتی ہو؟ کیوں نہیں ماں، بھائی کے پاس چلی جاتیں؟ اس کے پاس کتنے کیوں تھے، اس نے ایک بھی کیوں نہ اٹھایا۔ ماما آپ بتائیں؟ آپ کے پاس، ہمارے پاس کوئی یوں آکر رہنے لگے۔ چاہے آپ کی فرینڈ ہو، میری فرینڈ ہو، ہم رہنے دیتے؟ ہمیں کتنے ٹھک پڑتے۔“ نخبہ نے تھوڑا پانی گلاس میں لے کر گھڑا کر لیا۔

”پھر ماما..... اس کا ایک اور رخ میرے سامنے آیا۔ وہ میرے لیے دعا بن گئی۔ اس نے یہ دعا اپنے ذمے یوں لے لی جیسے اس سے قصور سرزد ہو گیا ہو، صفہ کی دعا میرے جیسوں کی دعا نہیں ہے، نہیں ہو سکتی، اس نے اللہ کے ذکر پر عمر، مال، جوانی، خواہشات ٹاڑ کر دی ہیں، ماما جان یہی عمر، مال، جوانی، خواہشات ہم دنیا والوں کے خدا ہیں، آپ بھی جانتی ہیں، میں بھی جانتی ہوں..... آسان نہیں ہوتا ان کو کرش کر دینا اور میں؟ کہاں میں یہ ترک کر سکتی تھی؟ مظلوم کی ٹانگ نہ اٹھ سکے تو دوڑ میں حصہ نہ لینا اس کا فیصلہ نہیں ہوتا..... البتہ..... یہ مصلحت ربانی ہوتی ہے..... مصلحت وہ فلسفہ ہے جس کے ظاہر میں اندھیرا ہے اور باطن میں راستہ ہے۔“

”سب باتیں ٹھیک ہیں، مجھے تو تمہاری باتیں سن کر یہی خیال آتا رہا کہ company makes a man تم کتنی بدل گئی ہو..... تم واقعی بدل گئی ہو۔“
 کشور جہاں نے انکڑ کا دانہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے کمرے پر نظر دوڑائی۔ ”یہ بتاؤ..... وہ صفہ کی سادات

اویں..... سوز بہاں ویہ ہر جہاں کو نہ دے۔“
 مگر بچے سے بحث کرنا مناسب نہ جانا۔ عبداللہ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اسے چند کھیلوں، جسمانی ورزش اور صحت مند سرگرمیوں کی اجازت تھی۔ کشور جہاں بچہ کے پاس آ بیٹھیں، اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آب دیدہ ہو گئیں۔

”ہی..... مجھے تیرے نصیب پر رونا آتا ہے، کیسی ماڈل جیسی خوب صورت تھی، کیا حال ہو گیا..... میری جان۔ لوگ اچھے علاج کے لیے بڑے ملکوں میں جاتے ہیں اور یہ گناہ نہیں ہوتا..... تو یہاں پسماندہ علاقے میں آکر بس رہی..... ڈاکٹروں نے تجھے لا علاج بتایا تھا، یہ کہا تھا کہ جینے کو پندرہ سال جی سکتی ہے، چھ مہینے بھی نہ جی سکے یہ بھی ممکن ہے۔“

”ڈاکٹروں نے کہا تھا ناں..... جرمی میں ہوتی تو ڈاکٹر جیت چکے ہوتے، ماما! انسان... جس ایمان پہ ہوتا ہے اسی دھیان پر چلتا ہے، اس کو شاید میڈیکل سائنس دل پاور دیتی ہوگی..... یہ پاور ایک اور پاور ہے، ویسے قسم سے میں بھی حیران ہوتی ہوں، مجھے کب امید تھی کہ عبداللہ کو پندرہ سال کا ہوتا دیکھوں گی۔“
 ”شکر ہے اللہ کا.....“

”ہاں تو یہ اللہ کا ہی کرم ہوتا ناں.....“
 ”اچھا اب میرے ساتھ چلو..... میں نے گھنٹا گھر والا مکان سیل کروا دیا اور ترے ابو کے جو دفتر تھے ناں فیصل آباد والے ان کے واجبات نکل آئے، اب میں اپنا حصہ رکھ کر باقی تجھے اور نجیب کو دے دوں گی..... ترا عبداللہ کا اثر نکٹ تو اس میں سے ہی نکل آئے گا۔“ کشور جہاں نے یوں مسئلہ حل کیا گویا سارا مسئلہ ہی انرٹکٹ کا ہے۔

”پیاری ماما..... listen to me just listen to me“
 صفہ نے لی نہیں ہوؤ، بہت قیمتی ہے میرے لیے..... وہ بہت اہم ہے میرے لیے۔ جب میرے سر پر دھوپ ہی دھوپ تھی۔ اس نے مجھے سامنے میں سمیٹ لیا۔ جب کڑوا ہی کڑوا چکھا تھا دنیا والوں سے..... مجھے شیرینی کا احساس یہاں ملا..... خالی دامن

نخبہ نے اِدھر، اُدھر ہو کے ماں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے سرو پا بول رہی تھیں، وہ خاموش ہوئیں۔

”خالہ صلیبہ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھو ڈیرہ۔۔۔۔۔“ صلیبہ نے نخبہ کو مخاطب کیا۔ ”میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں اپنے گھر سا آرام نہیں ملے گا۔“

”ڈونٹ وری صلیبہ بیٹی۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔“

آپ کے والدین کا بہت افسوس ہوا تھا۔ بات پرانی سہی مگر میں تو آپ سے پہلی بار مل رہی ہوں۔“ کشور جہاں ایک بار تکلف سے بولنے لگیں۔ مگر چھوٹے ہی دوسرا انتہائی ذاتی سوال داغ دیا۔

”آپ نے شادی کیوں نہ کی؟“

نخبہ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی ماں کو کیسے چپ کرائے، صلیبہ کے متین چہرے پر کوئی جوابی لکیر تک نہ پا کر کہا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔۔۔۔۔ شادی سنت ہے میں نے تو نخبہ کو سمجھایا تھا۔ پھر یہ بیمار پڑ گئی۔۔۔۔۔“

یورپ میں اس عمر کو نیک انج سمجھا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی تک نظر ہے۔۔۔۔۔ مایوس کن ہے۔“

”مما۔۔۔۔۔!“

”میں اپنے نواسے عبداللہ کی وجہ سے فکر مند رہتی ہوں۔۔۔۔۔ یہ میری بیٹی آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ ہزار بار اسے کہا بیٹے کو میوٹ بھیج دو۔ کوئی اس کا کیئریر

ہے۔۔۔۔۔ یہاں رہ کر تو وہ الگ سا دکھتا ہے۔ صلیبہ بخاری بیٹی! میں تو دنیا دار ہوں مگر یہ دنیا اللہ نے ہمارے لیے

بنائی ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھا جاسکتا ناں۔۔۔۔۔ جینا ہے تو آگے بڑھنا ہوگا۔“

”آگے کہاں؟“ وہ لفظی سوال بہت وزنی تھا۔

”میرا مطلب ہے ترقی۔۔۔۔۔“

”آپ کو مجھ سے شکایت ہے؟“ مسکرا کر پوچھا تو نخبہ فوراً بولی۔

”نہیں صلیبہ، تم سے شکایت کا کیا سوال، میں خود تمہارے پاس آئی تھی۔ تم نے مجھے نہیں بلایا تھا۔۔۔۔۔ اور اُمی یہ بات جانتی ہیں۔“

انہیں صفہ سے ملنا تھا۔ شبانہ نے صفہ کو نخبہ کی والدہ کی آمد اور ملنے کی اطلاع دی۔

کشور جہاں اس سادہ سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ صلیبہ کھڑی ہوئی۔ اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے

بڑھایا۔ اس کا ٹھنڈا کمرہ ہاتھ لپٹے ہاتھ میں لپٹے ہوئے کشور جہاں کے جسم میں ایک لہری دوڑی گئی۔ اس

کیفیت میں حیرانی لبالب بھری ہوئی تھی۔ کل کی ایک لڑکی (ان کی نظر میں وہ بی بی کی ہم جماعت سہیلی تھی)

تارک الدنیا، ولی بی بی ہوئی۔ اس ضمن میں پوچھنا ناچھینا تھا نخبہ کی زبانی سن رکھا تھا۔ کشور جہاں

مرعوب تھیں۔

”بی بی۔۔۔۔۔ آپ تشریف رکھیں۔“

”بی بی۔۔۔۔۔ نہیں بیٹی۔۔۔۔۔“ صلیبہ کی پہچان وہی ایک نرم مکان۔۔۔۔۔ کشور جہاں بات کرنے کا سرا تلاش

کرنے لگیں۔ بہت سے خیال آئے، دعاؤں کی فرمائش، نصیحت کا تقاضا، اصلاح احوال کی خواہش،

نخبہ کے بارے میں تشویش، عبداللہ کا مستقبل، الجھے رشتم کو سلجھانے پر کیسے؟

”میری ماں بس میری طرح دنیا داری بندی ہیں۔۔۔۔۔ اس وقت نفسیاتی وباؤں میں ہیں۔۔۔۔۔ میں بھی ان

کی جگہ ہوتی تو اسی حالت میں ہوتی۔“ نخبہ نے پہلی کی۔

”آپ کیسی ہیں خالہ؟“ صلیبہ نے اعتماد بحال کرانے میں مدد کی۔

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔ میں یہ سوچ رہی ہوں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔

باقی اچھے کام بھی اپنے حساب میں کر لیتے ہیں مگر ہم آگے کیوں نہیں نکل پاتے۔۔۔۔۔“ سوال بے موقع بھی تھا

اور بے وزن بھی۔

”ہم کسی ریس میں نہیں ہیں ممّا۔۔۔۔۔“

”میرا مطلب یہ تھا۔۔۔۔۔ اللہ معاف کرے ہماری تو نمازیں بھی اٹھک بیٹھک ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ نماز شروع کر دو تو

غیند آنے لگتی ہے، سلام پھیر کر اٹھو تو نیند غائب۔۔۔۔۔ مگر یہ

جھاگی، محفل جمی دیکھ کر پلٹ جانے کو بھی کہ نخبہ بنے بلایا۔
اس پر بھی کشور جہاں نے تادیبی نظروں سے
دیکھا وہ بہر حال اسے ایک عزت دی گئی ملازمہ گردانتی
تھی۔ شبانہ نے پھر سے ایک بار انگریزی میں وار کیا۔
”میم آپ کے لیے کوئلہ کافی تیار ہے۔“ نخبہ کو
اس وقت شبانہ نجات دہندہ لگی۔

”مما آپ چلیے..... میں آتی ہوں۔“ اس نے
ماں سے کہا۔

”میں پھر آپ سے بات کروں گی۔“ کشور
جہاں اٹھتے، اٹھتے کہہ گئیں۔ وہ چلی گئیں۔ نخبہ نے صفہ
کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بجا جنت سے معذرت کی۔

”اچھی بہن..... امی کی باتوں کو دل پر نہ لینا..... وہ
چاہتی ہیں کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“
”انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اچھی نہ
ہو..... نخبہ تم جاؤ اور زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزارو.....
ان کا تم پر بہت حق ہے۔“ نخبہ ریلیکس ہو گئی۔

”ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟“

”میں حیران ہوں کہ میں، اب اس اذیت
میں نہیں ہوں..... یہ میری زندگی کا معجزہ ہوگا اگر میں
میڈیکل کی سویفد پیش گوئیوں کو رد کر کے صحت یاب
ہو جاؤں..... اور یہ صرف تمہاری دعاؤں سے ہوگا.....
ہم صحت یاب ہو کے مل کے رہیں گے.....“

”اللہ اللہ.....“ صفہ نے سر جھکا کر گفتگو کا سلسلہ
منقطع کر دیا۔

☆☆☆

”کیا رکھا ہے جامعہ الا زہر میں..... نام ہی اتنا مشکل
کہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ عبد اللہ..... یہ سائنس، ٹیکنالوجی کا
زمانہ ہے، جہیں لائف میں کچھ بننا ہے اصفہ مسجد منجھالو گے؟“
کشور جہاں ہلکی نہیں بٹھیں اب عبد اللہ کو گھیر لیا۔

”ڈائیر گرینی..... جامعہ الا زہر میں سائنس،
ٹیکنالوجی تمام subjects ہیں۔ صفہ خالہ نے
میرے لیے بہتر سوچا ہے۔“ عبد اللہ نے فریق سے

”بٹھا..... ان کی دنیا محدود ہے..... ان کی
ساری زندگی ایک چار دیواری میں گزری..... انہیں کیا
پتا کون سا ادارہ ٹاپ کا ہے، کس مضمون کی ڈیما نڈ
ہے۔“ عبد اللہ چپ رہا تو کشور جہاں کو لگا دلیل اثر
کر رہی ہے مزید محبت سے کہا۔

”میرے پیارے بچے، نجیب انکل سے مشورہ
کر لو..... میرے ساتھ چلو ایک چکر لگا لو..... بڑے
ملک اور حیرتوں کو ملو گے، دیکھو گے تو وٹن بڑے
گا..... ایگز امز ہو چکے فارغ تو ہو.....“

”ماما سے پوچھ لیجیے..... لیکن میں شبانہ امی کے
بغیر نہیں رہ سکتا..... گرینی پلیز مجھے ان کو cheat
کر نامت بتائیے گا۔“

کشور جہاں اگلی بات یہی کرنے والی تھیں، وہ تو
نواسے کو خود ساختہ، ماں کے ٹرانس سے نکالنے کا
عزم لے کر آئی تھیں۔ برا وقت تھا گزر گیا اب کیا
ساری عمر ساتھ جوڑے رکھیں۔ انہیں انوس تھا کہ دس،
گیارہ سال کا یہ عرصہ نخبہ کو فری پنڈ دے کر غلطی کی۔
اب عرصہ اتنا گزر چکا تھا کہ ذہن بدلنا آسان نہ تھا۔

کشور جہاں نے سنگار میز پر رکھے پرفیوم کو اٹھایا۔
اس کو آنکھوں کے قریب لا کر نام پڑھا..... پھر اپنے
دائیں بائیں چہرے کا پھر برا سامنہ بنا کر رکھ دیا۔ وہ عبد اللہ
کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ تھپتھا کر بولیں۔

”مائی سوٹ سن..... تم نے تو مجھ سے زیادہ
اسلام کو اسٹڈی کیا۔ اسلامی ماحول کی تربیت لی، تم
جانتے ہو گے اسلام میں منہ بولے رشتوں کی کوئی
قانونی شرعی حیثیت نہیں..... منہ بولی ماں، ماں نہیں
ہوتی، رضاعی رشتوں کو اسلام نے مقام دیا ہے منہ سے
کہے ہوئے کو نہیں.....“

اسی وقت کمرے میں داخل ہوتی شبانہ کے قدم
وہیں تھم گئے۔ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”اچھا اخلاق، خدمت، محبت اپنی جگہ مگر اس
سے رشتہ نہیں بن جاتا۔ تمہاری ماں صرف وہ ہے جس

نے نہیں سم دیا..... پائے پونے کے لیے نوادہ، آیا
فوسر مد رہتی رہتی ہیں..... اللہ نے قرآن میں ہمیں
حکم دیا کہ وہاں کے برابر ہے؟“

الفاظ صحیح تھے یا تو صحیح صحیح، شانہ کی سماعتوں پر
بھڑکتے تیزاب کا کالا دگر اور اندر بھسم کرتا چلا گیا۔ ہاتھ
میں عبد اللہ کے استری شدہ کپڑوں کا بگڑا ہوا سا دھڑکا
کمرے کے دروازے کے ساتھ رکھے سجائی گلدان پر
ڈال کر اندھا دھند اپنے کمرے کو بھاگی شعور نے ایک ہی
حکم دیا ہماگ جاؤ، چھپ جاؤ، مٹ جاؤ، پردہ پوش
ہو جاؤ..... کمرے کا دروازہ بند کیا۔ مکلیہ بڑا تھا
سانے..... مکلیہ بوج کے فرش پر پھسکا ہمارے ڈھکے گئی۔
”منہ بولی ماں، ماں نہیں ہوتی۔“

نہنے سے عبد اللہ کا خنجر کی انگلی پکڑے سادات
حویلی میں داخل ہونا..... شانہ کا لپک کر اسے سینے سے
لگا لیتا۔ اٹھائے، اٹھائے پھرنے کے ان گنت مناظر،
طرح طرح کے کھیل بنا کر عبد اللہ سے کھیلنا، اس کی
خوشی کی خاطر جھلی بن کر پھرتا۔ صبح شام اس کو مزے،
مزے کی اول بدل کر چیزیں بنا کر کھانا، اس کو سنانے
کی خاطر کہانیوں کی کتابیں خریدنا، کبھی زبردستی سنانے
کی کوشش نہ کرنا، اس کو ناگوں پر جھلاتے ہوئے اس
کے نہنے قہقہوں پر ہنس، ہنس کر شہر ہونا۔ اس پر پڑھ،
پڑھ کر پھونکنا، اس کو دعاؤں کا بخور اول و آخر بنالینا، اس
کی کامیابیوں کی منیتیں، معمولی موکی بیماری پہ صحت
یابیوں کی منیتیں، اس کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی کلام
اللہ کا حصار، گھر کے اندر قدم رکھتے ہی بسم اللہ، بسم اللہ
کا استقبال، اس کے ساتھ جانے کی خاطر انگریزی
سیکھنا اور پھر عربی سیکھنا..... وہ اس کا کہنا ”شانہ امی“
اور شانہ کا جوابی ”امی صدقے.....“ مگر پھر بھی وہ ماں
نہیں تھی۔ اس کو رب نے ماں نہیں بنایا تھا۔ اس کے
بطن میں انکا رکھا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ ماں بننے کے
ترلوں میں عمر بتا دی..... اس کے قدموں تلے عبد اللہ
کی جنت نہیں تھی۔ منہ بولی ماں کا طمانچہ اس کی روح
شکسار کر گیا تھا۔ اس کا دل زخمی ہو گیا تھا اور اب وہ مکلیہ

حمد

الہ کہوں یا علت اوئی کہوں اسے
یزداں کہوں یا ایزد اعلیٰ کہوں اسے
وہ متمکن علی العرش العظیم ہے
وہ ذوالجلال و الاکرام ہے
لا یزال اور آفریدگار ہے وہ
محبب الدعوات اور معبود حقیقی ہے وہ
صفت الہی اور خدائی سب اسی سے ہے
ربوبیت اور معبودیت سب اسی سے ہے
لاحمد و طاقت اور وحدت کا مالک وہی خدا ہے
حاکمیت اعلیٰ اور ابدیت کا خالق وہی خدا ہے
واحد اور ہستی مطلق ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
متبرک اور معبود ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
وہ رزاق اور مسبب الاسباب بھی ہے
وہ حکیم، کریم، رحیم اور بصیر بھی ہے
حکمت، نیکی اور عدل سب اسی سے ہے
حق، محبت اور رحم سب اسی سے ہے
وہ منعم حقیقی اور خالق کل کائنات ہے
وہ اعلم الغیوب اور محافظ حقیقی ہے

کاوش: نعیم حیدر

انتخاب، صبا نور، لہ

کھجور کھائیں..... لمبی عمر پائیں

رسول اللہ کا مبارک ارشاد ہے.....
جس نے سات کھجوریں روزانہ اور سات شام کو
کھائیں وہ دن بھر (تمام پہاریوں سے) محفوظ رہے گا۔
عالمی ادارہ صحت میں وبائی امراض کے ماہر ڈاکٹر عمر
سلمان جگر جن کا تعلق سوڈان سے ہے، ان کا کہنا ہے۔
”ہمارے علاقے میں لوگوں کی عمریں بڑی لمبی
ہوتی ہیں، وہاں لوگ سو سال سے بھی زیادہ عمر پاتے
ہیں اور آخری دم تک صحت مند اور توانا رہتے ہیں،
میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ
غذا میں کھجور کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔
ایک تحقیق سے اقتباس۔ از: آسیہ عامر، کراچی

”خالہ کی صحت کیسی ہے؟“ ملنے آئی ہوں گی۔“
صفہ نے پوچھا۔

”امی کی صحت ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہے، ہماری جائیداد کے حسابات ریتے تھے کچھ اثاثے سیل کرنا چاہتی ہیں، ملے تو آئی تھیں مگر پھر آبائی گھر چلی گئیں۔ سب کچھ نسا کر آئیں گی۔“

”وہ تمہارے متعلق فکر مند ہوں گی ناں.....“
صفہ بولی۔

”تو بتا تو میرے متعلق کیا کہہ رہا تھا۔“ شبانہ، عبداللہ..... کو کہنی مار کے چکی۔

”ہاں عبد اللہ چاند، میں خوش ہوں، ہم سب خوش نصیب اور اللہ کے نوازے ہوئے لوگ ہیں، ہمیں اندازہ نہیں کہ اللہ نے ہمیں کتنا کچھ بنانا سکے دے رکھا ہے اور دے رہا ہے، مانگنا تو کجا ہمیں اس کا ادراک بھی نہیں ہوتا نخبہ باجی، ان دنوں زبان اور حلق ٹھنڈے پانی کو ترس گئے تھے۔ تازہ بے دریغ پانی سے نہانے دھونے کو ترس گئے تھے..... پھر چولستان دیکھ لینے کے بعد پانی بہت تتی لگتا ہے۔“

عبداللہ کے ہاتھ سے رخ بستہ بوسل پکڑی نہ گئی۔ اس نے دھیرے سے واپس رکھ دی۔ نخبہ نسا کہ ہو گئی، کہنے لگی۔

”تاریخ میں پڑھا ہے کہ واقعہ کربلا کے بعد حضرت امام حسینؑ کے فرزند حضرت امام زین العابدینؑ کے سامنے جب بھی پیئے کو پانی آتا، اشکبار ہو جاتے۔“
”لاکھوں درود آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر.....“
”مجھے اپنی نماز کی جگہ پر لوٹنا شادماں کر گیا۔“
صفہ اٹھنے لگی۔

”خالہ کو ہمارا گھر کیسا لگا؟ کیا کہتی تھیں؟“ شبانہ نے نخبہ سے برتن لیتے ہوئے پوچھا۔

”عبداللہ کو سامنے پا کر حیران ہو گئیں..... کہنے لگیں یہ تو ننھا مولوی لگتا ہے۔ مگر جب اس نے انگلیں شروع کی اور لاکی باتیں کیں تو پھر ٹہمتی ٹھیں بنا بنایا

”شانہ، آج تو کھانے دے، عید یاراں ہے.....“
ایک چھوٹا بچہ لیا ہے۔ ویسے میرا ہاضمہ کچھ بہتر ہو رہا ہے۔“
”تو، تو بہت اچھی بات ہے..... مگر احتیاط کرو۔“ صفہ نے سلا دیا۔

”اس سے بھی بڑی خوشی کی خبر ہے میرے پاس۔“
”یس ماما..... آپ وہ تو بتائیں۔“ عبداللہ کو لڈ ڈرنک کی بوسل کھولنے لگا۔ شبانہ نے اس کا ہاتھ روکا۔

”یہ چار دن میں شہزادے نے نئی، نئی عادتیں بنالیں۔ کو لڈ ڈرنک کھانے کے ساتھ صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔ آپ تو جانتے ہو بیٹا۔“

”جی امی..... مگر آج تو آج ہے، سارے کام آج روٹین سے ہٹ کر ہو رہے ہیں، صفہ خالہ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہی ہیں۔ ماما نے ساں لیا ہوا ہے اور آپ.....“
”اور میں کیا؟“

”ایک تو خوشی کی یہ خبر ہے کہ شبانہ کے لیے عربی بول چال کے ٹیچر کا انتظام ہو گیا ہے۔“ نخبہ جو سلا دلیے صوفے سے ٹپک لگا کر ٹیبلٹی لگی۔ اس نے بات ٹوک دی۔
”میل ٹیچر ہے؟“

”ہاں صفہ..... مگر ادھیڑ عمر شریف بندہ ہے، ماہر مضمون ہے۔“
”نہیں نخبہ..... شبانہ کسی جماعت میں ہوتی تو حرج نہ تھا۔“

”ماما..... یہ گڈ نیوز تو آپ کی شوں ہو گئی.....“
عبداللہ ہنسنے لگا۔
”میٹھا لے آئیں۔“ امیر بی بی کو جھوٹے برتن پکراتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

”میٹھا بھی ہے؟“ کہیں سے آواز آئی۔
”شانہ اور صفہ بھی اب دسترخوان سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھیں۔“

”ماما..... اب دوسری گڈ نیوز بھی سنا دیں۔“ عبداللہ نے یاد دلایا۔

”میری امی آئی ہوئی ہیں جرنی سے۔“

ہیں..... ضرور آئیں گی۔“

اگلے دن اذان اور منکریو کو موسیٰ چلوں کی
پٹیاں دو گھر تحائف کے ساتھ محبت و شکر یہ سے
رخصت کیا۔ یوں یہ ٹرپ مکمل ہوا۔

فرست پاکر منشی ماما نے سلام عرض کرنے کی
اجازت طلب کی۔ منشی ماما اگرچہ کافی بوڑھے ہو چکے
تھے، وہ ستادین سالہ صفہ بخاری سے اکیس بائیس سال
بڑے تھے۔ مگر محنت و درست تھی کسی قسم کی جسمانی
معذوری بخاتمی نہ تھی۔ نگاہ کم پڑنے لگی تو لکھت پڑھت
چھوڑ دی پھر بھی حافظہ اتنا اچھا تھا کہ یہ تک بتا دیتے کہ
پچھلے سال کس باغ سے کٹنا پھل اترا تھا، عشر کتنا
بنا..... موجودہ گزشتہ میں نفع یا نقصان کیا ہے، عمر بھر
دیانت داری سے کام کیا تھا، لقمہ حلال کھایا تھا اور بخاری
صاحب مرحوم کی بیٹی سے با احترام وفاداری کی تھی۔

آنے والے جمعے سے مسجد صفہ میں رنگ و روغن کا
کام شروع کر دیا جارہا تھا۔ اس شخص میں بھی منشی ماما کی
بات چیت متوقع تھی۔ ادھر سفر سے واپسی کے بعد شبانہ
کو بخار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ منشی
ماما، عبداللہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ صحن میں رکھی
کھٹولی پر بیٹھا تھا کہ چھوٹا گیت کھلا۔

”شبانہ ہے؟“ کسی خاتون نے جھانک کر پوچھا۔
”وہ بیمار ہے سو رہی ہے۔“ سر اٹھا کر بغیر منشی ماما
نے جواب دیا وہ تھوڑی دیر تذبذب میں ٹھہری پھر کہا۔
”ان سے کہہ دیجیے گا طارم کی امی آئی تھی۔
دیے مجھے خالہ غسالہ بھی کہتے ہیں..... (وہ ہنس پڑی)
پھر آؤں گی۔“ وہ چلی گئی۔

منشی ماما کو اس کے نام سے دلچسپی نہ آنے
جانے سے۔ عبداللہ کے آتے ہی اسے بلا لیا۔

”پتر ادھر آ..... جا کے اپنی بخاری خالہ کو خبر
کروے کہ منشی ماما حاضری کی اجازت مانگ رہا ہے۔
وہ اجازت دے، دے تو پھر آ کے میرے ساتھ چل۔“

عبداللہ نے کتابیں میز پر رکھیں اور منشی ماما کا فرمان

یاد کر رہے تھے۔
وہ خاموشی سے ابھی اور لاؤنج کے صوفے پر جا بیٹھی۔ منشی
ماما، عبداللہ کے ساتھ کھنکھار کے داخل ہوئے، وعدا کے کر
کونے میں منہ کر کے بیٹھ رہے، مسجد کے رنگ و روغن اور
باتھ رومز کی مرمت کے متعلق تفصیلی بتایا۔

”ایسٹن کے کلرز کارڈ لایا ہوں..... رنگ آؤٹ
ڈور کے لیے پسند فرمائیں۔“ کارڈ عبداللہ کو دیا پھر کہا۔

”ایک بات اور ہے پچھلے دنوں کوئی وکیل آیا تھا،
آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں نے بتایا کہ میں بی بی کا
مختار عام ہوں اور بی بی گھر پر نہیں ہیں۔ اس نے ایک
فائل دکھائی، عرصہ پانچ سال پہلے..... آپ کو شاید یاد
ہو..... چودھری واصف فوت ہو گیا تھا۔ حادثے میں
فوت ہوا تھا۔ چک نمبر ایک سو چھیالیس ایل میں اس
نے چار کنال اراضی مسجد صفہ کے نام
کرائی..... حادثے سے پہلے ہی کرائی..... اس کا
موجودہ ریٹ تقریباً تین، چار کروڑ ہے، مرحوم کے تین
بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ دار شین خاموشی سے یہ رقبہ
آپس میں بانٹ لینا چاہتے تھے کہ ایک بیٹی نے یہ بات
مشترک کر کے آؤٹ کر دی..... وہ بچی جو ہماری شبانہ کو
انگریزی سکھانے آئی تھی ناں کیا بھلا سامان تھا؟“

”طارم.....“ عبداللہ نے یاد دلایا۔

”مرحوم کی وہ بیٹی طارم کی..... سبیلی تو خیر
نہیں، کالج والی تھی..... اس کا مطلب ہے طارم نے
کہیں مسجد یا بی بی کا ذکر کیا ہوگا۔ یوں دیکھا جائے تو وہ
بیٹی انیس سال کی ہے ماڈلنگ کرتی ہے۔ یہ اسی وکیل
نے بتایا..... اس کے بھائی بہن مسجد کا حق ہڑپ کرنا
چاہتے تھے، وہ اس کو بے غیرت کہتے اور بول چال
نہیں تھی۔ اللہ جس کے دل میں نیک کام کی توفیق ڈال
دے اس کی مرضی.....“

”منشی ماما! مسجد میری ملکیت نہیں ہے، اسے
ٹرسٹ چلاتا ہے۔“

”جی، بی بی..... ٹرسٹ بھی آپ اور خنبہ بی بی ہیں،
ہا ہم مشورہ کر لیں آپ.....“

مجھے محشر میں بھی گود میں سر رکھ کے رونے نہ دیں گی۔
جب تک مجھ سے اس کا جواب طلب نہ کر لیں..... مگر
میں نے تو بھلا دیا تھا۔ بھلا دینا بہر حال سچ نہیں
ہوتا..... میری ساری حیاتی اس ایک دوپٹے پر رک
گئی..... وہ دوپٹا ایک واقعہ بن گیا جس کے بخور پر عمل،
روعمل کا تانا بانا بنا جاتا رہا..... تو یوں مقدر رحم ہوتے
ہیں..... ایک مرکزہ اور..... زوال و عروج، بعد و
مابعد..... اماں جان اور میرے درمیان یہ دیوار کب
تک ہے..... کتنی دیر کے لیے ہے..... جتنی دیر میں اوپر
نہیں اٹھتی..... جتنی دیر دیوار نہیں گرتی..... جتنی دیر
درمیان وقت ہے۔ کمرے کے دروازے پر ہلکی دستک
دے کر عبد اللہ نے جھانکا۔

”صفہ خالہ..... میں شائد امی کو لے کر کلینک
جار ہا ہوں.....“ اس نے سر ہلادیا۔ پیچھے ہی غیب آگئی۔
”یہ نہیں پوچھا..... کس کی گاڑی میں؟“
”کس سے پوچھوں؟“ وہ ذہنی طور پر حاضر نہ تھی۔
”عبد اللہ اور شانہ گاڑی میں ڈاکٹر کے کلینک
جار ہے ہیں۔“ غیب نے مکمل وضاحت کی۔
”کیوں.....؟“

”صفہ.....“ غیب حیرت سے پکاری، گلاس میں
پانی ڈال کر بڑھایا۔
”پانی؟ پانی تو نہیں مانگا.....“ اس نے گلاس
لے کر رکھ دیا۔

”شانہ کو بخار ہو رہا ہے تیز.....“ غیب نے پھر
اطلاع دہرائی۔
”میں دیکھتی ہوں.....“ وہ اٹھنے لگی۔
”کیا دیکھتی ہوں پیاری بہن..... وہ ڈاکٹر کے
پاس گئی ہے۔“

صفہ نے گلاس اٹھایا آنکھوں پر پانی کے چھینے
مارے پھر کہا۔
”میں نے عبد اللہ بیٹے سے کہا تھا کہ شانہ امی کی
دوا لے آؤ.....“

”میں تو یہ سوچتا ہوں کہ مرنے والا اپنے لیے
جاریہ نیکی کے تحت یہ فیصلہ کر گیا۔ اس پر عمل ہونا
چاہیے..... رقم کافی بڑی ہے، مسجد کیوں رو کرے۔“
”ہاں جی صفہ خالہ..... مسجد کو سنٹرل انٹیر کنڈیشنڈ
کر دالیں گے اور دائیں طرف والے نور انصاری اگر
مکان بچیں تو شامل کر لیں گے۔“

”عبد اللہ، آپ خاموش رہیں یہ منصوبہ بندی قبل از
وقت ہے۔“ صفہ کے منع کرنے پر وہ چپ ہو کر مٹی
ماما کو دیکھنے لگا جو پہلے ہی خاموش تھا۔
”مٹی ماما..... آپ کی طبیعت کیسی راتی ہے؟
راتوں میں آپ کو اکثر کھانسنے سنتی ہوں..... آپ بہتر
علاج کرائیں رحم کا مسئلہ نہیں۔“ بات پلٹ دی گئی تھی۔
”بخاری بی بی..... اس عمر میں کھانسی آثار زندگی
ہوتی ہے، ویسے میں ٹھیک ہوں..... کھانا بس جینے
جوگا..... پیٹ کو سہولت، سانس کو سہولت.....“

”آپ کا ساتھ ایسا احسان ہے جس کا بدلہ
میں نہیں دے سکتی۔ اللہ دے گا۔“

”اللہ مہربان ہے، اللہ آپ کی دعا سے مجھے بخش
دے..... اچھا بی بی پھر میں چلتا ہوں، آپ مشورہ کر کے
مجھے حکم دے دینا۔“ مٹی ماما سلام عرض کر کے چلا گیا۔

صفہ اپنے کمرے میں آگئی۔ کمرے میں چاروں
طرف نظر دوڑائی جیسے کسی کی تلاش ہو، وہاں تو ایک
چار پائی تھی، نیچے ایک ایسی جانماز جس کے پاؤں
رکھنے کی جگہ سے تیلیاں گھس گئی تھیں، دو کرسیاں اور
ایک میز، میز پر قرآن پاک، رحل میں رکھا ہوا، پانی کا
گلاس، پانی کی بوتل..... ”پانی والی اماں، پانی والی
اماں..... میں آپ کی گود میں سر رکھ کر رونا چاہتی
ہوں۔ اس رونے پر رونا چاہتی ہوں کہ میں کیوں نہ
ردی.....“ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئی..... مجھے تو اماں،
جان کے زانو پر سر رکھ کے سونا ہے سو جاتا ہے..... میری
خالہ کہتی ہیں الماری کھول کر نیلے ڈبے کے پیچھے سے
اٹھالو..... وہ میرا پیلا دوپٹا تھا..... جب وہ میرے

”اتنی لاڈ بھری باتیں سن کر شبانہ ای خوش ہو گئی ہیں۔“
 ”شبانہ..... مر لیض کی دعا قبول ہوتی ہے، تم نخبہ
 کے لیے دعا کرو، عبد اللہ کے لیے دعا کرو، میرے لیے
 دعا کرو..... منشی ماما کے لیے دعا کرو۔“
 ”میں ان سب کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں باجی۔“
 ”کیا کھایا ہے؟“

”میری زبان کا ذائقہ بہت کڑوا ہے..... کچھ
 اچھا نہیں لگتا۔“

”سیب کاٹ دیتی ہوں، کوئی پھل جو کبھو منگوادوں؟“
 ”اگر آپ کہتی ہیں تو سیب کھا لیتی ہوں.....“ عبد اللہ

... لپک کر سیب تھالی میں رکھ کر چاقو لے آیا..... وہ چاہتا
 تھا صفہ خالہ کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہیں شبانہ نے خود
 کاٹنا چاہا مگر صفہ کے روکنے پر اسے کاٹنے دیا..... سیب
 کی قاشیں بناتے ہوئے صفہ شیریں گفتار ہوئی۔

”حضرت ام العلاء بیان کرتی ہیں کہ میں بیمار تھی
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری عیادت کو تشریف
 لائے اور فرمایا اے ام العلاء خوش ہو جاؤ کیونکہ مسلمان
 کی بیماری کی وجہ سے اللہ اس کے گناہ اس طرح ختم
 کر دیتا ہے جس طرح آگ سونے اور چاندی کی میل
 ختم کر دیتی ہے.....“

”جراک اللہ..... آپ نے مجھے دُہری خوشی
 دی، آپ نے میرا خیال رکھا، مجھے حدیث سنا کر خوش
 کیا..... سچ میں، میری آدھی بیماری ختم ہو گئی۔“ پھر منشی
 ماما کی ہنکھار اور چپ سائی دی تو وہ اٹھ گئی۔ منشی ماما
 نے آکر بیٹی کا حال پوچھا۔

”پتری، تمہیں بی بی نے چودھری واصف مرحوم
 کے عطیے کی بات بتائی ہے؟ مجھے یقین ہے نہیں کی
 ہوگی۔“ شبانہ کی لاعلمی کے اظہار پر انہوں نے تمام
 بات کہہ سنائی۔

”مسجد کا پیسہ پائی، پائی کے حساب سے مسجد پر
 ہی خرچ ہوگا۔ میرا ذاتی خیال ہے قبول کر لیتا چاہیے۔“
 ”ماما جی..... قانونی طور پر ٹرسٹ میں آئے گی۔“

”بابو لے گیا ہوگا.....“ ان کی پرانی گاڑی پرانا بوڑھا
 ڈرائیور جس کو کبھی، کبھار گاڑی چلانے کا موقع ملتا تھا۔
 ”مما جب آئی تھیں تو ہمارے لیے نئی گاڑی
 سیراج میں چھوڑ گئی تھیں۔ پرانی والی کو لے گئیں.....
 کہا تھا اسے بکوا دوں گی۔“

”نئی ہو یا پرانی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ لو
 جی صفہ کو اس بات کی پروا تک نہیں ہوئی۔ لوگ نئی
 گاڑی کی خوشیاں مناتے ہیں۔

”کب آئیں گی؟“
 ”پر سوں آئیں گی۔“

”شبانہ جب آئے مجھے کھلوا دینا۔ میں اب نہانا
 چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھ گئی۔

”شبانہ کا بھی یہی حال تھا، سفر سے آکر دن میں
 دو، دو دفعہ نہاتی ہے وہ، اب تو موسم خاصا خشک
 ہے..... گیزر چلوادوں۔“ وہ انکار میں سر ہلا کر مسکرائی۔

شبانہ کی طبیعت اب بہتر تھی، وہ اپنے کمرے
 میں لیٹی تھی، برابر والے میڈ پر عبد اللہ بیٹھا انگریزی
 پہیلیاں بچھوارہا تھا۔ پہیلیاں کیا تھیں اور حوری سطریں
 اپنی مرضی سے با معنی الفاظ لگا کر مکمل کی جاتیں۔ شبانہ
 تھوڑی دیر ساتھ دے کر تھک گئی۔

”بیمار ماں کو تھکا رہے ہو..... کوئی آسان گیم کھیلو۔“
 جیتے، جیتے عبد اللہ دروازے کی طرف دیکھ کر ختم سا گیا۔
 شبانہ کی نگاہ نے تعاقب کیا۔ صفہ اندر داخل ہو رہی تھی۔

”صفہ خالہ..... زبہ نصیب۔“ عبد اللہ ایک دم
 شرارتی ہو گیا۔ وہ مسکرائی۔ صفہ نے شبانہ کی پیشانی پر
 بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر اشارہ دیا۔ وہ اٹھنے لگی تو منع
 کیا۔ اس کے بستر کی پائنتی پر بیٹھنے لگی تو شبانہ تڑپ اٹھی۔
 ”بخاری باجی، پلیز مجھے گناہ گار نہ کریں۔“

”تم کیوں گناہ گار ہوگی، یہ باتیں گناہ نہیں
 ہوتیں، اللہ تمہیں صحت عطا فرمائے۔ تم میری بہت
 پیاری بہن ہو، تم ہی تو اس آگ میں کی چپکار ہو.....“ اچھی
 اور امید والی لطیف باتیں حارادری کا حصہ ہوتی ہیں،

”آپ کیوں چلتے ہیں، سوتے تو آپ جلدی نہیں ہیں، منشی ماموں جان.....“ عبداللہ اپنی کتابیں سیٹ کر رہا تھا۔

”آرام تو کر لیتا ہوں کمر سیدھی کر کے۔“ وہ چلے گئے۔

”شانہ اسی..... آپ بھی سو جائیں..... میں یہ ٹیکل لیمپ جلا کے لائٹ آف کر دیتا ہوں۔“ شانہ نے کروٹ بدل کر کھل اوپر کھینچ لیا۔

☆☆☆☆

اب موسم خنک ہو چکا تھا۔ اے سی بند ہو گئے تھے، پنکھوں کی البتہ ضرورت رہتی، نومبر کی تیسری تاریخ تھی۔ خنبہ نے آج خیرات کے طور پر بریانی کی دیکھیں اتروائی تھیں۔ امیر بی بی محلہ بھر میں جانے نہ جانے والوں میں بانٹ رہی تھی۔ گاؤں سے نئے موسم کا تازہ ساگ کاٹنے، دھونے، ابلانے کے مراحل کے بعد بھیجا گیا تھا۔ شانہ اسے دیکھ لیتی، سوکھی مریج کا بکھار لگا رہی تھی۔ خنبہ کو کاموں میں دلچسپی لیتا دیکھ کر صفائے خوش ہوتی جیسے ڈاکٹر اپنے مریض کی صحت یابی پر مطمئن ہو، خوش ہوتی صفائے وقت زینے پر بیٹھی جو اس کا کبھی، کبھی ٹھکانا بنتا تھا۔ سفید ردا کا ہالہ اس کے چاندی جیسے چہرے کے گرد تھا۔ کلائیوں تک آتے آستین سے نکلنے کزور ہاتھ میں گل ریحان کی خوشبودار پتیوں تھیں۔ جنہیں بے دھیانی میں مسلتے ہوئے سونگھ لیتی اور کوئی معطر سا روز بان پر رہتا۔ چھوٹا گیت کھول کر طارم کی ای نے جھانکا..... پھر اندر قدم رکھا۔

”آئیں..... تشریف لائیں۔“

اسکارف سے ڈھانپے سر اور کزور نقابہت زدہ چہرے والی خنبہ نے انہیں خوش آمدید کہا۔ وہ وہیں قریب بیٹھ گئی۔ ان کے درمیان احوال پرسی کا تبادلہ، شانہ کا اندر سے جوس کا گلاس لا کر دینا پھر اس کا کوئی لمبا سا حال سنا، خنبہ کا سر ہلاتے ہوئے ہنسنے رہتا۔ شانہ کا آتے جاتے ایک آدھ بات کر لیتا۔ امیر بی بی کا بڑی ٹرے میں تھالیاں بھر، بھر کر کھانا ان کو ابلے دسترخوان

گئے۔“ پھر وہ بتانے لگا کہ اذان کو بھی بخار ہو گیا ہے۔

”اور ہاں سندری کا فون آیا تھا۔ تم تو جانتی ہو وہ بات کیسے کرتی ہے..... مجھ سے بکڑنے لگی آپ تو بڑے بڑھے ہیں، آپ ہی سمجھداری کر لیا کریں۔ محلہ سحر میں میرے بچے کو بیچ دیا۔ پتا نہیں کیا کھول کر ملا دیا ہے بخاری باجی نے ایک تم کو کر ہو، دوسری شانہ..... زندگی اس کے نامے لگا کے بیٹھی ہے، تیسرا اذان تیار ہو رہا ہے۔“

”یوں کہہ رہی تھی وہ؟“

”ہاں..... یہی الفاظ تھے۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”کیا کہتا..... خیر ہے، مگر بیٹھے بھی بخار ہو جاتا ہے..... ایسے بات نہیں کرتے، سمجھایا اسے۔“

”آپ نے ٹھیک کہا..... رہی بات میری..... تو میرے لیے صفہ بخاری اپنوں سے بڑھ کر ہے وہ میری ماں، بہن، سہیلی سب کچھ ہے پھر میرا یہ ہونہار تا بعد از پیارا بیٹا ہے۔ یہ میرا سہارا ہے، مجھے یہاں کیا نہیں ملا۔“

”اللہ اسے نیک صالح بنائے..... پتہ ہی.....! میں نے سنا ہے تم عبداللہ کے ساتھ مصر چلی جاؤ گی۔“

”قاہرہ، منشی ماما جان..... میں جامعہ الازہر میں ایڈمیشن لوں گا، میں لائسنسی قانون پڑھوں گا..... ہر مذہب کا لا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے..... مگر یہ جھلی وہاں کیا کرے گی؟“

”ماما جی..... میں اب جاہل جھلی نہیں رہی..... عمر بھی سکھاتی ہے..... پھر میں نے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔“

”پھر بھی..... تو کرے گی کیا؟ تو بھی جامعہ میں داخلے لے گی؟“

”دونوں کو منشی ماما کی پڑھنی آگئی۔“

”میں اپنے بچے کا خیال رکھوں گی..... اس کی گارڈین (سرپرست) ہوں گی۔“

”رہی ناں جھلی..... پھر تو ہاشل داخل ہو جائے گا..... تو کیسے خیال رکھے گی۔“ اس سوال کے جواب پر شانہ نے غور نہیں کیا تھا۔ اسے یہی پتا تھا کہ بخاری باجی جیسے گی تو بہتری کے لیے ہی ہوگا۔

طارم کی امی؟ یہ یونی کی لہائی ہے۔ اب شبانہ متوجہ ہوئی۔

”طارم کی امی تو صفہ بخاری سے بہت متاثر ہیں بتا رہی تھیں کہ پہلے مجھے بخاری بی بی سے پڑھنی میں نے اس سے نکرار بھی کی تھی کہ میری بیٹی کو ملانی بنا دیا ہے۔۔۔۔۔ زمین جو عطیہ دی گئی ہے اس کا قصہ یہ ہے کہ چوہدری مرحوم کے بیٹوں نے دبا رکھی تھی۔ مرحوم کی بیٹی حاجی جو ماڈلنگ کرتی ہے اس نے یہ خبر آؤٹ کی۔۔۔۔۔

قارئین متوجہ ہوں

پرچا
نہیں ملتا

کہو عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ ایک اسٹال کا نام جہاں پر چادر دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو ایک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

مرزا ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز

سپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیضانِ انجمنِ اسلامیہ، اسلام آباد، پاکستان

مندرجہ ذیل نیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سے ڈھانپ کر اٹھانا جانا انا، صفہ کی نظر پڑی رہی، کبھی تجسس یا کرید کے بغیر۔۔۔۔۔ اس کی سانسوں کی آمد و رفت میں اسمائے حسنیہ رہے ہوئے تھے، اب تو وہ زبان سے ادا نہ بھی کرتی تو قلب تسبیح کرتا۔ طارم کی امی اب جا چکی تھیں۔ خیرات کی ایک دیگ خالی ہو گئی۔ باقی یتیم خانے اور مدارس کو بھجوا دی گئیں۔ نخبہ بہت تھک گئی تھی اسنے کمرے میں معمول کی ڈھیر ساری دوائیں کھا کر لیٹ گئی۔ بہت دیر بعد شبانہ نے اس کے کمرے میں جھانکا۔ اب وہ بیدار ہو چکی تھی۔

”فارغ ہو گئی ہو۔“ نخبہ نے روکا۔

”جی۔۔۔۔۔ آپ کو کتنی کا جوس نکال دوں۔۔۔۔۔؟“

”نہیں ڈیر۔۔۔۔۔ آؤ بیٹھو۔۔۔۔۔“

”طبیعت کیسی ہے تھک گئی ہوں گی۔“

”کام تو تم میرے بعد گھنٹوں کرتی رہی ہو۔۔۔۔۔

ہاں مگر میں تھک گئی۔۔۔۔۔ شبانہ، تم نے چوہدری داحصف کے مسجد کے لیے عطیہ کا مجھے نہیں بتایا۔“

”ہائے اللہ۔۔۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی۔۔۔۔۔ مگر ماما جی نے بخاری حاجی کو بتاتا ہوا ہے، وہ بھی میری طرح آپ کو بتانا بھول گئی ہوں گی۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”جی۔۔۔۔۔“

”مگر عجیب سی بات ہے۔“

”کون سی بات؟ مسجد کے لیے عطیہ دینا؟“

شبانہ کے سوال میں تعجب تھا۔

”چوہدری داحصف کا قصہ یاد ہے ناں؟ صفہ بخاری کے لیے رشتہ دیا تھا۔۔۔۔۔ پھر اس کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ مگر عطیہ تو جیتے جی دیا ہو گا ناں!“

”میں کیا کہہ رہی ہوں کہ مرنے کے بعد دیا ہے۔

شبانہ تم شبانہ ہی رہو گی۔“ وہ ہنس پڑی۔

”تو پھر آپ اس پر اتنا غور کیوں کر رہی ہیں؟“

”مجھے اس مرحوم کی سمجھ نہیں آتی۔“

”آپ کو ماما جی نے بتایا ہو گا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ مجھے تو طارم کی امی نے بتایا ہے۔“

"wao a daily women can speak such a noble english" کشور جہاں نے اپنے تئیں حسین کی مگر خبیہ جانتی تھی کہ شیانہ کو ذیلی وومن (یعنی خنواہ وار ملازمہ) کے معنی معلوم ہیں اور یہ تو ہیں آئیز ہے، فوراً اماں کو ٹوکا۔

"مما..... آپ پلیز کسی کے بارے میں جانے بغیر رائے مت دیں۔ یہ عبد اللہ کی امی ہے، عبد اللہ آپ کے الفاظ سے بہت رنجیدہ ہوگا....." پھر شیانہ کو بلا کر ساتھ بٹھاتے ہوئے وضاحت کی۔

"مما جان..... جب آپ کی بیٹی کو ڈاکٹروں نے لا علاج بتا دیا تھا، میرے تین سالہ بچے کو اس نے ممتا کی محبت دی۔ اتنی کہ میں عبد اللہ کی جانب سے مطمئن اور بے فکر ہو گئی۔ یہ وہی شیانہ ہے جس کے متعلق آپ سے باتیں کرتی رہی تھی..... جب پچھلے دنوں آپ آئیں تو یہ اور صفہ یہاں نہیں تھیں۔ اب صفہ بھی آگئی ہے۔"

"سوری سوٹ شیانہ....." کشور جہاں کی معذرت پر خلوص تھی۔

"میری اچھی ماں..... صفہ بھی اب، وہ میری کلاس فیلو صفہ نہ چاہیے گا اسے وہ معرفت، روحانیت کے مقام پر ہے..... اور خیال رکھیے گا۔"

"ہاں، ہاں ضرور ملوں گی..... دعا کر اؤں گی۔" شیانہ اجازت لے کر چائے کا انتظام کرنے چلی گئی۔

عبد اللہ اپنی گرینڈ ما کے پاس آ بیٹھا۔ آج اتوار کا دن تھا اور وہ گھر پر تھا۔ وہ اپنے ماموں زاد بہن بھائیوں کا حال پوچھنے لگا۔

"تم تو میرے ساتھ چلو..... گرینی کی بات مان لو..... پاکستان میرا بھی وطن ہے، میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں مگر تم اپنا کیریئر بناؤ..... یہاں کیا ہے؟"

"گرینی، میں Egypt پڑھنے جاؤں گا..... جامعہ الازہر... میں ایڈمیشن لوں گا اور یہ اتنا بڑی نہیں ہوتا..... دعا کریں ایڈمیشن ہو جائے۔"

"نخبہ باجی..... ہماری صفہ بخاری کی شہرت کہاں، کہاں تک ہے۔"

"کہاں، کہاں تک کوئی نہیں..... ہماری صفہ بخاری تو مجذوبہ بندی ہے۔ مجذوبہ خود کو ظاہر نہیں ہونے دیتا اور سچ تو یہ ہے کہ ہم جو اس کے اتنے قریب ہیں، ہم پر بھی ظاہر نہیں ہے۔ اصل میں وہ ہے کیا؟"

☆☆☆

تہجد سے اشراق، چاشت تک جاگتے رہنے کے بعد صفہ کی آنکھ لگ جاتی تھی۔ وہ سو رہی تھی جب گھر کے باہر بڑی سی گاڑی آرکی..... شو فرنے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سفید بال مگر بوائے کٹ، لوز لائیک شرٹ اور جینز..... یہ نخبہ کی امی کشور جہاں تھیں جن کی عمر لگ بھگ اسی کے قریب تھی۔

پہلے امیر بی بی ششدر ہوئی پھر شیانہ حیران ہوئی، یہ حیرانی اور پریشانی عبد اللہ کے اچانک نکل کر آنے اور گرینی کے نعرے سے دور ہوئی۔

"اچھا..... یہ نخبہ باجی کی ماہیں....." شیانہ نے یہ آواز بلند سوچا۔ امیر بی بی ایک بار پھر دیکھنے لگی۔ شیانہ آگے بڑھ کر لی اور رہنمائی کرتی ہوئی نخبہ کے کمرے تک لائی۔

نخبہ جو اپنے بند پر نیم دراز تھی خوشی سے ایک دم اٹھی پھر بائے کر کے کمرہ تھا لی۔

"بیٹی بیٹی رو..... جی..... بیٹی بیٹی رو۔" اس کی ممانے اسے تھام کر بٹھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

شیانہ نے سکھ کی سانس لی کہ یہ ارود بول لیں گی۔

"گڈ گاڈ..... کیا حال ہو گیا ہے ترا..... سچ میں تجھے چھوٹے، سامنے بٹھا کر دیکھنے کو ترس گئی تھی۔ اب بڑس کے بقایا معاملات منہ کر آئی ہوں....." پھر اصرار، اُدھر دیکھ کر بولیں۔

"ہائیں، کیسا مزاج ہو گیا ہے، مجھے تو گرمی لگ رہی ہے۔"

"آپ یہاں کے موسم کی عادی نہیں رہو گی۔"

شاپنگ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ ”مجھے آج آٹھ بجوں کی کہتے ہیں، اگر آپ نے مجھے ڈھونڈ لیا تو ہم شاپنگ پر جائیں گے۔“
 ”شوہر۔ اگر میں آپ کو ڈھونڈ نہ سکا تو؟“
 بیوی۔ پیار سے بولی۔ ”جانو! ایسا نہ کہو میں دروازہ کے پیچھے تو چھپی ہوں گی۔“
 مرسہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

کا خوف میرے تعاقب میں تھا اور وقت کی پونجی ختم تھی۔ یہ نہ پوچھا صف نے..... کیوں آئی ہو؟ کیوں میری حویلی میں رہنا چاہتی ہو؟ کیوں نہیں ماں، بھائی کے پاس چلی جاتیں؟ اس کے پاس کتنے کیوں تھے، اس نے ایک بھی کیوں نہ اٹھایا۔ ماما آپ تائیں؟ آپ کے پاس، ہمارے پاس کوئی یوں آکر رہنے لگے۔ چاہے آپ کی فریڈ ہو، میری فریڈ ہو، ہم رہنے دیے؟ ہمیں کتنے شک پڑتے۔“
 نے تھوڑا پانی گلاس میں لے کر گھات کیا۔

”پھر ماما..... اس کا ایک اور رخ میرے سامنے آیا۔ وہ میرے لیے دعا بن گئی۔ اس نے یہ دعا اپنے ذمے یوں لے لی جیسے اس سے قصور سرزد ہو گیا ہو، صف کی دعا میرے ہی صوموں کی دعا نہیں ہے، نہیں ہو سکتی، اس نے اللہ کے ذکر پر عمر، مال، جوانی، خواہشات نثار کر دی ہیں، ماما جان یہی عمر، مال، جوانی، خواہشات ہم دنیا والوں کے ناخدا ہیں، آپ بھی جانتی ہیں، میں بھی جانتی ہوں..... آسان نہیں ہوتا ان کو کرش کر دینا اور میں؟ کہاں میں یہ ترک کر سکتی تھی؟ مفلوج کی ٹانگ نہ اٹھ سکے تو دوڑ میں حصہ نہ لینا اس کا فیصلہ نہیں ہوتا.....
 البتہ..... یہ مصلحت ربانی ہوتی ہے..... مصلحت وہ فلسفہ ہے جس کے ظاہر میں اندھیرا ہے اور باطن میں راستہ ہے۔“

”سب باتیں ٹھیک ہیں، مجھے تو تمہاری باتیں سن کر یہی خیال آتا رہا کہ company makes a man تم کتنی بدل گئی ہو..... تم واقعی بدل گئی ہو۔“
 کشور جہاں نے انکو رکھ کر دانہ توڑ کر منہ میں رکھتے ہوئے کمرے پر نظر دوڑائی۔ ”یہ بتاؤ..... وہ صف کی سادات

مگر بچے کے بحث کرنا مناسب نہ جانا۔ عبداللہ کرکٹ کھیلنے چلا گیا۔ اسے چند کیلوں، جسمانی ورزش اور صحت مند سرگرمیوں کی اجازت تھی۔ کشور جہاں، غلبہ کے پاس آئینیں، اس کا ہاتھ کچر کچرتے ہوئے آب دیدہ ہو گئیں۔

”ہی..... مجھے تیرے نصیب پر رونا آتا ہے، کیسی ماڈل جیسی خوب صورت تھی، کیا حال ہو گیا..... میری جان۔ لوگ اچھے علاج کے لیے بڑے ملکوں میں جاتے ہیں اور یہ گناہ نہیں ہوتا..... تو یہاں پسماندہ علاقے میں آکر بس رہی..... ڈاکٹروں نے تجھے لا علاج بتایا تھا، یہ کہا تھا کہ جینے کو چند روز سال جی سکتی ہے، چھ مہینے بھی نہ جی سکے یہ بھی ممکن ہے۔“

”ڈاکٹروں نے کہا تھا ناں..... جرمی میں ہوتی تو ڈاکٹر جیت چکے ہوتے، ماما! انسان... جس ایمان پہ ہوتا ہے اسی دھیان پر چلتا ہے، اس کو شاید میڈیکل سائنس ولی پاور کہتی ہوگی..... یہ پاور ایک اور پاور ہے، ویسے قسم سے میں بھی حیران ہوتی ہوں، مجھے کب امید تھی کہ عبداللہ کو چند روز سال کا ہوتا دیکھوں گی۔“
 ”شکر ہے اللہ کا.....“

”ہاں تو یہ اللہ کا ہی کرم ہوتا ناں.....“
 ”اچھا اب میرے ساتھ چلو..... میں نے گھنٹا گھر والا مکان سیل کر دیا اور ترے ابو کے جو دفتر تھے ناں فیصل آباد والے ان کے واجبات نکل آئے، اب میں اپنا حصہ رکھ کر باقی تجھے اور نجیب کو دے دوں گی..... ترا عبداللہ کا انٹرنکٹ تو اس میں سے ہی نکل آئے گا۔“ کشور جہاں نے یوں مسئلہ حل کیا گویا سارا مسئلہ ہی انٹرنکٹ کا ہے۔

”پیاری ماما..... listen to me just listen to me just آپ صف سے ٹی نہیں ہوؤ، بہت جیتی ہے میرے لیے..... وہ بہت اہم ہے میرے لیے۔ جب میرے سر پر دھوپ ہی دھوپ تھی، اس نے مجھے سامنے میں سمیٹ لیا۔ جب کڑوا ہی کڑوا چمکا تھا دنیا والوں سے..... مجھے شیرینی کا احساس یہاں ملا..... خالی دامن

کوئی ایسی وہ رہا۔ وہ بیویوں پر چڑھا دیا۔ (کو
جی کشور جہاں کو سمجھنا مشکل تھا) اور تم اپنا لباس
دیکھو۔ اس دن تم نے اپنی وارڈ روب دکھائی، کوئی
حال نہیں۔ میں تمہارے لیے آٹھ دس ڈیرے سر خرید کر
لے آئی پھر سوچا پسند اپنی، اپنی ہوتی ہے۔“ نخبہ جاکر بیڈ
پر لیٹ گئی۔ کشور جہاں آٹھ کر اس کی ڈیرے تک شیل کا
تقیدی جائزہ لینے لگیں، ایک کو نے میں کئی چند چیزیں
رکھی تھیں۔ لوٹن، پرفیوم، کریم کو باری، باری ہاتھ لگا کر
دیکھا۔ پھر غم میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی۔

”کیا لیول ہے یہ۔ کیا ہے یہ سب؟ یہ تری
ڈیرے تک ٹیل ہے، تو تو جیتے جی مٹی ہوئی ہے۔ ایسی
چیزیں تو ڈسٹ بن میں پھینک دیا کرتی تھی۔“ وہ ٹشو
پپر ہینچ کر اپنی آنکھیں تھپتھپاتے ہوئے سنگار میز کے
اسٹول پر بیٹھ رہیں۔ نخبہ کو ماں پر ترس آ رہا تھا۔ وہ ماں
کے جذبات سمجھ سکتی تھی۔ ماں کی محبت سے انکار نہ تھا۔ وہ
اسی ماں کو ناپسند آنے والے کا سٹیکس بغیر استعمال لوٹا
دیا کرتی تھی۔ وہ ناک پر کبھی نہیں بیٹھنے دیا کرتی تھی۔
”تری عمر کوئی پچھن ستاون برس ہے، میں ابھتر
پار کر چکی ہوں۔ تو خود کو دیکھ۔ مجھے دیکھ۔ بیماری
نے ترا دل مار دیا۔“ انہوں نے سنبھل کر پھر بات کی۔
کشور جہاں کے ڈریس سے اٹھتی قیمتی مہک، گلے
میں پڑا سفید موتیوں کا ٹیکس، ایک کلائی میں پرل کا
برسٹ دوسرے ہاتھ میں ہیرے کی انگوٹھی، کانوں
میں وائٹ گولڈ کے ٹاپس، پاؤں میں دیدہ زیب
جوتے، ہر چیز اپنی جگہ فٹ تھی۔ اور ادھر عام موٹی، ملائم
کاشن کے ڈھیلے ڈھالے کپڑے، سر کے بال جگہ، جگہ
سے گرے ہونے کے سبب سر پر اسکارف آنکھوں کے
گرو جھلتے، ہاتھوں پر جھریاں۔ یہ تو وہ بھی جانتی تھی کہ
کوشش میں لگی رہتی تو اس وقت بھی اپنی عمر سے بیس
سال چھوٹی لگ سکتی تھی۔ ظاہری چمک لگے رہنے سے
ملتی ہے ورنہ وقت تو ایک سا بے رحم ہے۔ کھیت میں
گندم کا نئی چالیس سالہ شقی عورت ساٹھ کی لگتی ہے
جبکہ رانک شکر نے والی سیلمنی پچاس سال کی ہو کر

ایک میں سے کسی سے۔ کشور جہاں سے تو
ایک مریض اس دوڑ میں کس جگہ سے لگتی اور لگتی بھی تو
اجت ہوئی۔ کچھ دیر تک افسوس کرنے کے بعد کشور جہاں
کو یہ بات سمجھ آنے لگی۔ پھر وہ خاموشی سے دوسرے بیڈ
پر جا کر لیٹ رہیں۔ پھر وہ اپنے شوہر اعوان صاحب
(نخبہ کے ابو) کے زمانے کی یادیں دہرانے لگیں۔
ماضی کی باتوں کی پٹاری کھل گئی۔

”تری شادی اس خبیث، کم ظرف آدمی سے
کرنا ان کی ایسی غلطی تھی جس کا پچھتاوا اعوان صاحب
کی صحت چاٹ گیا۔ ہم اس کی ظاہری شان و شوکت
سے متاثر ہو گئے۔“

”اب اسے گالی مت دیں۔ اللہ اس کی بھی
معفرت کرے۔“

”یہ تو بھلا ہوا وہ بھی اعوان تھا۔ عبد اللہ کا نام عبد اللہ
۔۔۔ اعوان اسے دونوں طرف سے بچا گیا۔“

”صفہ جاگ گئی ہے؟“ شبانہ اس دوران کسی کام
سے آئی تو نخبہ نے پوچھا۔
”ابھی تو نہیں جاگیں۔“ دوسری بار شبانہ ظہرانے
کے لیے ہدایات لینے آئی تو بتایا کہ بخاری باجی کے لیے
قبوہ بنارہی ہوں، ان کے سر میں درد ہے۔

”اب اس کی باری آگئی۔“

”کیوں، کیا ہوا۔“؟ کشور جہاں نے لیٹے،
لیٹے پوچھا۔
”پچھلے دنوں شبانہ کو تیز بخار چڑھا تھا۔ اب اللہ
خیر کرے صفہ کے سر میں درد جتا رہی ہے۔“

”نخبہ، تم نے بتایا نہیں جب میں آئی تھی یہ
دونوں کہاں تھی؟“

”مما۔۔۔۔۔ آپ نہیں سمجھیں گی۔۔۔۔۔ یہاں کا اپنا
آسمان اور اپنی پروازیں ہیں، آپ کو بتاؤں گی تو سوال
پہ سوال کریں گی۔“

”میرے حساب میں تو بھی مجھدوب ہو چکی
ہے۔“ کشور جہاں نے کبھی سانس خارج کی۔ ”اس گھر
کا نام مجھدوبان داڈیرا ہونا چاہیے۔ ساری کالیاں ایک

جس کا رسولوں سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بیٹا..... ان کی دنیا محدود ہے..... ان کی ساری زندگی ایک چار دیواری میں گزری..... انہیں کیا پتا کون سا ادارہ ٹاپ کا ہے، کس مضمون کی ڈیمانڈ ہے۔“ عبد اللہ چپ رہا تو کشور جہاں کو لگا دلیل اثر کر رہی ہے مزید محبت سے کہا۔

”میرے پیارے بچے، نجیب انگل سے مشورہ کر لو..... میرے ساتھ چلو ایک چکر لگا لو..... بڑے ملک اور حیثی کو ملو گے، دیکھو گے تو وژن بڑھے گا..... ایگز امز وہ چکے فارغ تو ہو.....“

”اما سے پوچھ لیجئے..... لیکن میں شبانہ امی کے بغیر نہیں رہ سکتا..... گری پیلیز مجھے ان کو cheat کر نامت بتائیے گا۔“

کشور جہاں اگلی بات یہی کرنے والی تھیں، وہ تو نواسے کو ”خود ساختہ، ماں کے ٹرانس سے نکالنے کا عزم لے کر آئی تھیں۔ برا وقت تھا گزر گیا اب کیا ساری عمر ساتھ جوڑے رکھیں۔ انہیں افسوس تھا کہ دس، گیارہ سال کا یہ عرصہ نجیب کو فری ہینڈ دے کر غلطی کی۔ اب عرصہ اتنا گزر چکا تھا کہ ذہن بدلنا آسان نہ تھا۔

کشور جہاں نے سنگار میز پر رکھے پرفیوم کو اٹھایا۔ اس کو آنکھوں کے قریب لا کر نام پڑھا..... پھر اپنے دائیں بائیں چھڑکا پھر براسا منہ بنا کر رکھ دیا۔ وہ عبد اللہ کے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ چھتھا کر بولیں۔

”مائی سویٹ سن..... تم نے تو مجھ سے زیادہ اسلام کو اسٹڈی کیا۔ اسلامی ماحول کی تربیت لی، تم جانتے ہو گے اسلام میں منہ بولے رشتوں کی کوئی قانونی شرعی حیثیت نہیں..... منہ بولی ماں، ماں نہیں ہوتی، رضاعی رشتوں کو اسلام نے مقام دیا ہے منہ سے کہے ہوئے کو نہیں.....“

اسی وقت کمرے میں داخل ہوتی شبانہ کے قدم دبیں تھم گئے۔ وہ مزید بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”اچھا اخلاق، خدمت، محبت اپنی جگہ مگر اس سے رشتہ نہیں بن جاتا۔ تمہاری ماں صرف وہ ہے جس

جھاکی، محض جی دیکھ کر پلٹ جانے کو بھی کہ نجیب نے بلالیا۔ اس پر بھی کشور جہاں نے تادیبی نظروں سے دیکھا وہ بہر حال اسے ایک عزت دی گئی مازمہ گردانی تھی۔ شبانہ نے پھر سے ایک بار انگریزی میں وار کیا۔

”ہم آپ کے لیے کوئلہ کافی تیار ہے۔“ نجیب کو اس وقت شبانہ نجات دہندہ لگی۔

”مما آپ چلیے..... میں آتی ہوں۔“ اس نے ماں سے کہا۔

”میں پھر آپ سے بات کروں گی۔“ کشور جہاں اٹھتے، اٹھتے کہہ گئیں۔ وہ چلی گئیں۔ نجیب نے صفحہ کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر لجاجت سے معذرت کی۔

”اچھی بہن..... امی کی باتوں کو دل پر نہ لیتا۔ وہ چاہتی ہیں کسی نہ کسی طرح مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جو اچھی نہ ہو..... نجیب تم جاؤ اور زیادہ وقت ماں کے ساتھ گزاردو..... ان کا تم پر بہت حق ہے۔“ نجیب ریلیکس ہو گئی۔

”ویسے تمہاری طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟“

”میں حیران ہوں کہ میں، اب اس اذیت میں نہیں ہوں..... یہ میری زندگی کا معجزہ ہوگا اگر میں میڈیکل کی سو فیصد پیش گوئیوں کو رد کر کے صحت یاب ہو جاؤں..... اور یہ صرف تمہاری دعاؤں سے ہوگا..... ہم صحت یاب ہو کے مل کے رہیں گے.....“

”الحمد للہ.....“ صفحہ نے سر جھکا کر گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

”کیا رکھا ہے جامع الا زہر میں..... نام ہی اتنا مشکل کہ زبان پر نہیں چڑھتا۔ عبد اللہ..... یہ سائنس، ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے، تمہیں لائف میں کچھ بننا ہے یا صفحہ مسجد منجھا لو گے؟“ کشور جہاں چٹائی نہیں بیٹھیں اب عبد اللہ کو گھیر لیا۔

”ڈائیر گری..... جامعہ الا زہر میں سائنس، ٹیکنالوجی تمام subjects ہیں۔ صفحہ خالہ نے میرے لیے بہتر سوچا ہے۔“ عبد اللہ نے فریج سے

نے تمہیں جہنم دیا..... پالنے پونے کے لیے تو دیا ہے، آیا
فوسٹر مد رہی رہتی ہیں..... اللہ نے قرآن میں ہمیں
حکم دیا کہ دایہ، ماں کے برابر ہے؟“
الفاظ سچ تھے یا تو صبح سچ تھی، شبانہ کی سماعتوں پر
بھڑکتے تیزاب کا الاؤ گرا اور اندر بھسم کرتا چلا گیا۔ ہاتھ
میں عبد اللہ کے استری شدہ کپڑوں کا بیٹگر تھا اسے وہیں
کمرے کے دروازے کے ساتھ رکھے سپاڈی گلدان پر
ڈال کر اندھا دھند اپنے کمرے کو بھاگی شعور نے ایک ہی
حکم دیا بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ، مٹ جاؤ، پردہ پوش
ہو جاؤ..... کمرے کا دروازہ بند کیا۔ ٹکیہ بڑا تھا
سامنے..... ٹکیہ دیو بچ کے فرش پر پھسکڑا مار کے ڈھے گئی۔
”منہ بولی ماں، ماں نہیں ہوتی۔“

نخسے سے عبد اللہ کا پنجہ کی انگلی پکڑے سادات
حویلی میں داخل ہونا..... شبانہ کا لپک کر اسے سینے سے
لگا لیتا۔ اٹھائے، اٹھائے پھرنے کے ان گنت مناظر،
طرح، طرح کے کھیل بنا کر عبد اللہ سے کھیلتا، اس کی
خوشی کی خاطر جھلی بن کر پھرنا۔ صبح شام اس کو مزے،
مزے کی اول بدل کر چیزیں بنا کر کھانا، اس کو سنانے
کی خاطر کہانیوں کی کتابیں خریدنا، کبھی زبردستی سلانے
کی کوشش نہ کرنا، اس کو ناگہوں پر جھلاتے ہوئے اس
کے نخسے قہقہوں پر ہنس، ہنس کر ٹار ہونا۔ اس پر پڑھ،
پڑھ کر پھونکنا، اس کو دعاؤں کا محور اول و آخر بنا لینا، اس
کی کامیابیوں کی خنٹیں، معمولی معمولی بیماری پہ صحت
یابیوں کی خنٹیں، اس کے گھر سے باہر قدم رکھتے ہی کلام
اللہ کا حصار گھر کے اندر قدم رکھتے ہی بسم اللہ، بسم اللہ
کا استقبال، اس کے ساتھ جانے کی خاطر انگریزی
سیکھنا اور پھر عربی سیکھنا..... وہ اس کا کہنا ”شبانہ امی“
اور شبانہ کا جوابی ”امی صدقے.....“ مگر پھر بھی وہ ماں
نہیں تھی۔ اس کو رب نے ماں نہیں بنایا تھا۔ اس کے
بلن میں انکار رکھا تھا۔ اس نے خواہ مخواہ ماں بننے کے
ترلوں میں عمر بتادی..... اس کے قدموں تلے عبد اللہ
کی جنت نہیں تھی۔ منہ بولی ماں کا طمانچہ اس کی روح
سنگسار کر گیا تھا۔ اس کا دل زخمی ہو گیا تھا اور اب وہ ٹکیہ

حمد

الہ کہوں یا علت اولی کہوں اسے
یزداں کہوں یا ایزد اعلیٰ کہوں اسے
وہ متمکن علی العرش العظیم ہے
وہ ذوالجلال و الاکرام ہے
لا یزال اور آفریدگار ہے وہ
محبب الدعوات اور معبود حقیقی ہے وہ
صفت الہی اور خدائی سب اسی سے ہے
ربوبیت اور معبودیت سب اسی سے ہے
لا احمد و طاقت اور وحدت کا مالک وہی خدا ہے
حاکمیت اعلیٰ اور ابدیت کا خالق وہی خدا ہے
واحد اور ہستی مطلق ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
متبرک اور معبود ہے فقط رب تعالیٰ کی ذات
وہ رزاق اور مسبب الاسباب بھی ہے
وہ حکیم، کریم، رحیم اور بصیر بھی ہے
حکمت، نیکی اور عدل سب اسی سے ہے
حق، محبت اور رحم سب اسی سے ہے
وہ منعم حقیقی اور خالق کل کائنات ہے
وہ اعلم الغیوب اور محافظ حقیقی ہے

کاوش: بصیر حیدر

انتخاب، صانور، لیلہ

کھجور کھائیں..... لمبی عمر پائیں

رسول اللہ کا مبارک ارشاد ہے.....

جس نے سات کھجوریں صبح اور سات شام کو
کھائیں وہ دن بھر (تمام بیماریوں سے) محفوظ رہے گا۔
عالمی ادارہ صحت میں وبائی امراض کے ماہر ڈاکٹر عمر
سلمان محمد جن کا تعلق سوڈان سے ہے، ان کا کہنا ہے۔
”ہمارے علاقے میں لوگوں کی عمریں بڑی لمبی
ہوتی ہیں، وہاں لوگ سو سال سے بھی زیادہ عمر پاتے
ہیں اور آخری دم تک صحت مند اور توانا رہتے ہیں،
میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ لوگ
غذا میں کھجور کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔

ایک تحقیق سے اتنباس۔ از: آسیہ عامر، کراچی

کودیں رہ رہ کر رہی تھیں۔
 بڑی دیر ہو گئی تھی۔ شبانہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ امیر بی بی کا کم کرتے یہی سوچ رہی تھی۔ عبداللہ نظر آتا تو پوچھا۔

”چھوٹے میاں..... شبانہ باجی کہیں گئی ہوئی ہیں؟“
 ”نہیں.....“

”سورہی ہوں گی.....“ امیر بی بی نے قیاس دوڑایا..... روٹی دھوئی شبانہ کو یاد آیا، بخاری باجی کے لیے ترکاری منگاتا تھی۔ خدمتوں کے الارم تو اس کے اندر فٹ رجتے تھے۔ کبھی کسی کو انتظار نہیں کرایا تھا۔ وہ الماری سے پیسے نکال کر امیر بی بی کو دیئے لٹکی ہی تھی کہ سیڑھیوں میں سفید ہولہ سا لگا..... یہ بخاری باجی اس وقت یہاں؟ ادھر سے اشارے سے بلایا گیا۔

”شبانہ.....“ صفہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے دھیسے سے پککارا۔ بس ایک ہی پکار جیسے سب کچھ معلوم ہونے کی خبر داری سے بھری تھی۔ شبانہ کی آنکھیں بھرا آئیں۔ صفہ زینے پر بیٹھ رہی اسے دائیں جانب آکر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت پیاری بہن..... کیا ہوا ہے؟“
 ”بخاری باجی.....“ وہ آنسوؤں کے گولے نگل کر بولی۔ ”آج پتا چلا ہے کہ میں ماں نہیں ہوں، میں منہ بولی ماں ہوں، میں ماں نہیں ہوں، قانون میں نہ شریعت میں نہ سوسائٹی میں.....“ نجیبہ باجی کی امی عبداللہ.... کو سمجھا رہی تھیں۔ صبح سمجھا رہی تھیں۔ یہ تو میرا گناہ ہے میرے کان پر اتو میں نے چھپ کر سنا۔“

صفاس کے سر پر آہستہ، آہستہ ہاتھ پھیرتی رہی۔
 ”اچھا، پانی لا دوں.....“ پانی پیو گی؟“ وہ آنکھیں پونچھ کے سیدھی ہوٹیلی اس خیال سے نادم ہو گئی کہ بخاری باجی اس کے لیے پانی لائے۔

”مہربانی ہے بخاری باجی..... پانی سے زیادہ مجھے آپ کی بات سے تسکین ملے گی۔“

”ممبر سے بات سنو شبانہ..... تم نے جو عمر بلکہ عمر کا بڑا حصہ میری خدمت، خاطر اور خیال میں گزار دی، وہ

ہوں..... نجیبہ میرے پاس آئی، کس رشتے سے آئی، نجیبہ نے خود اپنا بیٹا تمہارے حوالے کیا۔ ہمارا عادی بنایا، ہم سب کا کوئی خونی رشتہ نہیں ہے، انسانیت کا رشتہ، اخوۃ کا یعنی بھائی، بھائی کا ہے، شریعت کا رشتہ چچا زاد اخوت کا ہے۔ یعنی باپ کا باپ بھائی ہو تو اولاد چچا زاد ہے۔

حضرت علیؑ نے جب فرمایا دنیا دار بھڑکھانے والے درندے کے مانند ہے، تو پہلی سوچ یہی تھی کہ یہ سخت الفاظ ہیں..... مگر نہیں..... یہ حق الفاظ ہیں..... دنیا دار اس زبان، حبیب، tongue سے بھڑکھاتا ہے۔“

”آپ نے ہر لفظ سچ کہا مگر باہر کی دنیا انگلیاں اٹھاتی ہے میں جب گاؤں جاتی تھی تو ایک، ایک مجھے بٹھا کر سمجھاتا..... آپ نے سندری اور لالہ کا حال تو دیکھا تھا ناں.....؟“

”تو تمہیں لگا کہ وہ سچے ساتھی ہیں؟ تم نے ان کی مان لی؟ مومن کا مومن سے مفادے بالا تر ہو کر اللہ کی محبت میں جزا ہوتا وہی رشتہ ہے جس کی مثال حدیث پاک میں جسم کی دی گئی ہے جس کے ایک عضو کی تکلیف سارے جسم کی بے چینی بن جاتی ہے۔“
 ”جی.....!“

”شبانہ..... تم نکاح کر سکتی تھیں، راستے کھلے تھے، بھائی کے ساتھ رہ سکتی تھیں، راستے کھلے تھے، تمہارا فیصلہ درحقیقت رب کا فیصلہ تھا، اس کے فیصلے پر راضی ہو تو جس نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی اسے معاف کر دو..... بس اپنا دل صاف اور نرم رکھو..... اللہ بہتر سے بہتر کرے گا۔“

”آپ کا ساتھ نعمت ہے..... آپ کی باتیں سن کر ٹھنڈک سی پڑ جاتی ہے۔ ممبر آ جاتا ہے بلکہ..... ممبر اچھا لگتا ہے، صفہ باجی! عبداللہ میرے پاس رہے یا نہ رہے..... میرے دل میں بستا رہے گا..... وہ جہاں رہے خیر خوشی سے رہے۔“

شبانہ ایسی ہی صابر اور سمجھوتا مگر تھی۔
 (باقی آئندہ)



۲ گمنام

کشف بلوچ

سے چابی کو نکال کر قفل میں تھمایا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ماضی بہم کرواپس صندوق میں چپ چاپ لیٹ گیا اور وہ یوں بدک کر پیچھے ہوئیں جیسے کسی نے پیچھے سے ان کی کپٹی پر ہتھول رکھ دیا ہو۔

وہ ایک جھٹکے سے انہیں تو نیچے اترتے ہوئے چار پائی پر پنجھی سفید چادر کی جھال میں اٹکھٹا پھنس گیا۔ دونوں ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر اٹکھٹا تو نکال لیا مگر جگت کے باعث صندوق الماری کے اوپری حصے پر رکھتے

صندوق کھلتے ہی ایک مخصوص خوشبو خاتون بیگم کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ ہر بار صندوق کھلتے ہی گزرا زمانہ گویا باہر نکل آتا۔ صندوق میں قید یادیں باہر نکل کر ان کے سامنے چوڑی مار کر بیٹھ جاتیں۔

کاش ماضی، حال اور مستقبل وقت کے صندوق میں مقفل ہوتے اور یاد کی چابی گھماتے ہی سب منظر بھر سے چلنے لگتے۔

انہوں نے گھٹے میں ہمد وقت ٹٹکتے لاکٹ کی چین

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک انہیں اور زیادہ بوکھلارہی تھی۔

”کون ہو بیٹا..... تمہاری گیند اُدھر نہیں آئی؟“

وہ کمرے میں موجود چیزوں سے بچتی بچاتی دروازے پر پہنچیں۔ گھڑی بھر کے لیے سانس ہموار کیں اور مخاطب کے بولنے سے پہلے ہی جواب دے کر گویا جان چھڑائی۔

انہیں چپ کے خول میں بند ہونے کئی سال گزر چکے تھے۔ اتنا لمبا عرصہ کہ اب انہیں بولنا باہر گراں لگتا۔ زبان پر گرہ سی پڑ جاتی۔ اس لیے ان کی حتی المقدور کوشش ہوتی کہ وہ دوسروں کے بولنے سے پہلے ان کا مطلوبہ جواب دے کر سوالات کو جنم لینے سے روک دیں۔

اکثر عین اسی وقت کُلی میں کھینے بچوں کی گیندان کے گھر میں اڑتی ہوئی آ جاتی۔ کبھی کبھار وہ گیند دیوار کے پار پھینک دیتیں اور کبھی جلدی میں ہونے کے باعث ٹکا سا جواب دے کر واپس مڑ جاتیں۔ دیوار کے پاس ترتیب سے رکھے گھلوں کے پاس پلاسٹک کی نوکری رنگ برنگی گیندوں سے بھری پڑی تھی۔

”دروازہ کھولے خاتون امی، یہ میں ہوں۔“
خلاف معمول اس وقت رباب کی مضطرب اور تھکن سے بھرپور آواز سن کر کچھ دیر پہلے کی بھگائی ہوئی گھبراہٹ، دوبار عود آئی۔

دروازہ کھول کر بند کرنے اور اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آنے تک خاتون بیگم کے ہاتھ چر بھول گئے۔
”ارے خاتون امی آپ گھبرا کیوں گئیں؟“

سیاہ عبا یا جس کے کف اور گھیر میں کاڑھے گئے بہت سے پھولوں کے درمیان ننھے، ننھے شیشے جڑے تھے۔ اسے تہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے رباب کی نظر ماں کے اترے ہوئے چہرے پر پڑی تو پوچھ بیٹھی۔
”ارے نہیں بیٹا گھبرانا کیسا۔“ انہوں نے جھٹ

چہرے پر ہاتھ پھیر کر گھبراہٹ کے آثار مٹانے چاہے مگر سوائے پسینے کے ننھے، ننھے قطرہوں کے مزید کچھ

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء 132

سے ملنا کا مکر ہی۔
”تم اس وقت کبھی گھر آئی ہی نہیں تو حیرانی ہوئی۔“
رباب کو گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھا دیکھ کر انہوں نے کچھ وضاحتی انداز میں کہا۔

باوجود کوشش کے بھی ان کی آواز میں لرزش شامل تھی۔ انہوں نے تپائی پر رکھے جگ میں سے گلاس بھر کر خود پیا اور دوسرا اس کے لیے بھر کر آگے بڑھیں۔
”تم آج دفتر سے جلدی کیوں آ گئیں؟“ لہجہ

سرسری تھا مگر فکر مندی سے ان کا ہاتھ اب تک کانپ رہا تھا۔ کپکپاہٹ کے مارے توڑا سا پانی چھلک کر صوفے میں جذب ہو گیا۔

”طبیعت خراب ہو رہی تھی۔“ ایک ہاتھ سے اپنا سر دباتی رباب بند حال لہجہ میں بولی اور پھر بیٹھے، بیٹھے ہی اُن سے پانی لیا اور آہستہ، آہستہ پینے لگی۔

”الہی خیر۔“ ماں کو سینے پر ہاتھ رکھے پریشانی سے کہتے سناتو رباب کی بیماری جیسے اڑ چھو ہوئی۔ وہ آگے بڑھی اور جھٹ ان کے گلے میں بائیں ڈال کر ان کی چٹائی چوم لی۔

”فکر مت کریں۔“ وہ مسکائی۔

”میں بھلی چٹکی ہوں اے حسین خاتون۔“
رباب نے تھکن دور بھگاتے ہوئے بشت سے کہا تو ان کی جان میں جان آئی۔

”ویسے میں کبھی کبھار سوچتی ہوں کہ آپ اس عمر میں بھی اتنی حسین ہیں تو عالم شباب میں کیا غضب ڈھاتی ہوں گی۔“ رباب نے آگے بڑھ کر ان کی ٹھوڑی پکڑ کر یوں شرارتا کہا جیسے وہ اُن کی ہم جولی ہو۔

شاید رباب نے یہ بات ماں کی پریشانی دور کرنے کی غرض سے کی تھی لیکن رباب کی بات سن کر خاتون بیگم کا چہرہ ایک دم تاریک ہوا۔ اس کا ہاتھ جھٹکا اور نظریں چراتے ہوئے آگے بڑھیں۔ گھبراہٹ، شرم یا پھر شرمندگی تھی کہ بوکھلاہٹ میں سانسے پڑی کرسی سے جا کھرائیں۔ رباب جس کی شوخی اُن کے ہاتھ جھٹکنے پر ہوا ہوئی تھی۔ ان کو کرسی سے ٹکراتا دیکھا تو فوراً ان کی

طرف لپکی۔ دو قدم آگے بڑھ کر ان کو تھما لیا۔

”کب سے کہہ رہی ہوں نیا چشمہ بنو ادواب تو پاس کی چیز بھی صاف دکھائی نہیں دیتی۔“

انہوں نے مصنوعی غصے سے رباب کو دیکھا اور بچے گرا چشمہ اٹھا کر آنکھوں پر لگا لیا۔ کمرے سے نکل رہی تھیں کہ رباب کی آواز پر پھر ہنسی گئیں۔

”معاف کر دیں خاتون امی! آپ کا نیا چشمہ آج دکان سے لانا بھول گئی۔ اس بخار نے تو میری مت ہی مار دی۔“ کہہ کر وہ الماری کی جانب مڑی۔

خاتون بیگم کو پشیمانی نے آگھیرا۔

”اب ایسی بھی کیا جلدی۔ دھندلا سہی مگر نظر تو آہی رہا تھا۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے اتاؤ لے پن پر کڑھیں اور آگے بڑھ کر رباب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جو الماری سے اپنا عبا یا نکال چکی تھی۔

”رہنے دو، اب اس بخار میں جلتی بھتی بازار جاؤ گی کیا؟“ انہوں نے خود ساختہ شرمندگی سے نکلتے ہوئے اسے ڈپٹ کر کہا۔

”صبح دفتر سے واپسی پر لیتی آنا اب مجھ بڑھیا نے کون سے سوئی ستارے ٹانگتے ہیں۔ وہی دال چاول اور آلو بخارے دالی چٹنی اور صبح کو دو پھلکے ڈالنے ہیں۔ بھلا اس میں نظر کا کیا کام۔ دروازے سے لے کرے اور کمرے سے لے باورچی خانے کے راستے میں رکھی ہر ایک چیز سے برسوں سے واقف ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ ہنس دیں۔ یہ ہنسی بے پردائی کا انداز لیے ہوئے تھی۔

”دکان والے انکل نے کہا تھا کہ دفتر سے گھر جاتے ہوئے آج ہی لازمی لیتی جانا ورنہ اگلے ہفتے ان کی بیوی کا آپریشن ہے۔ شاید وہ دکان چند روز تک نہ کھولیں۔“

وہ عبا بے کے بٹن کھولتے ہوئے بولی تو خاتون بیگم شش و پنج میں پڑ گئیں۔

کچھ دیر تو یوپی انگلیاں چلاتی رہیں۔ جیسے ہاں اور نہ کے بیچ پھنس گئی ہوں پھر اچانک صاف انکار کر دیا۔ ”بس رہنے دو جب دکان کھلے میرا چشمہ لیتی آنا، میں کون سا اندھی ہوں۔“

لیکن رباب تو یہ سوچ کر اڑ گئی کہ تہجد کے وقت ابھی ہیں۔ اندھیرے کے باعث کہیں مگر گئیں تو مشکل ہو جاتی۔ مگر خاتون بیگم نے نہایت نرمی سے اس کے ہاتھ سے عبا لے کر واپس الماری میں رکھ دیا۔

بالآخر رباب ہار مانتے ہوئے اپنے بیگ کی طرف بڑھی۔ کاغذ پر کچھ لکھا اور ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے رسان سے کہا۔

”اچھا تو پھر یہ لیجیے دکان کا پتا اور خود جا کر لے آئیں۔“ یہ سننا تھا کہ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اور رہے اوسان تک خطا ہو گئے۔ ہاتھ اپنے سے بھیگ گیا۔ بقیہ پر رکھا کاغذ لرزش کی تاب نہ لاتے ہوئے زمیں بوس ہو گیا۔

کئی برس پہلے جب انہوں نے پہلی بار رباب کے ابا کے ساتھ اس آنگن میں قدم رکھا تو دنیا کو باہر ہی چھوڑ آئیں۔ دنیا سے کٹ کر خود کو گھر تک محدود کر دیا۔ اس روز کے بعد خاتون بیگم کبھی کسی سے ملنے گئیں اور نہ ہی کسی کو اپنے ہاں بلایا۔ گویا خود کو ڈوبے میں بند مرغی تصور کر لیا۔ رات ہوئی تو ڈوبے میں بند اور صبح ہوئی تو کھول کر باہر۔ اور یہ سب اپنی مرضی سے کیا۔ کسی قسم کی زبردستی نہیں تھی۔ سسرال کے نام پر ایک شوہر تھا۔ نہایت نرم گفتار اور شریف۔ ان کی پیمانی گیٹ کے نزدیک نان چولوں کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اگر وہ باہر جانے کی فرمائش کرتیں تو ان کا شوہر اپنی سائیکل پر بٹھا کر انہیں شہر بھر گھمائے پھرتا۔ اور بھولے سے بھی شکایت کا کلمہ زبان پر نہ لاتا۔ بلکہ شکایت تو دور وہ بچارہ تو بھیکے ہوئے جنوں کی طرح خوشی سے پھولے نہ سنا تا۔ مگر خاتون بیگم کے یوں چھپ کر رہنے کا کیا راز تھا۔ خود ان کی بیٹی تک نہ جان پائی۔ اسکول جانے کی عمر آئی تو ابانے فارم بھر کر اسے داخل کر دیا۔

باہر سے ضرورت کی کوئی چیز لانی ہوتی تو ہمیشہ ابا حاضر ہو جاتے۔ اسکول سے رباب کی تعریف آئی تب بھی پرنسپل کا شکریہ ادا کرنے ابا پہنچے اور جب کبھی کوئی شکایت آتی تب بھی ابا ہی جاتے۔

ذکر کے سامنے لا کھڑا لیا۔ وہ سمجھیں کہ انہوں نے خود کو قید کر کے وقت جیسے منہ زور گھوڑے کی لگام کھینچ لی مگر باہر نکلتے ہی احساس ہوا۔ بس ان کی زندگی ہی رک گئی تھی۔ باقی کی دنیا تو اسی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے گھر میں لگا کیلیڈر رجلا کر سمجھا کہ دنوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔

دیوار پر ٹک، ٹک کرتی گھڑی کا گلا گھومت کر وقت کو مار دیا۔

رباب لاگھ چیختی کہ چوبیس تاریخ کو اس کا... صہا ہی امتحان تھا۔ تاریخ معلوم نہ ہونے پر اس نے چھٹی کر لی اور اگلے دن خوب ڈانٹ کھائی مگر خاتون بیگم کان لپیٹ کر آگے بڑھ جاتیں۔

آئے روز شوہر لاگھ احتجاج کرتا کہ اس موٹی گھڑی کے سیل تبدیل کر دو، سات بج گئے اور میں ابھی تک چھ بجنے کے لیے کب سے اس منٹوں کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ کئی سال ہوئے انہیں وقت کے حساب کتاب سے خود کو آزاد کہے ہوئے۔

کہنے والا دن رات کی قید سے آزاد ہو کر عدم سدھار گیا مگر نہ ہی انہوں نے گھڑی کے سیل بدلے اور نہ ہی گھڑی نے کبھی چھ بجائے۔

رباب کے بچپن میں گھر کا پرانا ٹیلی وژن جس پر کبھی کبھار وہ دونوں باب بیٹی کوئی ایک آدھ روٹا دیکھ لیتے تھے وہ بھی ایک روز گھر آنے پر معلوم ہوا کہ صفائی کرتے ہوئے ان کا ہاتھ لگنے سے فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اگلے دن وہ ٹوٹا ٹیلی وژن سیٹ رباب منہ بسورتے ہوئے کباڑی کے ہاتھ فروخت کر آئی۔

گھر میں موجود پرانے زمانے کا ریڈیو کا بھی ایسا ہی حشر ہوا۔ اباریڈیو کے شوقین تھے۔ فارغ اوقات میں کبھی کوئی تازہ ترین خبر سن لیتے یا پھر کسی فرمائشی پروگرام میں کوئی بھولا بھرا فلمی گانا سنائی دیتا تو جس بھری فضا میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا سا آجاتا مگر ان پر بھی خاتون بیگم مقرر نہیں کہ عین اذان کے وقت

یہ دیکھ کر رباب نے باہر کے کاموں کی لسٹ میں سے ماں کا نام ہی خارج کر دیا۔ اسکول سے شیفٹنگ لینے سے لے کر کالج داخل ہونے اور کالج سے نکلنے کے بعد نوکری کرنے تک کے سارے کام خود سر انجام دیے۔

بھلا ان سے کسی کام کی کیا توقع رکھنی جو بیمار ہونے کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس اس ڈر سے نہیں جاتیں کہ کلینک گلی کے کنڈر پر سہی مگر جانا تو باہر ہی تھا۔

جب کبھی پیٹ میں درد ہوا اباحکیم سے دوائی لے آتے اور وہ پچاسک کر دروڑ بھاگاتیں۔ معمولی بخار اور نزلہ، زکام پر گھر بیٹوں کے آزمائیتیں۔

ایک دو بار مجبوری کی حالت میں گھر سے نکلیں بھی تو یوں خود کو برق میں لپیٹ کر دیوار سے لگ کر چلتیں جیسے لوگ رستے میں انہیں زبردستی روک لیں گے۔ اور پھر ان کا نقاب الٹ کر ناک پر انگلی رکھنے والے انداز میں نہیں گے۔

”اچھا تو یہ تم ہو۔“

نہ جانے کیوں اس دن کئی برسوں سے اپنے درد کو پس پشت ڈالنے والی خاتون بیگم سے بیٹی کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ رباب کو آرام کا کلمہ کر الماری کے نچلے خانے میں موجود اپنا عایا نکالا۔ اس وقت شاید عباے کے بجائے دو ڈوریوں کو چہرے کے نیچے باندھنے والا برقع تھا۔ جس کے پیچھے لٹکتے دو باریک پلوؤں کو نقاب کی طرح چہرے پر گرا دیا جاتا۔ غالباً پہلی بار پین کر آئیں تو نہ لگا کر الماری میں رکھ دیا۔ ابھی تو نیا کور تھا۔ کبھی استعمال ہوتا تو کپڑے کا رنگ پھیکا پڑتا یا پھر ڈوریاں کثرت استعمال سے ٹوٹنے لگتیں۔

خاتون بیگم گھر سے اتنے برس بعد نکلیں تو سورج جیسے آنکھوں میں گھس آیا۔ تیز روشنی کے باعث آنکھیں چند سی گئیں۔

”ڈر کا آسیب ایک بار وجود سے چمٹ جائے تو پھر لاگھ جھکیں، پیچھا نہیں چھوڑتا۔“

خاتون بیگم جس چیز سے خوف زدہ ہو کر کنویں کی مینڈک بن کر رہ گئیں وقت نے انہیں ہاتھ پکڑ کر اسی

ردیف گانا گادیتے ہیں۔

پتا نہیں ماں کو چڑا نا مقصود تھا یا پھر ضد کہ رباب نے اس دن کے بعد انہیں خاتون امی کہنا شروع کر دیا۔ دکان سے چشمے لے کر وہ نکلیں تو انہیں رباب کی تاکید یاد آئی۔ فوراً اسے کال کر کے جلدی لوٹنے کی اطلاع دی۔

دوسری طرف رباب نے سکھ کی سانس لی۔ کتنے سال ہو گئے تھے انہیں باہر کی دنیا کو خیر یاد کیے ہوئے۔ اب اکی وقات کے بعد فاتوں کی نوبت آنے لگی۔ رباب ان دنوں تازہ، تازہ کالج سے فارغ ہوئی تھی۔ اسے لگا اب خاتون امی خود پر لگائی یہ خود ساختہ پابندیاں بنا دیں گی۔ پر وہ تو مرنے کے اس آخری بزدل چوڑے کے مانند ہو چکیں جو مرغی کے ٹھونکنے مارنے کے باوجود خود ہی انڈے کی تہ میں دم سادھ کر بیٹھا رہتا ہے۔ رباب نے تنہائی کے انڈے میں قید خاتون بیگم کو باتوں کے کئی ٹھونکنے مارے مگر بے سود۔

ناکامی کے بعد اس نے خود کو باہر کی دنیا کے حوالے کر دیا۔

اس کی ملازمت کے بعد گھر میں چھائی بد حالی اور نا چھوٹوں کی مہک آہستہ، آہستہ دور ہوتی گئی۔ ”ارو بازار کے نزدیک پہنچ گئی ہوں، فکر مت کر داب ساری دکانوں پر لکھے نام اور ان کے اوپر ننگے سارے بل بورڈ آسانی سے پڑھ لیے ہیں۔“

اب کی بار خاتون امی کی چپکتی آواز سنائی دی تو رباب نے اطمینان سے ایک طویل انگڑائی لی اور چار پائی سے اٹھی۔ ارادہ باروچی خانے میں جا کر چائے بنانے کا تھا مگر نیچے پیر رکھتے ہی کوئی چیز پیر میں جھپی تو اس چیز کو ہاتھ میں دیکھ کر چائے بنانے کا ارادہ موقوف کر دیا۔

نیا چشمہ لگاتے ہی دھندلے منظر ایسے صاف ہو گئے جیسے چھا جھوں مینہ برسے اور شہر بھر کے دھول بھرے شجر، رستے اور منظر یک دم شفاف ہو جائیں۔

زمانے نے کیسے اطوار بدل لیے۔ یہ انہیں بل بورڈ دیکھ کر اندازہ ہو گیا۔ شہر کی اصل صورت ویسی نہ رہی تھی۔ جیسی ان کے دور میں ہوا کرتی تھی۔ انہوں

یوں پہلے پہل ریڈیو گھڑی دو گھڑی کے لیے بند ہوا پھر نامحسوس طریقے سے گھنٹے دو گھنٹے کے لیے۔ اگلے دن ایک آدھ دن کے لیے صحن سے ریڈیو کی آواز گم ہوئی۔ اس کے چند روز بعد طویل تر خاموشی چھا گئی۔ آخری بار رباب نے اسے الماری میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہاں سے نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ”خاتون امی دکان پر پہنچ کر اطلاع دیجیے گا۔“ ان کی دکان حسینہ چوک کے دائیں جانب نیو فردوسی بکری کے ساتھ والی ہے۔“

دو بار راستہ بھول کر وہ کسی راہ گیر کی مدد سے حسینہ چوک پہنچیں تو موہاں کی اسکرین رباب کی مس کالز سے بھر چکی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے فٹ ہاتھ پر سستاتے ہوئے اس کی میسجس کال اٹھائی تو اس کی فکر مندا واز سن کر انہیں بیٹی پر جی بھر کر پیار آ گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد حال ہے جو انہیں کسی قسم کی سچی دکھائی یا پھر تکلیف دی ہو۔

جی کجا اڑ کر گال کے بائیں جانب عین اسی جگہ پر پیار کریں کہ جس پر زندگی میں پہلی بار چارٹا سید کیا تھا۔ ”مجھی اردو کی درک بک میں اپنی، اپنی ماؤں کے نام لکھ رہے ہیں اور میں اس خانے میں جا کر لکھ دوں میری ماں کا نام خاتون ہے۔ کتنا نہیں گے ناں سب بچہ زک آج تک کسی خاتون کا نام خاتون سنا ہی نہیں۔“

زندگی میں پہلی بار رباب اپنی ماں کے سامنے بدتمیزی سے پیش آئی تھی۔ اس بات پر پیچھے ہٹ کر سامنے پڑی میز کے کونے سے ٹکرا کر ماتھے پر نشان لگوا لیا مگر دوبارہ یہ ذکر ان کے سامنے نہیں کیا۔

زخم بھر گیا مگر نشان رہ گیا۔ اکثر آئینہ دیکھتے ہوئے یہ بات رباب اور اس کا ناتھا چومتے ہوئے انہیں بھولتی نہیں تھی۔

اگرچہ وہ کئی دن تک چپکے چپکے ابا سے ان کا اصل نام اگلوانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ خاموش رہے۔ وہ خود بھی انہیں خاتون بیگم کے نام سے ہی پکارتے تھے۔

اپنی زندگی سے کی سال انکی باز آروں اور موثر...
 کاروں میں ایسے ہی برقع میں گزرا رہے۔ تب انہیں نظر
 کا چشمہ نہیں لگا تھا۔ وہ چہرے پر دونوں نقاب گرائے
 بہ آسانی تنگ اور رش دالی گلیوں سے نکل جاتیں۔
 تیرہ سال کی عمر میں ایک قرض دار کے ہاتھوں
 اپنے باپ کے قتل اور نئے رشتوں کے منہ موڑنے کے
 بعد وہ اپنے گھر کا باپ بن گئی۔ وہ جس کی خاطر باپ
 بنی تھیں اس نے غربت زدہ زندگی سے اعلان جنگ
 کرتے ہوئے چوری چکاری شروع کر دی۔

چند دن کی امارت نے اس کے بھائی سے یوں
 بدلہ لیا کہ اسے ہمیشہ کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے
 وہی پگلی دال کھانے پر مجبور کر دیا۔ جسے آخری بار وہ
 لات مار کر اپنے حالات سنوارنے نکلا تھا۔

”وقت کا کھیل بھی بڑا عجیب ہے۔ جہاں رک
 جائے تو لگتا ہے کہ کھڑے، کھڑے صدیاں بیت گئیں اور
 جب بدلے پر آتا ہے تو اپنے پیچھے نشان تک نہیں چھوڑتا۔“
 اس کے بعد خاتون بیگم اور ان کی ماں نے
 قدرے سہل زندگی گزاری۔ ماں کے مرنے کے بعد
 ان سے وہ نان چھوٹوں والا لکرا گیا۔ جس کے گھر میں
 آتے ہی انہوں نے بیرونی دنیا سے ناتا توڑ دیا۔
 انہوں نے جیسے وقت سے بدلہ لیا۔ جتنے برس گھر
 سے باہر گزرا رہے اتنے ہی شادی کے بعد اندر بتائے۔
 گویا حساب چکنا کر دیا۔

رباب کو جب پہلی تنخواہ ملی تو کئی روز تک ضد پکڑ
 کر بیٹھ گئی کہ وہ اس کے ساتھ باہر کہیں اچھی سی جگہ پر
 کھانا کھانے چلیں مگر وہ ٹال گئیں۔

باہر کے نام پر خوف سے اُن کے ہاتھ پیرس
 ہو جاتے۔ سر چکرانے کے ساتھ، ساتھ آنکھوں کے
 سامنے اندھیرا چھا جاتا۔

رباب کو لگتا کہ ان کی یہ حالت یکسانیت کے
 باعث ہو جاتی تھی۔ وہ منہ سے نہیں بولتی تھیں مگر اسے
 یقین تھا کہ انہیں یکسانیت کی دیکھ چاہئے لگتی ہے۔

بھلا کئی سالوں سے ایک جگہ رہتے، رہتے

طبیعت ادب نہیں جانتی ہے۔ رک پانی تعفن زدہ ہو جاتا
 ہے۔ وہ تو پھر جیتی جاگتی انسان تھیں۔

خاتون بیگم کو بھی یہی لگتا کہ رباب سچ کہتی ہے مگر
 یہ سب اندرونی یکسانیت کے باعث نہیں تھا۔ وہ اکثر
 چپ چاپ اس کی بات سن لیتیں۔ کچھ کہتیں تو اس سے
 جڑی کہانی بھی تو سنانی پڑتی۔ جس کی وہ تحمل نہیں ہو
 سکتی تھیں۔

وہ کہانی جسے برسوں سے صندوق میں مقفل
 کر کے سمجھ بیٹھی تھیں کہ کہانی دفن ہو گئی۔ ماضی وقت کی
 دھول میں گم ہو گیا مگر نہیں..... رباب کے ذہن میں ان
 کی پراسرار شخصیت کے متعلق جو گھٹیاں موجود تھیں۔
 انہیں بٹلھانے کے لیے وقت کی دھول میں الٹی اس کہانی
 پر سے گرد جھاڑنی تھی۔

چار پائی سے اترتے وقت اس کے پیر میں جو چیز
 چھپی وہ خاتون بیگم کے گلے میں ہمہ وقت جھولتے
 لاکٹ کے ساتھ بندھی صندوق کی جانی تھی جو شاید غلت
 میں یا پھر نظر نہ آنے کے باعث نیچے گر پڑی۔ رباب
 نے جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے یہ صندوق اس
 کے گھر میں موجود تھا۔ کسی مقدس مذہبی کتاب کے مانند
 جو الماری کے اوپر پڑا رہتا تھا۔ جسے خاتون بیگم کی
 انگلیوں کے سوا کسی اور نے چھوا تک نہیں تھا۔

آج وہی صندوق رباب کے سامنے کھلا پڑا تھا۔
 اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے گنگ بیٹھی تھی۔

سامنے پڑے رسالے کو دیکھ کر وہ نظریں ہٹاتا
 بھول گئی۔

رباب ہاتھ میں ایک پرانا رسالہ ”ستاروں کا
 جھرمٹ“ لیے بیٹھی تھی۔ سرورق پر اپنے وقت کی مشہور
 ادکارہ ایک اداسے براجمان تھی۔

رباب نے بڑی بے مبری سے رسالے کے
 اندرونی صفحات پر سرورق کی شخصیت کا نام ڈھونڈا۔ وہاں
 سرورق کی شخصیت کے آگے جسے تبسم کا نام جنگ مر ہوا تھا۔
 بالآخر وقت نے کہانی پر پڑی دھول اڑا دی تھی۔



ناولٹ

پریم دلیس ج

ایلیا علی غفار

”لالہ تمہاری زندگی میں دو مرد آئیں گے اور دونوں کو بنی تم سے محبت ہوگی اور تم ان میں سے ایک کو دوسرے کی جگہ سے چھوڑ دوگی۔“ میں نے گل کی پیش گوئی کو سچے ہوتے دیکھ لیا تھا..... ایسا ہی تو ہوا تھا۔ گل کو اشارے سمجھ میں آتے تھے، وہ واوی کی ذہین ترین لڑکی تھی..... آج چار سال بعد میں نے کھلے دروازے کے پار اسے کھڑا پایا تھا۔ سنہری رنگت، روشن پیشانی، بڑھے ہوئے فکڑا لے بال اور لمبوں پر وہی چار سال پرانی والی

تھیں، بزرے ادھر ادھر جاتے ہوئے اور دیوار،
کے شاہانہ مقدس پیڑ، باہر کے لوگ یہ دیکھتے یہاں
دوڑے، دوڑے آتے ہیں اور تم ہو کہ بس.....“
درختوں کی خوشبو وار چوٹیاں جھوم رہی تھیں۔ میرے وجود
جانے کب اور کیسے بغاوت در آئی تھی.....
ہمارے پاس آکر گر گئی تھی۔

”بائے کب میری بانسری کی دھن پر انگریز
شہزادے رستے بھولیں گے۔“ انداز میں کافی حسرت
اور غم تھا۔ وہ انگریزی شہزادوں کی ذاتی پارٹنر
تھی۔ آج برابر کرنی زری کہی، کبھی کرتی نہیں تھی۔
”نہیں دیکھیں گے تو پچارے اگلے جہان سدھار
گے.....“ رباب بانسری پتھروں سے رگڑنے لگی۔

ہم چاروں کا بچپن ساتھ، ساتھ گزرا تھا۔
پہاڑوں پر بندروں کے مقابلے میں کودتے
پھاندتے ہم جوان ہوئے..... دیودار کی ٹیوں پر
بچی ہم چڑھ چکے تھے..... ندی، تالوں میں غوطے
بھی لگا چکے تھے۔ جھولیوں میں خشک لکڑیاں اکٹھی
کر کے ہم جنگل میں بڑے پتوں پر بیٹھے بیروں کے
کھاتے ہوئے شان سے چلتے تھے..... بندروں کے
منہ چڑاتے انہیں غصہ دلانے میں ہر بار ہم کامیاب
ہو جاتے۔ غصے سے لال بھسوکا ہوتے بندر کبھی،
کبھی تو ہمارے دوپٹے جھپٹنے اور چیر پھاڑ دیتے
تھے..... پہاڑی چڑیوں کے ساتھ سر ملا کر ہم گاتے
تھے..... اگر آس پڑوس میں کسی کی شادی ہوتی تھی
تو باپسے بٹے گانے کی ذمہ داری ہم چاروں کی ہی
ہوتی تھی۔ ہمیں نہایت عزت اور احترام سے مدعو کیا
جاتا تھا۔ کشمیری چائے اور اخروٹ کے حلوے سے
تواضع کی جاتی تھی..... رباب بانسری بجاتی میں اس
کا ساتھ دیتے ہوئے دف بجاتی تھی..... ہم جب
سماں باندھتے تو بڑی بوڑھیاں دوپٹے منہ
میں دبائے شرم سے گلابی ہو جاتیں اور اپنے ماضی
میں گم ہو جاتیں۔

دور نہیں ہماری پتھر لڑھکا تھا..... گل کا آسن شور

یہ دوسرے اور دوسرے وہ آئے
پتھروں پر میرے سامنے کھڑا تھا..... میں نے پلکیں جھپکائی
تھیں..... واوی کے جھرنے، نالے اور دریا میری آنکھوں
سے رواں ہونے کو تھے..... ہاں..... یہی وہ شخص تھا جس
سے میں محبت کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

پہاڑی چوٹی پر ہم سب کا جھوم اکٹھی لیاں کر رہا ہوتا
اور پہاڑ ہماری شرارتوں سے تنگ آ جاتے..... کل
پہاڑی کے بڑے پتھر پر آسن جمائے بیٹھی تھی۔ زمین
ہمیشہ کی طرح چولھا بنائے اس پر لہندہ کھمبیاں تل رہی
تھی..... کبھی، کبھا اگر کھمبیاں زہریلی نکل بھی آتیں تو
ہم حکیم کا چورن ساتھ رکھتے تھے جو ہم سب کے دوپٹوں
کے پلوؤں سے بندھا ہوتا تھا۔ رباب بانسری ہونٹوں
سے لگائے سر کھینچنے میں لگن تھی..... میں جڑی بوٹیاں
اکٹھانے کے ساتھ، ساتھ سوچوں کے سفر پر روانہ
ہو چکی تھی..... کھمبیوں پر کئی ہونی چڑھتی چڑھتی زری منہ
بغور مجھے دیکھا۔

”لالے، آج کل تمہارے حواس تمہارے نہیں
لگتے۔“ ہمارے سروں سے بادل گزرتے جا رہے تھے۔
”زری..... بس مجھے آج کل اپنی یہ زندگی کچھ اچھی
نہیں لگ رہی۔“ میں نے نیچے واوی میں جھانکا، بزرے
کی چادر تھی..... موٹی ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔
”لئے..... کسی انجینی بائیں کرتی ہے۔“

”دیکھو ناں..... یہاں زندگی کسی دیران اور رکی،
رکی سی ہے..... پانچ سال بعد بھی یہ لوگ وہی کر رہے
ہوں گے جو آج کر رہے ہیں..... وہی بھیڑ بکریاں، وہی
گھروں سے اٹھتے کڑے دھوئیں، پتھروں والی گلیاں،
اونچے لمبے درخت اور بس۔“ مجھے نہیں علم تھا میرے لہجے
میں کیا تھا کہ جس نے زری کے چلتے ہاتھوں کو روک دیا
تھا۔ وہ سن ہی ہو کر مجھے دیکھے جا رہی تھی۔

”یہ غصہ ہی بغاوت اور بیزاری..... لالے، پہاڑی
لڑکی ہو دماغ ٹھکانے رکھو۔ پناہ گاہوں سے بیزاری نہیں
رکھتے۔ یہ پانیوں سے بھرے نیلے شفاف بادل، پُرسکون

کے ساتھ ٹوٹا تھا۔
 ”میرا آسن توڑنے کی جرات کس نے کی ہے؟“
 سمجھی کا ٹکڑا منہ میں رکھتی رہا باب ہنسی تھی۔
 ”یہ جرات پہاڑوں کے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔“ وہ چلا نک مارتی ہماری طرف آ رہی تھی۔

☆☆☆

سالار کی مٹھی دھیرے سے کھلی تھی اور میری جان حلق میں آگئی تھی۔ پہاڑوں نے لاوے اگلے تھے، زمین پھٹنے لگی تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ میری سوچ کے دائروں سے باہر ہو کر ملا کرتا تھا۔ سادگی سے پیاری ہنسی ہنستا وہ ہتھیلی پر میری پائل کا ٹھنکرو رکھے کھڑا تھا، سالار قیس کو لا جواب کرنا آتا تھا مگر مجھے لا جواب ہونا نہیں آتا تھا۔ وہ اتنا سادہ تھا کہ لوگ دکھاوے کی ہنسی سے اسے خرید لیتے تھے اور وہ بکنے کو تیار ہو جاتا۔ پہاڑ کی چوٹی سے میں نے پائل کا ٹھنکرو نیچے وادی میں پھینکا تھا اور سالار قیس کو ڈھونڈنے کو کہا تھا، وہ مجھے کھنکھلی باندھے دیکھتا رہ گیا تھا۔

”لالے..... بس اتنا چھوٹا سا کام.....؟“ یہ چھوٹا کام ہرگز نہیں تھا میری آنکھیں باہر اٹنے کو تھیں۔ وہ ہفتوں تلاش کرتا رہتا، ٹھنکرو اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا مگر وہ کیسے مسکرایا تھا۔

”لالے..... سالار کے دل اور چھوٹے سے ٹھنکرو کا مقابلہ کرتی ہے..... ٹھنکرو بے شک چھوٹا سی مگر سالار کا دل بہت بڑا ہے.....“ کالی آنکھوں والا، بڑے دل والا، ٹھنکرو نہیں جیسے دنیا کا خزانہ سامنے رکھے کھڑا تھا..... واوی میں دھند چھانے لگی۔ باورچی خانوں کے دھوئیں سے گلیاں بھر گئیں..... سہ پہر کا گیا اب شام سے لائین کے ساتھ لوٹا تھا..... مسافر کی آنکھوں کے سرخ ڈورے ٹھنکرو سے بے حال تھا۔ اس نے ٹھنکرو دیر کی مٹھی میں دبایا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

”لالے..... امتحان لینا نہ چھوڑنا تب تک..... جب تک دل نہ ہار جاؤ.....“ میں پیچھے ہٹنے لگی تھی۔
 ”ایسا نہیں ہوگا۔“

”لالے..... تو بڑی آن بان سے..... پہاڑوں کی مٹی اس کے آگے گھرا رہی ہوئی جاتی ہے۔“
 ”گل..... میرا دل نہیں مانتا.....“ عرق کی بوعل تھا اس نے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا تھا۔
 ”چھوڑ کیوں نہیں دیتی اسے.....؟“ میری جان جیسے حلق میں لگی تھی۔

”پہاڑوں کی لڑکیوں کو یہ زیب نہیں دیتا۔“
 ”لالے، دل سے بیزاری نکال کر تو دیکھ..... ایسا سچا اور کھرا مرد قسمت سے ملا کرتا ہے۔ نظر میں حیا رکھتا ہے، دل کا اتنا سادہ کہ اگلے کو موم کر دیتا ہے..... وادی میں اس جیسا کوئی ایک بھی نہیں..... وادی میں آج تک ایسا مرد پیدا نہیں ہوا جو پائل کا ٹھنکرو ڈھونڈ کر ہتھیلی پر لا کر رکھ دے.....“ میں نے ٹھنکرو کو ہتھیلی پر رکھے دیکھا۔
 ”زر گل..... دل کا کیا کروں.....؟“ وہ گھاگرا سمیٹتی غصے سے ابھی تھی۔

”زری کو کہوں گی کھمبیوں کے ساتھ، ساتھ لالے کا دل بھی تو ہے پر بھون کر رکھ دے۔“ دلدل میں گری تھی میں تو جیسے..... عزت، آسودگی، سب تو مل رہا تھا مگر یہ دل.....؟ یہ کیا چاہتا تھا؟

☆☆☆

جھیل کے پانی میں وہ سنہری عکس کس کا تھا..... دل میں گھٹنیاں بج اٹھی تھیں اور میرا وجود آگ ہو گیا تھا..... دیوار کے درختوں کے سامنے کیمرہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے وہ اتنی بے نیازی اور شان سے ٹھٹھا آ رہا تھا کہ بس..... گل کہتی تھی اگر نظر ہٹنے سے انکاری ہو تو دل پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے..... دل یونہی ہاتھوں سے چپ چاپ کھسک جاتے ہیں..... نہ نظر پر اختیار رہا تھا

میں اس پتھر پر بیٹھ سکتا ہوں؟“ اپالو دیوتا کی مدد سے آواز نے مجھے کچھ بھی سوچنے نہ دیا تھا۔

”جی بیٹھ جائیں۔“ وہ کیراگود میں رکھتا اطمینان سے بیٹھ گیا تھا۔ کسی مرد کے اتنے پیارے نقوش بھی ہو سکتے ہیں.....؟ اپنے جوتے اتارتا وہ پاؤں پانی میں ڈالے بیٹھا تھا۔ شفاف پانی میں اس کے پیر کیسے پیارے لگ رہے تھے۔ میں دھکتی رہی تھی۔

”آپ اسی وادی میں رہتی ہیں؟“ وہ جگنوؤں کی روشنیوں کا سا روشن شخص مجھ سے مخاطب تھا۔

”جی..... اسی وادی میں رہتی ہوں۔“

”گریٹ..... بہت پیاری جگہ ہے۔ ہے ناں.....!“
وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ کل تک جو میں بحث کرتی تھی اور پہاڑوں سے آنتاہٹ کا مظاہرہ کرتی تھی آج کیسے میرا لہجہ اور الفاظ بدل گئے تھے..... یوں اچانک.....؟

”جی..... مہربان پہاڑوں کی اس داوی میں بہت سکون ہے..... ویو دار اور چٹن کے خوشبودار مقدس چٹن ہیں..... اور پتا ہے یہاں شرارتی بندر بھی ہیں.....“ وہ اجنبی تھا تو اس کے لیے میرے چہرے پر مسکراہٹ کیوں تھی..... وہ دھیرے سے ہنسا تھا۔

”آتے ہوئے میری گاڑی کے شیشے پر اتنے
بندرجھگئے کہ انہیں اتارنا مشکل ہو گیا تھا۔“

عجیل کے پانی میں گلابی پھول تیرتے ہوئے
آ رہے تھے..... اس نے ہاتھوں میں پانی بھر کر اپنے
منہ کی طرف اچھا لٹھا۔ پانی کے قطروں میں دھوپ کا
عکس جم گیا تھا۔

”آپ شہر سے آئے ہیں؟“ وہ کیرے کا لینز
فوکس کرتا مجھے دیکھنے لگا تھا۔

”جی شہر سے آیا ہوں..... میں ایک فوٹو گرافر ہوں..... شہر کی بھاگتی دوڑتی روٹیں سے فرار چاہتا تھا جیسا دوسرا بھاگ آیا۔“ جہنم کے پاس کچے فولد کیے وہ پانی سے کھیلنے میں مگن تھا۔

”آپ کو شہرا چھا نہیں لگتا؟“

☆☆☆

”آپ کا نام بہت پیارا ہے۔“ شام سے ڈراسا پہلے کا وقت تھا..... پہاڑوں کی چوٹیاں تاریکی ہو رہی تھیں..... کونجوں کی ڈائریں قطاروں میں بیٹھی تھیں۔ روشنیوں کے سارے رنگ جمیل کے پانیوں میں اتر آئے تھے..... وہ آج بھی وہیں پتھر کے اوپر چڑھا کیمرہ اٹھائے کچھ capture کر رہا تھا۔

”بے بے کو بھی میرا نام بہت پسند ہے..... کہتی ہیں ایسا نام پوری وادی میں کسی کا بھی نہیں.....“
میں نے پانی ادک میں بھرا.....
”واقعی.....“

”اور آپ کا نام کیا ہے؟“ وہ کیرا کو نجوں کی ڈار پر فوکس کر چکا تھا۔

”شاہ زین.....“ کیسی شیرینی کھولتا سا نام تھا
تاں اس کا.....

”آپ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔“ کیرا ہٹا کر اس نے مجھے دیکھا تھا۔

”لالہ..... میرے نام کی تعریف کرنا ضروری نہیں تھا۔“ میرے چہرے پر جھینسی سی ایک مسکراہٹ

بازگشت نے ہمیں نڈھال کر دیا تھا..... گرم قبوے کے سب لیتے ہم دائرے میں بیٹھ گئے تھے..... رباب نے گل کے سامنے پھیلی پھیلائی تھی۔

”میرے ہاتھ کی لکیریں دیکھو اور بتاؤ کہ میری بانسری کی دھن پر کب انگریزی شہزادے رستے بھولیں گے۔“ دو کتنا انتظار کیا کرتی تھی کبھی، کبھی تو اس پر سنو ادب کا گمان ہونے لگتا تھا۔

”انگریزی شہزادے پہاڑوں کی طرف نہیں آئیں گے رباب، یہ امیدیں کبھی پوری نہیں ہوں گی..... دل کو سمجھا لو.....“ رباب بانسری تھامے گم سمی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ہر بار ایک ہی جواب ملتا تھا۔ زری نے تاسف سے اپنے مہندی رنگے ہاتھوں کو سامنے کیا تھا۔

”لکیریں تو مہندی کے رنگ میں چھپ گئی ہیں گل۔“ گل نے حنا رنگی پھیلی پھیلائی تھی۔

”میں مہندی کے رنگوں میں لکیروں کے رنگ یہاں ڈھونڈ نکالوں گی۔“ واقعی زرگل نے ڈھونڈ نکالے تھے..... فاتحانہ سر اٹھایا تھا۔

”جلد تمہارے ہاتھ اپنے عزم کے رنگوں کی مہندی سے بچیں گے..... جلد تم اگلے گھر سدھا رو گی۔“ ”پہاڑوں اور وادیوں کے سارے رنگ زرینہ کے ہیں.....“ اس نے شرم سے سرخ چہرے کے ساتھ ہاتھ واپس کھینچ لیے تھے۔

”اللہ کرے سچ ہو.....“ میں اطمینان سے قبوہ جیتی انہیں دیکھے گی۔

”لالہ..... تم اپنے ہاتھ آگے کرو۔“

”میں.....؟“ میرے سوال پر رباب نے میری پھیلی آگے کر دی تھی..... گل کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے اور ہر رنگ مجھے خوف میں مبتلا کرنے لگا تھا۔ ”لالہ..... تمہاری زندگی میں دو مرد آئیں گے اور دونوں کو ہی تم سے شدید محبت ہوگی اور تم ان میں سے ایک کو دوسرے کی وجہ سے چھوڑ دو گی۔“

☆☆☆

”تیری خالہ شادی کے لیے دباؤ ڈال رہی

جھیل گئی تھی۔ پھر وہ میری پہلی سی ہنسی نہ رہی تھی..... شاہین مراد اپا لوی دیوتا پھر میرے خوابوں میں آنے لگا تھا..... نیندوں میں اس کی جاگ پڑ گئی تھی..... ہم دونوں نے اب جھیل پر ملنا شروع کر دیا تھا..... جھیل ہمارا انتظار کرتی..... پہاڑوں کی کوئیں ہم کو نکلتی باندھے دیکھا کرتیں۔ وہ میری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا جس سے میں متاثر ہوئی تھی، اسے دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول جاتا تھا..... ہم دونوں چٹانوں پر ساتھ ساتھ بھاگتے تھے۔

”لالے، خیال سے گر جاؤ گی۔“

”میرے خیال راستے بھٹک گئے ہیں۔“ جھیل میں پتھر پڑا تھا۔

”کس نے پہاڑوں کی لالہ کے خیال میں دخل اندازی کی؟“ صنوبر پر بیٹھی پہاڑی چڑیوں نے سر جھٹک کر نیچے دیکھا تھا۔

”شہر سے آنے والے مسافر نے میرے خیالوں میں خلل ڈالے ہیں۔“ وہ میرے پاس کھڑا مجھے دیکھتا رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے تم دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہو۔“ پہاڑوں کا سرخ رنگ مجھے چڑھ گیا تھا..... میں رنگی گئی تھی..... بہار راستوں میں تھی۔

اب بھی پہاڑ ہم چاروں دوستوں کا انتظار کرتے تھے..... پہلے ہم نے بھی پہاڑوں کو انتظار نہیں کرایا تھا..... زری نے مجھے آنسو بھری آنکھوں سے خوب، خوب لتاڑا تھا۔

”لالہ..... مہربان پہاڑوں کو انتظار نہیں کراتے..... پھر پہاڑ تالیوں کی بازگشت چھین لیتے ہیں۔“ مجھے پہاڑوں سے بے پناہ عشق تھا..... اور پہاڑوں کی بازگشت میری محبت..... میں نے زرینہ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ ”چلو زری، میں پہاڑوں کو تاراض نہیں کر سکتی، کبھی نہیں.....“ اس دن ہم چاروں پھر سے اکٹھے ہوئے تھے اور تب تک پہاڑی دامن میں تالیاں پیٹتے رہے جب تک ہماری پھیلیاں لال نہیں ہو گئیں۔

ہیں۔“ بے بے نے دھوئیں کے بادل کے پار مجھے دیکھا تھا۔

”بے بے..... ایسے کیسے؟“ میری سانس پرانگاہ آگیا تھا۔ میرے انداز کو جرت سے دیکھا گیا تھا۔

”لالے..... تو کیسی باتیں کرتی ہے..... کب تک تجھے ہم بٹھا کر رکھیں گے۔“ میں نے نگریوں کے ٹھنڈ کو پرے دھکیلا تھا۔

”بے بے، ابھی مجھے نہیں کرنی شادی وادی.....“

بے بے بڑبڑاتی ہوئی آگ درست کرنے لگیں۔

اور اگلے دن وہ آگیا تھا۔ سورج سے پہلے..... رات کے بعد.....

”کیوں شادی نہیں کرنا چاہتی ہو؟“ دروازے سے لگ کر وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”سالار..... ابھی میرا دل نہیں مانتا.....“

”دل کو مٹانے میں اتنی مدت تو نہیں لگتی.....“

”مجھے لگے گی۔“

”کتنی.....؟“

”ابھی مجھے اندازہ نہیں ہے..... مگر وقت دو مجھے.....“

”تمہیں میری محبت پر شک ہے؟“ اس کا لہجہ سو

کالچ کے ٹکڑوں میں بٹا تھا۔

”نہیں.....“ میں نے دروازہ دھاڑ سے بند کر دیا تھا۔

”گھر کا دروازہ بند کرنے کا اختیار رکھتی ہو مگر

تمہارے دل کی چابی اپنے پاس رکھوں گا۔“ دروازے کی

جبری سے وہ دور جاتا دکھائی دے رہا تھا..... آخر کیوں

نہیں تھکتا تھا وہ اتنا کچھ کر کے؟ میں تھکنے لگی تھی.....

کبھی، کبھی محبت بھی تو انسان کو تھکا دیتی ہے نا..... وہ

چھلاؤں کی طرح میرے راستوں میں آ جاتا تھا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”تمہیں دیکھنے آیا تھا.....“

”دیکھ لیا..... اب جاؤ.....“

”دل نہیں بھر رہا میرا.....“

”بھاڑ میں جائے تمہارا دل.....“ سالار ہٹکا بٹکا

سا کھڑا رہ گیا تھا۔

”اپنے شوہر کو پہاڑی لڑکیاں ایسے نہیں

کہتیں.....“ میں نے اپنی پائل کے ٹھنڈ دم کرنے

شروع کر دیے تھے۔ شاید کہ وہ تلاش سے تھک

جائے..... تھم جائے یا پھر رک ہی جائے مگر میں غلط

تھی..... وہ ہر بار ہی ٹھنڈو لے کر حاضر ہو جاتا تھا۔

میں زچ ہونے لگتی۔

”کیسے ڈھونڈ لیتے ہو تم؟“ وہ ساڈی سے ہنستا تھا۔

”لالے..... تیری پائل کے ٹھنڈو مجھے ڈھونڈ رہے

ہوتے ہیں، میری تلاش میں رہتے ہیں..... میں ہی تو

آخر ان کا حقدار ہوں.....“ سالار برا نہیں تھا مگر وہ

میرے دل کو کچھ خاص اچھا بھی تو نہیں لگتا تھا..... اصل

بات تو پھر دل ہی کی ہوا کرتی ہے..... خشک لکڑیاں کاٹ

کر وہ ہمارے گھر کی چمتوں پر اسٹھی کر رہا تھا..... بار بار

چوری دیکھی بھی لیتا تھا، میں نے پیٹھ موڑ لی تھی۔

”مہربان پہاڑوں کے واسطے اپنے دیوانے کی

طرف دیکھ لو.....“ وہ دہائیاں دیتا رہ گیا۔ مگر میں نے

ہرگز بھی اپنی پیٹھ سیدھی نہیں کی۔

”لالے..... محبت کرنے والوں کو ایسا روگ

نہیں دیتے۔“ آخر وہ کی چھال پرے پھینک کر میں

نے تند نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتی..... بھاگ جاؤ.....“

”مگر کیوں..... آخر کیوں؟“ وہ دنیا جہان کا

مہسین ترین شخص بن گیا تھا۔

”کیونکہ..... کیونکہ میرا دل تمہاری چاہت نہیں

رکھتا۔“ میرے لفظوں نے اس کے چہرے کو کالا کر دیا

تھا۔ وہ جھٹ کے عقبی جانب اتر گیا تھا..... جانے

میرے دل میں کیوں ہلکی سی اداسی چھا گئی تھی..... پھر

وہ مجھے کچھ روز نظر ہی نہیں آیا..... بے بے اگلی شام کو

ذکر کرتی نظر آئی تھیں۔

”سالار کو تاپ چڑھ گیا ہے۔“

اس دن کے بعد وہ پھر بادام والا حلوہ دینے آیا

تھا اتنا چپ وہ مجھے پہلے تو کبھی نظر نہیں آیا..... بے بے

”جب چیزیں اور لوگ دسترس میں ہوتے ہیں تو ان کی تب قدر کیوں نہیں ہوتی تب ہی کیوں ہوتی ہے جب یہ ہاتھوں سے پھسل جاتے ہیں۔“ رباب نے نفی میں سر کو ہلاتے ہوئے زرگل کو جیسے تسلی دی تھی۔
”وہ کبھی چھوڑ کر تو اس کا گھر ہے۔“ قبوہ سڑک، سڑک پتہ گل غم گئی تھی۔

”پہلے وہ باپ کی چوکھٹ سے قدم باہر رکھ کر پلٹی تھی، اب وہ شوہر کی چوکھٹ کیسے پار کرے گی رباب..... عورت کے لیے باپ اور شوہر کے گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔“ خوف کنڈلی مارے روشنیاں نکلنے لگتا تھا۔
”تو کیا وہ اب کبھی ہم سے نہیں ملے گی؟“ سوال زہر تھا..... سوالی نیلا پڑ گیا۔
”کیا خبر۔“

”تو کیا وہ مقدس پہاڑوں کے بلاوے پر بھی نہیں آئے گی؟“

”پہاڑوں نے اب اسے اپنے سحر سے آزاد کر دیا ہے۔“ ہم سے دور..... تھوڑی ہی دیر میں زری موتی چور لڈو منہ میں ڈالے ہنس رہی تھی..... کیسی باغی مسکراہٹ تھی، قصور اس کا بھی تو نہیں تھا ناں..... ہم تینوں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

دیوار کی چوٹیوں میں آگ لگ گئی تھی.....

پہاڑوں کے بلاوے پر اب ہم تینوں جاتی تھیں..... اب بھی زرگل آسن جما کر بیٹھ جاتی ہے۔ رباب اور میں کھمبیاں اکٹھی کرتے.... اور سٹل کر کھاتے..... رباب نے بانسری بجانا بالکل ہی چھوڑ دی۔

”رباب، تمہاری بانسری کے سرگم ہو گئے کیا؟“ میں اسے کریدتی رہتی ہوں۔

”لالے، انگریزی شہزادوں نے راستے بدل لیے ہیں..... پہاڑ خفا ہیں مجھ سے اور پہاڑوں کی چٹان خفا.....“

”تو تم انہیں منا کیوں نہیں لیتیں؟“

”سڑکی موت سے ہی وہ راضی ہوں گے۔“

بانسری نذر آتش کر دی گئی اور رباب سارا دن ہنستی رہی تھی..... وحشت بھری ہنسی..... اس کے گھرے سانولے

سے سر جوڑے چوڑھے کے پاس بیٹھا رہا۔ جانے لگا تو میں سامنے دیوار کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

”کیوں کر رہے ہو ایسا؟“

”کیا کر رہا ہوں؟“

”یہی سب کچھ.....“ وہ اداسی سے ہنسا۔

”لالہ..... میرا دل بہت چھوٹا ہے اسے بڑے

انتہانوں کے حوالے نہ کیا کر.....“

”ڈرتے ہو.....؟“

”نہیں.....“

”تو پتھر.....؟“

”تمہارے غرور کو بچانا چاہتا ہوں۔“

”تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”میرے اختیار کی بات نہیں ہے۔“

”سالار، بالکل اسی طرح تم سے محبت کرنا بھی

میرے اختیار میں نہیں ہے۔“ وہ سن ہو کر رہ گیا میں نے پتھر کو ٹھوک کر سے اڑا دیا تھا۔

وادی کی بڑی بوڑھیاں سالار کو دعائیں دیتے ہوئے کہتی تھیں۔

”تیرے گھر آنے والی لڑکی تجھ سے محبت کرے گی۔“

وہ اعتبار چھوڑ بیٹھا تھا..... اور میں شاہ زین پر

اعتبار کر بیٹھی تھی..... ہاں محبت اور اعتبار..... ☆☆☆

دف کا شور تھا..... دیو کی ٹٹماتی ہوئی روشنیاں

تھیں اور وادی پر ہلکے بادل اتر آئے تھے..... زرینہ

ماپوں کے زرد جوڑے میں سچی ہوئی سرسوں کے پھولوں

کی طرح دمک رہی تھی..... رباب کوئی بیسیویں بار

میرے کانوں میں سرگوشی کر چکی تھی۔

”ہائے لالے..... زری اتنی پیاری ہوگی، میں

سوج بھی نہیں سکتی تھی۔“ میں نے اسے دھوکا جڑا تھا۔

”دفع ہو جاؤ تم..... آج تم اسے نظر لگا کر ہی

رہو گی.....“ گل منی کے ویپک و نیمختی قبوے کا کپ

تھا سہ کھڑی تھی۔

”لالہ..... اب کھمبیاں کون تلے گا.....“ بھرائی

ہوئی آواز۔

دھڑکنے والی ایک چم لوہے کی مٹی سی۔
 ”اللہ نہ کرے۔۔۔۔۔“ ہم دونوں صنوبر کے
 میں برابر قدموں سے چلتے جاتے تھے۔۔۔۔۔ اس کا
 میرے اندر عجیب سی تمکنت اور غرور پیدا کر دیتا تھا
 ”محبت کرتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”بہت، بہت۔۔۔۔۔ کتنی بارسنگی؟“
 ”جتنی بارسناؤ گئے۔۔۔۔۔“
 ”میں تو ساری زندگی سنانے کو تیار ہوں
 میں خشک چوں کو پیروں تلے رکھے کھڑی کی کھڑی
 تھی کسی کا چہرہ سامنے آ گیا تھا۔
 ”لالہ۔۔۔۔۔ چپ کر گئیں۔۔۔۔۔؟“
 ”وہ۔۔۔۔۔ سالار۔۔۔۔۔“

”تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔۔۔ دیش اٹ
 کوئی تمہیں مجبور نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔ بس تم انکار کر دو۔۔۔۔۔“
 ”انکار۔۔۔۔۔؟“ میری سرکشی صنوبر کے چہرے
 میں کم ہو گئی تھی۔

”ہماری وادی میں ایسا نہیں ہوتا شاہ۔۔۔۔۔“
 ”تمہیں کرنا ہی ہوگا۔۔۔۔۔ تم چھوڑ دو اسے۔۔۔۔۔“

☆☆☆

”تم چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔۔“ میرے سکون سے
 گئے الفاظ نے مقابل کو بت بنانے میں کوئی کسر نہیں
 چھوڑی تھی۔۔۔۔۔ ہم دونوں پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تھے
 وہ کھڑیوں کے گٹھے باندھ رہا تھا اور میں بالکل پاس
 قبوے کا تھرا بس لیے کھڑی تھی۔۔۔۔۔ وہ رنگوں بھرا فخر
 تھا۔ بہار کے گیتوں میں سے ایک الوہی گیت۔۔۔۔۔ میں
 نے ہمیشہ اسے ہر کسی کی بات پر دھیمہ، دھیمہ بننے
 مسکراتے ہی دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ لوگوں کے کام آتا جانتا تھا
 ساری وادی کے بوڑھوں، بچوں اور بوڑھیوں میں
 یکساں طور پر مقبول تھا۔

”نفرت کرتی ہو مجھ سے؟“ اس نے بغور مجھے دیکھا۔
 میرے ہاتھ کپکپا سے گئے۔
 ”نہیں تو میں تم سے کیسے نفرت کر سکتی ہوں۔“
 میری تردید پر اس کے چہرے پر فخر کا چھینٹا پڑا۔

چڑیاں ہمارے سروں پر دیوانہ وار منڈلانے لگیں۔
 رباب چٹکیاں لیتی قبوے تلے آگ برابر کرتی رہی۔
 ”دیکھو لالے۔۔۔۔۔ پہاڑوں کی چڑیاں میری
 بانسری کی مرگ پر رقص کرتی ہیں۔“

”پہاڑی لڑکیوں کے خواب لاوے میں پکتے
 ہیں۔۔۔۔۔ اٹھتے ہیں۔“ قبوہ کناروں سے باہر اچھل رہا تھا۔
 ”لالہ۔۔۔۔۔ میں بھی زری کے جیسی دلہن بنوں گی
 ناں۔۔۔۔۔؟“ رباب کا لہجہ اور تیور ایسے تھے کہ میں کٹ
 کر رہ گئی۔۔۔۔۔ اور اسے خود سے لپٹا لیا۔ مگر اسنو لاریج
 اسے کہیں سے بھی پہاڑی دو شیرہ ثابت نہیں کرتا
 تھا۔۔۔۔۔ مرد اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے اور مردوں کی
 مائیں نظریں۔۔۔۔۔ وہ ڈھل رہی تھی۔

”میرد کجور رباب۔۔۔۔۔ وقت تمہارے مخالف چل
 رہا ہے۔“ شہد کڑوا ہو گیا تھا۔ گل آسن توڑتی پاس
 آگئی تھی۔

”جوز، جوزے کی طرف آنکھتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بھی
 آنکھے۔“

”کب آئے گا زرگل؟“

”انتظار زندہ رکھو زندہ دل لڑکی۔۔۔۔۔“ رباب
 نے انتظار زندہ رکھ لیا تھا اور میں انتظار پلو سے باندھے
 جمیل کنارے ٹہل رہی تھی۔۔۔۔۔ خوشبودوں کے دیس کا وہ
 دیوتا پھولوں کے پار سے آتا نظر آ گیا تھا۔
 ”آج ویر کر دی آنے میں۔۔۔۔۔؟“

”غلام معذرت چاہتا ہے۔۔۔۔۔“ شہری لباس
 میں ملبوس وہ میرے سامنے جھکا تھا۔ میں نے ہلکا سا
 رخ موڑ لیا۔

”کوئی معذرت نہیں۔۔۔۔۔ میرا انتظار مرنے کو تھا۔۔۔۔۔“
 ”میں نے تمہارا انتظار زندہ رہنے دیا۔۔۔۔۔“ وہ
 مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ بیٹھا اور بس ہر بار یہی تو ہوتا تھا۔
 وہ ہاتھ پکڑتا تھا اور مسکرا دیتا تھا لالے کا دل پھل جاتا۔
 ”جاؤ۔۔۔۔۔ مجھے بات نہیں کرنی تم سے۔۔۔۔۔“

”مر جائے گا شاہ زین۔۔۔۔۔“ میرے دل کی

”اے چھوڑ آئی ہوں۔ گوشت کی مہک اس پتھر کے گھر میں پھیل رہی تھی۔“

”کیا بکواس کر رہی ہے لالہ؟“ ان کا لہجہ لرز رہا تھا۔ جوان بیٹی کی ماں تھیں وہ، آئے روز دھڑکے لگے رہتے۔

”بے بے..... ابھی اس کا کام باقی تھا۔“

”قبوے والے برتن کہاں ہیں؟“

”اس نے ابھی قبوہ نہیں پیا تھا۔“

”ہونے والا شوہر ہے وہ تمہارا، اس کی ہر خواہش اور رضا کا احترام کیا کرو یوں منہ اٹھا کر نہ آجایا کرو۔“ جب میں ننھی بنارہی تھی بھی وہ اندر آیا اور سیدھا بے کے پاس موڑھے پر آکر بیٹھ گیا۔

”خالہ..... مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”خالہ صدقے، کہو..... کہو.....“ بے اس کی بلائیں لیتی قربان ہونے لگی تھیں۔ ٹھنکر وڈھوٹ کر ہر بار میری تعقل پر رکھ دینے والے اس مرو نے کر بناک نظروں سے مجھے دیکھا اور کہہ دیا۔

”میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔“

☆☆☆

محبت کی کہانی میں

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کوئی کروار قصے کو چاٹک درمیاں سے چھوڑ کر رستہ بدل کر

ممکنہ انجام سے پہلے کہانی کا سراپی موڑ دیتا ہے تو پھر امید کے موسم میں ناامید ہونے کی صلیبوں پر لٹکا دوسرا کروار

قصے میں کئی صفحات خالی چھوڑ دیتا ہے اگرچہ بعد اس کے بھی کہانی چلتی رہتی ہے

مگر اس کی عبارت سننے والوں کو بیدار نہیں کرتی ہے سمجھ میں آئے بھی کیسے

شاید

وہاں وصل کا لک باب آتا تھا

”محبت کرنی ہو کسی اور سے؟“ وادی کے سارے پہاڑ میرے اوپر آن گرے تھے۔ میں کسی بھی طور بچ نہ سکی تھی۔

”نہیں..... میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔“

”تم نہیں کر سکتیں لالہ..... مگر تمہارا دل تو کر سکتا ہے ناں۔“

”شم غلط سوچ رہے ہو سالار.....“ چینی کی پیالی میں رکھے قبوے سے بھاپ اٹھ رہی تھی، ابھی تک اس نے پیالی سے ایک گھونٹ تک نہ بھرا تھا۔ ہواؤں کا راز دار مات لکھایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

”لالہ، تم مجھ سے نفرت نہیں کرتیں..... کسی اور سے محبت نہیں کرتیں۔ اس کا تو مجھے بھی مطلب نظر آتا ہے کہ تم یہ دونوں کام کرتی ہو..... بچپن سے اپنا اور

تمہارا نام ایک ساتھ سنتا ہوا آرہا ہوں، کیا تمہیں مجھ پر زس بھی نہیں آتا..... تمہیں یاد ہے کبھی ہم اچھے دوست بھی ہوا کرتے تھے..... گھبریلوں کو اخروٹ چھپاتے

دیکھا کرتے تھے، چیری کھاتے تھے..... دھوکےیں لٹا کر شہد کے چھتے اتارتے تھے..... صنوبر کے جھکل

میں خشک چوں پر چلتے تھے۔ جیسے، جیسے ہم بڑے ہوتے گئے تم بدلتی گئیں یا پھر تمہارا دل..... میں کچھ بھی سمجھ نہیں

پڑا، ہم جانتی ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں۔ ایسے بغیر کسی چھوٹی یا پھر بڑی وجہ کے محبت کیسے چھوڑی جاسکتی ہے

لالہ..... کیسے؟“ مطلع ابر آلود تھا..... پہاڑ ہر روز بادل سر پر تاج کی طرح پہنے رکھتے تھے۔ ہر لحظہ بڑسنے کو

تیار..... میٹروں کے ٹولے لڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر چلے جا رہے تھے اور ان کے گلوں میں بندھی گھنٹیوں کے دھڑ سے شور کی آواز یہاں تک سنائی دے رہی

تھی۔ میں دھیرے، دھیرے اٹنے پاؤں واپس پلٹ آئی تھی وہ اونچائی پر ٹھنڈے قبوے کی پیالی پکڑے

مجھے دیکھا کر باور میں جاتی تھی کہ وہ تب تک مجھے دیکھتا رہے گا جب تک میں اسے نظر آتا بند نہیں ہو جاتی۔

”سالار کہاں ہے؟“ گوشت ابالتی بے بے نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

پیلے میں میرا چہرہ بھرا لیا تھا۔

”لالے..... شہر سے آئے ہوئے مسافر اکبر بازار ہوتے ہیں، وعدے پلو سے باندھ کر جاتے ہیں پھر واپسی کا رستہ بھول جاتے ہیں۔ تم میرا نمونہ ہو.....“ دیوتاؤں کی سی آن بان والا وہ شخص میرے سامنے آ گیا تھا۔ پھر وہی صنوبر کا گھٹا اور خوشبودار جگر تھا اور ہم دونوں تھے۔

”میرا کام بس تھوڑا سا رہ گیا ہے..... یہ مکمل کر کے میں چیتل کو جمع کر کر واپس لوٹ آؤں گا..... جگر ستاروں سے روشن ہو گیا تھا۔

”کب تک آؤ گے شاہ.....؟“ میرے لہجے کی بے قراری اور بے تابی پر وہ دھیمے سُرد میں جہاتا تھا۔

”بہت جلد..... اتنا جلد کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں.....“

”میں کتنا انتظار کروں؟“ میں اپنی لالہ کو زیادہ انتظار نہیں کراؤں گا..... یقین ہے ناں مجھ پر؟“ اس نے اپنے بازو میرے گرد باندھ لیے تھے۔

”خود سے بھی زیادہ یقین ہے۔“ خشک پتے.....

چرچراتے رہے اور ہم چلتے رہے تھے۔

”امی، ابو جان مان تو جائیں گے ناں؟“ میرے دل کا خوف صنوبر کی چونٹیوں سے بھی اوپر اٹھنے لگا تھا۔

”ضرور مانیں گے اور انہیں ماننا ہی ہوگا..... اور تم ہو ہی اتنی پیاری کہ انہیں ماننے ہی بنے گی.....“

سوکھے درخت کے تنے پر ہم بیٹھ گئے تھے۔

”اب اتنی بھی پیاری نہیں ہوں میں.....“

”خود کو میری نظر سے دیکھو تو نہیں خبر ہو.....“

”شاہ زین، جلد آنا..... جتنی جلدی ہو سکے، پہاڑ والے طویل انتظار نہیں کر سکتے.....“ میری آنکھیں ڈنڈبا گئی تھیں اور وہ آنسو پونچھنے پر کمر بستہ نظر آنے لگا تھا۔

”دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی کی آنکھوں میں آنسو اچھے نہیں لگتے۔ آنکھوں کا کا جل تم خشک ہی رکھا کرو.....“ جانے دہ کیسا جادو گر تھا جو مجھ پر حاوی ہو گیا تھا۔ مجھے سب بھول گیا تھا..... ہر لمحہ، ہر پل اس کا خیال میرے ساتھ، ساتھ رہنے لگا تھا..... بے بے نے

”تم نے دادی کے سب سے شریف اور سادہ مرد کے لیے انکار کر دیا لالے..... مگر کیوں؟“ رباب پھٹ پڑی تھی۔ وہ کبھی ایسا نہیں سوچ سکتی تھی کہ میں بھی بیوقوف ہو سکتی تھی..... میں نے گھاٹوڑا دے پھینچنے کے گرد پھیلایا تھا اور ڈھلتے سورج کے رنگ کو دیکھنے لگی تھی..... زرگل کی نظریں مجھ پر تھیں اور ان نظروں کا ارتکاز میرے ارادے متزلزل کر رہا تھا۔

”وہ دوسرا مرد کون ہے لالہ.....؟“ اس سے پہاڑوں کی ساری برف گل کے لہجے میں درا آئی تھی.....

جس نے میرا سارا وجود ٹھنڈا کر کے رکھ دیا تھا۔

”گل..... وہ.....“

”بات کو نالومت.....“

”میں تمہیں کیسے بتاؤں؟“

”راز رکھنا چاہتی ہو؟“ میں چپ رہی تھی..... وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھا سے نیچے دادی کی طرف جانے لگی تھیں۔ میں نے بھاگ کر انہیں روکا تھا۔

”شاہ زین نام ہے اس کا.....“ وہ دونوں دہیں سرخ زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔ دادی کے گھروں سے دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ غبار سا پھیلنے لگا۔

”کہاں کا رہنے والا ہے؟“

”شہر سے آیا ہے.....“

”ملازمت کرتا ہے؟“

”ہاں، کسی ٹی وی چینل کے لیے کام کرتا ہے۔“

”کہاں ملا تھا؟“

”جھیل پر.....“

”خوب صورت ہے؟“

”بہت زیادہ، دیوتاؤں کا حسین ہے۔“

”بیادہ کرے گا تم سے؟“ یہ حسرت سے لبریز سوال رباب کی طرف سے آیا تھا۔

”ہاں، کرے گا.....“

”کب تک یہاں ہے وہ.....؟“

”دو ہفتوں تک.....“ زرگل نے ہاتھوں کے

جان تمنا

تجھ سے بچھڑ کر جان تمنا ہم بھی چین نہ پائیں گے
روگ لگا کر دل کو اپنے ہم جوگی بن جائیں گے

یاد آئیں گے تیرے وعدے یاد آئیں گی تیری قسمیں
بھولنے کی کوشش میں بھی ہم تجھ کو بھول نہ پائیں گے

چاہت کا اظہار تمہارا اور وہ اپنا شرمانا
رہ رہ کر وہ منظر سارے تیری یاد دلاؤں گے

چہرہ نکلتا ہاتھ پکڑتا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھنا
رات کی تنہائیوں میں ہم کو بہت ترپائیں گے

ہم کو حیا کا پاس ہے ورنہ آجائیں ہم تیرے پاس
جج تو یہ ہے تجھ سے بچھڑ کر ہم تو جی نہ پائیں گے

گردش حالات نے فرحت ہم کو کر دیا ہے جدا
اپنے خیالوں کی دنیا میں تیرا ساتھ نبھائیں گے

کاوش: فرحت احمد، گلشن حدید

غزل

ہر طرف ہے حبس پھیلا اور ہوا خاموش ہے
حالتِ انسان پہ سوچو کیوں خدا خاموش ہے

امت پرور آدمی نے ظلم کیسا کر دیا
فاختہ کی آہ سن کر بھی فضا خاموش ہے

کیا ہوا ہے ماجرا اور کیا سبب اس کا بنا
ایسی الجھن دیکھ کر اب قائلہ خاموش ہے

چھاری ہے ہر طرف اک رت گریباں چاک کی
پھر بھی اک دیوانہ پاگل آشنا خاموش ہے

اہل دنیا کی یہ کیسی رسم ہے خاتم بتا
بے خطا سولی چڑھا اور پُر خطا خاموش ہے

کلام: فریدہ خاتم، لاہور

زور سے چٹا میرے ہاتھوں پر مارا تھا۔
”لالہ..... شور باز زیادہ گاڑھا ہو گیا ہے، یہ آج
کل تیرا دھیان کدھر ہوتا ہے۔“ اگر جو کبھی بے بے کو
میرے دھیان کی خبر ہو جاتی تو.....؟

”جانے کس پہاڑی چنڈال نے سالار کا دل
اپنی طرف پھیر لیا ہے۔“ وہ اب اٹھتے بیٹھتے آنسو
پونچھتی کہتیں..... یہ عیب اور راز پردوں میں ہی رہے تو
بہتر ورنہ تو بیچ چور ہے ذلیل کر دیتے ہیں..... اب
اس نے میرے راستے میں آنا چھوڑ دیا تھا کوئی ایک
آدھ بار اتفاق سے سامنے آ بھی گیا تو منہ پھیر کر اپنی
راہ ہو گیا تھا اور جانے کیوں میرے دل کو لاک دھکا سا
دے گا..... چاہے جو بھی تھا ہمارا بچپن ساتھ، ساتھ گزرا
تھا..... ایک بار پھر میں قبوہ لے کر گئی تو غصے ہوئے لگا۔

”آئندہ آپ قبوہ لے کر نہ آیا کریں۔“ جانے
یہ زندگی کس کس مقام پر میں تم سے آپ ہو گئی تھی۔

”کیوں نہ لے کر آیا کروں.....؟“ وہ سرخ
چھوٹے پتھر اٹھا، اٹھا کر وادی کی طرف پھینکنے لگا۔

”قبوہ زہر ہو جاتا ہے۔“ اس نے نہایت
اطمینان سے میرے قدموں تلے سے زمین لٹکی تھی

میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی مجھ سے اس
لجے میں بھی بات کرے گا..... میں پلٹنے لگی تھی جب

پچھے سے سالار کی آواز آئی تھی۔
”لالے..... وہ بہت محبت کرتا ہے تم سے؟“

میں تڑپ کر مڑی تھی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔
”کون..... کس کی بات کر رہے ہو؟“ وہ بغور

مجھے دیکھنے کے بعد بس معمولی سا ہنس دیا تھا۔
”نام بھول گئی ہو کیا اس کا..... شاہ زین.....“

”تم کیسے جانتے ہو اسے؟“ سرخ مٹی کے بادل
اڑے تھے۔ ذرا دیر کو تو نظر آنا بھی جیسے بند ہو گیا تھا۔

”سارے پہاڑ جانتے ہیں.....“
”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو.....؟“
”کبھی اس کی آنکھیں غور سے دیکھنا لالہ.....“

وہاں تمہیں مجھ سے زیادہ محبت نظر نہیں آئے گی.....

بہی ہم دونوں چلا کرتے تھے۔ صنوبر کا وہ جنگل صرف ہمارا تھا..... صرف ہمارا.....“

”مگر میں تمہاری نہیں ہوں سالار.....“ وہ پہاڑی مرد سرخ آنکھوں سے مجھے تاکتا رہا تھا۔

”پوری پائل بھی پہاڑوں کی چوٹیوں سے اچھا لوگی ناں وہ بھی ڈھونڈ کر نہیں لاپائے گا۔“

”نفرت کرتی ہوں میں تم سے..... اور سالار سے محبت ہو ہی نہیں سکتی..... شاہ زین سے محبت ہے مجھے۔“ اس کا قبوہ زہر، زہر کر کے میں پلٹ آئی تھی۔

م چاروں نے پھر محفل لگائی تھی زری شوہر کی چوکھٹ بے باہر آئی تھی، بار، بار دقت کی قلت کا ردنا ردتی تھی۔ رباب کو غصہ آتا۔

”زرمینہ..... آج کیوں پرانی ہو کر آئی ہو؟“ زری دھیرے سے ہنسی تھی اور اس پل وہ ہمیں ہماری زری نہیں لگتی تھی..... مجھ لوں گا تھا جسے وہ کافی عرصے بعد ہنسی تھی..... اس کی پلکیں بوجھل ہوئی تھیں۔

”زری تو اب اپنی بھی نہیں رہی.....“

"کچھ ہوا ہے کیا؟" گل کے آسن ختم ہو گئے تھے۔۔۔۔۔ رباب کی بانسری کے ساز بک کے مر گئے تھے۔

"باپ کے گھر بھی تو مجھے راضی رکھا جاتا تھا، گلے گھر مجھے ہر کسی کو راضی کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ وقت نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔ زندگی دیسی جانے کیوں نہیں رہی پہلے جیسی۔۔۔۔۔ وہ شامیں کیوں نہیں۔۔۔۔۔ زر گل کے آسن، میری اور تمہاری آنکھیں کی دونی کھمبیوں کا شور باور رباب کی بانسری کی بے مٹنی۔۔۔۔۔ آنکھیں چٹک نکلیں۔"

”پہاڑوں نے اب چپ اوڑھ لی ہے۔ غضب ناک رہتے ہیں لاوائے اگلے ہیں..... دیودار کی چوٹیوں پر میٹھی چڑیاں بھی ہجرت کر گئی ہیں۔“ گل بھائی کے ساتھ جہڑپ کے بعد بازو دھلا میٹھی تھی..... رو، رو کر آنکھیں سوچ چکی تھیں..... وہ غم خوردہ سے لہجہ میں نہیں تھی۔

”زری، اب خوشیاں ہجرت کر گئی ہیں۔“ وہ تو

”لالہ..... رشتوں سے، چیزوں سے، سب سے برکت اٹھ گئی ہے، برکت اٹھ جائے تو لوگ پاگل اور دیوانے ہو جاتے ہیں۔“ اس کی ظالم بھائی بیٹے کو جہنم دے کر مر گئی تھی..... چھوٹے سے ننھے بچے کو گل اپنے ساتھ لٹکائے رکھتی تھی۔

”مجھے وہ چڑیل ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی مگر دیکھو اس کی اولاد میرے دل میں گھر کر گئی ہے۔“

”جب پہاڑی ماؤں کی بیٹیاں چونکھٹ پر بیٹھی ہوں تو ان کے شور بے گاڑھے ہو رہی جاتے ہیں۔“

بے بے راگھ کریدنے لگتی تھیں۔

دبے کا سالن مجھ سے ہر بار خراب ہو جاتا تھا۔

بے بے سارا سارا دن لرزتی رہتی تھیں۔

”ہائے نی لالہ..... اپنے سوا کسے دے آئی ہے..... کس کا انتظار کرتی ہے؟“

”نہ، بے بے نہ.....“ دل میں چور ہو تو ذائقے باغی ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

سرخ پہاڑی لگا کرے میں ملیں رباب نے ہماری طرف دیکھا تھا اور مسکرائی تھی..... جانے زندگی ہم چاروں کو سولی چڑھے قیدیوں کی طرح کیوں مسکراتا دیکھ رہی تھی..... رباب نے زمین کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”ذرا میرا جھومر دیکھو..... اور میری تیاری.....“

میں تم سے بھی زیادہ اچھی دہن بنی ہوں ناں.....؟“

ہم تینوں نے اکٹھے سر ہلایا تھا۔

زیتون کے تیل میں بکا شور بہتی، ہم تینوں اس کے چہرے پر اصل خوشی تلاش کرنے کی کوششوں میں تھیں۔ شاید زرگل ج ہی تو کہا کرتی تھی۔ ”ہماری خوشیاں ہجرت کر گئی ہیں۔“

”رباب وہ تیرے باپ کی عمر کا ہے۔“

بوڑھیوں نے رباب کے سامنے کہنا شروع کیا تھا۔

”مگر میرا باپ نہیں ہے وہ..... سمجھے آپ لوگ.....“

وہ روتی ہوئی لرزتی رہی تھی۔ ہم نے اسے ساتھ لپٹا لیا تھا۔

”انگریزی شہزادے نہیں آئے تو میرا کیا تصور.....“

”میں جلد امی، ابو کو لے کر آؤں گا لالے..... تم راستوں پر نظر رکھنا.....“ اور میں راستوں پر نظر رکھنے والی تھی۔

سفری بیک اس کے کندھے پر تھا..... شاہ زین نے میری پیشانی پر ویرے سے بوسہ دیا تھا..... میں نے اس کی آنکھوں میں دور دور تک دیکھا۔ وہاں میں ہی میں تھی..... دل فخر سے دھڑک اٹھا تھا..... وہ مجھے اپنے ساتھ لگائے گئے جنگل سے راستہ بتاتے ہوئے گزر رہا تھا۔

”ہمارا اپنا ایک گھر ہوگا..... اپنی گاڑی ہوگی، ہر شام ہم باہر سیر کو جایا کریں گے..... اُس کریم کھائیں گے..... ہر دن ایک یادگار دن ہوگا۔“ راستے گلزار ہو گئے تھے، انتظار ابھی سے شروع..... اور پھر وہ آگے چل دیا..... میں تنگی باندھے اسے جاتا دیکھتی رہی تھی۔

دوبار، بار پلٹ کر دیکھتا اور مسکراتا بھی تھا..... میں آنسو پونچھتی بیٹھی اور وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہاں سالار.....

”اپنی آنکھیں صاف کر لو لالہ.....“ میں آگے کو مڑی تھی۔

”کیوں؟“

”مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔“ میں نے آنسوؤں کو

ببنے دیا تھا..... وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا تھا۔ وقت

رک سا گیا تھا اور میں کھوسی گئی تھی۔ ہر دستک وہ

تھا..... ہر بارش اس کا گمان، میری آنکھیں راستوں پر

تھیں..... مسافر..... جانے والا نہ جانے کب آئے

گا.....؟ دن، بچے، مہینے اور سال..... سوالیہ نشان.....

میں اکیلی خود کو تسلیاں دلا سے دیتی پہاڑوں کی چوٹیوں

پر چڑھتی ہاتھوں کا چھبنا بنا کر دیکھتی..... پہاڑ بڑھتے تھے

اور منور پر بیٹھی چڑیاں روتی تھیں..... میں اپنی ہتھیلی

گل کے سامنے پھیلا دیتی۔

”زرگل..... دیکھو..... وہ آئے گا ناں؟“ وہ

خالی، خالی آنکھوں سے بس مجھے دیکھ جاتی تھی۔

”لالے..... اب مجھے لکیروں نے اشارے

دینے بند کر دیے ہیں.....“ میں پھوٹ، پھوٹ کر روتی

گل کو دیکھ گئی..... وہ کیسی باتیں کرنے لگی تھی..... ہم میں

سے کوئی بھی پہلے تو ایسا نہیں تھا۔ گل ایسے کب ہتی تھی؟

اور اس جنگل میں کیے گئے سارے وعدے اور قسمیں آگ کے شعلوں کا رزق بن گئے ہیں۔“

☆☆☆

اور آج وہ چار سال بعد میری چوکھٹ پر اکھڑا ہوا..... جب صنوبر کا جنگل جل چکا..... انتظار مر چکا۔
 ”کیسی ہولالہ.....؟“ اس کی آواز تو آج بھی ویسی کی ویسی بنی ہے..... دلکش اور سحر انگیز، پہاڑی لڑکیوں کو راستوں سے بھٹکا کر رکھ دینے والی..... مگر میں تو ویسی نہیں رہی ہوں، چار سال پہلے جیسی..... زندگی میں اگر تغیر نہ ہو تو زندگی عذاب ہوتی جاتی ہے۔ شکر کہ تغیر زندگی کا حصہ تھا..... میں نے شاہ زمین کو اسی وقت نوک دیا تھا۔

”صرف لالہ نہیں..... پورا نام لو..... لالہ سالار۔“
 حیرت اس کے چہرے پر چند ثانیے کھلتی رہی تھی پھر وہ گویا ہوا۔

”تو تم آگے موڈ آن کر چکی ہو..... خوب، بہت اچھا کیا..... میں بھی تمہیں یہی کہنے آیا تھا کہ تم میرا انتظار ختم کر کے اب اپنی زندگی میں آگے بڑھ جاؤ..... میں بھی آگے بڑھ چکا ہوں..... میں نے اپنے جھپٹل کے اونز کی بیٹی سے شادی کر لی ہے مگر یقین رکھو تمہاری محبت کا حق میں نے اسے نہیں دیا۔“

وہ پہاڑوں کو ”گواہ“ کر کے گیا تھا..... پہاڑ جھوٹے نہیں ہوتے..... مسافر جھوٹے ہوتے ہیں..... مرد ہر بار عورت کو محبت کا یقین دے کر پیچھے کیوں ہو جاتا ہے..... اور عورت جو گمن بنی اپنی زندگی عذاب کیے رکھتی ہے..... دل چاہا اسے ایک تھپڑ دے ماروں جو کہہ رہا تھا کہ اس نے میری محبت کا حق اپنی بیوی کو نہیں دیا..... کیا لطفہ ہے ناں یہ..... جس پر ہنسی اور رونا ساتھ، ساتھ آتا ہے۔

”میں جھیل پر تمہارا انتظار کروں گا..... آؤ گی ناں؟“
 اب کیا بات رہ گیا تھا..... میں کس ناٹے اس سے ملنے جھیل پر جاتی..... آخر کیوں.....؟ بہت جتن کر کے تو میرے دبے کے سالن میں ڈانٹہ آیا تھا..... بے بے

”باب تمہارا کوئی قصور نہیں..... سارے قصور شہزادوں کے ہوتے ہیں۔“

دل چاہا بتیوں، چاروں پہاڑوں کی چوٹیاں گھیر لیں، تالیاں پینیں اور بازگشت سے غدا حال ہو کر گر پڑیں..... میں نے زمینوں کے تیل سے دیے روشن کرنے لگی..... وہ راستوں میں آنے والا مہینوں بعد سامنے تھا..... ہم دونوں نظریں نہیں جھکا سکے تھے۔
 ”کیسی ہولالہ.....؟“

”انتظار میں ہوں سالار۔“ دیوں کی لو پھڑکنے لگی تھی..... شعلے رنگ بدلنے لگے، سے صنوبر کے جنگل میں بٹھہر سا گیا..... کیا اب بھی اس کا قبوہ زہر ہوتا تھا.....؟
 ”میں بھی انتظار میں ہوں.....“ میری آنکھوں پر پتکوں کا زور بڑھنے لگا تھا۔
 ”کیسا انتظار.....؟“

”تمہاری واپسی کا..... مجھے یقین ہے تم واپس آؤ گی.....“ اتنے دنوں، مہینوں، سالوں کا ضبط میرے سامنے کھڑے شخص نے ریت کا ڈھیر کر دیا تھا۔
 جبر کی دعوپ میں پھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں رستہ دیکھنے والی آنکھوں کے انہو نے خواب پیاس میں بھی دریاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے ہیں پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاردوں سے ہیر پھل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں رنگ سے خوشبوؤں کا نانا ٹوٹا جاتا ہے پھول سے لوگ خزاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں میں نے زر گل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔
 ”گل، خدا کے واسطے..... چند لمحے کو مجھے سنو.....“

تم تو دادی کی سب سے ذہین لڑکی ہو ناں..... بتاؤ میں کیا کروں؟“ گل نے میرے ہاتھ جھٹک کر رکھ دیے تھے۔
 ”صنوبر کے خوشبودار جنگل میں آگ بھڑک اٹھی

طرح، طرح کے شور ہے..... پہاڑوں نے پھر سے
ہمیں بلاوے بھیجے تھے اور ہم دوڑے پٹے آئے۔
پہاڑ ہمارے دوست ہیں۔ رباب نے شور بے
کاپیالا کوئی تین مرتبہ پیا تھا۔

”زندگی اتنی بری شے بھی نہیں اگر شور بہ پینے کو
مل رہا ہو تو.....“

”شور کا گھر مضبوط ہوتا ہے اگر بنیاد ولا در کھے
تو.....“ زری کھمبیاں گل رہی تھی۔ اس کا بیٹا ذرا فاصلے
پر بیٹھا کنکر واوی میں پھینک رہا تھا۔

”ہمارے غم ہجرت کر گئے ہیں۔“ گل نے قبوہ
سڑک، سڑک پیتے ہوئے ایک لمبا قہقہہ لگایا۔

رباب نے دف اٹھا کر بجانا شروع کر دی.....
پہاڑ باز گشت ہو گئے..... ہم نے قہقہوں کو دیو دار کی
چوٹیوں سے بھی اوپر اور اوپر جانے دیا۔

میں نے شمال کی طرف دیکھا تھا۔ وہ سالار تھا
جو ادھر ہی آ رہا تھا اور اس کا رنگ بہار کی طرح کھلا
ہوا تھا۔

”لالے..... لالے..... صنوبر کا جنگل پھر سے
اگنا شروع ہو گیا ہے۔“

اور ہم دو تھے..... سالار اور میں..... تیسرا صنوبر
کا خوشبودار جنگل تھا۔

خنگ چوں کا چنگٹا..... منگٹا ہوا شور اور ہم.....
شریر بندر شاخوں سے ادھر، ادھر تک رہے تھے۔

”مجھے وہ ملا تھا.....“ سالار نے مجھے بتایا تھا۔

”کون.....؟“

”شاہ زین.....“

”میں کسی شاہ زین کو نہیں جانتی.....“ پہاڑ

مسکرائے اور جنگل کھل اٹھا تھا۔

”میں بھی نہیں جانتا۔“

ہم دونوں بس صرف اور صرف ایک دوسرے کو

جانتے تھے۔

کیسے خوشی سے روئی ہیں.....
”لالے..... تیرا شوہر تجھ سے راضی ہے اسی
واسطے تیرا سالن ڈال کھتا ہے اور کھانے والا سیر ہو کر
کھاتا ہے۔“

☆☆☆

اس شام زرگل کے کہنے پر مدت بعد میں نے اپنی
پائل کا ٹھکر و پہاڑ کی چوٹی سے نیچے واوی میں گم کیا تھا۔
”جاؤ سالار..... اگر آج ٹھکر و ڈھونڈ کر لائے تو
میں اپنی محبت گم کر دوں گی۔“

وہ شام سب نارنجی شاموں پر بار تھی..... دیو دار اور
صنوبر کی چوٹیاں ڈھکے گئیں..... اندھیرا روشنی نکلنے کو آن کھڑا
ہوا اور بھی وہ آگیا۔ واوی کا سب سے شریف اور آنکھوں
میں حیار رکھنے والا مرد..... اس نے لائسن ہم دونوں کے
درمیان کھڑی کی تھی۔ آنکھیں پھیل کر چار ہو گئیں.....
میں نے ہتھیلی سامنے پھیلا دی..... وہ ہنسا اور ہتھیلی پر احتیاط
سے ننھا چاندی کا ٹھکر و رکھ دیا۔ اور..... یہیں شاہ زین کو
مات ہو گئی..... میں نے آنکھوں کو بہہ جانے دیا۔

”جاؤ، خال کو بھیج دینا۔ اس بار انکا نہیں ہوگا۔“ میں نے
آخری بار اپنے سامنے کمرے شخص کو نظر بھر کر دیکھا تھا۔

”حلے جاؤ شاہ زین..... ہمارے پہاڑ فریب
اور دھوکے کی محبت پر پھٹ پڑتے ہیں لاوے اگلنے
ہیں۔“ وہ پتھر بنا کھڑا تھا..... بت اور بتوں میں جان
نہیں ہوتی..... میں اپنے دل اور گھر کے دروازے
بیشہ، بیشہ کے لیے اس پر بند کر چکی تھی..... وہ اپلو
دیوتا اسی لائق تھا..... اب کہیں بھی ”محبت“ نہیں تھی۔

☆☆☆

”میں نے سالار کے لیے شاہ زین کو چھوڑ دیا۔“
گل نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔
”واوی کے سارے پھول تم پر قربان ہوں۔“
رباب بکری کے گوشت کا شور بہ بنا کر لائی تھی۔

”میں شور بہ بہت اچھا بنانے لگ گئی ہوں کیونکہ
انہیں بہت پسند ہے۔“ زری نے سالوں بعد ہماری پھر
سے پہاڑوں پر دعوت کی تھی..... کھمبیاں، بیٹھا قبوہ اور



محراب

نار کہانی ہے محبت کی مگر اس میں آپ کو محبت ہوتی نظر نہ آئے گی... سمجھ نہ آئے گی گر سمجھ آگئی تو سلجھ نہ پائے گی...

نار کہانی ہے اک راز کی... اور راز اک چنگاری سے کم نہیں ایسی چنگاری جو سلگی تو بھڑکے گی، گر بھڑکی تو... شاید دل بچیں گے نہ وجود...

نار کہانی ہے دو ناآسودہ لوگوں کی جو مردہ دلوں کو زندگی کی زور سے باندھے گھسیٹتے ہیں اور پھر خود ہی گھسیٹتے چلے جاتے ہیں... زندگی کا تنفس برقرار رکھنے کی بدترین کوشش میں...

نار اک پہیلی ہے یا کسی کی سہیلی ہے مگر نار تو نار ہے... سہیلی کیسی؟

ایک چپ رہنے کے سب الزام مجھ پر ہی نہ تھے
خاموشی پر بھی تو تہمت لب کشا ہونے کی تھی
میں خود اپنی آگ ہی میں جل بھا تو یہ کھلا
شرط جلنے کی نہیں تھی کیا ہونے کی تھی

نار پڑھیے، لکھیے اور پھر سلجھائیے.....





احمد صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ خولہ اور مزنہ۔۔۔۔۔ احمد صاحب کی بہن فرخندہ کے شوہر اجمانہ، مارکیٹ میں آگ لگنے کے سبب ہونے والے نقصان کو برداشت نہیں کر سکے اور ہارٹ ایک میں اپنی جان ہار بیٹھے۔ احمد صاحب اپنے بھانجے جہانگیر اور بہن فرخندہ کو اپنے گھر لے آتے ہیں۔ خولہ نے ایم ایس مکمل کیا اور جہانگیر نے ایم بی اے، وہ علیحدہ ایک گمراہے کا گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتا ہے۔ مس تسم کی سالگرہ کی تقریب ان کے بھائی نے بعد اصرار کی اور وہ ساڑھی اور ہینکے میک اپ میں اس کی سالگرہ میں آئی۔ تسم کے بھائی کی یہ اس سے تیسری ملاقات تھی جس میں وہ اسے پروپوز کرتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ میر ڈے۔ فرخندہ اپنے بھائی سے مزنہ اور جہانگیر کے رشتے کی بات کرتی ہیں تو وہ خولہ کو مجبور کرتے ہیں کہ مزنہ کیونکہ سمجھدار نہیں ہے اس لیے وہ اس رشتے کو قبول کر لے۔ خولہ سوچتی ہے کہ جو رشتہ مزنہ کے لیے صحیح نہیں وہ اس کے لیے کیسے صحیح ہے لیکن وہ مزنہ میں یہ رشتہ قبول کر لیتی ہے اور جہانگیر جس کا خواب جرمنی جا کر آگے پڑھنا تھا وہ شادی کر تو لیتا ہے لیکن اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اور بالآخر وہ خولہ کو نوکری کرنے کا کہتا ہے۔ جس پر وہ حیران و پریشان رہ جاتی ہے۔ خولہ، مزنہ کو بتاتی ہے کہ جہانگیر چاہتا ہے کہ وہ جاب کرے تو وہ بھی بہت حیران ہوتی ہے، فرخندہ بھی نہیں چاہتیں کہ خولہ جاب کرے اس لیے وہ جہانگیر پر دباؤ ڈالنے کے لیے احمد صاحب کو بتاتی ہیں جس پر خولہ پریشان ہوتی ہے کہ انہیں اب کو نہیں بتانا چاہیے تھا۔ احمد صاحب، جہانگیر کو سمجھانے آتے ہیں تو وہ خولہ کو ان کے ساتھ ہی بھیج دیتا ہے، مزنہ کا رشتہ آتا ہے اور خولہ کے بیکے بیٹھے ہونے کی وجہ سے وہ لوگ انکار کر دیتے ہیں۔ وہ ہوٹل کے ایک پرنسپل کرے میں تھی، اس کا لباس سرخ نہ تھا لیکن وہ ڈھن تھی۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ یہ اس نے کیا، کیا کہ اسے میں ہاپیوں کرے میں آجاتا ہے۔ مزنہ کی وجہ سے خولہ واپس سرسرا چلی جاتی ہے۔ جہاں گھر اور پھوپھو کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے۔ جہانگیر، خولہ سے کہتا ہے کہ اس نے اسے بہت سنا کیا لیکن وہ جھکتا نہیں چاہتا، جہانگیر کے پاس کی وجہ سے خولہ کو اسکول میں جاب مل جاتی ہے لیکن خولہ ایلے جسٹ نہیں ہو پاتی۔ مزنہ کی ٹینشن میں احمد صاحب کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے خولہ بہت مشکل سے اسکول میں اپنی کارکردگی بہتر کرتی ہے۔ خولہ اور احمد صاحب، مزنہ کے رشتے کے لیے ایک جگہ جاتے ہیں تو وہ مزنہ کی کلاس فیلو نکلتی ہے وہیں باہر خولہ کی ملاقات اپنی پرنسپل مس مفتی سے ہوتی ہے۔

اب آگے بڑھیے

قسط نمبر 3

"may I come in?" دروازے میں سے جھانکتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ میڈم نوکل گلاسز لگائے، سر جھکائے کچھ لکھنے میں مشغول تھیں۔ پوچھے جانے پر سر اٹھایا۔ اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" خولہ نے پوچھا۔
 "میں ٹھیک ہوں سرز جہانگیر۔۔۔۔۔ آپ کیسی ہیں۔۔۔۔۔؟" مصروف سے انداز میں جواب آیا تھا۔
 "آپ بڑی ہیں تو میں پھر آ جاؤں گی۔۔۔۔۔" وہ اُن کی مصروفیت محسوس کرتے ہوئے بولی۔
 "ارے نہیں۔۔۔۔۔ آپ کیسے۔۔۔۔۔"

"میں آپ سے بہن کے پروپوزل کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔ اس دن بتایا تھا ناں میں نے آپ کو۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔۔ بالکل آپ پوچھیے جو بھی آپ کو پوچھنا ہے۔" وہ اب کے پوری طرح سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"وہ نہیں تو ان کی فیملی پسند آئی ہے۔ ابو کی لڑکے سے اسکا پ۔۔۔۔۔ بھی بات ہو گئی ہے۔ میں بس تسلی کرنا چاہ رہی تھی کہ وہ لوگ کیسے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ خاندانی، اچھی شریف فیملی ہے؟ آپ تو زیادہ بہتر جانتی ہوں گی۔" اور خولہ جب بات کر رہی تھی تو اس کے لہجے میں اک بچکا ہٹ تھی۔ یوں جیسے معلوم نہ ہو کہ سامنے موجود شخصیت کیا۔۔۔

مذہب ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی بات سن کر مس مفتی نے فوکل گلاسز اتار کر ٹیبل پر رکھے اور دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا کر کہنیاں پز پر رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مسز جہانگیر ٹیبل تو واقعی ہی میں اچھی ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے جبین کے بھائی کی بابت استفسار کریں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ کافی سالوں سے جرمنی میں سیٹل ہے۔ اس لیے میں اس بات سے لاعلم ہوں کہ لڑکا کیسا ہے یا کیسا ثابت ہوگا۔ باقی فیملی بظاہر تو اچھی ہی ہے۔“ سنجیدہ سے انداز میں انہوں نے بات مکمل کی تھی۔ خولہ کے چہرے پر یک دم اطمینان سا پھیلا تھا۔

”بہت شکریہ..... مس مفتی.....“ اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

”my pleasure!“ انہوں نے بھی مسکرا کر ہی جواب دیا تھا۔



چراغ دین کے لیے دین..... کسی کتاب، کسی سنت کا نام نہیں تھا۔ چراغ دین کے لیے دین، صرف اور صرف مولوی اللہ رکھے کا نام تھا۔ خود تو وہ فقط کلمہ پڑھنا جانتا تھا، وہ بھی غلط تلفظ کے ساتھ۔ قصور تو شاید چراغ دین کا بھی نہیں تھا کہ ساری بات شعور کی تھی اور مصیبت یہ کہ یہاں پھر ”شعور“ کا نام بھی مولوی اللہ رکھا ہی تھا۔ چراغ دین کے گھر میں کوئی چیز بعد میں آتی تھی مولوی اللہ رکھے کے ہاتھ کا لکھا تعویذ پہلے۔ بھینس مرگئی..... خشک ہوگئی، نئی بھینس لی۔ فصل کو کیڑا لگ گیا۔ یا پھر چراغ دین کو زکام..... ہر کام کا ایک ہی جادوئی حل تھا اور وہ تھا کیا..... جی ہاں..... مولوی اللہ رکھا۔ چراغ دین اپنی عقل تو نہ رکھتا تھا۔ وہ مولوی اللہ رکھے کی آنکھوں سے ڈکھتا تھا، اس کے کانوں سے سنتا تھا اور جو منہ میں گوشت کا ایک لوتھڑا تھا وہ بھی وہی کہتا تھا جو مولوی اللہ رکھا چاہتا تھا۔ فصل کا ایک حصہ مولوی صاحب کو جاتا تھا۔ ہر جمعرات کا کھانا دیسی مرغ، دیسی مٹی میں ہی بھنا ہوا۔ بشمول زردے کی پلیٹ کے مولوی صاحب کے گھر چراغ دین بے نفس نفس خود پہنچا کر آتا۔ مہینے میں ایک بار مولوی صاحب چراغ دین کے گھر پھیرا ضرور لگاتے تھے..... بد اثرات دور کرنے کے لیے اور اپنے لعاب و دہن والا پانی گھر کے کونوں میں چھڑکنے کے واسطے، یوں سمجھیے کہ چراغ دین کی آدمی کمائی اس کا گھر آنا کھانا اور باقی آدمی مولوی صاحب اور ابھی ختم درود کی داستان تو میں نے کہی ہی نہیں..... چراغ دین کا بس چلتا تو وہ مولوی اللہ رکھے کو سر پر اٹھا کر پھرتا اور قدم اٹھانے سے پہلے پوچھتا.....

”اعلیٰ حضرت! پیر صاحب، پیر کھتے رکھنا ہے یا بچے.....“ شعور پہناتا نہ ہو چکا تھا اور عقل گردی رکھ چھوڑی تھی اس نے..... اس کے گھر کی برکتیں..... رونقیں سب (نعوذ باللہ) مولوی جی کے دم سے تھیں..... وہ نہ ہوتے تو چراغ کا بننا کیا..... ایک مولوی صاحب کی ذات تھی کہ جنہوں نے (نعوذ باللہ) اس کے گھر سے ہر قسم کی بلاؤں کو دور کر رکھا تھا۔ ابھی سال بھر پہلے کی تو بات تھی کہ اس کا بیہ ہوا تھا اور آج..... آج وہ صاحب اولاد ہو چکا تھا۔ جب کھیتوں پہ کام کرتے چراغ دین کو یہ خبر ملی تو وہ دوڑا، دوڑا بھاگا، بھاگا گیا تھا۔ بھلا کہاں؟ گھر؟ ارے نہیں..... مولوی اللہ رکھے کے پاس..... بچے کو کھٹی دینی تھی اور اس کا نام بھی تو جو بڑ کرنا تھا۔ مولوی صاحب نے قل نکال کر۔ اور مولوی صاحب ان کے لیے وہ دن بڑا بھاگوں ثابت ہوتا تھا کہ جب بھی گاؤں میں کسی بھی گھر میں ولادت ہوتی تھی۔ دارے نارے ہو جایا کرتے تھے۔ ایسے میں جب چراغ دین انہیں بلائے آیا تو وہ کچے دھاگے سے ہی تو بندھے..... پلٹم پلٹم چراغ دین کے ساتھ دوڑے آئے۔ گھر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے بچہ مولوی صاحب کی گود میں ڈالا گیا۔ مولوی صاحب نہ جانے کتنی دیر زیر لب درود کرتے رہے اور پھر بچے کے چاروں جانب پھونکیں مارتے رہے۔ اتنی دیر میں بچہ بھوک سے بلکنا رہا مگر جب تک مولوی صاحب کا دم پورا نہیں

ہوا تھا۔ سوائس لپیدا نہیں ہوتا تھا کہ بچے کو پچھ پلایا جائے۔ مولوی صاحب نے پندام پورا کیا۔۔۔۔۔ ایک آخری پھونک مار کر بچے کو آئندہ زندگی کی تمام تر بلاؤں سے محفوظ کیا اور پھر جلالی آواز میں کہا۔

”شہد لاؤ۔۔۔۔۔“ شہد لایا گیا۔ مولوی صاحب نے بچے کو شہد چٹایا۔۔۔۔۔ پھر کان میں اذان دی اور چراغ دین کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

”بیٹا مبارک ہو چراغ وین۔“ اور چراغ وین فرط مسرت اور فرط احترام سے جھک، جھک جاتا تھا۔

”بھیر و مرشد۔۔۔۔۔ نام بھی بتا دیجیے کہ کون سا نام میری اولاد کے لیے ٹھیک رہے گا۔ بھاری نہیں پڑے گا۔“

”چراغ دین۔۔۔۔۔“ مولوی صاحب کھڑے ہوتے ہوئے بولے۔

”مسجد آتا۔۔۔۔۔؟“ وہاں تمہیں بتائیں گے کہ کون سا نام صحیح رہے گا۔ حساب کتاب بھی تو لگانا ہے ناں

ابھی۔۔۔۔۔“ وہ اب اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہے تھے۔

”جی مولوی صاحب۔۔۔۔۔ جو عظم۔۔۔۔۔ جیسا آپ کہیں۔۔۔۔۔“ اور چراغ دین کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ وہاں اپنا جسم رکھے کہ جہاں مولوی صاحب اپنا ہیر رکھتے تھے۔۔۔۔۔ وہ مسجد تک گیا تھا، مولوی صاحب کو چھوڑنے اور خالی ہاتھ

کیسے جاسکتا تھا۔ نذر و نیاز کا ایک ڈھیر تھا جو چراغ وین کے ساتھ تھا۔ وہ مولوی صاحب کو ان کے حجرے کے اندر

تک چھوڑ کر آیا تھا۔ مع اس ساز و سامان کے اور کل جب وہ نام کا پوچھنے آتا تو تب بھی کون سا خالی ہاتھ آتا تھا تو

جب کل آئی اور چراغ وین چیزوں اور نیاز کے ایک اور ڈھیر کے ساتھ مولوی صاحب کے حجرے میں پہنچا

تو۔۔۔۔۔ مولوی صاحب نے کہا تھا۔

”تمہارے بیٹے پہ ”اح“ سے شروع ہونے والا نام موزوں رہے گا۔ دوسرا کوئی نام رکھو گے تو بیٹا یا تو بیمار

رہے گا یا پھر ساری عمر پریشانیوں میں گھرا رہے گا۔“ اور اب چراغ وین کی کیا مجال کہ وہ کوئی اور نام رکھتا۔۔۔۔۔ اس

نے اپنے بیٹے کا نام ”احمد مجیبی“ رکھا تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک لمبے عرصے کے بعد ابو کے چہرے پر اتنا سارا اطمینان دیکھا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے نظر آئے تھے اور

بے فکری کا رنگ ہنسی پر غالب تھا۔۔۔۔۔ اور معلوم نہیں کیوں اس نے خود بھی خود کو اتنے عرصے بعد اتنا پرسکون محسوس کیا

تھا۔ چند لمبے وہ ان کے مسکراتے چہرے کو دیکھتی رہی اور خود کے لیے سکون کشید کرتی رہی۔

”ابو آج مجھے سمجھ آیا کہ محبت ہمیشہ بے توازن ہی ہوتی ہے۔ جیسے آپ کی مزنہ کے لیے اور میری آپ کے

لیے۔۔۔۔۔ توازن کا بھلا کیا کام محبت سے۔“ سر جھٹک کر اس نے سوچا اور مز گئی۔ مزنہ کی منگنی بھی جو ابویوں اتنے

پرسکون نظر آتے تھے۔ جہانگیر کے ساتھ بھی ان کے تعلقات میں بہتری آئی تھی۔ اور یہ تب سے ہوا تھا کہ جب وہ

بیمار پڑے تھے۔ خولہ مصروف سے انداز میں بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے چکن کی طرف مٹی تھی کہ جہاں بہت سے کام

اس کے منتظر تھے۔

☆☆☆

اس نے کام دار و دوپٹا مزنہ کے سر پر ٹھیک کیا اور پھر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مزنہ نے نظریں اٹھا کر اسے

دیکھا، خولہ مسکرا دی۔ اس نے ابو کی طرح مزنہ کو بھی اتنے ہی عرصے بعد یوں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ قریب

تھا کہ وہ ڈیپ ڈپریشن کا شکار ہو جاتی۔

”خوش ہو؟“ اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر خولہ نے پوچھا۔

”خوشی کا معلوم نہیں۔۔۔۔۔ لیکن مطمئن ضرور ہوں۔“ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے مزنہ نے جواب دیا تھا۔

خولہ ایک بار پھر سے مسکرائی گی۔
 ”نہ جیوں کے بھائی کا تو معلوم نہیں..... لیکن نہ جیوں ضرور تمہاری آنکھوں پر فدا ہے۔“ خولہ نے بیڑ کر اؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے اسے چھیڑا تھا۔

”لو بھلا..... اس کا کیا فائدہ ہوا؟“ مزمنہ نے منہ ہناتے ہوئے کہا۔ اور پھر ان دونوں کا قہقہہ گونجا تھا۔
 ”بندہ معقول لگتا ہے مزمنہ.....!“ خولہ نے اب کے سنجیدگی سے ہی کہا تھا۔
 ”مجھے کیا پتا؟ میں نے کون سا اس سے بات کی ہے؟“ مزمنہ ابھی تک شرارت کے موڈ میں تھی۔ خولہ نے اب کے ہنسی وبائی۔

”آج بڑی ہری، ہری سو جھ رہی ہیں تمہیں؟“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے ایک دھب اس کے کندھے پر لگائی۔
 ”اب بھی نہ سو مجھے آئی.....“ چند لمحوں بعد مزمنہ نے کہا تھا۔ اس کے لہجے میں کچھ تھا کہ جس نے خولہ کے دل کو جکڑا تھا۔

”اللہ ہمیشہ تمہیں خوش رکھے۔“ خولہ نے بے ساختہ اس کا ماتھا چوم کر دعا دی۔

☆☆☆

مستثنیٰ کا فریضہ انجام ہو جانے کے بعد گھر میں ایک بے ترتیبی سی پھیلی ہوئی تھی۔ جابہ جا بیروں کے نیچے آکر مسلی جانے والی پھولوں کی پتیوں اور اننگ روم میں موجود صوفوں کے کشن اپنی جگہ سے ہلے ہوئے..... ہال کرسیوں سے اٹا پڑا تھا اور ان کرسیوں اور گول میزوں کی حالت صاف بتاتی تھی کہ وہاں کھانا، کھایا گیا تھا۔ فرش کی چمک کو جو توں کی مٹی نے وھندلا رکھا تھا۔ کچن میں برتنوں کا ایک جم غفیر تھا اور کام والی میج آکر دھوئے کا کھڑکے کاغذ ہو چکی تھی۔ ایسے میں..... اس اگلے پڑے، بے ترتیب گھر میں..... ایک جانب سے بار، بار قہقہوں اور ہنسی کی آوازیں آتی تھیں۔ وہ ایک خوشگوار دن تھا..... مزمنہ نے جیوری اتار دی تھی لیکن ابھی تک وہ اسی جوڑے میں تھی۔ خولہ نے بھی چنچ نہیں کیا تھا۔ جہانگیر کا کوٹ صوفے پر الٹا پڑا تھا اور اس نے ڈریس شرٹ کے بازوؤں کو رکھے تھے۔ ٹائی ڈھیلی اور گریبان کا اوپری بٹن بھی کھول رکھا تھا۔ احمد صاحب نے بھی شلوار سوٹ کے اوپر پہنی واسکٹ اتار کر کرسی کے بازو پر ڈال رکھی تھی۔ اور اب آرام دہ حالت میں بیٹھے تھے، فرخندہ بھی دونوں پاؤں اوپر کر کے صوفے پر براجمان تھیں۔ ان کے پہلو سے چپکلی مزمنہ بیٹھی تھی اور خولہ..... وہ ابھی ابھی چائے کی ٹرے لے کر آئی تھی۔ سب کو باری، باری کب پکڑانے کے بعد وہ مزمنہ کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔ وہ ہنس رہے تھے، خوش گپوں میں مصروف تھے۔ آج کی تقریب کو دیکھ کر کیا جا رہا تھا۔ کبھی کی رائے مزمنہ کی سسرال والوں کے بارے میں اچھی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ یہ اطمینان ایک عرصے بعد نصیب ہوا تھا۔

”احمد بھائی..... مزمنہ کی شادی کے بعد تو آپ اکیلے ہو جائیں گے۔“ فرخندہ نے اچانک پوچھا۔ اس سوال پر ایک محسوس کی جانے والی اداسی وہاں سرعت سے پھیلی تھی۔ ماحول پر یک دم خاموشی حاوی ہو گئی تھی۔
 ”بہنوں کو تو بیاہنا ہی ہوتا ہے ناں فرخندہ.....“ چند لمحوں بعد وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولے تھے۔
 ”نہیں، احمد بھائی..... میں آپ کو اکیلا نہیں رہنے دوں گی۔ آپ ہمارے ساتھ رہیں گے۔“ فرخندہ جذباتی ہو رہی تھیں۔ احمد صاحب ہنس دیے۔

”اچھا جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ ابھی سے کیوں ہلکان ہو رہی ہو تم.....“ بہن کا سر شفقت سے تھپکتے ہوئے وہ بولے۔ مزمنہ کا دل بھر آیا تھا۔ اسے یوں رونے کے لیے آمادہ دیکھتے ہوئے خولہ نے اس کی پٹلی میں کہنی ماری۔ ”سی“ کر کے اس نے گھور کر بہن کو دیکھا۔ خولہ نے مسکرا کر اسے نہ رونے کا اشارہ کیا تھا۔

ہا معلوم سے احساس نے جکڑ لیا تھا۔ عجب، عجب طرح کے وہم تک کرتے تھے اور وہ ہم، ہم جانتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں یہ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ایسا تو پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ جتنے، جتنے ایک دم اس کے ہونٹوں کی انہی غائب ہو جاتی اور دل پر خوف اپنے پنچے پھیلا کر اسے جکڑ لیتا تھا۔ خوف.....؟ کیا خوف؟ یہ ہی تو کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تو کیا وہ مزہ کی شادی کے باعث نیشٹن میں تھی یا پھر اسے ابو کی پریشانی تھی۔ ان کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے ایسا تھا؟ لیکن یہ دونوں معاملات ایسے تو نہ تھے کہ جن کا حل نہیں نکالا جاسکتا، مزہ کو بھی سب لڑکیوں کی طرح ایک نہ ایک دن بیاہنا ہی تھا تو پھر خوف؟ کیا..... وہ گیا احمد صاحب کا معاملہ تو اس کا دل بھی کل بھی نکالا جاسکتا تھا بعد کی بعد میں دیکھی جانی تو پھر..... پھر ایسی حالت کیوں.....؟ اور یہ ”کیوں“ کا جو سوال تھا اس کا جواب کہیں پر بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہر وقت یہ ہی ”کیوں، کیوں“ ہوتی رہتی تھی اور وہ ہم، ہم جانتی، دل میں جو اک خوشی کا جذبہ تھا وہ جیسے اچانک مر گیا تھا۔ وہاں بس اب اک انجانا، ان دیکھا کچھ میں نہ آنے والا خوف براجمان تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ دنیا اس کے سامنے سلوموشن میں چلنے والی پکڑی یا پھر وہ ہی کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ کیا یہ اسٹرپس تھا؟ اس تھا کہ دینے والی روٹین کی وجہ سے..... جسے وہ شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اختیار کیے ہوئے تھی۔ اسٹرپس تھا..... یا پھر کوئی ذہنی حالت وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ خولہ یہ حالت کسی سے ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہتی تھی کہ خوشی کا موقع تھا اور وہ کسی کو پریشان بھی نہیں کرنا چاہتی تھی، چاہے خود پریشانی اس کے وجود پر ضرر نہیں لگا، لگا کر اسے اودھ موا کرتی رہے، وہ کسی سے بھی یہ بات ڈسکس کرنے والی نہیں تھی۔ وہ مزہ سے ڈسکس کرنے لگتی تو مزہ نہ کا ہنسا چہرہ اس کے ہونٹوں کو ”ش، ش، ش“ کرتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کرتا تھا۔ اور پھر..... پھر اس کا دل چاہتا کہ وہ وہاں سے مار، مار کر روئے۔ اتار روئے، اتار روئے کہ دل پر چھایا یا غبار، آنسوؤں کے ساتھ حل، حل کر پھٹ جائے..... وہ بھی بے فکری سے اک، اک لمحہ انجوائے کرنا چاہتی تھی۔ اونچے، اونچے بے مقصد قہقہے لگانا چاہتی تھی۔ خوش ہونا چاہتی تھی کہ خوشی کا ہی موقع تھا۔ لطف اٹھانا چاہتی تھی لیکن..... لیکن اس کے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ اس کے قہقہے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ ہنسی پیڑ پھیر کر کہیں بھاگ گئی تھی۔ خوشی اسے جیسے گڈ بائے فارا پور کہہ چکی تھی۔ تو کیا زندگی کبھی بھی..... اسے کبھی بے فکری کا معنی اوڑھ کر نہیں ملے گی؟ کیا کبھی بھی نہیں.....؟ اس کا دم اور گھٹنے لگتا..... اتنا کہ آنکھوں سے آنسو بھی خفا ہونے لگتے۔

”تو کیا وہ کسی قسم کے ذہنی مرض کا شکار ہو رہی تھی؟“ اور اگلی ذہنی روا سے نئے سرے سے خوف میں مبتلا کر کے رکھ دیتی تھی۔ یوں جیسے وہ دو نقطوں کے درمیان کھینچا گیا ایک خط تھی۔ پہلے نقطے کا نام بھی خوف اور دوسرے کا بھی..... وہ بس انہی دو نقطوں کے درمیان کسی گیند کی طرح لڑھکتی رہتی..... اور جیسے، جیسے مزہ کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا اتنا کہ اب دوسروں پر بھی عیاں ہونے لگا تھا۔

”تم تھک گئی ہونا خولہ.....! آرام کر لو چند دن..... مت کر داتا کام.....“
 ”مزہ! تم نے میری بیٹی کو خوار کر کے رکھ دیا۔ دیکھو تو کیسے رنگت ہی بدل کر رہ گئی ہے اس کی تو.....“ ابو کہتے..... بچپو اسے دودھ، بادام کھلانے کے چکروں میں رہتی اور وہ..... وہ ان سب کو سمجھانے میں ناکام تھی کہ آخر..... آخر اس کا اصل مسئلہ کیا تھا۔

☆☆☆

شاپنگ کا کام ختم ہوا تو..... ایک دو دن کے وقفے سے گھر میں ڈھولک رکھی گئی تھی۔ خولہ نے ابھی تک اسکول سے چھٹیاں نہیں لی تھیں۔ سوس کی مصروفیت کا وہ ہی عالم تھا۔ اور اب تو اس نے اس کا آسان حل بھی ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ وہ پچھو کو لے کر ابو کے گھر میں ہی آ گئی تھی۔ شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے تھے۔ مزہ کے منیجر کو بھی ایک دو دن

اس وقت بھی وہ سب کو چائے سرد کر رہی تھی اور بے طرح مصروف دکھائی دیتی تھی۔ چہرہ بخیدہ، رنگت زرد، آنکھوں کے نیچے واضح محسوس کیے جانے والے طعنے، ہونٹ خشک.....

”تو کیا اسے پانی پینے کا بھی ہوش نہیں تھا؟“ یہ سب جہانگیر اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اور وہ جب کسی کام کی غرض سے دوبارہ کچن کی طرف مڑی تو جہانگیر بھی اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ وہ کچن میں ملازمہ کو کچھ کہنے میں مشغول تھی اور اس کا آنا ٹوش نہیں کر سکی تھی۔ جہانگیر نے ایک دم اس کا ہاتھ پکڑا۔ ہاتھ میں موجود پلیٹ کو فلیٹ پر رکھا اور اسے کھینچتے ہوئے باہر لایا۔

”جہانگیر، جہانگیر افوہ..... ہوا کیا ہے؟ اُف..... کچھ بتاؤ تو سہی..... جہانگیر کیا کر رہے ہو، یا خدا یا.....“ وہ اس کی سنے بغیر کھینچتا ہوا اسے چھت پر لے آیا تھا اور پھر اپنی پشت پر موجود اس کے وجود کو کھینچ کر اپنے سامنے لا کھڑا کیا۔ اب کی بار وہ کچھ یوں بولی نہ تھی بلکہ خشکی بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے سوال کرتی ہو۔

”آ خر مسئلہ کیا ہے؟“

”جہیں کیا ہوا ہے خولہ.....؟“ وہ دو قدم نزدیک ہوا۔ خولہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ اور پھر الٹا سوال پوچھا۔

”حالت دیکھی ہے اپنی؟ کیسی ہوتی جا رہی ہو؟ شادی میں تم دلہن کی بہن کم اور ماسی زیادہ نظر آؤ گی۔“ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔

”آں..... اور تم کب چاہو گے کہ تمہاری بیوی ماسی لگے، بے ناں.....؟“ وہ بالکی سی شگفتگی سے بولی تھی۔

”شٹ اپ خولہ! یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اسکول سے چھٹیاں کیوں نہیں لے لیتیں تم.....؟ کیوں خود کو اتنا تھکا رہی ہو؟ نہیں ہوتا تم سے تو دفع کرو اسکول کو.....“ وہ ناراضی اور جھنجھلاہٹ سے بول رہا تھا۔ اور خولہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ دیکھو تو بھلا..... کہہ کون رہا تھا؟

”مجھے تم عزیز ہو خولہ.....“ وہ اب اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے مدھم لہجے میں بولا۔ اور خولہ..... اس کی آنکھوں میں ایک دم ہی اک بے نام سی جلن اتر آئی۔ اس نے ایک سستکی سی نظر سے جہانگیر کو دیکھا۔

”آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت ہے تمہیں یا یہ کام بھی میں ہی کر دوں؟ تاکہ تم کم از کم اپنی حالت تو ملاحظہ کر سکو!“

وہ اب دو انگلیوں میں اس کے بالوں کی لٹ کو پکڑے، اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ خشکی اس کے لہجے سے چھلک، چھلک پڑتی تھی۔ آنکھوں کے جلن نے سرطان کے مانند پورے جسم کا احاطہ کیا تھا۔ دھیرے، دھیرے آہستہ، آہستہ جوں، جوں وہ اس کی خاطر، اس کی فکر میں ایک، ایک جملہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ ویسے، ویسے وہ سستی جا رہی تھی۔

”جواب چھوڑ دو خولہ.....! میں یہ تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یوں دیکھوں؟“ اور وہ بے اختیار، بے ساختہ اک مرتبہ پیش منکر اہٹ منکرائی۔

”نہیں جہانگیر.....! اب تو جواب میرے لیے مسئلہ ہی نہیں رہی، میں عادی ہو چکی ہوں، یہ اب میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے زندگی کا کوئی دوسرا معمول..... جیسے..... جیسے تین وقت کا کھانا..... مجھے اب فرق نہیں پڑتا اور رہ گئی چھٹیاں لینے کی بات..... تو لے لوں گی آف..... آخر لپٹا ہی ہے ناں اور اس تھکاوٹ کا کیا ہے..... چار دن کی بات ہے، دن گزر جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ اسی توتلی منکر اہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے براہ راست چپکس جھپکے بنا۔

”شیور.....؟“ جہانگیر نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

”شیور.....!“ اس کے چہرے پر طنز یہ سے تاثرات ابھرے اور انہی تاثرات کے ساتھ اس نے جہانگیر کا

ہاتھ چپتہ پٹا تھا۔

”اچھا! ابھی تم بچے نہیں جاؤ گی..... میں تمہارے لیے اچھی سی چائے کا کھہہ کراتا ہوں اور میرے آنے تک تم یہاں سے بلو گی تک بھی نہیں..... چاہے کوئی جتنی بھی آوازیں دیتا رہے، اوکے؟“ وہ پیار سے کہہ رہا تھا اور اک ان دیکھا، نظر میں نہ آنے والا پچھلا خولہ کے جسم پر نمودار ہوا تھا۔ اک اور تکلیف کی لہر..... اس نے مسکرانے کا تکلف کیا اور اثبات میں سر ہلایا۔

”ہلنا نہیں.....“ اسے ایک بار پھر سے وارن کیا گیا تھا۔ اور خولہ تپتے وجود اور اسی پُرپش مسکراہٹ کے ساتھ اس کی پشت کو دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو..... تنہائی کا فائدہ اٹھا کر ایک دم نمودار ہوئے تھے۔

”ہونہ.....!“ وہ خود پر ہنسی۔

”تو جہانگیر اعجاز، تو جب تمہاری مرضی ہو گی جیسے تم چاہو گے۔ جب تمہیں اچھا لگے اور جب تمہیں برا..... تو تم ویسے ویسے ہی مجھ سے محبت کرو گے میری پروا کرو گے..... ٹھیک! تو پھر میری مرضی.....؟ میری منشا؟ میری زندگی اور اس کی خواہشات؟ وہ کیا ہویں.....؟ سارے اختیار تمہارے..... اور خواہشات بھی کیا تمہاری؟ اچھا! تو محبت اسے کہتے ہیں اور پھر اس کا نام ہے، پہلی دفعہ ذائقہ چمکا ہے اور زبان کہتی ہے کہ اللہ نہ کرے کہ دوبارہ یہ ذائقہ نصیب ہو..... ٹھیک ہے، جب تمہارا دل چاہا، تم نے اپنی زندگی میں مجھ کو جگہ دی اور اب جب میرا دل مرضی ہو گا تو تب میں اپنے دل میں تم کو جگہ دوں گی..... یوں ہے تو یوں ہی سہی..... تمہاری محبت اور برادریوں ہی اہم ہیں اب میرے لیے، وہ یوں کہ مجھے نہ صرف ہیروں پر کھڑا ہونا آ گیا ہے بلکہ میں نے تو دوڑنا بھی سیکھ لیا ہے جہانگیر.....! اور تم..... تم تو کہیں پیچھے ہی رہ گئے ہو..... بہت پیچھے..... میری زندگی میں تو بس اک خواہش بچی ہے، شخص اک ہی خواہش..... میری اولاد اور اسی خواہش کے واسطے میں نے اپنا آپ وقت کے ہیروں تلے رکھ چھوڑا..... کہ آؤ اور لمحہ لمحہ مجھے روندتے چلے جاؤ..... چنانچہ محبت کہتے کے ہیں..... اگر اسے تو بڑی ہی کڑی شے ہے یہ.....“

”چائے.....“ اس کے بدن کو گرم، گرم لہروں کی صورت ڈھانچتی سوچوں کا تانا اس آواز سے ٹوٹا تھا۔ اس نے چونکے بنابے تاثر نظروں سے جہانگیر کو دیکھا اور چائے کی پیالی پکڑی تھی۔ جہانگیر کچھ کہہ رہا تھا..... کیا؟ وہ بھلا کیوں سنتی..... ہاں..... کیوں؟

”عورت بڑی سخت چیز ہوتی ہے، پتھر ہے پتھر..... دل کا دروازہ نہیں کھولتی، چاہتی ہے کہ اسے ویسے چاہا جائے جیسے کہ وہ چاہے جانا پسند کرتی ہے، جس مرضی سے اور گریوں نہ ہو تو سارے دروازے بند، قفل ڈال کر چھوڑتی ہے یہ، لاکھ سر جیتنے رہو نہیں کھولنا تو بس نہیں کھولنا..... موسم ہونا کہاں آتا ہے اسے..... اس کے برعکس مرد کے دل میں گنجائش کا اوہ زیادہ ہوتا ہے۔ وہ جیسے تیسے ہی سہی محبت ہونہ ہو سوتا تھا رہنے والی عورت کے لیے گنجائش نکال ہی لیتا ہے، گنجائش یوں اس کے دل میں موجود رہتی ہے جیسے کہ دھڑکن..... اور عورت..... سمجھوتے کے نام پر ساری زندگی گزار دے گی، خالی رہنا پسند کر لے گی مگر محبت..... من مرضی سے ہی کرے گی۔

☆☆☆

”ابو.....“ وہ یک دم بوکھلائی سی آئی تھی۔

”یا اللہ خبر کیا ہوا خولہ!“ ابواس سے زیادہ حواس باختہ ہوئے۔

”نہیں، نہیں سب ٹھیک ہے ابو، وہ میں آپ کو یاد کروانے آئی تھی کہ آج مرنے کے.....“ اسے یک دم یاد آ رہا

تھا اور وہ بھاگی، بھاگی ابو کے پاس آئی تھی۔

”ہاں، ہاں.....! یاد ہے مجھے، آج فلاٹ تھی ناں اس کی۔“

”تو.....! تو ملنے نہیں جانا کیا؟“

”سماں کرتی ہو خولہ.....! ابھی تو بچہ آیا ہوگا.....! اسے تھوڑا آرام تو کرنے دو..... کل چلیں گے ہم لوگ.....“

”تو پھر فون پہ ہی مہ جیس سے پوچھ لوں؟“

”کیا پوچھوں گی؟“

”خیریت ہی پوچھنی ہے ابو.....! وہ لوگ یہ نہ سوچیں کہ ہم نے پوچھا تھا کہ نہیں.....“

”ہاں، ٹھیک ہے، فون کر لو مناسب رہے گا۔“ ان کے جواب دیتے ہی وہ مزنہ کے کمرے کی طرف مڑی

تھی۔ اپنا سیل فون اس نے مزنہ کے پاس ہی رکھ چھوڑا تھا۔ درنہ اتنی مصروفیات میں وہ تو کب کا سیل کم کر چکی ہوتی..... مزنہ سے سیل فون لے کر اس نے کال ملائی تھی۔ مہ جیس کے نمبر پر..... دوسری طرف تیل جا رہی تھی مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک ٹرائی کرنے کے بعد اس نے کوشش یہ سوچ کر ترک کر دی کہ مہ جیس مصروف ہوگی اور پھر ایک ٹیکسٹ میسج بھیج دیا تھا۔

”بھائی خیریت سے پہنچ گئے ناں؟“ اور مزنہ کو بتا کر، سیل فون اسی کے حوالے کرتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔

بعد میں مزنہ نے اسے بتایا تھا کہ کافی دیر بعد مہ جیس کا ایک لفظی جواب آیا تھا۔ ”ہاں.....“

☆☆☆

چائے کاگ پکڑے وہ کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں تھی کہ جہاں بیٹھ کر وہ سکون سے چائے پی سکے..... پینے تو وہ چائے ہی آئی تھی لیکن..... سوچوں کے سفر پہ چل نکلی تھی۔ دور سے دیکھو تو یوں لگتا تھا کہ چائے کاگ دونوں ہاتھ میں پکڑے وہ عہد رفتہ کا کوئی سنگی مجسمہ ہو۔

”آپی.....!“ اور وہ بری طرح ڈری تھی۔ رنگت یک دم اتنی چلی پڑی کہ مزنہ حیران ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ اب اس کے ہاتھ سے چائے کاگ پکڑ کر مائدہ پر رکھتے ہوئے بولی اور اپنے دوپٹے سے اس کے ہاتھ پر چھلک جانے والی چائے صاف کرنے لگی۔ خولہ کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرے گئے تھے۔

”آپی.....؟“ مزنہ ان آنسوؤں کو دیکھ کر اور بھی حیران ہوئی تھی۔ اور خولہ نہ چاہتے ہوئے بھی..... قابو نہ رکھ سکی تھی۔ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ روئے جا رہی تھی اور مزنہ حق وق پریشان کہ محض چائے چھلک جانے سے بھی کوئی یوں روتا ہے، وہ ہنسی تو نہ تھی۔

”آپی کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں.....؟“

”تو پھر یوں رو رہی کیوں ہیں؟“

”بس دل گھبرا رہا تھا۔“

”اور دل گھبرانے کی وجہ.....؟“ مزنہ چڑی تھی۔

”کچھ نہیں.....“ اب وہ مزنہ کو اپنی کیفیت کیا سمجھاتی۔

”تم کیوں آئی تھیں؟“ خود پہ اب وہ قابو پا چکی تھی۔

”ابو بار ہے ہیں کہہ رہے ہیں کہ میری سسرال جانا ہے۔“ اور مزنہ بولتے ہوئے ابھی تک حیرت بھری

نظروں کے ساتھ اسے دیکھتی جاتی کہ اسے آخر ہوا کیا تھا؟

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

”اچھا آتی ہوں.....“ اس نے اتنا ہی کہا۔

☆☆☆

دل گھبرائے تو گھبرانے کی وجہ بھی تو ہو..... جو یہ بے وجہ ہی گھبرانے، رو نے یہ آواہ ہو تو کوئی کیا کرے؟ کیا ہے یہ..... وہ تیار تو ہو گئی مگر ابھی تک دل گھبرا رہا تھا۔ جب تیار ہو کر آئی تو ابو اور جہانگیر بھی تیار ہی کھڑے تھے۔

”اطلاع دی تھی مہ جیس کو؟“ احمد صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں..... یاد نہیں رہا ابو.....“ وہ شرمندہ سی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی پرس سے سیل فون نکال کر.....
”جیس کا نمبر ملانے لگی۔ جہانگیر اور احمد صاحب دونوں ہی اب اس کے منتظر تھے۔ اس نے دو تین بار ٹرائے کیا مگر فون نہیں اٹھایا چار ہاتھ۔

”فون ریسیو نہیں کر رہی ہے مہ جیس.....“ اس نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا۔
”اچھا چلو کوئی بات نہیں..... مصروف ہو گئی اپنے ہی گھر والی بات ہے اب تو..... چلو جہانگیر آگے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

احمد صاحب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولے تھے اور خولہ نے بھی ان کی پیروی کی تھی۔

☆☆☆

گیت کھلا ہوا تھا۔ اتنی حیرانی کی بات نہیں تھی کہ چند دن بعد ہی مہندی کا فنکشن تھا۔ مہمانوں کا آنا جانا لگا ہوا ہوگا۔ وہ آرام سے اندر آئے، گاڑی باہر پارک کی تھی لیکن لاؤنچ کا داخلی دروازہ داخل ہونے سے پہلے تاک کیا گیا تھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار..... اور چوتھی بار ان کے درمیان حیران نظروں کا تبادلہ ہوا تھا۔ وہ سب راک لئے کے لیے وہاں ساکت کھڑے رہے کہ اب کریں تو کریں کیا؟
”خولہ تم جاؤ اندر.....“ جہانگیر نے اس سے کہا تھا۔

”میں.....!“ اور اس کا بے وجہ گھبرانے والا دل اک بار پھر گھبرایا۔

”ہاں تم! اب ہم دونوں مردیوں بنا اطلاع کے اندر جاتے اچھے تو نہیں لگتے ناں..... تم جاؤ۔“ اور وہ جہانگیر کے کہنے پر تذبذب کے سے انداز میں آگے بڑھی تھی، لاؤنچ خالی تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ خولہ کو حیرت ہوئی، وہ ہنگامہ، رونق بھی عقلاً نظر آتی تھی۔ جو شادی والے گھر کا خاصہ ہوتی ہے، عجیب سائیں، سائیں کرتا ماحول تھا۔

”مہ جیس..... آئی!“ وہ آواز دیتی آگے بڑھ رہی تھی اور جواب..... خاموشی..... وہ تھوڑا سا اور آگے بڑھی تو یک دم اسے ایک جانب سے مہ جیس آتی دکھائی دی۔

”مہ جیس.....!“ خولہ نے ترنٹ آواز دی تھی۔ یوں جیسے یہ کوئی بھوت بٹکا تھا اور مہ جیس کا ظہور بھی چند سیکنڈز کا تھا۔ ورنہ وہ پھر کہیں طول کرنے والی تھی۔

”آپ؟“ مہ جیس کو اس کی موجودگی پیٹ میں بڑے گھونے جیسی لگی تھی۔ وہ بھی اچانک اور لاعلمی میں پڑنے والا گھونسا اس کے اس طرح کے رد عمل پر خولہ عجب سی خجالت کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کا دل اک بار پھر سے بے وجہ ہی گھبرایا تھا۔

”آپ کب آئیں؟“ مہ جیس کو جیسے ہوش آیا تھا۔

”ابھی..... ذرا سی دیر پہلے ابو اور جہانگیر بھی ہیں ساتھ۔“ خولہ نے ایک ہی سانس میں بات مکمل کی ایسے جیسے اس کے بعد بولنے پر پابندی لگنے والی تھی اور یہ سن کر بوکھلائی ہوئی مہ جیس مزید بوکھلائی تھی۔

”آئی ایم سوری..... میں نے فون کیا تھا مگر آپ نے ریسیو نہیں کیا تو ہم بنا اطلاع کے ہی آ گئے۔“

”ہم کوئی بات نہیں..... آپ جانتے ہیں..... انکل اور جہانگیر بھائی کو بھی بلائیں..... بلکہ میں بلاتی ہوں۔“ وہ بولی نہیں، بوکھلائی تھی۔ اسی حواس باختگی کے عالم میں وہ ان دونوں کو بلانے لگی اور ان کو اندر بٹھا کر وہ امی کو بلانے چلی گئی تھی۔ اس کے انداز اتنے عجیب تھے کہ وہ بیٹوں ایک دوسرے کو حیرت بھری سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر خود کو روک نہیں پائے تھے۔ اور جب مہ جہیں کی امی آئیں تو وہ بھی بوکھلائی ہوئی تھیں لیکن مہ جہیں سے ذرا کم.....

”مہ بھائی سے ملنے آئے تھے۔ ان کو بلا دیں پلیز.....!“ جب چائے کے بعد بھی بھائی کے آثار نظر نہ آئے تو خولہ کو کہنا ہی پڑا۔

”ہاں، میں بلاتی ہوں۔“ مہ جہیں انھی ہی تھی کہ ایک طرف سے آواز ابھری۔

”السلام علیکم.....“ اور سب یک دم اس آواز کی سمت متوجہ ہوئے تھے۔ وہ دروازے کے پتوں بچ کھڑا تھا۔ اس کے سلام کا جواب ان لوگوں کے حلق سے برآمد نہ ہو سکا تھا۔ وہ اندر ہی کہیں گھٹ سا گیا تھا۔ اور وہ سنجیدہ تاثرات کے ساتھ کھڑا انہی لوگوں کی طرف متوجہ تھا۔ شاک وہاں موجود تین لوگوں کے چہرے پر جیسے درج ہو کر رہ گیا تھا۔ بے یقینی رقم بھی ان کی آنکھوں میں اور خولہ..... وہ اک لمحے کے لیے حیران ہوئی تھی اور دوسرے ہی لمحے اس کا دل اتنے دنوں کی تکلیف اور بے سکونی کے بعد..... عین اسی لمحے میں حالت سکون میں آیا تھا۔

”اچھا.....“ تو یہ تھی وہ ”وجہ“ جو الہام بن، بن کر مجھ پر ٹوٹی رہی۔“ اس پر جیسے انکشاف ہوا تھا اور اس نے بے اختیار تھک کر اک گہری سانس بھری تھی۔

اور وہ..... وہ اب اندر ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔

”خوشی کو اگر حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی وہ بس مزہ نہ احمد ہوتی۔“

اور یہی... خوشی گرہا ہوتی تو ایسی ہوا ہوتی کہ جہاں، جہاں سے گزرتی وجود پتھر کر چھوڑتی۔ کسی کام کا نہ رہنے دیتی اور وہاں صرف خوشی تو نہ تھی وہاں دیرانی بھی تھی..... موت کی سی دیرانی..... سزاوند کی صورت چھپتی ہوئی..... یہ شدید تھا..... بدتر زحکا تھا۔

عزیز، مزہ نہ کاسگتیر..... وہ اک مدد بچے کے ہمراہ واپس آیا تھا۔ ”قانونی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کی گئی پیپر میرج کا تخذ.....“ اس بچے کے بارے میں اس نے اپنے گھر والوں کو بھی لاعلم رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کا خون تھا۔ وہ کیسے اسے چھوڑ سکتا تھا اور اب جبکہ وہ یہاں، پاکستان میں شادی کر رہا تھا تو اس کی بیوی کو ہی یہ بچہ سنبھالنا تھا..... یہ طے تھا۔

”تم نے ہمیں لاعلم کیوں رکھا؟“ احمد صاحب نے بے حد بے بسی سے سوال کیا۔

”میں بتانا چاہتا تھا لیکن جرات نہیں کر پایا۔“ عزیز کا سر اٹھا ہوا نہیں ہوتا چاہیے تھا۔ اور وہ جھکا ہوا ہی تھا۔

”اور اب جو جرات کی ہے وہ؟ یہ ظلم ہے.....“ احمد صاحب کو تاؤ آیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“

”تمہاری معذرت کا اب میں کیا کروں عزیز؟ اب کیا؟“ لہجہ مزید سخت ہوا۔

”تمہیں شرم آنی چاہیے، تم جانتے بھی ہو تم نے کیا کیا ہے؟“ وہ جہانگیر تھا جو کہ بھڑک کر بولا تھا۔ احمد صاحب نے یک دم اس کے بازو پر دباؤ ڈال کر اسے روکا تھا۔ مہ جہیں اور اس کی امی در رہی تھیں۔ اور ان کا روٹنا بتاتا تھا کہ وہ بھی لاعلم تھیں۔ جہانگیر نے اک غضب سے پُر نگاہ عزیز پر ڈالی اور پھر وہ وہاں رکا نہ تھا، وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ خولہ نے اک گہری سانس بھر کر عزیز کو دیکھا اور اک مزید تھکا دینے والی تھکن اس کے وجود میں اتری تھی۔ مزہ نہ تو مرجائے گی..... اور اس کے ذہن میں یہ جملہ تھوڑے کی طرح ضرب لگاتا تھا۔

اور مزہ..... وہ واقعی سر ہنسی گئی تھی..... لمحوں میں دفن ہوئی تھی۔

”اور اگر نموشی کو حکم ہوتا کہ وہ محسوس ہونے کے بجائے دکھائی دے تو وہ اپنا آپ دکھلانے کے واسطے کچھ اور نہ ہوتی..... وہ بس مزہ احمد ہوتی۔“

وہ جب وہاں سے واپس لوٹے تو کوئی بھی وہاں ان تینوں میں سے کوئی بھی کم از کم گھر تو جانا نہیں چاہتا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ فی الوقت گھر کے راستے کے علاوہ اور کوئی رستہ بھی تو نہیں تھا۔ احمد صاحب گھر آ کر خود پر قابو نہ رکھ سکے تھے اور وہ مزہ کو نگلنے سے لگا کر آواز کے ساتھ رونے لگے۔ مزہ حواس باختہ ہوئی۔ فرخندہ کے بھی چھکے چھوٹے تھے کہ اچھے بھلے تو گئے تھے..... اب کیا ہوا اور جب معلوم ہوا کہ کیا ہوا تو..... تو اک موت کا سا سنا..... اک دھماکے کے ساتھ اس گھر میں پھیل گیا تھا۔ مزہ اتنی چپ ہو گئی اتنی ساکت کہ لگتا تھا چھوٹے تو دھڑام سے گرے گی، زمیں بوس ہو جائے گی، اسے یک دم، کھڑے، کھڑے سیکنڈز میں دیمک چاٹ گئی تھی۔

”مزہ.....!“ خولہ نے ڈرتے، ڈرتے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے میکا کی انداز میں کندھے پہ دھرے ہاتھ کو دیکھا اور پھر اسی انداز میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی۔ خولہ کا ہاتھ پہلو میں جا گرا..... پھو پھو اور آواز دور رہی تھیں اور وہ سر پکڑے، پکڑے صوفے پر ڈھس گئی تھی۔

جو تکلیف ہوتی ہے ناں..... چاہے کوئی کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو..... کتنا ہی جان سے بڑھ کر عزیز کیوں نہ ہو..... پھر بھی..... پھر بھی آپ اس بات پر قدرت نہیں رکھتے کہ اس کے جسم سے تکلیف کشید کے خود کو اس تکلیف کے سامنے پیش کریں۔ نہیں، آپ ایسا نہیں کر سکتے..... یہ جس کی تکلیف، جس کا دکھ ہوتا ہے ناں یہ اسی کو سہنا پڑتا ہے۔ اپنے دکھ خود ہی سہارنے پڑتے ہیں۔ وہ مزہ کی تکلیف کا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ تسلی کے دو بول بھی اسے جرم محسوس ہوتے تھے اور وہ سب اپنی، اپنی جگہ مر چکے تھے، وہ خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتے تھے کہ ایک دوسرے کا کندھا بھی تھپتھپا سکیں وہ سب اپنی، اپنی جگہ غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور باوجود اس سب کے وہ مزہ کو اس دکھ، اس تکلیف سے بچانہ سکے تھے۔

وہ مزہ کے کمرے کے باہر کھڑی رہی، پیر چوکھٹ پار کرنے کی جسارت نہ کرتے تھے۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتی تھی، اسے تسلی دینا چاہتی تھی، ہر ذمہ پر شفا والا ہاتھ رکھنا چاہتی تھی مگر..... اپنی ہمت کو ختم پانی تھی، وہ تھک چکی تھی۔ ہاں..... وہ تھک چکی تھی..... مزہ سے بھی زیادہ..... اپنی زندگی کی پریشانیوں، مزہ کی پریشانی، الو کی پریشانی اور نہ جانے کون، کون سی پریشانی..... اور وہ اک گہری سانس بھر کر پلٹ آئی۔ پورا گھر سکوت میں ڈوبا تھا، اندھیرے کا مسکن بنا ہوا تھا، آج تو کسی کو محسن کی حق جلانی بھی یاد نہ رہی تھی۔ کیسی نحوست پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا دل گھبرا رہا اور اس نے سوچ بورد نہ کیا تھا، مار، مار کر سارے گھر کی بتیاں جلا دیں، سارا گھر روشنی میں نہا گیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا..... اس نے من لاؤنچ کے وسط میں کھڑے ہو کر اس چمکتی سفید روشنی کو دیکھا اور بس دیکھنے کی دیر تھی، روشنی اسے چھینے لگی۔ وہ بھی بری طرح سے..... وہ صحن سے نکل کر آئی اور ساری بتیاں پھر سے بجھا دیں، اندھیرا منحوس لگتا تھا تو روشنی جسم کھوٹے لگتی تھی..... کیسی حالت تھی یہ.....

اس نے آسمان کی طرف اک شکوہ بھری نگاہ کی اور پھر جھکالی۔ مرے، مرے قدموں کے ساتھ وہ جھولے پر جانیٹھی..... اس کے بیٹھنے سے جھولے کی حالت سکون میں ارتعاش آیا تھا اور وہ جب بے بسی کے عالم میں سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہی۔ باہر صحن میں وہ بے بسی کی تنہی بنی بیٹھی تھی اندر ایک کمرے میں جہانگیر، ماں کو ہائی بلڈ پریشر کی دوا کھلا رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں احمد صاحب نیند کی گولیوں کی تلاش میں تھے اور ان کے ہاتھ میں نیند کی گولیوں کا پتا موجود تھا مگر پھر بھی وہ اسے تلاشتے تھے اور مزہ..... اپنے کمرے میں دروازے کے بند پٹ کے ساتھ ٹپک

اس حالت میں کسی کی جیسے بیان کرنے کے واسطے لفظ ملتے نہ تھے۔ اس کی ٹانگیں سیدھی تھیں اور وہ اپنے پانخنوں سے، اپنے ہاتھوں پر نقش مہندی کی سرخی کو کھرچتی تھی۔ وہ روتی نہ تھی..... ہائے تک نہ کرتی تھی واویلا نہ مچاتی تھی۔ بجلا وہ کیسے روئے..... کیسے ہائے کرے، کیسے چائے واویلا..... وہ تو مجسم خموشی تھی..... مجسم خموشی..... یوں جیسے ہر اک گزرتے لمحے کے ساتھ وہ خموشی کی ایک نئی دبیز تہ میں لپکتی جا رہی تھی۔ دفن ہوئی جا رہی تھی۔ یوں جیسے اب کے بعد کبھی نہ اٹھے گی، کبھی نہ بولے گی، کبھی نہیں..... اور اس کا ہاتھ سرخ، سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتا چلا جاتا تھا۔ کھرچتا ہی چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

سورج نے تو چڑھنا ہی تھا کہ حکم تھا دن اور رات کے بدلنے کا۔ اور سورج حکم کیسے ٹالے..... کہ وہ پابند ہے، زمین والوں پہ جتنی بھی بڑی آفت ٹوٹے، کیسی بھی مصیبت آئے، دن کو رات اور رات کو دن میں بدلنا ہی ہے اور اسی تغیر میں ابن آدم کے لیے شفا ہے..... جان لو کہ اسی میں شفا ہے، مہرم کا مجید چھپا ہے۔ مؤذن کی آواز نے خولہ کے دل پر چوٹ لگائی تھی۔ اس کا دل بھرا آیا۔ وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر ابھی اور جب لاؤنج میں داخل ہوئی تو وہاں اتنا سکوت، اتنی خموشی، اتنی ویرانی تھی کہ اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ زور سے چلائے..... ایسے کہ یہ سکوت، یہ خموشی، یہ ویرانی مٹ جائے۔

”ابو، پچھو.....“ اس نے بے اختیار آوازیں دیں۔ کمروں کے دروازے کھٹکھٹائے۔ نماز کے بہانے سب کو اٹھاتی رہی اور وہاں سویا ہی کون تھا، سوائے احمد صاحب کے کہ جن کو بالآخر معلوم ہوئی گیا تھا کہ ہاتھ میں پکڑا ہوا ہی مطلوبہ تھا..... اور جب اس کا ہاتھ مزینہ کے کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹانے لگا تو پھر سے ساکت ہو گیا۔ اس نے بے ساختہ ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کے گلے سے کچھ نیچے اترتا محسوس ہوا، کسی ہمت چاہے تھی ناں لکڑی کے اس بے جان سے پٹ کو دھکیلنے کے واسطے..... کیسی؟ خولہ کی آنکھ نم ہوئی تھیں اور بالآخر اس نے آنکھوں سے پٹ کو دھکیلا۔ قدم اندر رکھا اور لا شعوری طور پر سامنے بیڈ پر دیکھا..... اور جیسے ہی دیکھا تو شعور نے اطلاع پہنچائی کہ اس کی بائیں طرف قدموں کے پاس کچھ تھا۔

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو..... تو..... مزینہ ابھی تک سرخ مہندی کے نقش کو کھرچتی تھی۔

”مزینہ.....“ اس کے لب بے آواز رہے اور دل دھک کر کے رہ گیا۔

”مزینہ.....“ اب کہ وہ بولتی ہوئی نیچے بیٹھی تھی۔ بے اختیار آپے سے باہر ہو کر اس نے مزینہ کا ہاتھ ہٹایا تو اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھنا پڑا۔ مزینہ کی انگلی کے تھکنے تلے..... زخم بن چکا تھا اور خون ایک خراش کی صورت میں نظر آتا تھا۔ واضح نہ ہوتا تھا کہ مہندی کا رنگ کون سا تھا اور..... وہ چند لمحے ضبط کی بہترین کوشش کرتی رہی اور پھر اس نے ایک دم مزینہ کو سینے سے لگا لیا تھا۔ اور وہ..... اب رو رہی تھی..... وہ مزینہ کو سختی سے سینے میں بھینچے ہوئے تھی اور مزینہ کے دونوں بازو دائیں بائیں ڈھلکے ہوئے تھے یوں جیسے اسے اب فرق نہ پڑتا ہو۔ فرق محسوس نہ ہوتا..... اور خولہ کو اختیار نہ رہا..... وہ اپنی آواز کو ادھونچا ہونے سے روک نہ سکی۔ اس کی ہچکچاہٹ بندھ گئیں پر مزینہ بے اثر دکھتی تھی۔

”خولہ، خولہ کیا کر رہی ہو؟“ وہ جہانگیر تھا جس نے سب سے پہلے آواز کی سمت کا تعین کیا تھا، پر خولہ کو ضبط کہاں.....

”خولہ.....“ اس نے زبردستی ذرا سے غصے کے ساتھ خولہ کو مزینہ سے الگ کیا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا.....“ جہانگیر برہم ہوا، خولہ کی آواز رگڑنے کے طور پر ذرا آہستہ ہوئی تھی۔

”کیا چاہتی ہو کہ ماموں اسپتال جا پڑیں۔ ابھی تو انہیں تمہارا سہارا ہے اور اگر تم یوں ری ایکٹ کرو گی تو ان

کا کیا حال ہوگا۔“ جہانگیر کے کہنے کی دیر بھی اس کی آواز خود بخود بتی چلی گئی۔ وہ اب منہ پر ہاتھ رکھے، اکڑوں بیٹھی، ہم آنکھوں سے مزنہ کو دیکھ رہی تھی۔

”خولہ!“ جہانگیر نے اس کا کندھا ہلایا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم جاؤ..... میں آتی ہوں جہانگیر۔“ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”شیور؟“ اور خولہ نے جواباً گردن ہلائی۔

جہانگیر کے جاتے ہی اس نے مزنہ کو اٹھایا۔ بیڈ پر بٹھایا اس کے لیے دودھ کا گلاس لائی اور اس ایک گلاس... مزنہ کو پلانے کے لیے اسے کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ مزنہ نے بڑے آرام سے دودھ پی لیا تھا۔ اس سے اگلا کام خولہ نے وہی کیا تھا، جو ایسی کسی بھی صورت حال میں کیا جاتا چاہیے..... اس نے مزنہ کو نیند کی دوا کھلائی تھی۔ خولہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی..... ہٹا پلکیں جھپکے..... ساکت یوں جیسے آنکھ جھپکے گی تو کچھ ہو جائے گا، یہاں تک کہ مزنہ کی پلکیں بھاری ہونے لگیں اور ایک دوسرے سے جڑنے لگیں۔ اور پھر وہ سو گئی تھی، خولہ کے گال پر اک آنسو لڑھک آیا تھا۔

”اب..... اب کیا ہوگا؟ کیا.....؟ مزنہ کی شادی ہوگی یا.....“ اور اس یا کے بعد اس کے دل پر ہاتھ پڑتا تھا۔

اور جان جیسے کھل، نکل جاتی تھی۔ یہ سوچ بھی تکلیف دیتی تھی اور اگر ایسا ہو گیا تو.....؟ تو.....؟ تکلیف کا کوئی انت نہ ہوگا، کوئی انت نہ ہوگا۔

☆☆☆

وہ محبت تھی اور اس کو گرسارے گھر سے لڑکر، بھڑک سب کی مخالفت مول لے کر وہ شادی کرنا پڑتی تو وہ کرتا۔ اس پر کسی قسم کا دباؤ کارگر ثابت نہ ہو سکا تھا۔ کوئی جیڈ باتی دھمکی کام نہ دکھا سکی تھی..... باپ کے عاق کر دینے کے باوجود وہ اپنے ارادے سے ایک انچ بھی نہ ہٹا تھا۔ محبت تھی کوئی مذاق تھوڑی تھا اور گھر والے جس وجہ کو بنایا کر اس شادی کے مخالف ہوئے تھے وہ اس وجہ، اس بنیاد کو زنی جہالت گردانتا..... ایک بکواس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا، بشعور آدمی تھا اور اوپر سے فطری ایک آئینہ کھینی میں ملازم تھا۔ وہ ایسی باتوں کی پروا کرتا تو کرتا ہی کیوں..... وہ وجہ، وہ بات اس کے لیے قابل گرفت نہ تھی..... باپ عاق کرتا ہے تو کرتا رہے..... وہ کوئی باپ کا دیا کھاتا تھا؟ اچھی خاصی تنخواہ تھی اس کی اور اسی کے مل پودہ اکڑتا تھا۔ پر اس کے ماں، باپ..... ہاں ان کے لیے وجہ بہت بڑی ہی تھی جو اس کے لیے معمولی سی اہمیت بھی نہ رہتی تھی۔ ذہنیت بدلنے کے لیے اک جزیریشن چاہیے تھی۔

”اک اس کے علاوہ جس لڑکی کے لیے..... جس لڑکی کے لیے تو کہے گا، میں بیاہ لاؤ گی لیکن اس رزیل کا خیال دل سے نکال دے۔“

”ماں جی! رزیل ہے اسی لیے تو دل سے نکلتی نہیں.....“ وہ ہنس کر کہتا اور ماں جی کے پیر دبانے میں شدت آئی تھی۔ ماں جی وہ ہی پیر اس کے ہاتھوں سے نکال کر زور کی ایک لات رسید کرتیں..... مگر وہ جوان تو اتنا خون..... ایک ذرا سا جھنکا کھاتا اور پھر وہ ماں کے پیر کو مضبوطی سے پکڑ لیتا اتنی مضبوطی سے کہ ماں جی چاہنے کے باوجود اسے لات رسید نہ کر سکتی تھیں۔ وہ اور ہنستا..... ماں کو چپ چڑھتی تو وہ بجائے اسے ڈانٹنے کے اس کی محبوبہ کے دائیں کندھے والے فرشتے کو ایک ٹوکرو دیتی تھیں۔ وہ ان کو سنوں، طعنوں اور بددعاؤں پہ ہنس دیتا۔

”ان میں سے ایک بھی..... ماں جی ایک بھی طعنہ، کو سنایا بددعا اسے لگنے والی نہیں ہے، مظلوم سستی ہے ماں جی وہ..... کچھ تو خیال کریں۔“ اس کی ساند لیتا وہ یقین سے کہتا تو ماں کو اور غصہ چڑھتا..... اس کے ہاتھ زور، زور سے پیر دباتے رہتے اور ماں کی زبان تیز، تیز چلتی ہوئی بددعا میں فائر کرنے والی ایک مشین بن جاتی۔

اس کی بہن بیخ پاہو کر باہر نکلتی اور ناک کے نیچے پھیلا کر بے حد برہم ہو کر کہتی۔
 وہ سنتا اور ہنس دیتا۔ اور اس کی تو عادت تھی ہنسنے والی بات پہ ہنسنے۔ اور رونے والی بات پر بھی ہنسنے۔ وہ اکثر سوچتا کہ یہ ماں، باپ بھی کیا ہوتے ہیں۔ اپنے منہ کا نوالہ کھلا دیتے ہیں، اپنی ہڈیوں کو گھسا دیتے ہیں، جان مار دیتے ہیں اور گر ضرورت پڑے تو وار بھی دیتے ہیں۔ قدم، قدم انگلی پکڑ کر چلنا سکھاتے ہیں، بچوں کو سنانے کے لیے اپنی نیندیں حرام کر لیتے ہیں، ایک بار بلاؤں دفعہ ”جی“ کرتے ہیں۔ لیکن اولاد کو اپنی مرضی سے ایک فیصلہ نہیں کرنے دیتے۔ پسند کی، کیم، پسند کی آئس کریم فلیور، پسند کے کپڑے، پسند کے جوتے، پسند کا اسکول بیگ، پسند کی ٹائی، شرٹ، جینز، سب کچھ مگر پسند کی ”زندگی“۔ نہیں، کیوں؟ کیوں؟ ٹھیک ہے ان کا تجربہ ہے، ان کا مشاہدہ ہے مگر ضروری تو نہیں کہ ہر اولاد غلط فیصلہ ہی کرے اور بالفرض کر بھی لے تو کیا؟ کیا انہوں نے زندگی میں اپنی جوانی میں سارے فیصلے ٹھیک کیے تھے؟ کیا انہوں نے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا تھا؟ یہ تو پھر محبت نہ ہوئی۔۔۔۔۔ جھکرائی ہوئی ناں، ہاں بھی ہم نے تمہیں پالا، جوان کیا، اک عمر کھپائی تم پر۔۔۔۔۔ چلو اب احسان اتارو، بدلہ چکاؤ، تاوان بھرو۔ وہ سر جھٹک دیتا اور اس کا ارادہ کچھ اور مضبوط ہو جاتا۔

”شادی کروں گا تو اسی سے اور وہ بھی آپ دونوں کی مرضی سے، رضامندی سے۔۔۔۔۔ بھگا کر لے جانے والا میں نہیں۔۔۔۔۔ میں مرد ہوں کوئی نام کی تو نہیں جو رات کے اندھیرے میں نقب لگاؤں۔“ تو یہ طے تھا۔۔۔۔۔ اسے اپنی پسند سے ہی شادی کرنا تھی اور وہ بھی ماں اور باپ کی رضامندی سے۔ فی زمانہ ایسا کبھی ہوا تو نہیں تو دیکھیے اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے بھلا کیا۔۔۔۔۔؟

☆☆☆

وہ قدیم طرز پہ بنا ایک جدید گھر تھا، جس کا لاؤنج گولا کی میں تھا، وہاں بہت سی، قطار کی صورت و پوار کی گولائی میں نصب آنسو کھڑکیاں تھیں۔ سورج کب کا چڑھ چکا تھا اور روشنی ان آنسو کھڑکیوں سے چھن، چھن کر اندر آ رہی تھی اور اس گول کرے کو روشن کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ جاتی سردی کے دن تھے اور اب وہ ایک چمکیلا گرم دن ثابت ہونے جا رہا تھا۔ سورج کی روشنی تو یہی اعلان کرتی تھی۔ لاؤنج و دھصول میں منقسم نظر آتا تھا ایک حصہ سٹنگ ایر یا تھا جبکہ دھصول میں تقسیم کرتے نیٹ کے پردوں کے پار ڈائننگ ٹیبل رکھی تھی۔ کھڑکیوں کے قریب۔۔۔۔۔ سورج کی تمازت سے ہلکی سی خشکی اب رخصت ہونے کے واسطے بالکل تیار تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچنے اس کی بیک سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر روشنی اک گرم سا احساس چھوڑ رہی تھی جو کہ فی الوقت بھلا محسوس ہوتا تھا۔ تمازت آنکھوں کو اک راحت کا احساس بخشتی تھی۔ اس گھر کا کچن آج روز تیز کے صبح کے معمول سے عاری تھا۔ پرائیوٹ کی انٹھی مہک، برتنوں کے کھینکنے کی اٹھانچ کی آواز ابنتی چائے کی خوشبو اور نہ ہی ایسی کوئی آواز۔۔۔۔۔

”ابو جی ناشتا کر لیں۔۔۔۔۔ پچھو آپ کے لیے دلایا بناؤں یا پھر جہاں گھر تم کیا لو گے؟ پراٹھا یا تو س۔۔۔۔۔؟“
 چولہا ٹھنڈا تھا اور ویرانی کو سورج کی روشنی بھی کم نہ کر پائی تھی۔

”خولہ۔۔۔۔۔!“ اس نے اپنے کندھے پر اک ہاتھ کی گری محسوس کی اور نرم سے لہجے میں اسے پکارا گیا تھا۔
 اس نے چونکے بنے۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولیں اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد نرمی تھی۔ اتنی کہ آج سے پہلے بھی نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ اس کے دیکھنے پر۔۔۔۔۔ اس کے کندھے کو تسلی سے تھپتھاتا، اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا تھا۔ خولہ اب اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں تیر چند لمبے اسے دیکھتا رہا۔ اور

پہر اک گہری سانس بھر کر اس نے زاویہ نگاہ بدلا اور باہر پھیلتی روشنی کو دیکھنے لگا۔
 ”اب کیا ہوگا جہانگیر.....؟“ اس کی آواز اتنی شکستہ، اتنی دکھ سے پر تھی کہ جہانگیر کو نظر پھیر کر اسے دیکھنا پڑا تھا۔
 ”ہم مزہ کی شادی وہاں نہیں کریں گے۔“ وہ توقف کے بعد مضبوط لہجے میں بولا تھا۔
 ”جہانگیر.....!“ اور خولہ کا ہاتھ دل پر جا پڑا اور وہ دشت زدہ و کشتی تھی۔ بے ساختہ اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیری تھی۔

”مگر جہانگیر یوں..... اچانک شادی سے چند روز قبل، اس طرح سے رشتہ ختم کرنا.....“ وہ بات نہیں کرتی تھی ہلکاتی تھی۔

”آف.....“ اس نے تکلیف سے آنکھیں بند کیں..... جہانگیر خوش رہا اور اسے دیکھتا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ خولہ بات مکمل کر لے۔

”زیانیں زہر اٹھیں گی جہانگیر..... کتنی ذلت، کتنی ہنسی ہوگی اور ابو، وہ..... وہ کیا کریں گے۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور طعنے کو کچھ کاٹا تھا۔

”خولہ.....!“ جہانگیر نے ذرا سا جھک کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور جب وہ خولہ، کہتا تھا تو پکار میں مضبوطی ٹھانیں مارتی تھی۔

”ہاں، میں مانتا ہوں، یہ ہوگا، یہ سب ہوگا شاید اس سے بھی بدتر ہو جتنا تم سوچ رہی ہو، مزہ کو ہو سکتا ہے اک لمبے عرصے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا پڑے لیکن اس سب کے باوجود میں دُہرا رہا ہوں، ہاں اس سب کے باوجود..... مزہ کی زندگی اتنی غیر اہم نہیں کہ اسے ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جائے جس میں جرأت نہ ہو اور اس شخص کے ساتھ زندگی اک آزمائش سے زیادہ اور کچھ نہ ہو۔ مزہ کا مزاج میں جانتا ہوں، وہ یہ نہیں کر سکے گی، اسے کپور ماڑن نہیں کرنا آتا خولہ..... وہ نباہ نہیں کر سکے گی تو کیوں اس کی زندگی کو داغدار کیا جائے..... یہ چند روز کی پریشانی ہے اور شادی کی صورت ساری عمر کا بمکھان..... تھوڑا سا حوصلہ..... زندگی کبھی اک نقطے پر نہیں رکتی خولہ، وقت جب بدلتا ہے تو مرہم ہو ہی جاتا ہے۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے، اتنی نرمی، اتنے خلوص سے کہہ رہا تھا کہ وہ جہانگیر نہ لگتا تھا، وہ کوئی اور دکھتا تھا۔ وہ حیرانی سے اسے دیکھتی رہی۔

”جہانگیر ٹھیک کہہ رہا ہے خولہ.....“ اپنی پشت پر اس آواز کو سن کر وہ چونکی..... چونکا تو جہانگیر بھی تھا۔ اس نے بے اختیار خولہ کے ہاتھ چھوڑے تھے اور خولہ بے اختیار ہو کر اٹھی تھی۔

”ابو.....“ اس کے لب بے آواز لیے اور وہ فوراً انہیں سہارا دینے کے واسطے اٹھی تھی۔ اس صبح کو وہ اتنے بوڑھے دکھتے تھے جیسے عمر کی آخری حد تک پہنچ چکے ہوں۔ خولہ نے آہستگی سے ان کا ہاتھ تھاما اور ڈانٹنگ ٹینل کی کرسی گھسیٹ کر انہیں بٹھایا تھا۔ چند لمحوں بعد فرخندہ بھی وہیں آچکی تھیں اور ان چاروں نفوس کے چہروں پر خوشی اپنا رقص پیش کر رہی تھی۔ وہ چاروں چہرے جیسے خوشی کے بیروں تلے تھے۔ ان کے چہرے جیسے خوشی کے لیے ایک اسٹیج بن گئے تھے۔

”میں مزہ کی شادی کبھی ایسے شخص سے نہیں کروں گا۔“ احمد صاحب اک لمبے وقفے کے بعد بولے تھے۔
 ”مگر بھائی صاحب.....!“ فرخندہ اپنے تحفظات بیان کرنے لگیں اور ان کے تحفظات بھی کم و بیش وہ ہی تھے جنہیں خولہ پہلے ہی دُہرا چکی تھی۔

وہ عورتیں تھیں سمجھوتا انہیں آسانوں سے دے کر اتارا جاتا ہے اور وہ مرد..... مضبوطی اور خطرناک فیصلے کرنا ان کی پہچان اور شان بھی۔

ہوئے تھے اور وہ اپنی عمر سے چاہے جتنے بھی زیادہ بوڑھے اور شکستہ نظر آتے مگر لہجان کا ایک توانا مرد کا ہی تھا۔
 ”مزنہ کی شادی نہیں ہوئی..... میں انکار کر رہا ہوں۔“

”اور میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی ابو.....“

اور وہ سب بری طرح سے چونکے اور چونک کر، مڑ کر استعجاب سے پُر نظروں کے ساتھ اس آواز کی سمت دیکھا تھا۔ وہ مزنہ کی جو کہ سرخ چہرہ لیے، کسی مرد کے سے ہی مضبوط لہجے میں بولی تھی۔

☆☆☆

اس نے کھلے دروازے پر انگلی کی پشت سے ٹک، ٹک کیا۔ مس مفتی نے چونک کر سر اٹھایا۔

”مزین جہانگیر.....! آئیں ناں اندر آئیں.....“ انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔ خولہ ست روی سے چلتی ہوئی اندر آئی تھی اور جب تک وہ کرسی صحنیت کر بیٹھی مس مفتی کو کچھ غلط ہونے کا احساس ستا رہا۔ اس کا چہرہ.....؟ سچی اور مس مفتی کی نظر میں اس آزدگی کا سر ڈھونڈتی تھیں۔

”ایوری تھنک از فائن مزین جہانگیر؟“ کسی خدشے کی بنا پر انہوں نے پوچھا۔

”مجھے کچھ دنوں کے لیے آف چاہیے مس مفتی.....“ ایک گہری سانس بھر کر سر اٹھاتے ہوئے وہ بولی تھی۔

”آپ کی بہن کی شادی ہے..... اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... آف لینا آپ کا حق ہے۔“ وہ کہہ رہی تھیں اور خولہ کا دل کسی انجانے، ان دیکھے پلنگے میں جکڑتا جا رہا تھا۔ ”شادی کے لیے اب میں آپ کو منع تو نہیں کر سکتی ناں.....“

”مس مفتی.....!“ اور اس نے اچانک انہیں ٹوکا تھا۔

”میری بہن کی شادی..... کیمنسل ہوگئی ہے.....“ اس نے بوجھل لہجے میں کہا تھا۔

”اوہ.....“ وہ یک دم سناٹے میں رہ گئیں۔

”کیوں.....؟“ اگلا سوال فطری رد عمل کی غمازی تھا۔

وہ انہیں بتانے لگی۔

”میرے خدا.....! آئی ایم سوسوری مزین جہانگیر..... سوسوری..... مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا تو میں.....“

”ارے نہیں مس مفتی..... آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں..... اس کے تو گھر والے بھی لاعلم تھے۔“ اس نے نرمی سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا۔ وہ کتنی دیر منہ پر ہاتھ رکھے افسردہ سی بیٹھی رہیں۔

”اللہ بہتر کرے گا۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اسی میں کوئی بہتری ہوگی۔“ خولہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر

انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔ اس نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ انہوں نے پھر اس سے دوبارہ پوچھا نہیں تھا کہ جب شادی نہیں ہو رہی تھی تو وہ آف کس بات کا لے رہی ہے..... وہ اچھی طرح سمجھ سکتی تھیں کہ وہ کس وجہ سے آف لے رہی تھی، خولہ گھر کے فینس ماحول سے بھاگی تھی۔ وہ مزید سہہ نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا گھر سے نکلے گی تو ذہن کچھ ریلیکس ہوگا مگر اسکول آکر ہو کیا..... ساتھی ٹیچرز نے فنکشنز، عروسی ملبوسات اور اسی طرح کے دوسرے سوال پوچھ، پوچھ کر اسے زچ کر دیا تھا۔ وہ بے طرح سے گھبراہٹ تھی اس سے بہتر تھا وہ آف ہی لے لیتی، وہ ابھی سب کو کچھ بھی بتانے سے گریز کر رہی تھی اور وجہ بھی مزنہ..... وہ عزیز سے شادی کرنے پر بعد تھی۔

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء۔ 170

”مزنہ..... اللہ کا واسطہ ہے تمہیں..... خدا کے لیے ہم یہ رحم کھاؤ۔“ وہ اتنی تنگ آئی تھی کہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑی۔ مزنہ ایک دم گھبرائی تھی۔

”آبی پلیز.....!“ لہجہ التجا یہ تھا۔ ”آپ کیوں نہیں سمجھتیں..... مجھ سے نہیں ہوگی پھر سے وہ پریڈ اور شادی سے چند روز قبل..... شادی ٹوٹنے کا مطلب جانتی ہیں ناں آپ.....؟ میری مشکلات میں اضافہ نہ کریں، میں پال لوں گی اس کی اولاد کو۔“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”تم نہیں پال سکو گی مزنہ.....“ خولہ نے بھڑک کر اس کی بات کاٹی تھی۔ زری جذباتیت ہے یہ..... آج جذبات میں آکر پھندا اپنے گلے ڈال لوگی اور کل کو جب دم گھٹنے لگے گا پھر ہمیں الزام دو گی میں تو نا سمجھ تھی۔ آپ لوگ تو سمجھ والے تھے..... کس کرو مزنہ، عزیز اس دنیا کا آخری مرد نہیں ہے۔ جو تم اتنا بڑا قدم اٹھانے جا رہی ہو۔“ خولہ کی سانس ہموار نہ رہی تھی۔ اسے بے حد غصہ آیا تھا۔ وہ ہمیشہ خود کا ہی کیوں سوچتی تھی۔ کیا ابو کی حالت اسے نظر نہیں آتی تھی۔ مگر اتنا ہی آسان ہوتا جتنا وہ کہہ رہی تھی تو اب سب سے پہلے اس آسان حل کو سمجھنے والے ہوتے..... جب وہ خود انکار کر رہے تھے تو وہ کیوں مری جا رہی تھی۔ مزنہ چند لمحے خوش رہی اور خولہ کو دیکھتی رہی۔

”یہ میری زندگی ہے آبی.....! اور اس میں فیصلے کرنے کا اختیار صرف مجھ کو ہے..... آپ لوگ اپنی، اپنی مرضیاں اور اپنی سن ماناں مجھ پر مت تھوپیں..... مجھے عزیز سے ہی شادی کرنی ہے۔ میں لوگوں کی باتیں سن سکتی ہوں اور نہ برداشت کر سکتی ہوں۔ میرے لیے اس شادی کے بعد کی مشکلات سہتا زیادہ آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ میں خود کو، اپنے دجو کو لوگوں کی اٹھتی اٹھیوں اور زہریلی زبانوں کے لیے چھوڑ دوں..... سوری آگین آبی..... آپ، ابو کو بتا دیجیے گا۔“ وہ اتنے غصوں اور بے حس انداز میں کہہ رہی تھی کہ خولہ کو سانس روک کر اسے سننا

مارچ 2019 کا دلکش شمارہ ایک نظر میں

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مزید

خطوطِ مافیٰ محفل، محفلِ شعر و سخن اور

سرزنش الہجہ بیگ کا دلچسپ انداز

شکست پا

زندگی کے خشب و فراز میں انسان جانے کتنے کھماؤں سے لڑتا ہے..... وہ بھی اپنوں کے درمیان منافقتوں اور مصلحتوں میں الجھا لڑتا رہا.....

آخری صفحات پر **اسما قادری** کے خیالات کی پرواز

ہنگامہ زن

ماضی کے پوشیدہ گوشوں..... اور بند درپچوں میں پنہاں راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر **الیاس سیٹا پوری** کے قلم سے

رنگ آسمان

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا غم..... **اے آدرا جیوت**؛ سحر انگیز انداز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کرہاں ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحہ کا احاطہ کرتے وقت کی مکاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

انسی کے علاوہ تنویر ریاض، ماہ رخ، باب، شاہ زین رضوان، اعتزاز سلیم و صلی، فہمی فردوس، منظر امام اور آصفہ ضیا احمد کی خوبصورت کہانیاں

مڑا تھا۔ وہ سناک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک دم اس کی پشت پر کھٹکا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہی چونک کر متوجہ ہو گئیں۔ کسی نے دروازہ کھولا تھا۔

”خولہ!۔۔۔۔۔!“ وہ جھانک رہا تھا اور ضرورت سے زیادہ سنجیدہ دکھتا تھا۔

”عزیز کے گھر والے آئے ہیں۔“ جھانگیر کے منہ سے نکلا ہوا جملہ۔۔۔۔۔ محض جملہ ثابت نہ ہوا تھا۔ وہ ایک دم کا ثابت ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار مزہ کو دیکھا اور مزہ کی آنکھیں اس کے چہرے کے تاثرات، اس کی باؤں لٹکوتج، یہی کبھی تھی کہ ”انہیں انکار نہیں، ہرگز، ہرگز بھی نہیں۔۔۔۔۔“

☆☆☆

عزیز کے گھر والوں کا آنا۔۔۔۔۔ یہ اتنی غیر متوقع بات تھی کہ کوئی بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اب اگر کیا جائے تو آخر کیا، کیا جائے۔ وہ اب کیا کرنے، کیا کہنے آئے تھے۔ جب سب کچھ واضح تھا، طے نظر آتا تھا تو اب۔۔۔۔۔ اب کیوں۔۔۔۔۔ آئے تھے وہ لوگ۔۔۔۔۔ کیا وہ سمجھوتے کی بات کرنے آئے تھے تو ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ احمد صاحب کسی بھی قسم کا کوئی بھی سمجھوتا کرنے پر تیار نہ تھے۔ کوئی ایک دو دنوں کی بات ہو تو برداشت کو آواز دے لے انسان۔۔۔۔۔ ساری عمر، ساری عمر کا معاملہ تھا اور سمجھوتا کوئی بہترین حل نہ نظر آتا تھا، نہیں ایسا تو وہ کرنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے ہی جھانگیر کو کہہ کر خولہ کو بلانے کا کہا تھا اور خولہ۔۔۔۔۔ جھانگیر کی بات سن کر اس کی تو جیسے ساری سمجھ ہی رخصت ہو گئی تھی۔

”خولہ۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ ماموں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ جھانگیر نے اسے اپنے پیچھے آتے نہ دیکھ کر کہا۔

”آ رہی ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے قدم بڑھائے مگر یک دم ٹھک کر رک گئی تھی۔ اور رکنے کی وجہ۔۔۔۔۔ مزہ نہ بنی تھی۔ اس نے خولہ کا ہاتھ پیچھے سے تھام کر اسے روکا تھا۔

”شٹ اپ مزہ نہ جسٹ شٹ اپ۔۔۔۔۔“ اس نے بری طرح سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”اور خبردار۔۔۔۔۔ خبردار جو تم اس کمرے سے باہر نکلیں۔۔۔۔۔ تمہاری بات میں نے سن لی ہے اور اب تک بھی پہنچا دوں گی، بار، بار مت دہراؤ۔۔۔۔۔“ شٹل ہو کر کہتے ہوئے، وہ بل کھا کر پٹلی اور مزہ کے تقریباً منہ پر ہی زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ مزہ کی آنکھوں میں بے اختیار نمی ابھری، بلند ہوئی اور اب وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

جیسے ہی اس نے ڈرائنگ روم میں قدم رکھا تو تھوڑا کسی ناگوار بدبودی کی طرح ماحول میں پھیلا ہوا تھا۔ وہ محسوس کر سکتی تھی اور دیکھ بھی سکتی تھی۔ ابو کا چہرہ خطرناک حد تک سنجیدہ دکھتا تھا۔ جھانگیر کی پیشانی پر کئی بل تھے اور وہ ناک تک بھرا بیٹھا تھا اور پھپھو۔۔۔۔۔ وہ عورت تھیں، مروت دکھلانے کی ایسی کوئی ضرورت انہیں نہ تھی ان کا چہرہ شدید ناگواری کا نینوں سا بننا ہوا تھا۔ جیسے ابھی کہ ابھی وہ ان آنے والے مہمانوں کی تو اسٹج، بے عزتی سے کرنے والی تھیں۔۔۔۔۔ خولہ نے پست آواز میں سلام کیا اور خوشی سے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی تھی۔ اخلاقیات بھی کوئی چیز ہوتی ہے آخر۔۔۔۔۔ وہ اب انہیں شراب سرد کر رہی تھی۔

”شکر یہ بنے۔۔۔۔۔!“ عزیز کی امی نے دھمے لہجے میں کہا جب اس نے انہیں گلاس پکڑ لیا تھا۔ سرد کرنے کے بعد وہ بھی وہیں بیٹھ گئی تھی۔ ماحول پر اب ایک بھاری، بوجھل خاموشی تھی کہ جس کا بوجھ کندھوں پر پڑتا محسوس ہوتا تھا۔ ان سب کے لیے ہی بات شروع کرنا ایک عذاب کی طرح تھا۔

”بھائی صاحب! آپ کو یقین آئے نہ آئے مگر ہم بھی آپ کی طرح ہی لاعلم تھے۔“

”ٹھیک ہے مان لیا کہ آپ لاعلم تھے بچے کے وجود سے مگر ہمیں میرج سے تو آپ لاعلم نہیں تھے ناں، وہ کیوں چھپائی ہم سے۔۔۔۔۔؟“ وہ جھانگیر تھا۔ جس نے اتنے ترش لہجے میں عزیز کی امی کی بات کا انی کی طرف متوجہ ہوئے

تھے..... اور عزیز کی ماں..... ان کا رنگ فق ہوا تھا۔ مہ جبین نے بے اختیار ہونٹوں پر زبان پھیر کر انہیں دیکھا۔
 ”اس کے قصور وار ہیں ہم..... مگر.....“ وہ دم لہجے میں بولیں لیکن بات مکمل نہ کر سکیں۔

”ہم آپ سے مزید کوئی بد مزگی نہیں چاہتے تھے اور.....“
 ”آئی پلیز..... ابھی آپ لوگ چلے جائیں۔ ہمیں کچھ وقت دیں..... تھوڑا سا وقت ایک بہترین فیصلہ کرنے کے لیے.....“ وہ خولہ تھی جس نے احمد صاحب کو کوئی اور بات کہنے سے روکا تھا۔ احمد صاحب، جہانگیر اور فرخندہ..... وہ سب اتنی حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو وہ ٹھیک ہو جیسے.....
 ”بہت شکریہ بیٹے..... امید ہے کہ آپ لوگ اچھا ہی فیصلہ کر س گے۔“ مہ جبین کی امی اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ مہ جبین نے بھی ان کی پیروی کی اور چند لمحوں بعد وہ دونوں چلی گئی تھیں۔
 ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کیوں انہیں آس دلا کر بھیجا ہے جب طے ہے کہ انکار ہی کرنا ہے تو؟“

جہانگیر ان لوگوں کے اٹھنے ہی خولہ سے مخاطب ہوا تھا۔ لہجہ برہم، انداز خفا، خفا.....
 ”دماغ میرا نہیں..... مزہ کا خراب ہوا ہے جہانگیر..... وہ اس..... وہ شادی پر بعد ہے ابو۔“ جہانگیر کو جواب دے کر رخ موڑ کر اس نے احمد صاحب سے کہا..... فرخندہ کا منہ کھلا اور احمد صاحب نے اچھٹے سے اسے دیکھا۔ وہ اتنی حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے تھے جیسے دنیا کی سب سے انہونی بات ہو گئی تھی۔ خولہ تھک کر ڈھے پڑنے والے انداز میں صوفے پر بیٹھی تھی کہ ان نظروں کی حیرت کا علاج اور جواب..... دونوں ہی اس کے پاس نہیں تھا۔

مزہ ایک بار پھر سے مسئلہ بن کر سامنے آئی تھی۔ اور اب کی بار یہ سنگین صورت حال تھی۔

☆☆☆

اس نے بے حد حیران ہو کر وہ کاغذ کا ٹکڑا پکڑا تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا تھا کہ چند لمحوں تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ سامنے کھڑی لڑکی اس سے کیا کہہ رہی تھی۔ اور جب بانو نے اسے بت بنا کھڑا دیکھا تو گھبرائے سے انداز میں ادھر، ادھر دیکھتے ہوئے اس نے کاغذ کا وہ ٹکڑا..... اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمایا تھا۔ اسے کسی کے آجانے کا خدشہ تھا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے پٹی اور تیز قدموں کے ساتھ ہی اس سے دور ہوتی چلی گئی۔ وہ اس کی زمین چادر کے پلو کو پھڑ پھڑاتا ہوا دیکھتا رہا جو کہ اس کی تیز چال کی وجہ سے اڑا جا رہا تھا۔ اس کے دور جاتے ہی اس نے ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑے اس کاغذ کو دیکھا اور ایک بار پھر سے وہ خود کو حیران ہونے سے روک نہ پایا تھا۔ ”یہ..... یہ اس نے بھیجا تھا۔ اپنی کسی کزن کے ہاتھ.....“ یہ اس کے لیے کسی بدترین دھچکے سے کم نہ تھا۔ وہ ایسی کسی کوشش کی توقع کم از کم اس سے نہیں کر رہا تھا۔

”آ.....“ اس نے دونوں بازو ہوا میں پھیلانے..... ”ہو“ کر کے سانس باہر بھیکی۔

”یہ..... یہ کیا تھا؟“ اسے اپنے ماتھے پہ پسینہ آتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ان دونوں کا تعلق ایسا تو نہ تھا۔ اس نے اسے پسند کیا تھا۔ رشتہ کرنے کی بات کی تھی جو بھی تھا ایک طرف..... ایسا کوئی خط، پتر جیسا تعلق تو بھی نہ تھا۔ وہ بد دل ہوا تھا، باک لہجے کے لیے۔ وہ ایسی تو نہ تھی۔ شاک پہنچا تھا اسے یقین نہیں آتا تھا مگر ہاتھ میں پکڑا وہ کاغذ..... یقین کے تھپڑ اسے دے مارتا تھا۔ بالآخر اس نے کاغذ کو کھول ہی لیا تھا۔ اس کی نظریں سطروں پر دوڑنے لگیں..... اس کا دل و حشرک اٹھا تھا، کیا یہ اقرار نارہم تھا..... اظہار نارہم تھا کیا.....؟ اور جو وہ تھا اس نے اس کا دماغ بھک سے اڑا دیا تھا..... وہ ایسی کسی بات، ایسے الفاظ کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ دنیا کی پہلی بات نہیں تھی۔ تو یہ آخری بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنی ہی دیر منہ کھولے اس نے ”تائے“ کو دیکھتا رہا۔

”ہیں..... کیا تھا؟“ اس خط میں اسے منع کیا گیا تھا کہ ”وہ اس کے رشتے کے لیے اپنی کوششیں ترک کر دے مزید یہ کہ وہ اس کے لیے موزوں نہیں تھی اس کی ”محبت“ اس کے لیے محض مشکلات کا باعث بن رہی ہے۔“ کتنی ہی دیر وہ اس کاغذ کا کوٹا ہونٹوں میں دبائے حیران پریشان کھڑا رہا۔ اتنے عرصے سے یہ بات چل رہی تھی۔ پسندیدگی کی بات اس کے خاندان میں بھی پھیل گئی تھی اور سب کو معلوم تھا کہ اس کی اماں مان کے نہیں دے رہی تھیں۔ ایسا پہلے تو نہیں ہوا تھا۔ کیا ہوا تھا ایسا..... کیا؟ کہ اسے یوں..... اس سے رابطہ کرنے اور اسے پیچھے ہٹنے کی تلقین کرنا پڑا تھی۔ وہ الجھا اور بری طرح سے الجھا۔ ایسا کیا ہوا تھا، کیا ہو گیا تھا۔ اسی الجھن کے ساتھ وہ گھر آیا اور جیسے ہی گھر آیا تو اس کی بہن اس کا بازو پکڑ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتی ہوئی ایک طرف لے گئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔
 ”ماں جی آج اس کے گھر گئی تھیں.....“ اور اس کے ساتھ ہی اس کی بہن نے آنکھ اور بھوؤں سے اشارہ کیا تھا اور وہ اچھی طرح سمجھ گیا کہ وہ کس کے گھر گئی تھیں۔
 ”کیوں؟“ حیرت سے ہرگز دھیما لہجہ.....

”اتنی بے عزتی کی ہے، اتنی بے عزتی کہ بس..... اتنی باتیں سنائیں ہیں کہ کیا بتاؤں.....؟“ بہن اسے بتا رہی تھی اور اس کی جیب کے اندر، والٹ میں رکھے کاغذ کے الفاظ جیسے بولنے لگے، پھڑپھڑانے لگے تھے۔ ساری الجھن رفع ہو گئی تھی اور خط بھیجنے کی حرکت بھی جیسے بہترین طریقے سے justified ہوئی تھی۔
 ”ماں جی..... نے ایسا کیا؟“ وہ یوں بولا جیسے ماں سے اس انتہائی قدم کی توقع وہ مر کر بھی نہیں کر سکتا تھا۔
 ”کیوں کیا ایسا.....؟“ اس نے سوال کیا۔

”کیوں سے کیا مطلب ہے بھائی، ضد کرو گے تو..... یہ تو ہو گا ہی۔“ بہن اس کے بچکانہ سوال پر مسکرا کر بولی تھی۔
 ”یہ ٹھیک نہیں ہوا، بے حد غلط بات ہے یہ.....! انتہائی نامعقول حرکت ہے یہ..... ماں جی کو جو کہنا ہے مجھے کہیں اس کی اور اس کے گھر والوں کی یوں بے عزتی کرنا.....“ اور اس نے نف کے سے انداز میں سر جھٹکا تھا۔
 ”تم ہی ضد چھوڑ دو بھائی.....“ بہن نے چند لمحوں کے توقف کے بعد اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بچی لہجے میں کہا تھا۔
 ”ضد ہوتی تو چھوڑ دیتا، میں کیا کروں..... کیا کروں کہ یہ ضد نہیں ہے۔ بے غیرت دل کا مسئلہ ہے۔“
 آخری جملہ اس نے منہ ہی منہ میں کہا تھا۔ اسے جیسے خود یہ بے طرح سے غصہ آیا تھا۔

”وہ اس گھر میں آگئی تو تم سوچ سکتے ہو ناں کیا ہو گا؟ کیا کبھی سوچا تم نے کہ تم کیسی زندگی اسے دو گے.....؟ خود تو تم قطر چلے جاؤ گے اور وہ پیچھے سے ماں جی کے ہاتھوں اور زبان پر ہوگی۔ زندگی اتنی پیچیدہ ہو جائے گی کہ.....“

”اسے یہاں چھوڑ کر جائے گا کون.....؟“ اس نے بہن کی بات کا ٹی تھی۔ اور بہن ایک دم نہ سمجھ سکی اور جب سمجھی تو ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

”یعنی کہ ایک اور رولا..... ایک اور مسئلہ.....“ وہ حیرت سے بولی۔
 ”بھائی ماں جی تمہیں کھا جائیں گے۔“ اور وہ ہنس دیا..... کھل کر..... زور سے..... اک بھر پور مردانہ قبضہ لگا کر۔
 ”فکر نہ کرو..... میں ماں جی سے اس دفعہ کھل کر اور بالکل صاف، صاف بات کروں گا، وہ نہیں..... تو اور کوئی بھی نہیں..... کوئی بھی نہیں.....“ اس نے اتنے مطمئن اور اتنے مضبوط لہجے میں کہا تھا کہ وہ دلیل کر رہی تھی۔
 یہ اونٹ آخر کس کر ڈٹ بیٹھے گا۔ آخر کس کر ڈٹ.....؟

وہ جیسے ہی فون کر پائل پر رکھ کر پلے..... ساکت رہ گئے تھے۔ وہاں مزہ فٹری کی اور وہ اکی جیراں سے انہیں
 دیکھ رہی تھی کہ احمد صاحب کو عجیب محسوس ہوا..... اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں..... لبریز تھیں۔
 ”ایسا کیوں کیا آپ نے ابو.....؟ کیوں؟“ اور پانی جھلک گیا..... بہہ گیا۔ احمد صاحب وود قدم آگے
 بڑھے، ایک نظر اسے دیکھا۔ اس کا سر شفقت سے تھپتھپایا اور آگے بڑھ گئے اور مزہ..... وہ وہیں ہونٹوں پہ ہاتھ
 رکھ کر نیچے ٹھٹھکی چلی گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اس کے رونے کی آواز سے گھر کی دیواریں بل گئی تھیں۔ خولہ ننگے پیر، بنا
 دوپٹے کے دوڑی۔

”یا اللہ خیر.....!“ فرخندہ بھی حواس باختہ ہوئیں..... اور جہانگیر اس وقت گھر پر نہ تھا۔ اور مزہ..... وہ اسی
 طرح سے روئی تھی جیسے کوئی مر گیا تھا۔
 ”مزہ..... مزہ کیا ہوا ہے..... کیا؟“ خولہ نے اسے دونوں بازوؤں میں بھرتے ہوئے سیدھا کیا لیکن وہ
 روئے جا رہی تھی۔

”بتاؤ تو سہی..... آخر ہوا کیا ہے؟“ خولہ نے اس کا چہرہ سیدھا کیا، تھپتھپایا اور پوچھا۔
 ”ابو..... ابو نے..... انکار کر دیا..... آپ.....“ وہ ہچکچاہٹ میں اس نے بات مکمل کی اور خولہ کے اندر اٹھتے
 وہموں کے پھیروں پہ ایک دم برف گری تھی۔ وہ مٹن ہو کر رہ گئی تھی۔ باوجود اس کے وہ جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوتا تھا۔
 باوجود اس کے کہ یہ ہی طے تھا پھر بھی یوں محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دل نکال لیا تھا۔ اس نے کچھ اور مضبوطی سے
 اسے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا مزہ..... سب ٹھیک.....“ اس کا سر چومے ہوئے اس نے کہا۔
 ”کسا ہوا؟“ فرخندہ حواس باختہ، گھبراہٹ ہوئی آتی تھیں۔ خولہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں واپس جانے
 کا کہا۔ وہ خشکیں..... رک کر ان دونوں کو دیکھا۔ خولہ نے پھر سے انہیں واپس جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ باول
 خواستہ مزگئی تھیں اور اب ذہاں بے قابو ہوتی، تڑپتی، جھلکتی مزہ تھی اور اسے اپنے بازوؤں میں جکڑے..... اس کے
 سر پر ہونٹ رکھے اسے سنبھالے ہوئے خولہ تھی، جس کے اپنے آنسو کہیں اندر بہت اندر کسی گہواہ میں ٹپ، ٹپ
 گرتے تھے، نظر نہ آتے تھے۔ بالکل بھی نظر نہیں آتے تھے۔

☆☆☆☆

تین ماہ بعد
 چٹھی کی گھنٹی بجتے ہی اس نے بچوں کی قطار خوانی اور انہیں لے کر گیٹ کی طرف جانے لگی۔ ارد گرد بچوں کا شور
 پیلا ہوا تھا۔ گاڑیوں کی پائل، پاں..... چونکیدار مختلف ناموں کو پکار رہا تھا۔ بچوں کی مستیاں عروج پر تھیں۔ اس نے
 اپنی کلاس کو گیٹ تک چھوڑا..... اور پھر واپس اسٹاف روم میں آگئی۔ اسٹاف کی چٹھی، بچوں کے آف ہونے کے پندرہ
 منٹ بعد ہوتی تھی..... پندرہ منٹ بعد ہی اسے جانا تھا۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹنے لگی۔ کچھ کاپیاں تھیں، کچھ ورک شیٹس اور
 اسی طرح کی دوسری چیزیں..... جنہیں اس نے اسٹاف روم کی الماری میں رکھ کر الماری لاک کی تھی۔ گلے میں پڑا
 دوپٹا اتار کر اس نے چادر اوڑھی اور اب وہ ہٹاؤ ہٹا کر رہی تھی کہ اچانک اس کا فون بج اٹھا تھا۔
 ”اس وقت..... خیرت ہو؟“ اس نے فوراً سا جیراں ہوتے ہوئے فون دیکھا تو ”جہانگیر کالنگ“ کے الفاظ
 اسے مزید حیران کر گئے۔

”خیریت جہانگیر.....؟“ اس نے ریسو کر تے ہی سوال داغا۔
 ”ہاں خیریت ہی ہے، میں آج فری تھا تو سوچا تمہیں پک کر لوں۔ تم دین والے کو منع کرو.....“ جہانگیر نے
 ماہنامہ پیکیز۔ مارچ 2019ء 175

اتنا کہ کروں آف کر دیتا اور وہ احتجاج سے فون کی بجھتی اسکرین کو دیکھتی رہی۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ شادی کے دوسالوں میں کبھی نہیں..... اسے اعتراف تھا کہ جہانگیر کی فطرت پہلے کی نسبت ذرا سی بدل گئی تھی مگر پھر بھی اس کا یہ کہنا خولہ کو حیران کرتا تھا اور بے طرح سے کرتا تھا۔ اسی حیرت کے زیر اثر اس نے دو پٹا کر کے بیک میں رکھا اور جہانگیر کا انتظار کرنے لگی۔ قریب میں منٹس کے بعد اسے جہانگیر کی مس کال آئی تو وہ گیٹ کی طرف بڑھی تھی۔

”سبز جہانگیر..... آج آپ دیر سے جا رہی ہیں۔“ اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ وہ مڑی اور مسکرائی۔

”جہانگیر نے آتا تھا لینے..... بس اسی کا انتظار کرتے دیر ہو گئی۔“ وہ دونوں اب ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔

”آپ بھی تو دیر سے جا رہی ہیں.....“ اس نے سوال کیا۔ بس مغنی مسکرا دیں۔

”میرا تو کام ہی ایسا ہے۔“ اسی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے جواب دیا تھا۔ وہ اب گیٹ کے پار پہنچ چکی تھیں جہاں پہ جہانگیر، خولہ کا اور مس مغنی کی گاڑی ان کی منتظر تھی۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر نکلیں۔ گاڑی ان کے قریب آ کر رکنی گئی تھی۔ وہ ان کو خدا حافظ کہتی جہانگیر کی طرف بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

”بچو کہاں ہیں؟“ جہانگیر کو گیٹ کا لاک کھولتے دیکھ کر اس نے از حد حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ ماموں کی طرف گئی ہیں..... فون آیا تھا ان کا مجھے.....“ جہانگیر بایک کو اندر لاتے ہوئے بولا۔ اور وہ رک گئی، ٹھہر گئی۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر جہانگیر کو دیکھا، کچھ غلط تھا، کچھ غلط تھا۔ غیر معمولی کچھ تھا جو وہ چھپا رہا تھا۔ اس کا دل بے اختیار گھبرا یا۔ بچو اسے بتائے بنا تو نہیں جاتیں۔

”جہانگیر، کیا ہوا ہے؟“ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ آگے بڑھ کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خولہ نے پوچھا اور اس طرح پوچھتے ہوئے وہ بے حد پریشان دکھتی تھی۔ جہانگیر نے بے اختیار ایک گہری سانس بھری تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ یک دم اسے بتائے..... پریشان کرے صبح سے وہ اسکول میں تھی۔ لچ عموماً گھر آ کر ہی کرتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ کھالے تھوڑا آرام کر لے تو وہ اسے طریقے سے، سجاوے سے بتا دے گا مگر خولہ کی حیات تیز نہیں اتنی کہ..... اس کی ہر کوشش پہ پانی پھیر کر رکھ دیتا تھا۔ جہانگیر نے اک نظر اسے دیکھا۔ بایک کو کھڑا کیا۔ اس کی طرف مڑا..... اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے..... اور خولہ کا دل تھا کہ آج پسلیاں توڑ کر رکھ باہر آنے کو تھا۔ جہانگیر کے ہاتھوں کا لمس بھی تسلی نہ دیتا تھا اور اس کے ہاتھ لرزتے سے تھے۔

”جہانگیر.....“ خولہ نے سراپہ ہو کر پکارا اور رومل کے طور پر جہانگیر کے ہاتھوں کو کچھ اور مضبوطی سے تھام لیا۔

”مزنہ اسپتال میں ہے خولہ..... anxiety attack“ اور خولہ کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا چہرہ لحوں میں سفید ہوا تھا۔

☆☆☆

خیال یہ ہی تھا کہ وہ چند دن ایسی کیفیت کے زیر اثر رہے گی۔ اور پھر نارمل ہو جائے گی۔ آہستہ، آہستہ وقت کے ساتھ، ساتھ مگر مزنہ، مزنہ احمد نہ رہی تھی۔ وہ ایک مسئلہ بن چکی تھی۔ ان تین ماہ میں وہ کتنی ٹھیک ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس طرح سے لگایا جاسکتا تھا کہ تین ماہ میں یہ دوسرا anxiety ایک تھا۔ یہ ایک بڑا اور سنگین مسئلہ تھا۔ خولہ اب اسے اوویات کے زیر اثر سوتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی رنگت حیرت انگیز طور پر چلی اور گہری ہو چکی تھی۔ ہونٹ خشک اور سیاہ پڑ چکے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس رہی تھیں، اس کے چہرے کی ساری رعنائی جیسے نچوڑ لی گئی تھی۔ خولہ یک یک اسے دیکھتی رہی اور پھر اس نے مڑ کر اپنے بوڑھے باپ کو دیکھا۔ ان کے سفید بالوں اور جھریوں زدہ چہرے اور جھکے کندھوں کو دیکھا۔ اک تکلیف کی لہر سی اٹھی اور کسی کوڑے کی طرح اس کے جسم پر ضرب لگا گئی تھی۔ وہ بے اختیار اٹھی

اور اٹھ کر وہاں سے نکل گئی تھی۔ کب تک..... کہاں تک..... آخر کہاں تک..... وہ تھک چکی تھی..... خدا کی قسم وہ تھک چکی تھی۔ تیز، تیز قدموں سے چلتے ہوئے وہ اسپتال کے لان میں نکل آئی اور نسبتاً کیلے گوشے میں جا بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ تکلیف کی اس حالت میں تھی کہ جہاں آنسو ساتھ بھاتے نہیں..... ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ فرخندہ اسے پوں باہر نکلا دیکھ کر اس کے پیچھے آئی تھیں۔ اس کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل کنتا تھا۔

”خولہ..... بچے.....“ شفقت سے کہتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا تھا۔ اس نے کسی بچے کی طرح منہ ان کے سینے میں چھپایا تھا۔ وہ اس کا سر سہلاتی رہیں، تسلی بھرے انداز میں۔

”پھو! خوشی کیا ہوتی ہے..... کہاں ہوتی ہے..... کیسی ہوتی ہے یہ.....؟ کہاں سے ملتی ہے پھو.....؟“ وہ یونہی ان کے سینے میں منہ چھپائے ہوئی تھی۔ پھو نے اک لمبی سانس کھینچی تھی۔

”بتائیں ناں پھو.....!“ اب کی بار اس نے منہ اٹھا کر انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا اور پھو کی آنکھ نم ہوئی تھی۔ وہ اسے بتاتی تو آخر بتاتیں کیا؟

”معلوم نہیں میری زندگی کب سیدھی ہوگی..... کب؟ مجھے اس سے کچھ نہیں چاہیے..... ماسوائے ذرا اسے سکون کے.....“ وہ دوبارہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر ہلکا سا بڑبڑائی تھی ایسے کے فرخندہ کو اب کی بار کچھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہتی ہے، کیا بولتی ہے۔

☆☆☆

سنگ کے کناروں پر میل اک واضح لکیر کی صورت موجود تھی۔ مسالاجات کے ڈبوں پر گرد کی اک تہ جم چکی تھی۔ kitchen cabinets اتاری کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ کوکنگ ریج کی حالت بھی چیخ، چیخ کر کہتی تھی کہ اسے صفائی کے لیے کسی کے بھی ہاتھ دستیاب نہ رہے تھے اور وہ حیرانی سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔

”مزنہ اتنی بے پروا تو کبھی نہیں تھی۔“ یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ ابو کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ان کی ولز روپ..... چپک کی تو نتیجہ حسب توقع تھا۔ ایک جوڑا بھی پریس کر کے نہیں رکھا گیا تھا۔ کپڑے گول مول کر کے الماری میں ٹھنڈا دیے گئے تھے، تیر کے نہ رکھے گئے تھے۔ اور اس طرح سے ٹھنڈائے گئے کہ الماری کا پٹ کھولتے ہی ایک ڈھیر خولہ کے پیروں پر آن گرا تھا۔ خولہ نے جس تیسری چیز کا جائزہ لیا تھا وہ گھر کی اندرونی چھت تھی جا بجا لٹکتے جالے، فرنیچر بے ڈسٹ، بے ترتیبی اک کمال ترتیب سے پورے گھر میں بکھری نظر آتی تھی۔

”یہ..... یہ اس کے پیچھے کیا ہوتا جا رہا تھا..... کیا؟“ وہ ابو سے پوچھتی تو وہ ادھر، ادھر کی بات کر کے ٹال دیتے۔ اس نے محسوس کیا کہ ابواب اس سے باتیں شیر نہیں کرتے تھے..... چھپاتے تھے، وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتے مگر..... یہ سب..... یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اس نے نیم باجی کو پکڑا تھا، جو گھر کی ملازمہ تھیں۔

”خولہ بیٹانہ ہی پوچھو تمہارے جانے کے بعد ہوا کیا ہے اس گھر میں..... مزنہ بیٹا سارا، سارا دن کمرے میں بڑی روتی رہتی تھیں۔ کھانے کا ہوش اور نہ باپ کا خیال..... پھر جو روٹا تھا تو عجیب بد مزاج اور چڑچڑی ہو گیا۔ صاحب جی سے جھگڑا کر لیتی ہیں کسی چیز پر تو جہ نہیں دیتیں۔ صاحب جی اپنے کپڑے بھی خود ہی استری کرتے ہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہوگئی صاحب جی کو کہہ دیا۔“

اور اس کے آگے جو نیم نے کہا اس نے خولہ کے جسم اور ذہن دونوں کو اک زبردست الیکٹرک شاک سے... دوچار کیا تھا۔

”مزنہ نے ایسا کہا؟“ وہ بے یقینی سے پوچھتی تھی۔

”جی..... کئی دفعہ تو ان کی طبیعت اتنی خراب ہو جاتی ہے کہ سانس اکڑے لگتی ہے۔ سوتی بھی

خولہ بیٹا۔“ نسیم بتا رہی تھی اور خولہ کے ہاتھوں، پیروں سے جیسے جان نکلتی جا رہی تھی۔

اتنا کچھ ہوتا رہا اور ابوا کیلئے سہتے رہے۔۔۔۔۔ اسے دکھ اس بات کا تھا۔ نسیم اب بھی اسے بہت کچھ بتا رہی تھی اور وہ سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے بیٹھی سختی رہی۔۔۔۔۔ چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ نسیم باجی کی باتوں کے لیے آج کا دن تو کم تھا۔۔۔۔۔ انہیں تو کئی دن دکھ کا رستہ، سر جھک کر اس نے جیسے خود کو حالت توازن میں لانا چاہا۔

”نسیم باجی! میں اب یہیں ہوں، سارے گھر کو صبح کر کے ہی جاؤں گی، آپ ذرا چپن تو دیکھ لیں۔“ اس نے نسیم باجی کی زبان کے آگے جیسے فل اسٹاپ لگا دیا تھا۔ وہ اک لمحے کو چپ ہوئیں اور پھر برا سامنے بناتے ہوئے اٹھ گئی تھیں اور خولہ۔۔۔۔۔ وہ کسی لمحے وہاں بیٹھی اپنی کپڑی کو مسلتی رہی۔ درد منھ کسپٹی میں ہی نہیں اٹھا تھا وہ تو جیسے ہر بہن ہر موم میں اہل پڑا تھا۔

”یا اللہ۔۔۔۔۔ کہاں سے لاؤں اتنی ہمت۔۔۔۔۔“ وہ کسی بڑھیا کی طرح ہی گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ابھی تھی۔ اس نے ہمت کو جمع کیا اور ارادے کو مضبوط کیا۔۔۔۔۔ وہ مزہ سے درد نوک بات کرنے جا رہی تھی۔ اسے سمجھانے جا رہی تھی۔ اک آخری بار، آخری کوشش اور پھر جیسے ہی اس نے مزہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تو۔۔۔۔۔ وہ جھپکے کیا تھے جو نسیم باجی کے انکشافات نے دیے تھے۔ یہ جو دھچکا تھا ناں جو کہ اس کا منظر تھا۔ یہ اسے سرے سے شمع کر کے رکھ دینے والا تھا۔ اس نے جب دروازہ کھولا تو مزہ کے ہاتھ میں اک رومال تھا اور رومال میں۔۔۔۔۔

☆☆☆

”ماں جی اب وہ شادی شدہ نہیں رہی اور دوسرا عقد کرنے کے قابل ہے۔ ہر لحاظ سے قانونی، معاشرتی اور مذہبی، ہر لحاظ سے آپ کا اعتراض بلا جواز ہے۔۔۔۔۔“ اس نے ماں ہی کے ایک سواکھتر دفعہ کے دہرائے گئے اعتراض کے جواب میں ایک سواکھتر دفعہ وہی بات دہرائی تھی جو اس نے پہلے دن کہی تھی۔

”دنیا کی ساری کنواری لڑکیاں مرگتی ہیں کیا۔۔۔۔۔ تمہارے لیے بس وہ طلاق یافتہ ہی بچی ہے اور تم کتنی شادا یاں نبھا چکے ہو؟ کنوارے ہو تو بیاہ بھی کنواری سے ہی کروں گی۔ تمہاری ضد ہے تو میری بھی ضد سی۔۔۔۔۔“ اور وہ ہنس دیا۔ ”چلیں ٹھیک ہے ماں جی۔۔۔۔۔ ضد، ضد کھیلتے ہیں۔ اسی میں عمر بیت جائے گی۔ وہ نہیں تو نہ سہی پر کوئی اور بھی نہیں۔۔۔۔۔ اب آپ کی نافرمانی نہیں کر سکتا تو کیا ہوا۔ خود ہی اپنی مرضی تو چلا سکتا ہوں ناں۔۔۔۔۔ بس طے ہو گیا۔“ وہ اٹھ کر ان کے پیچھے آیا اور اب وہ زور، زور سے ان کے کندھے و باتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ماں جی کے دل کو ہاتھ پڑا۔۔۔۔۔ مگر وہ پکامنہ بنائے بیٹھی رہیں۔ چار دن کی ضد بھی، ساری عمر تو نہ چلتی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ اب ساری عمر ہی چلتی تھی۔ وہ اس دفعہ کی چھٹیاں گزار کر واپس چلا گیا اور جاتے ہی کہہ دیا۔ اب نہیں آئے گا پاکستان۔ اب تب ہی آئے گا جب ماں جی مانیں گی۔ ماں جی نے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ کبھی ہارٹ اٹیک کے بہانے تو کبھی شوگر ہائی کبھی سانس اکھڑنے لگی تو کبھی مرنے کے ٹانگ لیکن اس نے بھی موکل چھوڑنے ہوئے تھے۔ اس کی بہن تھی ناں۔۔۔۔۔ مکمل اور درست، سچی پر پور تنگ کرنے کے واسطے۔ سو ماں جی کے داؤ چلے ہوئے کار تو سی ثابت ہونے تھے اور بالا آخر۔۔۔۔۔ بالآخر۔۔۔۔۔ انہیں ہتھیا رڈالنے پڑے تھے۔ اس نے فون پر ہی نکاح کیا تھا اور بہانہ۔۔۔۔۔ چھٹیاں نہیں مل سکتیں۔ نکاح کے بعد اس نے بیوی سے ڈاکو میٹس منگائے۔ ویزا ایلانے کیا اور پورے سال بعد وہ اسے رخصت کروا کر اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔

☆☆☆

”ماں جی کہتی ہیں تم بہت چالاک ہو لیکن مجھے کیوں تم اتنی معصوم دکھتی ہو۔“ اور شوہر کے منہ سے پہلی بات سن

کر اس کا جھکا ہوا سر مزید جھکا تھا۔ وہ اس پر سرایا۔
 ”اب ماں جی کو کیا پتا کہ مجھے معصومیت نے مارا..... نہ ہی تمہارے حسن نے لوٹا، میں تو تمہاری آنکھوں سے
 پٹ گیا ہوں.....“ وہ کہہ رہا تھا اور اس کا سر جھٹکا ہی چلا جا رہا تھا۔ تو ایک جنگ، ایک لڑائی اپنے انجام کو پہنچی۔ اس
 نے کہا تھا کہ ماں، باپ کی رضا مندی سے ہی شادی کروں گا۔ اور اس نے گرد دکھایا کہ وہ نام کا مرد نہیں تھا۔ وہ چھ ماہ
 کی چھٹی پر آیا تھا اور یہ چھ ماہ گزرنے تک سارا پیپر ورک بھی مکمل ہو جاتا تھا۔ ماں جی کو ابھی تک معلوم نہیں تھا اس
 کا رروائی کا..... وہ تو بیٹے کی رروائی کی منتظر تھیں۔ ادھر وہ جہاز پر بیٹھا..... ادھر انہوں نے آستین چڑھائی تھیں۔ پھر
 جو دلہن کا حال ہوتا..... وہ حال اک زمانے نے دیکھا تھا۔ لیکن وہ..... وہ کچے کام کرنے والا نہیں تھا اور وہ اپنی ماں
 کو بھی جانتا تھا۔ مرضی کی شادی..... لومیرج کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بھی ہم نے تمہیں پسند کیا..... زمانے سے بھڑک
 شادی کی، لوب تم تاوان بھرو۔ ماں، باپ کی خدمت، ماں، باپ کی فرمانبرداری اس پر فرض تھی۔ اس کی بیوی کیوں
 تاوان بھرتی..... کہا ناں وہ نام کا مرد نہیں تھا۔ عورت کا تحفظ، اس کی زندگی کا سکون جتنا عورت کے ہاتھ میں ہوتا
 ہے اس سے کہیں زیادہ یہ مرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر مرد یہ بات سمجھ لے اور تاوان کا کام لینے کے بجائے عقل کو
 استعمال کر لے تو love marriages کے ٹوٹنے کی شرح بھی زیادہ نہ ہو۔



بارشوں کا موسم تھا..... سیلا سا..... ہر طرف نمی جیسے پھوٹی پڑتی تھی۔ دور کہیں رات کی سیاہی میں جھینگہ لڑتے تھے۔
 آسمان آج صاف تھا اور ستاروں کی چمک شاندار تھی۔ رات ٹھنڈی تھی۔ تاریکی میں لان میں لگے دیو قامت
 درخت پراسراریت کا مطلب سمجھاتے تھے۔

”خولہ..... خولہ.....“ اسے اپنے نام کی پکار پڑتی سنائی دی مگر وہ ٹھس..... بہری بنی بیٹھی رہی۔ وہ چھت کے
 فرش پہ دونوں بازو جھٹھنوں کے گرد لپیٹے بیٹھی تھی۔ ذہن من ہو رہا تھا۔ سوچ مفلوج ہوئے چلی جا رہی تھی اور یوں لگتا
 تھا کہ ساون کا سارا سیلا پن اس کے اندر آن سلا تھا۔ وہ قطرہ، قطرہ بہہ رہی تھی۔ ٹپ، ٹپ کہیں دور سے آواز آتی
 تھی مگر معلوم نہ پڑتا تھا کہ کہاں پر بادل برس۔

”خولہ..... خولہ.....“ آواز اک دفعہ پھر سے آئی۔ وہ ابو تھے مگر وہ تو بہری تھی۔ سنی تو آخر سنی کیسے..... جو
 اب ہوا تھا..... ایسا تو وہ مگر بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ گمان کی گرد بھی اسے نہیں پاسکتی تھی جو کہ اب ہوا۔ ٹھیک ہے مزہ
 کے ساتھ برا ہوا..... حادثہ تھا جو کہ ڈھے پڑا۔ وہ آیا، اس نے روندنا..... اور گزر گیا۔ چند دن..... چند روز..... چلو
 مہینہ دو مہینہ..... لوگوں کی باتیں اور ان باتوں کا زہر..... سنا اور برداشت کر لیا لیکن جیسا بھی کڑا وقت تھا۔ جیسا بھی
 سخت حادثہ تھا..... کتنا ہی درون ناک البیہ تھا۔ وہ گزر چکا تھا۔ اسے گزر رہی جاتا تھا لیکن نہیں..... وہ تو مزہ احمد کے اندر
 جیسے ٹھہر چکا تھا۔ اس نے مزہ احمد کو پکڑے رکھا تھا۔ وہ ابھی تک اس فیز، اس حادثے کے اثر سے باہر نہیں نکل سکی تھی
 اور حادثے نے اسے کیسے روندنا..... کیسے اس کے دل کے وجود پر اپنے بھاری بوٹوں کے نشان چھوڑے تھے، یہ تب
 معلوم ہوا کہ جب اس دن خولہ نے مزہ کے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رومال تھا اور رومال میں
 کوئی شے جسے وہ ناک کے پاس کیے سوکھ رہی تھی قطعاً اس بات..... سے بے خبر تھی، غافل تھی کہ دروازہ کھول کر کوئی
 کھڑا اسے دیکھ رہا ہے۔ خولہ چند لمحے الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھتی رہی یوں جیسے وہ سمجھ نہ پائی ہو اور
 پھر..... پھر جیسے ہی سمجھ آئی کوئی چیز، اک تیز جھپٹتی ہوئی لہری صورت اس کے ناک کے تھنوں سے ہوتی پورے جسم
 میں پھیلی تھی۔ یوں جیسے اس کی سانس کھینچ لی گئی ہو۔ اگلا قدم عین فطری تھا، اس نے جھپٹا مار کر مزہ کے ہاتھ سے وہ
 رومال چھینا اور رومال میں موجود چیز لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری اور اب..... اب وہ دونوں ہی شاک کی بدترین حالت

"glue sniffing" خولہ کے لب بے آواز ملے اور اس نے بے حد، بے حد بے یقین ہو کر اس کو دیکھا تھا۔ پھر اس کی نظروں کا زاویہ بدلا اور اس نے مزہ کو دیکھا اور جب وہ مزہ کو دیکھتی تھی تو یوں محسوس ہوتا کہ حیرت اک لاوا تھا جو کہ اس کی آنکھوں سے ابلتا تھا اور مزہ کے وجود پر جاگ رہا تھا۔ خولہ چند لمحے بدترین انکشاف کے زیر اثر ساکت، بے حس و حرکت کھڑی رہی اور پھر..... اس کے بعد اس نے دوسرا کام وہ بھی کیا تھا جو اب بھی کبھی حالت میں کرنا چاہیے تھا۔ وہ ڈیرنگ ٹیبل کی طرف بڑھی تھی اور اب وہ ایک، ایک کر کے ساری دراز کھول کھول کر کھنگالتی جا رہی تھی۔ اسی طرح اس نے سائڈ ٹیبل کی دراز بھی کھول کر نیچے الٹ دی تھی۔ الماری کو کھنکھارے پکڑے نکال کر باہر پھینکے، سیف لاک کو کھنگلاؤ، کچھ ڈھونڈ رہی تھی اب اور اس کے ہاتھ میں مطلوبہ تھی۔ وہ اس موڈی چیز کا شابر تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اس شابر کو پکڑے یقین کر لینے کی پوری کوشش کرتی رہی اور پھر..... پھر اس نے غصے سے پیش سے پُرو ہو کر پوری قوت سے شابر مزہ پر دے مارا تھا۔ اور بس اسی پر بس نہ کیا تھا آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑتے ہوئے اس نے کھینچ کر زور سے الٹے ہاتھ کا تھپڑ بھی اسے دے مارا تھا۔ پھر چپکے کے ساتھ اسے پرے گرایا۔ اور اسے نہیں معلوم تھا کہ ایسا کرتے ہوئے وہ رو رہی تھی۔ مزہ گال پر ہاتھ رکھے، ہیڈ پہلو کے بل گری بے یقینی سے اسے دیکھتی تھی اور وہ..... وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھاے نیچے نیچے چلی گئی۔

”یہ..... یہ کیا ہو گیا تھا کیا؟ تو کیا..... کیا مزہ addict ہو چکی تھی؟“

☆☆☆

مزہ دراصل clinical depression کا شکار ہوئی تھی۔ پہلے اس کا رشتہ طے ہو کے نہیں دے رہا تھا پھر جب یہ مسئلہ حل ہوا تو عین شادی سے چند روز قبل شادی ٹوٹ گئی..... وہ بھی اس کی مرضی کے بنا اور چھوٹی ہونے کی وجہ سے وہ جتنی لاڈلی تھی اتنی ہی حساس بھی..... حادثہ اس پر پورے معنی و مفہوم کے ساتھ اثر انداز ہوا اور اسے نفسیاتی طور پر بری طرح سے مجروح کر کے رکھ گیا تھا۔ وہ ریکور نہیں کر سکی تھی..... مواد آن نہیں کر سکی تھی۔ وہ اسی آلے کے تختے میں پھنسی رہ گئی تھی۔ شروع میں وہ روئی رہتی تھی پھر اس کی نیند اور بھوک اڑ گئی۔ اس کا وزن دنوں میں گرا تھا۔ ایسے ہی دنوں میں اتفاقاً اس کے ہاتھ یہ چیز لگ گئی جو کسی چیز کو جوڑنے کے واسطے اس نے استعمال کی اور پھر اس کے ہاتھوں یہ لگی رہ گئی تھی۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹی تو ایک خوشبو نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے، کسی خیال کے تحت اس نے اپنے ہاتھوں کو سونٹھا اور حیرت انگیز طور پر اسے وہ خوشبو، جو کسی بھی نارمل انسان کو خوشگوار محسوس نہ ہوتی۔ اسے وہ خوشگوار اور بے حد مہلکی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بار بار ہاتھوں کو ناک کے قریب لے جا کر سونٹھتی رہی اور پھر اس رات..... اس رات بنا کسی کوشش، بنا کسی دوا کے وہ ایک چر سکون نیند سوئی تھی۔ پھر تو سمجھو روز کا معمول ٹھہرا۔ وہ اس خوشبو کو سونٹھتی اور سارا درہ، ساری تکلیف، ساری اذیت اور ساری جلن پتا نہیں کہاں چلی جاتی تھی۔ اس کے اعصاب ریلیکس ہو جاتے تھے اور وہ سکون کی ایک پُر لطف کیفیت سے دوچار ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ مسئلہ میریس ہے مگر علاج سے، تو جسے حل کیا جاسکتا تھا اور یہ کہ ابھی وہ پوری طرح سے ایڈکٹ بھی نہیں ہوئی تھی سو امید پوری طرح سے موجود تھی۔ اور اس ٹھنڈے، ملے چھت کے فرش پر بیٹھے ہوئے خولہ نے ایک فیصلہ کیا تھا۔ تنہا، اکیلے اور شکرت رہنے کے باوجود..... اس نے ریزہ، ریزہ بکھری ہمت کو جمع کیا اور اٹھ کھڑی ہوئی تھی..... وہ اب مزید ایک گھریلو، عام شادی شدہ عورت نہ رہی تھی۔ وہ فیملی میں کام کرنا جانتی تھی۔ وہ اب پریکٹیکل وومن تھی۔ اسے جیسے اکیلے فیصلے کرنے کی عادت سی ہوئی تھی۔

☆☆☆

ایک ماہ 6 سالہ ایک دم انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

”مزے جہانگیر..... یہ ناممکن ہے..... آپ کے پیریڈز، وہ کس طرح سے میچ ہوں گے۔ ایک دو پیریڈز کی بات ہو تو substitute لگایا جاسکتا ہے مگر 5، 6 پیریڈز..... مجھے حیرت ہے کہ آپ نے ایسی درخواست کی۔ میں بورڈ آف ڈائریکٹرز کو کیا جواب دوں گی اس فور کا۔“

”مس مفتی میری بہن بہت بیمار ہے اور اس کو کئی کئی کی ضرورت ہے۔ میرے علاوہ اور کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کی کثیر کر سکے..... میرا آدھا دن تو دوسرا اسکول میں ہی گزر جاتا ہے۔ رہا باقی آدھا دن تو اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔ اس کو بھرپور توجہ کی ضرورت ہے ورنہ وہ دیکھو نہیں کر پائے گی۔“ اس نے اپنی مجبوری بیان کی اور وہ دونوں ہی اب خاموش تھیں۔

”اگر میں کوئی بیماری کا.....“

”نہیں مزے جہانگیر..... میں وہ نمبر کام کرتی ہوں اور نہ ہی ایسا کسی دوسرے کو کرنے دے سکتی ہوں۔ آپ کے مسئلے کا یہ حل ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی کلاسز میں اور چلی جایا کریں۔ گو کہ مجھے اس کے لیے بھی پورے ٹائم ٹیبل کو ہلانا پڑے گا اور دیگر اسٹاف کا بھی خیال کرنا ہوگا۔ مگر میں یہ کر لوں گی، آپ کے سارے پیریڈز اکٹھے کر دوں گی تاکہ آپ کو آسانی رہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔“ ان کا انداز لفظی تھا۔ خولہ چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی۔ جب وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کل، پرسوں..... کسی ایک دن جہانگیر کو جرمی جانا ہی تھا تو تب..... تب اسے اپنا اور پچھو کا خرچہ اٹھانا تھا۔ سو وہ چاہ کر بھی یہ جاب نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

”جھینک یوس مفتی..... جھینک یوسوچ.....“ اس نے ممزنیت سے کہا اور ان کے آفس سے نکل آئی تھی۔

یہ پہلا کام تھا جو اس نے کیا۔ دوسرا کام..... اسے ابو کے گھر شفٹ ہونا تھا، جس کے لیے اسے جہانگیر اور پچھو سے بات کرنی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پچھو اتنا مسئلہ نہیں کریں گی مگر جہانگیر..... اور جہانگیر کو وہ کبھی یہ بتانے والی نہیں تھی کہ مزہ glue sniffing کا شکار ہو رہی ہے اور جہانگیر..... وہ اس کی بات سن کر اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

”مزہ بچی تو نہیں ہے خولہ.....“

”ہاں، وہ بچی نہیں مگر وہ بیمار ہے جہانگیر.....“

”تو تمہارے وہاں جانے سے کیا ہو گا؟“ اس نے تکلیف سے جہانگیر کو دیکھا۔

”اب اب اس عمر میں اسے لے کر ڈاکٹرز کے ہاں چکر پہ چکر لگائیں۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہے جہانگیر، اسے مسلسل چیک اپس اور توجہ کی ضرورت ہے اور.....“ اس نے ذرا سے توقف کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے وہاں جانا ہے۔ چاہے تم رضامند ہو یا نہیں.....“ پھر اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔ جہانگیر کے ماتھے پر لکیریں ابھریں مگر وہ نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر پیکنگ کرنے لگی تھی۔ اسے عادت جو ہو گئی تھی اپنے فیصلے خود کرنے کی.....

☆☆☆

”آپ لوگ اپنا وقت اور پیسہ دونوں برباد کر رہے ہیں..... جب یہ ہونا ہی نہیں تو اس کے لیے کوشش ہی کیوں کی جائے۔“ وہ بی بی لاؤنچ میں بیٹھی تھی۔ سامنے اسکرین پر کوئی ڈراما چل رہا تھا اور وہ سیب کے بڑے بڑے بانٹس لیتے ہوئے انتہائی بے حسی اور بے پروائی سے بولی تھی۔ احمد صاحب کے چہرے کا رنگ بدلا..... خولہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دی اور کمرے میں جانے کا اشارہ کیا تھا۔ اس نے چند لمحے رک کر ان

”تمہیں کیوں لگتا ہے کہ ہم وقت اور پیسہ دونوں بر باد کر رہے ہیں اور یہ کس نے بتا دیا تمہیں کہ ایسا ہونا ہی نہیں..... کیا الہام ہوتے ہیں تمہیں؟“ وہ نرمی سے کہتے ہوئے اس کے پاس صوفے پر بیٹھی اور جھک کر اسٹرپ کھولتے ہوئے اس نے اپنے پیروں کو جوتوں سے آزاد کیا تھا۔

”مجھے جیسی لڑکی سے کون شادی کرے گا بھلا؟“

”ہاں، یہ تو سوچنے کی بات ہے کہ تم جیسی لڑکی سے بھلا کون شادی کرے گا؟ تم تو نلتکڑی ہو، اندھی ہو، بہری بھی ہو اور بد صورت بھی..... اور اوپر سے کافی بھی تو ہو۔“ خولہ اب بھی نرمی سے کہہ رہی تھی اور مزہ نہ رہنے بدل کر خشکیں لگا ہوں سے اسے دیکھا۔ احمد صاحب اور خولہ..... دونوں آج بھی کہیں سے ہو کر آئے تھے مزہ نہ کے سلسلے میں اور جب وہ دونوں اسی پروپوزل کو ڈسکس کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو تب مزہ نہ نے انتہائی بد مزاجی سے کہا تھا۔ خولہ نے اک نظر اسے دیکھا اور پھر اپنے جوتے اٹھا کر وہ کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ ٹھیک ہے وہ بہتر ہو رہی تھی مگر ایک چیز جیسے اس کے ذہن میں چپک کر رہ گئی تھی کہ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، نہیں ہو سکتی تھی۔ بھلا ایک ایسی لڑکی جس کی شادی عین شادی ہونے سے چند روز قبل ٹوٹ جائے اس سے کون کرتا ہے شادی..... یا گل ہی ہو گا کوئی..... خولہ جانتی تھی اس خوف، اس وہم سے باہر آنے کے لیے بھی اسے وقت چاہیے تھا اور ڈاکٹرز کہتے تھے کہ اس کا ”فوری حل“ یہی ہے کہ اس کی کہیں شادی کر دی جائے اور یہ جو ”فوری حل“ تھا ناں یہ اتنا فوری و ذریعہ پر نہیں ہو سکتا تھا۔ خولہ کو وہاں آئے کافی دن ہو چکے تھے اور وہ ایک بار پھر اسکول اور سسرال کے مابین سینڈ ویج بنی ہوئی تھی۔ دیکھ ایڈ پر وہ سسرال جایا کرتی تھی اور یہ چیز ایک بار پھر سے نئے سرے سے اس کی طاقت کو ختم کرنے لگی تھی۔ مسئلہ اب کی بار پھر وہی درپیش تھا۔ کوئی مناسب، ڈھنگ کا پروپوزل نہیں مل رہا تھا اور ڈاکٹرز کے مطابق اگر ایسا جلدی نہ ہوا تو مزہ نہ ڈریشن کے ایک بے فیئر میں داخل ہو سکتی تھی۔ وہ اس حد تک ناامید اور مایوس ہو سکتی ہے کہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے۔ اور یہ اب تک کی سب سے پریشان کن بات تھی۔ علاج ہو سکتا ہے، زخم مندمل ہو سکتا ہے، مرنہم رکھا جاسکتا ہے مگر جو انسان خود ہی ٹھیک نہ ہونا چاہے اس کا کیا..... کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

”ابو وہ بہت بری طرح سے ری ایکٹ کرے گی۔ میں جانتی ہوں ناں.....“

”اس میں ری ایکٹ کرنے والی کون سی بات ہے خولہ..... لڑکا اس سے عمر میں ذرا سا چھوٹا ہی تو ہے..... باقی تو یہ ایک بہترین پروپوزل ہے.....“ احمد صاحب حیران ہوئے۔

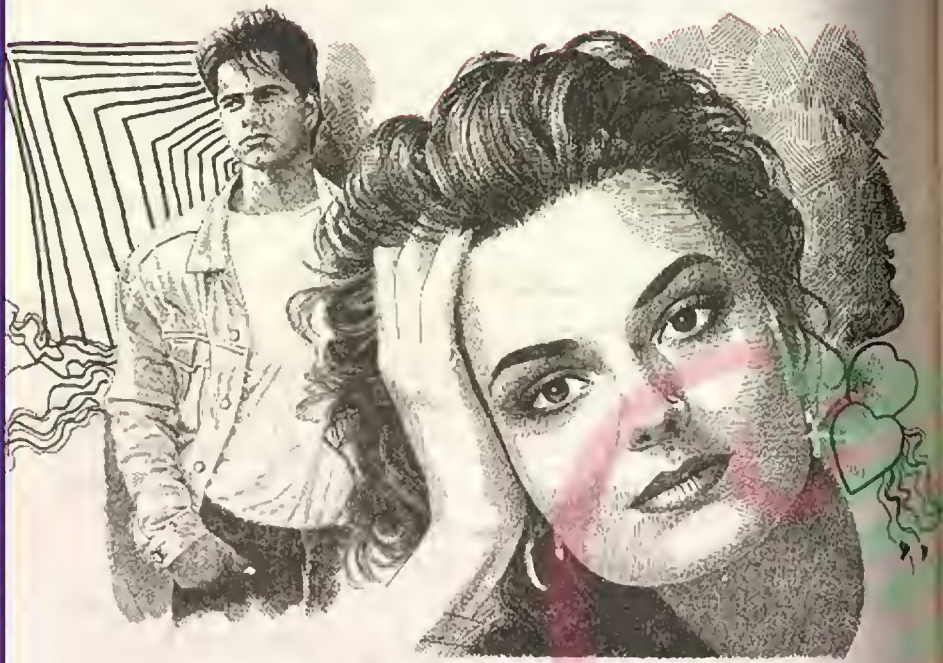
”ابو، ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی سوچ ابھی اتنی پریکٹیکل نہیں ہوئی۔ مرد کو عورت سے بڑا ہی تصور کیا جاتا ہے اور مزہ نہ..... میں کہہ رہی ہوں ناں وہ ری ایکٹ کرے گی۔“

”تم بات کرو..... دیکھو تو سہی بھلا وہ کیا کہتی ہے۔“

”ٹھیک ہے میں بات کروں گی اور اگر اس نے انکار کر دیا تو؟“ خولہ کی بات سن کر احمد صاحب خاموش ہو گئے تھے۔

”تو میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ یہ بیوقوفی ہے۔“ ذرا سے توقف کے بعد جواب آیا تھا اور خولہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

(جاری ہے)



فاصلوں کا فیصلہ

شایعہ

”ایمن کیا تم سنجیدہ ہو؟“ اس نے ایمن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا جو اپنے خوب صورت ناخنوں پر سے بے پروائی سے نیل پاش کھرچ رہی تھی۔
 ”بناؤ ناں.....“ وہ پریشانی سے پھر گویا ہوئی۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ ایمن نے ترجیحی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بھئی سب حالات و واقعات تمہارے سامنے ہیں.....“
 ”میں تو یہ جانتی ہوں کہ سیر بھائی تمہیں بہت چاہتے ہیں۔“
 ”ہونہہ.....“ ایمن نے اپنی ناک چڑھائی۔
 ”اگر وہ مجھے چاہتا ہوتا ناں تو میں آج یہاں نہ ہوتی..... وہ تو خوش ہوگا کہ میں اتنی آسانی سے اس کی زندگی سے نکل گئی..... ہوگا اپنے دوستوں کے ساتھ سیر سپاؤں میں مصروف۔“
 ”اور وہ تمہاری ساس؟“ رابعہ بولی۔ ”وہ تو تمہاری سگی خالہ ہیں..... اور وہ گھر تمہاری سسرال ہی نہیں،

پورے خاندان پر اثر پڑے گا۔“

”بس بس رہنے دو رابعہ، سگی خالہ ہونہ۔۔۔!“
شادی کے بعد کوئی سگی خالہ والہ نہیں ہوتی اور نہ وہ خالہ کا گھر ہوتا ہے بلکہ وہ صرف ساس ہوتی ہیں اور وہ گھر صرف سرسرا ہوتا ہے، جہاں بہو سے کوئی خوش نہیں ہوتا ہے۔ اور تمہیں کیا لگتا ہے رابعہ، میں یہ سب نہیں سمجھتی، میں جانتی ہوں کہ امی اور خالہ امی، سگی بہنیں ہیں۔۔۔۔۔ اور اس فیصلے سے ان کے آپس کے رشتوں میں دراڑ آجائے گی۔۔۔۔۔ لیکن میں اب میر کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”اور تمہیں پتا ہے خالہ بنو کیا کہہ رہی تھیں؟ یہی کہ میر کے چہرے سے بالکل نہیں لگتا کہ وہ تمہارے جانے سے دکھی ہے یا پریشان۔۔۔۔۔ بلکہ وہ تو دینی جا رہا ہے۔۔۔۔۔ اور کافی خوش لگ رہا تھا۔“

”خالہ بنو؟“ رابعہ نے سوالیہ نظروں سے ایمین کی طرف چائے بڑھاتے ہوئے دیکھا۔ ”یہ وہی تو نہیں جو تمہاری امی کی کزن ہیں۔“

”ہاں، ہاں وہی لیکن امی ان سے بالکل سگی بہنوں کی طرح ملتی ہیں۔ وہ بچاری خود اتنی دکھی ہیں ابھی ان کی بیٹی آمنہ کو ڈائیورس ہوئی ہے اور ان کے شوہر کی جاب بھی چھٹ گئی۔ بچاری خود کافی پریشان ہیں۔ لیکن رابعہ سمجھے وہ اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتی ہیں، ایمان سے۔“ ایمین نے رابعہ کی آنکھوں میں بے یقینی دیکھتے ہوئے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں وہ تو تمہیں ضرور چاہتی ہوں گی۔۔۔۔۔ لیکن یہ معاملہ تمہاری اپنی زندگی کا ہے اور ایمین تم جذباتیت سے نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔“ رابعہ اس کی بیٹ فریڈنٹی اور سچے دل سے اس کی خیر خواہی۔ وہ دونوں بچپن کی دوست تھیں اور رابعہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایمین کے فیصلوں میں جذباتیت زیادہ ہوتی ہے۔

”اچھا رابعہ۔۔۔۔۔ میں چلتی ہوں، بس تم جلد از جلد کسی جاب کے بارے میں بتانا۔ آج موسم بھی ابراؤد ہو رہا ہے ایسا نہ ہو کہ برس پڑے۔“ وہ رابعہ کے روکنے پر

لہر رہی کی۔ بس میر اکام یا درختا۔
راستے میں ہی ہلکی، ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ وہ تیز، تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف آ رہی تھی۔ دونوں کے گھر نزدیک ہی تھے۔ جبھی اس نے اپنے گھر کے دروازے کے پاس خالہ بنو کو اسکوٹر سے اترتے دیکھا۔

”ارے ایمین تم کہاں پھر رہی ہو؟“
”خالہ میں رابعہ کی طرف گئی تھی۔“
”اس موسم میں؟“ انہوں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے ایمین کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔
”ہاں وہ خالہ بنو اسل میں، اس سے جاب کی بات کرنی تھی۔“

”اچھا! تو کیا اب تم جاب کرو گی؟“ انہوں نے گھر میں داخل ہو کر چادر اتارتے ہوئے پوچھا۔
”جی خالہ بنو اب ایسے تو نہیں بیٹھ سکتی کچھ تو کرنا ہو گا نا۔۔۔۔۔“

”باجی، میں نے تو بہت سمجھایا اسے مگر اس کی ضد ہے کہ جاب کرے گی۔۔۔۔۔ ذکیہ بیگم نے خالہ بنو کو پانی کا گلاس دیتے ہوئے کہا۔

”ارے ہاں بہن۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔۔۔۔۔ ”میری اتنی حسین بھانجی ناندروں کے ہاتھوں رُل گئی۔۔۔۔۔ سچی جب بھی اس کے بارے میں سوچتی ہوں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں اور ساتھ ہی آنکھوں سے تادیدہ آنسو صاف کرنے لگیں۔

”میں نے تو صبر (ایمین کی ساس) سے صاف کہہ دیا کہ تم نے قدر نہ کی، میری پھول سی بچی کی۔“ انہوں نے ایمین کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

”اور اسے دیکھو الٹا مجھے کہہ رہی ہے کہ ایمین کو گھر بسانا نہیں آتا۔۔۔۔۔ نہ اٹھنے بیٹھنے کا ڈھنگ ہے نہ ہی ہنسنے بولنے کی تمیز۔۔۔۔۔ منہ پھاڑ کر تو ہنستی ہے۔“

”میرے بارے میں خالہ امی نے یہ کہا؟“ ایمین بیٹھے سے کھڑی ہوئی۔

”ہاں تو اور کیا۔۔۔۔۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس خالی کیا۔

”اور کیا، کیا کہا انہوں نے؟“ ایمین نے غصے سے پوچھنے لگی۔

”ارے بیٹا جانے دو..... خواہ مخواہ کی چغلی ہو جائے گی اور میری عادت تو ہے نہیں کہ کسی کی پیٹھ پیچھے بات کروں..... میں تو صاف بات کرتی ہوں کسی کو بھلی لگے چاہے بری..... لگی لپٹی تو ہم سے ہوتی نہیں ہے بھیا! میں نے صاف بول دیا کہ ایمین تو اتنی حسین ہے اور اس کے لیے تو بہت رشتے تھے، تمہیں اپنا کچھ کراپنی چاندی ہنچی دی تھی..... اور اب تمہیں اس میں کیڑے نظر آنے لگے..... پتا ہے وہ کیا کہنے لگیں کہ صرف صورت ہی سب کچھ نہیں ہوتی..... سلیقہ، تمیز بھی ہونا چاہیے جو ایمین میں نہیں ہے، شوہر کی پسند ناپسند، اس کا خیال رکھنا اچھی بیوی کے اوصاف ہیں..... جو ایمین میں ناپید ہیں..... صرف اسے حسن پر ناز کرنا، ہن مانی کرنا اور ایسی لڑکیاں گھر نہیں ہٹا سکتیں۔“ ایمین حیرت سے منہ کھولے انہیں سن رہی تھی۔

”میں نے تو صاف کہہ دیا کہ اگر اتنی بری ہے ہماری بچی تو بھیا فارغ کر دو اور ہماری جان بخشو.....“

”کیا؟ باجی آپ نے ایسا کہہ دیا۔“ ذکیہ بیگم نے وہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”ایسا کیوں کہہ دیا آپ نے..... میاں، بیوی کے درمیان لڑائی جھگڑے ہو ہی جاتے ہیں پھر صبرِ صفائی بھی ہو جاتی ہے۔“

”دیکھو ذکیہ..... ایمین کو میں نے ہمیشہ اپنی بچی کی طرح سمجھا ہے..... اور یہ کوئی اتنی گری بڑی نہیں ہے کہ کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ بھی بول دے اور میں چپکی بیٹھی سنتی رہوں.....“ غصے سے خالہ بنو کے نتھنے پھول رہے تھے۔

”اور تم بھی کسی خوش فہمی میں مت رہنا کہ میرا ایمین کو لینے آئے گا..... اس نے کہا ہے تم ناک بھی رگڑ لو تو بھی وہ خود ایمین کو لینے نہیں آئے گا..... اسے خود آنا ہو تو آئے..... اور ہماری شرطوں کے ساتھ۔“

”کیسی شرطیں باجی؟“ ذکیہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

”ارے بیبی کہ ایمین ان کی مرضی کے بغیر کہیں نہیں

جاسکتی تھی کہہ بھی نہیں..... اور موبائل فون بھی استعمال نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ہر وقت موبائل میں ہی مصروف رہتی تھی..... اور گھر کے سارے کام کاج بھی کرے گی..... ارے تو تم کیا ایمین کو وہاں غلامی کرنے بھیجو گی..... بتاؤ.....؟“

”نہیں امی.....! میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ایمین نے خالہ کی باتیں سن کر رونا شروع کر دیا تھا۔ ذکیہ بیگم سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھیں۔

”مجھے اب وہاں سب لوگوں سے نفرت ہو رہی ہے، کوئی اتنا کیسے بدل سکتا ہے۔“ ایمین روتے ہوئے بول رہی تھی۔

”اور ایمین تم کان کھول کر سن لو..... میرا فون آئے تو اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، تم کوئی فالتو نہیں ہو کہ جب چاہا وہ کرا دیا اور جب چاہا منہ لگا لا۔ یہ سلسلہ بس اب ختم ہی سمجھو.....“ انہوں نے ہاتھ جھاڑنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

”ایمین تم جاب کا کہہ رہی تھیں ناں، میرے ایک جاننے والے ہیں، ایسا کرتے ہیں ان سے مل لیتے ہیں..... ہو سکتا ہے کہ تمہارا کام بن جائے.....“

”ہیلو.....“ دوسری طرف سے ایمین کی مسلسل خاموشی پر رابعہ کو تشویش ہوئی۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں.....“ ایمین کی بھگی، بھگی آواز سنائی دی جیسے وہ رو رہی ہو۔

”ایمین سب خیریت ہے؟“ رابعہ پریشانی سے پوچھ رہی تھی۔

”رابعی، میرا سمجھتا ہے میں اس کی دولت پر مرتی تھی اسی لیے میں نے اس سے شادی کی ورنہ اس کے لیے تو بہت اچھی دولت مند گھرانوں کے رشتے موجود تھے اور یہ کہ اس نے اپنی غریب کزن پرتس کھا کر شادی کی تھی اور خالہ امی کہتی ہیں کہ میں بانجھ ہوں اسی لیے ان کو اب تک اولاد کی خوش بھی نہیں دے سکی۔“

وہ اب سسک رہی تھی، ایمین کی بات سن کر رابعہ بھی

دنگ رہی۔“

”کیا؟ یہ سب سیر بھائی نے ہی کہا ہے؟“

”تو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں..... رابعہ اس نے ایسا کیوں کہا.....“ وہ باقاعدہ روپڑی تھی۔ ”میں اسے بھی معاف نہیں کروں گی۔“

”ایمن پلیز سنبھالو خود کو..... ایسا بھی تو ہو سکتا ہے جیسے بعض اوقات ہم غلط فہمی کی دیوار اتنی اونچی کر لیتے ہیں کہ جو نہ بھی کہا گیا ہو وہ بھی سنا لی دینے لگتا ہے۔ کیا پتا کچھ ایسا ہی ہوا ہو..... اور تم آنکھ بند کر کے اس سنی سنانی پر اعتبار کر رہی ہو۔“

”کیا مطلب رابعہ.....؟“

”اچھا اس پر پھر بات کریں گے۔ بس تم میرے ساتھ کل آفس چل رہی ہو اور میں تمہیں پک کروں گی..... سمجھیں۔“

اگلے دن وہ صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی تھی۔ امی کو معلوم تھا وہ کہاں جا رہی ہے، بولیں کچھ نہیں بس اسے دیکھتی رہیں..... کچھ دیر میں رابعہ رکشے میں اسے لینے آگئی تھی اور اب وہ دونوں ایک شاندار آفس میں بیٹھی تھیں..... اور اس شخص کے انتظار میں تھیں۔ جس سے رابعہ کو ایمن کو دانا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور کوئی بہت غلٹ میں آفس میں داخل ہوا..... اور آتے ہی رابعہ سے لیٹ ہونے کی معذرت کرنے لگا۔ ایمن کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ اس نے جیسے ہی آنے والے کو مڑ کر دیکھا..... وہ اچانک کھڑی ہو گئی پھر اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا مذاق ہے رابعہ..... تم میرے ساتھ اس طرح کرو؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”ایمن پلیز ایجوونی مت کرو، تم سیر بھائی کی بات تو سن لو۔“

”مجھے ان کی کوئی بات نہیں سننی..... جون لی ہے وہی کافی ہے، اب مجھے ان کی کسی بات کا اعتبار نہیں۔“ اس نے نیمل پر سے اپنا ایک اٹھا کر کندھے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

”تو مت کرو اعتبار.....“ سیر اس کے قریب آیا۔

”پلیز سیر بھائی..... اور تم ایمن پلیز تم دونوں بیٹھ

جاؤ۔ میں تمہاری دوست ہوں صرف میری خاطر۔“ رابعہ کی آنکھوں میں التجا تھی..... ایمن کرسی پر نلنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔

”تم لوگ آپس میں بات کرو، میں تم لوگوں کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔“ رابعہ تیزی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی..... اور ایمن بیچ و تاب کھا کر کھڑی رہ گئی۔

”کیوں بات کرو میں! میں ایک غریب کزن، جس سے انہوں نے ترس کھا کر شادی کی تھی۔“ وہ..... بڑبڑا رہی تھی، سیر جو انگلیوں سے عادتاً اپنے بال سنوار رہا تھا۔ ایک دم رکا..... اور بغور ایمن کی طرف دیکھا..... اور

ایمن جو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ اس سے مسلسل اپنی طرف دیکھنے سے زور ہو گئی۔ وہ دل کشی سے مسکرایا۔

”کیوں بھی، تم میں کیا کمی تھی جو میں تم پر ترس کھاتا بلکہ جہاں تک میں نے سنا ہے کہ تمہارے لیے کافی مالدار گھرانوں کے لڑکے جھولی پھیلائے کھڑے تھے بلکہ غالباً اب بھی تمہارے خواہش مند ہیں۔“

”ہاں تو اس میں کیا جھوٹ ہے۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ویسے بھی آپ کے گھر والوں کی نظر میں مجھ میں کوئی خوبی تو ہے نہیں..... ہنسنے کی تمیز نہ بولنے کی، بیٹھنے کی نہ اٹھنے کی۔“

”ہاں اور میری تو بہت سی لڑکیوں سے دوستی ہے، جن سے میں رات، رات بھر موبائل پر باتیں کرتا رہتا ہوں۔“

”تو کیا نہیں ہے تمہاری لڑکیوں سے دوستی؟“ وہ چمکی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوہ کم آن ایمن.....“ وہ زمری سے گویا ہوا۔ ”ان سب کو تم بھی اچھے سے جانتی ہو اور ان فیکٹ تمہاری بھی

ان سے دوستی ہے۔ لیکن میں نے کب ان سے رات بھر باتیں کی ہیں؟“ ایمن اس کی بات پر گڑبڑا گئی۔

”اس پر مجھے اعتراض ہے، کیا تم جاؤ گی..... یہ سب کس نے اڑائی ہے۔“ وہ بغور سے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں، آں..... رات بھر نہیں کس.....“ وہ ہلکائی۔

”لیکن کیا..... ایمن تم نے مجھ پر الزام لگایا..... اور

کچھ بھی نہ سوچا۔“ وہ رکا۔

کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ، شرمندہ سی سکرادی۔

”بس، مجھے بھی غصہ آ گیا تھا۔“

”اور ہمارے اسی غصے کی وجہ سے سچ والے لوگ فائدہ اٹھا رہے تھے، ہمارے درمیان مزید غلط فہمیاں ڈال کر۔“

”کیا مطلب؟“

”تمہیں پتا ہے کہ خالہ بخو نے اپنی آمنہ کے لیے اکی کو کہا ہے۔۔۔۔۔“

”کیا کہا ہے؟“ وہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہی کہ وہ آمنہ کا رشتہ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“

”کیا؟“ وہ اس کی آدھی بات سن کر چیخی۔

”تم ایسا سوچ بھی کیسے ہو سیر۔۔۔۔۔“

”میں نہیں سوچ رہا، بیوقوف لڑکی۔۔۔۔۔ بلکہ وہ ایسا

چاہتی ہیں۔“ سیر نے ایمن کے چہرے پر سے بالوں کی

لٹ کوڑی سے ہٹایا۔ وہ جیسے سکتے میں تھی۔

”میرے خدایا! میں انہیں کیا سمجھتی تھی۔۔۔۔۔ اور

وہ۔۔۔۔۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔ ”اور میں اپنی

بیوقوفی میں اپنا گھر پر باد کرنے لگی تھی۔“

اور سیر سوچ رہا تھا کہ اگر اس روز رابعہ اسے نہ ملتی تو

شاید وہ بھی۔۔۔۔۔ یہ رابعہ ہی تھی، جس نے سیر سے بہت سی

باتوں کے بارے میں باز پرس کی۔۔۔۔۔ اور یوں بہت سے

حقائق سے پردہ اٹھا تھا۔ ورنہ دونوں اپنی اس جنگ میں سب

کچھ بار جاتے، بعض لوگ اپنے مفاد کے لیے اس طرح آپ

سے کھیل جاتے ہیں۔۔۔۔۔ کیونکہ آپ ان پر اندھا اعتماد کر کے

ثابت کرتے ہیں کہ آپ واقعی اندھے ہیں۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔۔۔۔۔ رابعہ جوں لے کر داخل

ہوئی اور دونوں کے چہروں کو بخوردیکھا۔

”میرا خیال ہے کہ مجھے اکیلے ہی واپس جانا پڑے

گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ ایمن سنجیدہ انداز میں بولی۔ جس پر سیر

اور رابعہ نے چونک کر ایمن کو دیکھا۔۔۔۔۔ ایمن نے باری،

باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ”بلکہ ہم دونوں تمہیں گھر ڈراپ

کر دیں گے۔“ ایمن نے ہنسنے ہوئے سیر کا ہاتھ تھاما۔۔۔۔۔ اور

اس کی ہنسی میں رابعہ اور سیر نے بھی ساتھ دیا۔

”اور ایمن کیا واقعی میں اتنا برا تھا کہ تم نے ایک وفد بھی مجھ سے بات کرنا گوارا نہیں کی۔“ اس کے لہجے میں دکھ بول رہا تھا۔ ”تمہیں جو بھی گلہ شکوہ تھا تم مجھ سے کہتیں، مجھ سے لڑتیں، اس طرح گھر چھوڑ کر تو تم نے مجھے ہی رسوا کر دیا۔“

”میں نے کوئی تمہیں رسوا نہیں کیا۔۔۔۔۔ بلکہ خالہ امی نے ہی مجھے بانجھ قرار دے دیا۔۔۔۔۔ کہ میں ان کو اولاد کی خوشی تک نہیں دے سکی۔“

”کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ جیسے غصے سے ایک دم کھڑا ہو گیا۔

”تمہیں بانجھ بنا دیا امی نے؟ یا تم نے جو مجھ پر

الزام۔۔۔۔۔ وہ رکا۔

”یہ الزام تو تم نے مجھ پر لگایا ہے ایمن لیکن میری

بے غیرتی کہہ لو یا میری اعلیٰ ظرفی کہ میں پھر بھی تمہارے

سامنے بیٹھا ہوں۔“ وہ تاسف سے مسکرایا۔ ”صرف اس

محبت کی وجہ سے جو مجھے تم سے ہے اور واقعی اس محبت نے

مجھے بہت خوار کیا ہے۔“ وہ دکھ سے ہنسا اور اس کی ہنسی میں

جیسے کچپاں سی چھپی تھیں۔

”میں؟“ ایمن نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ

کیا۔۔۔۔۔ ”میں تم پر اتنا گھٹیا الزام لگاؤں گی۔۔۔۔۔ تم ایسا سوچ

بھی کیسے سکتے ہو۔“ وہ حیرت زدہ تھی۔ ”کس نے کہا ہے

یہ سب۔۔۔۔۔ مجھے بتاؤ۔۔۔۔۔“ وہ غصے میں اپنی مٹھیاں سمجھ

رہی تھی۔

”کیا فرق پڑتا ہے، تم کیا کر لو گی؟“ وہ سوالیہ انداز

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں اس کا منہ نوچ لوں گی۔“

”تم ایسا کیوں کرو گی ایمن؟ تمہیں تو اب میرے

ساتھ رہنا ہی نہیں ہے، تم تو کورٹ میں خلع کا ٹکس دائر

کرنے والی ہو۔“ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

”ہاں! میں نے ایسا کہا ضرور تھا لیکن میرا ایسا کرنے

کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”ایسے ہی ایمن میں نے بھی تمہیں غصے میں الٹا

سیدھا بول دیا تھا۔ میں تمہیں عہد نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ لیکن تم تو اپنے گھر جا کر بیٹھ ہی گئیں۔ میرا فون تک

رہیو نہیں کیا۔“ اب وہ دوستانہ انداز میں اس سے شکوہ

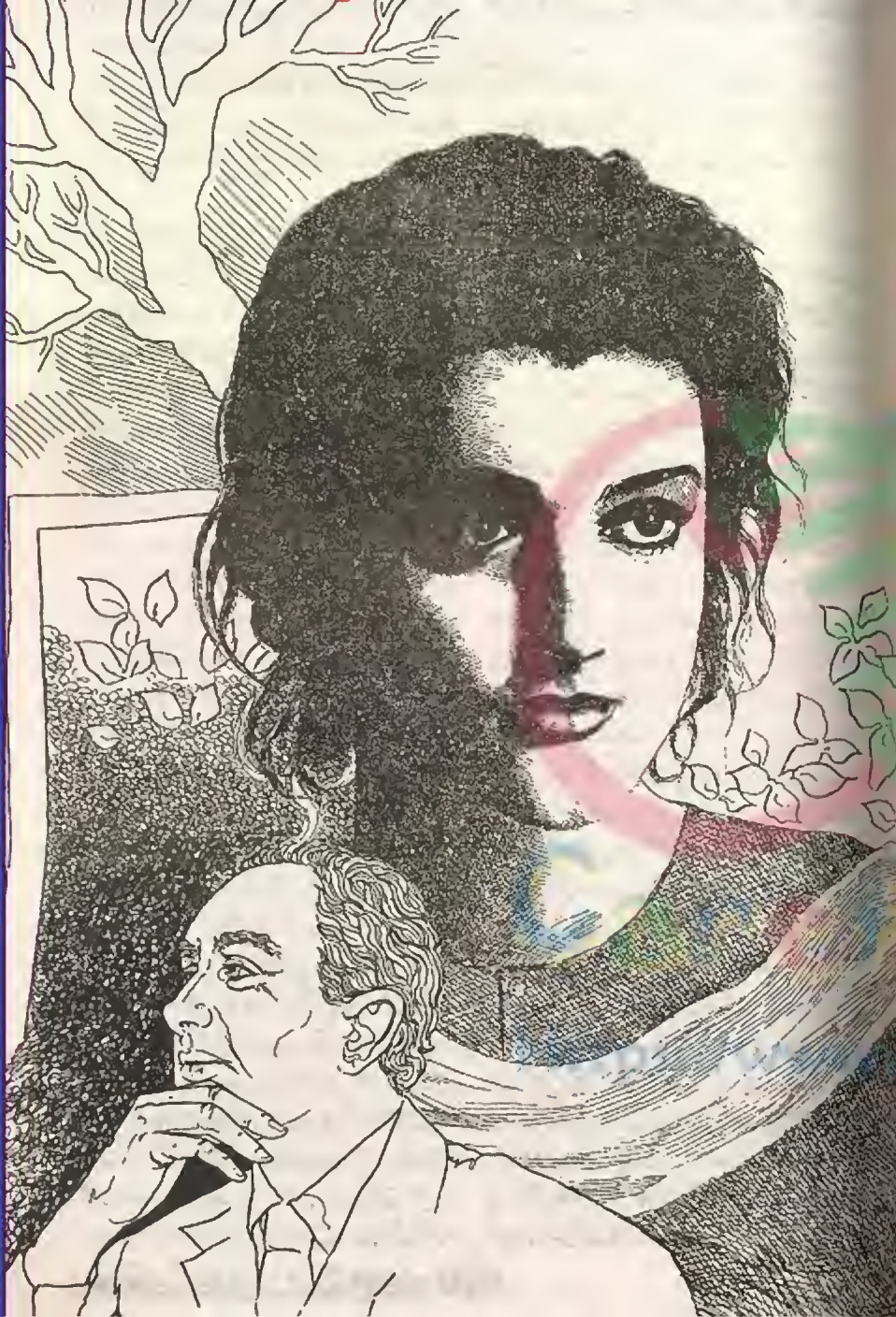


ناولٹ

بیگم جانجی

رفاقت جاوید

”اُف زندگی بھرا سڑکل کی اور آخر میں پایا کیا؟
 سسکیاں، حسرتیں، آہیں اور آنکھوں میں ساون
 بھادوں کی جھڑی..... جو طویل سے طویل ہوتی جا رہی
 ہے، رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ کیا تروں.....؟“
 وہ خود کلائی کرتے ہوئے اپنے بھیکے ہوئے چہرے کو
 دوپٹے سے صاف کرنے لگیں۔ شام کا دھندلکا نہ جانے
 کب سے تاریکی کا چیرا بن چکا تھا۔ انہیں اس کی
 خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے بیٹے اور بیو کے گھر کے



انداز میں کہا۔

”باجی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں..... بس اب میرا یہاں کام کرتے، کرتے دل بھر گیا ہے۔“ وہ آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”اس لیے میں اب نہیں رکوں گی، میری اپنی زندگی ہے جی.....“

”ہاں تمہاری یہی تو مشہوری ہے جھمو..... لیکن میں نے یقین اس لیے نہیں کیا تھا کہ تمہیں معصوم اور ان بیگناہ تو تیرے سمجھ کر کسی کی ایک نہ مانی..... آخر تمہیں شرط پر رکھ لیا، آج تو تم نے وہی کر دکھا یا جو میری سہیلیاں کہا کرتی تھیں کہ تمہارے پاؤں میں چکر ہے، تم کسی ایک جگہ تک ہی نہیں سکتیں، آج میں شرط ہار گئی۔ فی الحال فوراً یہاں سے جگن میں جاؤ اور میری بارہ سہیلیوں کے لیے سچ تیار کرو تا کہ میں ہاری ہوئی شرط کا ہر جانہ آج ہی ادا کر دوں، اس کے بعد تم مجھے یہاں نظر آئیں تو یہ جو تمہارا تین سال کا بچہ تمہارے پیچھے روں، روں کرتا ہو امیر المند پریشربانی کیے رکھتا ہے نا اسے اٹھا کر باہر پھینک دوں گی، جاؤ اپنا کام ختم کرو..... پھر تمہیں دو ہفتے کے کام کی تنخواہ دوں گی۔“ شمرہ نے غصے میں کھولتے ہوئے کہا۔

”باجی! مجھے تو اہ نہیں چاہیے، میں سمجھوں گی میرے بیٹے کے سر کا صدقہ ہے، جس کی آپ کو ضرورت تھی۔“ وہ دھیمے لہجے میں طنزیہ انداز میں بولی..... اور تیزی سے بچے کو اٹھا کر داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”اس کا دماغ ہی خراب ہے، نہ جانے گھر، گھر کیا تلاشی پھرتی ہے؟ آج تک کوئی بھی یہ معاملہ نہیں کر سکا۔ حالانکہ فطرتاً عورت لا جواب ہے، خوش خلقی، خدمت گاری اور رکھ رکھاؤ اس پر ختم ہے لیکن جب نوکری چھوڑنے کا فیصلہ کر لیتی ہے تو پھر کسی کے غصے اور خفگی کی پروا کرتی ہے نہ ہی دوسروں کی ضرورت و مجبوری اسے نظر آتی ہے۔ بچہ اٹھاتی ہے اور یہ جاوہ جا..... اس کا رخہ تو ملاحظہ فرمائیں کہ دو ہفتے کی تنخواہ کی بھی پروا نہیں کی۔ کام چھوڑنے کی وجہ بتانے کی بھی

حسابہ کر رہی ہیں۔

”کتنے اچھے تھے وہ دن جو بلال کے ساتھ گزر گئے۔“ اُن کے ذہن کے پردے پر جیکٹر پر بیٹے دنوں کے چیدہ، چیدہ مناظر آتے لیکن اضطراری کیفیت میں مندل ہو جاتے۔

ان کا مقدر بچپن سے ہی ایسا تھا جیسے آکاش پر کالے سیاہ بادل اور برستی ہوئی گاڑھی سیاہی..... جسے رب العزت کے سوا کوئی بھی مٹا نہیں سکا۔ تین سال کی عمر میں ماں کا انتقال ہوا تو باپ نے کسی سچ خاندان کی لڑکی سے شادی رچائی۔ ان کا خیال تھا کہ اس... شکرگزاری اور احسان مندی کے صلے میں وہ ان کی بیٹی کو مانتا کہ بھر پور پیار سے نوازی رہے گی..... اور لاڈلی بیٹی اسی کے سنگ ایک مکمل عورت بنے گی۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ جب کسی ملازمہ سے بھی نکاح کے دو بول رشتہ استوار کرتے ہیں تو پھر وہ ملکن کہلاتی ہے، بیوی کی تمام ذمہ داریاں اس نکاح نامے پر دستخط کرنے کے ہمراہی اس میں بیکار کرتی ہیں، کچھ ایسا ہی حال تھا ان کا۔ بیٹی کا بچپن مار پھنکار میں گزرا... جو خنی انہوں نے جوانی میں قدم رکھا، ان کی شادی خالہ کے بیٹے سے ہو گئی۔ اور وہ ہمیشہ خوشی کیے بعد دیگرے چار بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں بن گئیں اور ان کی زندگی اپنے شریف انفس شوہر کے سنگ تناسب سے رواں دواں رہی۔

☆☆☆

”جھمو میرے پاس تم بے حد خوش بھی ہو اور مطمئن بھی..... پھر میرا کام چھوڑ کر پڑوس میں کیوں جانا چاہتی ہو؟ اگر تنخواہ کا مسئلہ ہے تو بڑھادی ہوں، دیکھو تمہیں کام چاہیے اور مجھے تم جیسی با اعتماد عورت کا ساتھ..... تو پھر تم بار بار گھر کیوں بدلو.....؟ اور میں بی ملازمہ کی تلاش میں مغز ماری کروں؟ بہتر ہے ہم دونوں ایک دوسرے کی ہمراہی میں چلتے رہیں..... جب ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے خوش بھی

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء [190]

وہ نفرت آگئیں لہجہ میں بولی۔ ”جس کی بیوی بیڑ روڈن ہے اور بڑھا کھوسٹ باتونی اور لاغر..... ان کی نوکری پکڑی ہے بھمھو نے.....“

”مطلب کہ شمرہ شرط ہار گئی، فوری طور پر لنچ ہو جائے۔“

”انہوں نے چار میسے زیادہ آفر کیے ہوں گے، یہ تو ہوتا ہی تھا۔“ وہ قہقہہ لگا کر مسخرا نہ انداز میں بولیں۔

”لنچ دو بج بھول جاؤ، نئی ملازمہ تو آنے دو۔ ویسے بھی ابھی تو میں شکد ہوں، ذرا سنبھل تو جانے دو۔“ وہ ان کے ہاتھ پکڑ کر منمنائی اور گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

”نی الحال اس سردی میں گر مار گم جائے یا کافی کی ایک پیالی تو مل سکتی ہے ناں کہ وہ بھی کل پرسوں پر نال دو گئی۔“ دونوں بھی کبھی کرنے لگیں۔

”نوکر کے بغیر جینا مشکل ہے۔ لیکن ان کم بختوں کے ساتھ رہنا موت کے مترادف ہے، منہ پر پٹی باندھ لو اور پرس کی زپ کھول دو..... پھر بھی دغا دینے سے باز نہیں آتے، اس بار سوچا تھا کہ اپنی ہم جنس کو، ہی نرائی کر لوں..... کچھ تو دید لیا ظر رکھے گی۔ اس نے تو بھگو کر میرے منہ پر دے ماری ہے، یہ تو م ہے ہی نمک حرام جو مالک انہیں جوتی کی نوک پر رکھتا ہے، اس کے آگے پیچھے گھومتی ہیں۔ بہت عجیب مشعلی ہے اس کلاس کی۔“

وہ صوفے پر بیٹھتے ہی بولتی چلی گئی۔

”یار حوصلہ کرو.....! اور اب ڈنڈا رکھو ہاتھ میں..... آدھے مینے کی تنخواہ رکھو اپنے ضبط میں حفظ ماتقدم کے طور پر اور کھانے کے لیے اپنی ہوئی دال اور باسی چپاتی سے ان کا بھر و پیٹ، شرطیہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ ایک نے ہاتھ نچا کر تعقین کی۔

”بھئی یہ ظلم تو میں کرنے سے قاصر ہوں، جو خود کھاؤ وہی ملازم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلاؤ..... جب تک میرے ہاں لڑکے ملازم رہے میں ساتھ بٹھانے والا اصول بھانے میں نا کام رہی لیکن ان ملازمین کو

کے سر سے سینگ۔“ شمرہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ سے باہر رک کر شان بے نیازی سے چلتی ہوئی بھمھو کو حیرت اور تاسف بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ تین بچھے چھوڑ کر چوتھے محل نما بچکے کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی۔

”اچھا تو یہ ان کے گھر میں ملازمت کرنا چاہتی ہے، مزہ چیکو لو بھمھو..... کیا ساز مانا آ گیا ہے کہ پڑوسیوں کے دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ کیسے بے باکی اور دیدہ دلیری سے میری میڈ کو چالیا۔ ماما کا دور پہلو ہی میں تو کھڑا ہے، کیا مجال ہے کہ ایک گھر کے نکالے ہوئے ملازم کو نوکی پڑوسی، سنبلی یا جان پہچان والا اسے ملازمت دے دے، اب تو تاجدار اور ہنرمند ملازم کی یوں حفاظت کرنی پڑتی ہے جیسے اپنی سینہ دیمبل جو ان ہنچی کی کہ کہیں کسی کی نظروں میں ہی نہیں آجائے۔ چلو ممبر کا گھونٹ بھر کر انتظار کرتی ہوں اس کی واپسی کا..... اس شہر میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی وہ میرے جیسی باجی ڈھونڈ نہیں پائے گی۔“ وہ خود کھلائی کرتی ہوئی گیٹ کی اندرونی جانب مڑی ہی تھی کہ دائیں، بائیں کی رہائشی دوسیلیاں داک کرتے ہوئے اس سے اوپچی آوازیں بولیں۔

”شمرہ جلدی سے جا گرز پہن کر آؤ، مل کر واک کرتے ہیں۔“ شمرہ نے ان کی طرف مڑ کر دیکھا.....

آدھے منٹ میں ہی دونوں اس کے دو بدو کھڑی تھیں۔

”شمرہ کیا بات ہے..... کچھ پریشان نظر آ رہی ہو..... یہ اڑتی ہوئی چہرے پر ہوا یاں کیا پیغام دے رہی ہیں؟“ دونوں بیک زبان بولیں۔

”ہائے کیا بتاؤں؟ نظر لگ گئی کسی کی۔“ وہ ہر شکل بولی۔

”کس کو کس کی نظر لگ گئی بھئی، گھر میں تو خیریت ہے؟“ وہ اس کے قریب ہو کر راز دارانہ لہجہ میں بولیں۔

”اس کم بخت دو نکے کی بھمھو کو..... آنا قاتا دفغان ہو گئی۔ تنخواہ کا مطالبہ کیا نہ ہی میری ایک سنی.....

میں نے مکمل آزادی دے رکھی تھی کہ جو ہم کھاتے ہیں وہی تم لوگ بھی کھاؤ۔ پھر بھی وہ چند مہینوں کے بعد تنخواہ لیتے ہی غائب ہو جایا کرتے تھے، میں نے اس کا بھی خود کو مورد الزام ٹھہرایا کہ ہمارے درمیان ایک حد ہونی ضروری ہے۔“ وہ پڑھ روک سے بولی۔

”ارے تم نے تو میاں کی موجودگی میں بھی اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا شروع کر دیا تھا ناں، یہ اسی کا نتیجہ ہے شہرہ۔“

”بے شک انہیں تمام حقوق دینا ہمارا فرض ہے لیکن یاد رکھو کہ ہر شے، ہر تعلق کے درمیان ایک لکیر کھینچی ہوئی ہے۔“ (بھئی ملازم اور مالک کا بھی ایک تعلق ہی تو ہوتا ہو..... ملازم سے تعلق ہے ہی دینی، عارضی اور غیر پائدار..... وہ کبھی گھر کا فرد نہیں بن سکتا۔ یہ ان کی بد قسمتی ہے ہماری نہیں۔“

”ہاں سمجھ گئی..... اب نصیحت کرنا بند کر دو چلو اٹھو میرے ساتھ چائے دم دو.....“ تینوں مل کر چھوکی دھوکے بازی پر فاتحہ خوانی کرتی رہیں۔

☆☆☆

چھو بکٹی ملکتی سیکرٹری بلال خان کے گھر داخل ہوئی تو آمنہ بلال نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ انہیں صاف ستھری اجلی قبول صورت آیا مل گئی۔ آمنہ نے اسے اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ معمولی سا چٹکی پانی اور پھر رحم سے بیٹھ کر آمنہ کی عائیں دبانے لگی، بچہ ہم کر اس کی عائوں پر اوندھے منہ گر گیا۔ آمنہ نے اپنی نئی آیا کو آہستہ آہستہ اپنے کام اور روٹین سمجھانا شروع کی۔ فجر کی نماز کے بعد سے جو چھوٹے کاموں کی شروعات ہوتی اور رات سونے تک بڑے کاموں کے ہمراہ ایک ڈھیر لگ گیا۔ وہ تعجب اور خوف سے مالکن کے کام دل ہی دل میں کتنی چلی گئی۔

”آخری کام ذرا سا مشکل ہے۔“ آمنہ نے طویل سانس لے کر کہا۔

”جیکم صاحبہ آپ حکم تو کریں، میں کسی کام سے

میں اس کالونی کا ہر گھر چھان مارا..... مگر عزت نصیب نہ ہوئی۔ ان بڑے گھروں میں جس کو بھی دیکھا وہ بہت چھوٹا ہی نکلا۔ تو بس پھر میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکی۔ ہم لوگوں کے لیے عزت پہلے اور پیسہ بعد کی ضرورت ہے، میں نے خان صاحب کی بہت تعریف سنی ہے۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔ ”کہ وہ بے حد خدا ترس اور عبادت گزار انسان ہیں۔“

”عزت دینا اور لینا تو ہر انسان کا حق ہے، تم فکر مت کرو..... میری پہلو بھئی کی بیٹی تو شادی کے فوراً بعد بیرون ملک چلی گئی۔ دو بیٹے بھی شادی شدہ ہیں۔ وہ بھی اپنے روزگار کے حصول کی خاطر اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے..... دو بیٹے ابھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کے قریب ہیں ایک کراچی اور دوسرا لاہور میں زیر تعلیم ہے، صاحب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں، ایک بیمار بیوی کے ساتھ..... ہم میاں، بیوی کے لیے اس وقت کچن میں خانہ سال اور پیلر بھی ہے..... صفائی ستھرائی، دھلائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے ایک عمر رسیدہ عورت بھی ہے، ان کے ساتھ تمہاری کمپنی بھی رہے گی۔ جونہی اماں کے کام ختم ہوتے ہیں، وہ اپنے گھر چلی جاتی ہے اگر وہ میرے کاموں کی ذمہ داری اٹھالیتیں تو مجھے دوسری عورت کی ضرورت ہر گز محسوس نہ ہوتی۔“ وہ نرماسٹ سے بولیں۔ ”لیکن اب اس کی ہڈیوں میں جان ہی کہاں ہے؟“

”جی جیکم جی..... آپ بے فکر رہیں، آپ کی خدمت کرنا میرے لیے نیک جی ہے اور فرض بھی..... آپ میری ماں جیسی ہیں، آپ کو مجھ سے کبھی شکوہ شکایت نہیں ہوگی، مجھے تو آپ کی کمپنی ہی کافی ہے۔“ وہ عاجزانہ لہجہ میں بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ابھی تم نے آخری اور ضروری کام کے بارے میں سن کر فیصلہ کرنا ہے کہ میری خدمت گاری منظور بھی ہے کہ نہیں۔“ آمنہ بنجیدگی سے بولیں۔

”جیکم صاحبہ بتا دیں، میں اپنا چکا بھلا کام چھوڑ

پھر اس نے پاؤں اسی ہوں، آپ کا حاساں ہے۔ پھر میں
یہاں نہیں کر کے لایا ہے، منہ مانگی خواہ پر۔ مجھے مجبورا
یہ نوکری قبول کرنی پڑی..... ورنہ اس سنے کے ساتھ
تہیں بھی نوکری نہ کرتی..... اس پر توجہ دیتی، آخر دس
جماعتیں پڑھی ہوئی ہوں۔“ وہ دھکی لہجے میں بولی۔

☆☆☆

جنوری کے اوائل دن اور راتیں بے حد بخیر تھیں،
ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس بخیر بستی میں زمین اور آسمان یکجا
ہو گئے ہوں اور ان کے درمیان چرند، پرند، انسان اور حیوان
غرضیکہ ندی نالے، درخت اور پہاڑ زیدہ ہوں۔ آخری
شرط کے مطابق آمنہ کے کمرے میں بیڈ کی پانچویں کی جانب
مجموعہ گدے پر لیٹی گہری مٹھی نیند کی وادیوں میں تھی۔ آج کی
رات اس کے بچے نے بھی جو معمولی سی جنبش کی ہو۔ آمنہ
نے ہاتھ روم جانے کے لیے بلال کو آہستہ سے بلایا تو وہ
ایک دم سے چوٹے۔

”خان صاحب مجھے ہاتھ روم جانا ہے۔“

بلال توقف کے بعد پورے ہوش و حواس
میں آچکے تھے۔ انہوں نے بیوی کو جواب دینے کے
بجائے مجموعہ کو آواز دی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”بیگم جوانی کی نیند بڑے ہی ظالم طریقے سے
انسان کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، اس سے پہلے عمر
رسیدہ آیا تھا راتیں ساتھ چلتی رہیں، اب تم نے اس جوان
لڑکی کو اپنے گرم کمرے میں سلا لیا ہے، اس کے کان کے
پاس ڈھول بھی بجا دوں گا تو یہ کم بخت نہیں جاوے گی۔ قصور
گس کا ہوا..... میرا کہہ رہا؟“ بلال نے واکر ان کے
قریب کی انہیں سہارا دے کر بیڈ سے نیچے اتارا۔ واکر ان
کے ہاتھ میں تھا کر ان کے ساتھ زیر و میثر کی رفتار سے کمر
پر ہاتھ رکھ کر..... چلنے لگے۔ انہیں ہاتھ روم میں، بٹھا کر وہ
غصے میں کھولتے ہوئے کمرے میں آئے اور گدے کے
قریب بیڈ کرا سے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔

”بیگم صاحبہ اٹھ جائیں، یہ ڈیوٹی تمہیں بیگم نے
پہلے ہی سے بتادی تھی۔“

مجموعہ نے ان کے ہاتھ کو جھٹکے سے بڑے ہٹایا اور
کروٹ بدل کر غنودگی کے عالم میں بڑبڑائی۔

”میں جانتی ہوں تمہاری مجبور یوں کو..... مجھے یہ
سمجھ نہیں آتی کہ تم لوگوں کے والدین بیٹی کا رشتہ دیتے
وقت اندھے اور بہرے کیوں ہو جاتے ہیں؟ چری اور
اپنی شوہر تو بیوی کے کندھوں کا ایسا بوجھ بن جاتا ہے
کہ اسے پھینک سکتی ہے نہ اٹھانے کی ہمت رکھتی ہے
بیچاری..... اور پھر بچے پر بچہ.....“ آمنہ نے ترس و وحرم
سے اس کی طرف دیکھا۔ لاؤنج میں خاموشی چھا گئی۔
بچہ سکیاں بھرنے لگا تو مجموعہ نے آمنہ کی ٹانگیں دبا
جھجھوڑ دیں۔ اور بچے کو اٹھا کر لاؤنج میں ہی ادھر، ادھر
چکر لگا کر اسے بہلانے لگی کچھ دیر بعد دوبارہ ان کے
قریب ہی بیٹھ گئی۔

”مجموعہ تم مجھے بہت عقلمند دیکھتی ہو، یہ بتاؤ کہ اس
بچے کے ساتھ میرا کام کیسے کر دو گی؟“ وہ فکر مند انہ لہجے
میں بولیں۔

”اس کی فکر مجھے کرنی چاہیے بیگم جی..... آپ
مطمئن و پرسکون رہیں۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔
”ہم بوقت ضرورت اپنے بچوں کو معمولی سی انیم چٹا دیتے
ہیں، یہ سوئے رہتے ہیں، آخر کئی تو کرنی ہے۔“
”اوپر یہ تو بہت ظلم ہے ان معصوم جانوں پر۔“
آندر تپ کر سیدھی بیٹھیں۔ ”مجموعہ میرے گھر میں یہ
ظلم نہیں چلے گا۔ کان کھول کر سن لو.....“

”میں نے بوقت ضرورت کہا ہے بیگم جی.....“ وہ
سنیدگی سے بولی۔ ”ہر وقت کا نشہ تو اسے بیکار اور ست
کر دے گا، میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے ایک مہینے کے لیے
لڑائی تو کریں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، میری بھی مجبوری ہے، مجھے غلیظ
لڑکیوں سے بہت عین آتی ہے، خانساں ان تمہاری
جتنی بھی تعریف کی تھی تم تو اس سے کئی گنا بڑھ کر نکلیں.....

جنگی کتنی ٹھنڈی، بے آرام اور تاریک ہوتی ہوگی، آج اسے زندگی میں شاید پہلی بار گرم کمرے میں نرم بستر پر سونے کا موقع ملا ہے، اس پر خفا مت ہونا، دو چار راتوں کی پرسکون نیند کے بعد اس کی آنکھ پہلی آواز پر ہی کھل جائے گی۔“ وہ انہیں نرمی سے سمجھاتے ہوئے کمرے میں لے گئے اور سہارا دے کر بیڈ پر لٹایا اور پیار سے ان کے گال چھوتے ہوئے کہا۔ ”میری جان تھوڑا سا صبر کر لو۔۔۔۔۔“

”خان صاحب آج آپ کو میری بے بسی اور محتاجی پر ترس بھی آیا اور پیار بھی، یہ معجزہ سمجھوں کہ ایک سہانا خواب۔۔۔۔۔“ وہ حیران کن لہجے میں بولیں۔
 ”نیم خواب نہیں، ایک حقیقت سمجھو۔۔۔۔۔“ بلال ان کے گریے لہجے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔
 ”ہرگز نہیں مانوں گی، ایک وقتی ابال ہے ہمدردی و رحم کا۔۔۔۔۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر نرم ناک لہجے میں بولیں۔

”شوہر کی محبت کا امتحان بیوی کی بیماری میں ہوتا ہے اور بیوی کے پیار کو شوہر کی بے روزگاری میں آزمایا جاتا ہے، میں تو ہوئی کامیاب کہ آپ کو مشکل وقت میں بھی نہ چھوڑ پائی تھی۔ یاد ہے ناں وہ وقت جب میں نے اپنا تمام زلیور آپ پر قربان کر دیا تھا۔ آج آپ کے پاس وافر دولت نہ سہی۔۔۔۔۔ بس اوقات سے زیادہ بینک بیلنس ہے، میں نے پھر بھی کبھی سونے کی داپہی کا تصور نہیں کیا۔ آج آپ کی پارینہ ہمدردی دیکھ کر مجھے یہ خیال آیا ہے کہ میں بہت ہی عجیب اور نرالی فطرت کی بیوی کیوں ہوں۔“

”نیکم تم ٹھیک ہو جاؤ، تمہیں جیولر شاپ پر لے جاؤں گا، تم اپنی پسند کا زیور خرید لیتا۔ اگر تم نے اس کا اظہار پہلے کر دیا ہوتا تو خدا کی قسم تمہیں اسی وقت اس سے ڈبل سونا دلا دیتا۔ میں جانتا ہوں کہ سونا عورت کی سیکوریٹی ہوتا ہے، اسے خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ میں نے سمجھا کہ تمہیں اس میں دلچسپی نہیں جو تم نے اس کی داپہی کا مطالبہ نہیں کیا۔“ وہ ان کے جھریوں زدہ

پالیا بلال ایک دم سے اچھلے اور اسے پھر سے بلایا لیکن اس بار وہ منہ سے کچھ نہ بولے۔ اسی کیفیت میں وقت گزرتا گیا جب آمنہ نے آواز دی تو وہ ایک دم سے ہوش و حواس میں اُدھر اُدھر کا جائزہ لینے لگے، چھو گہری نیند میں تھی۔ اور وہ خود نیم غنودگی میں اس کے پہلو میں لیٹے ہوئے تھے، یہ کس وقت ہوا وہ حیران و پریشان لگدے پر بیٹھ گئے، شاید نیند نے غلبہ پالیا تھا کہ وہ وہیں لیٹ گئے تھے۔

”ادمانی گاڈ۔۔۔۔۔ مجھے معاف فرمانا میرے رب۔۔۔۔۔“ بہ مشکل وہ سیدھے کھڑے ہوئے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر وہ بولے، ہوئے ہاتھ روم کی جانب چل دیے۔ جب دروازے سے باہر آئی بیوی پر نظر پڑی تو ستر سالہ بلال نے ٹھنڈی طویل سانس بھر کر کہا۔
 ”آمنہ تمہاری چوٹ اس کا جواب نہیں، خانساں تو انعام کا مستحق ہے۔“

”خان صاحب وہ آپ کی آوازوں سے بھی نہیں جاگی۔ تو میری بیمار اور لاغر آواز اسے کیسے بیدار کرے گی۔ میرا دل تو گزر رہی جاتا تھا۔ بچاری الم کھر کا کام کرتی ہوئی مجھے سہارا دے ہی دیتی تھی۔ کیا کروں خان صاحب مجبوری میں ہی اسے قبول کیا ہوا تھا۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی کے لیے ہی بہتر ہے مگر اس سے بڑی عجیب سی بو آتی ہے، سردیوں میں تو اس کا نہانا ہی محال ہے بلکہ جو بھی آیا آئی وہ اک مخصوص تعفن میں نہاتی ہوئی ہی ملی، یہ پہلی لڑکی میں نے ایسی دیکھی ہے کہ کسی جھگی کی رہائشی نہیں لگتی، ورنہ میں اپنے تجربے کی بنیاد پر جو ان لڑکی کو اپنے گھر کی طرف جھانکنے بھی نہ دیتی۔ مگر میں اس میں لپٹ ہو گئی۔“ وہ وا کر کو پکڑتے ہوئے بولیں۔ ”میں اسے کل ہی چلتا کروں گی ایک تو جوان دوسرے بے حد حاضر جواب۔“

میں نے اسے اپنے کمرے میں سونے کے لیے نہیں رکھا کہ آپ اس حالت میں رات بھر ڈھنگ سے سو بھی نہ سکیں۔“

1987ء سے خدمت میں مصروف

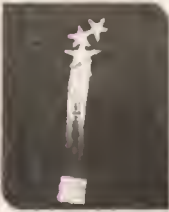
LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

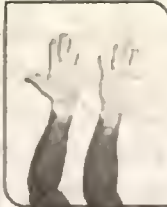
پہلی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی کے دورانیہ پاکستان کا مستحق و سرگرم



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT



اسلام آباد



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

کان نمبر 462 سرحد پر 20 ستمبر 87/ G-7
سرحد کا قسمی چاک اسسٹنٹ
فون 32331725 (051)
موبائل 0300-8566188

پت

9- اپریل 30ء مئی
9- اگست 30ء ستمبر
9- دسمبر 30ء جنوری

لاہور

گلف سینٹر

آفس نمبر 16

فیروز پور روڈ سترک چوکی

نزدیک ٹیڑھ بیگ لاہور

موبائل نمبر 0300-8566188

14- فروری تا 27 فروری

14- جون تا 27 جون

14- اکتوبر تا 27 اکتوبر

قیام

پشاور

ہیٹل لین

قنی روڈ نزد پنجگڑی چاک پشاور

موبائل 0300-8566188

یکم فروری تا 11 فروری

یکم جون تا 11 جون

یکم اکتوبر تا 11 اکتوبر

قیام

ملتان

ہیٹل سائبر سٹیٹ

ولیم سٹروڈ روڈ چاک نزد پشاور

فون 4518061-62 (081)

4582803 (0300-8566188)

28 مارچ تا 6 اپریل

28 جولائی تا 6 اگست

28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام

کراچی

ہیٹل سائبر سٹیٹ

آفس 7-706 گورنمنٹ روڈ

فرسٹ اسٹاپ بینک

موبائل 0300-8566188

13 مارچ تا 27 مارچ

13 جولائی تا 27 جولائی

13 نومبر تا 27 نومبر

قیام

”یہ کھریہ سب کچھ اور میں سب تمہارا ہی تو ہے۔“
 ”کہنے کو تو عورت کا ہی ہوتا ہے گھر کا اثاثہ، بچے
 اور شوہر پر بھی عورت کا ہی حق ہوتا ہے لیکن خان
 صاحب یہ سب زبانی کلامی باتیں ہیں، دل سے
 نہیں نکلتیں نہ ہی سوچ میں ان کی ہلکی سی رقت ہوتی ہے،
 حالات بدلنے کی دیر ہے، عورت ان سے محروم کر دی
 جاتی ہے، عورت تو عمر کے ہر حصے میں تہی دست ہے۔
 میں نے تو اپنی جوانی آرٹیفشل جیولری پہننے بتادی، اب
 تو زندگی کی شام ہونے کو ہے۔“ وہ روہانسی ہو گئیں۔
 ”اب گھر نہ پیسے میں اور نہ ہی آپ میں دلچسپی رہی ہے،
 جذبات پر اس بیماری نے ہی غلبہ پالیا ہے۔“

”اے مت کہو آمنہ..... تم بہت جلد تندرست
 ہو جاؤ گی، دیکھو جب تمہیں اسٹروک ہوا تھا تو تم ہلنے
 چلنے سے قاصر ہو گئی تھیں، اب تو ماشاء اللہ اپنے قدموں
 سے چل کر ہاتھ روم تک جاتی ہو اور ماشاء اللہ مکمل طور
 پر الٹ بھی ہو، کیا مجال ہے کہ کوئی نوکر اپنے کام
 میں ڈنڈی تو مارے۔ میری دعا ہے کہ کوئی نوکر اپنے کام
 ایک دن اس داکر کا سہارا بھی تمہاری جان چھوڑ دے
 گا۔“ وہ محبت سے بیوی کی طرف دیکھ کر بولے۔
 ”جانتی ہوں اولڈ از گولڈ..... آئی لو یو جانی.....“

”خان صاحب میں بے ہوش ہو جاؤں گی، مجھ
 سے اتنا بڑا مذاق مت کریں۔ لگتا ہے یہ عورت ہمارے
 لیے مبارک ثابت ہو گئی ہے۔“ وہ کانوں پر دونوں
 ہاتھ رکھ کر تڑپیں۔

”خان صاحب اس بیماری میں آپ کے کس،
 کس روپ سے مقابلہ نہ کیا لیکن کسی سے اپنا دکھڑا نہ
 ردیا کہ کہیں آپ کی نیک نامی پر حرف نہ آجائے۔“
 ”آئی ایم سوری آمنہ..... دراصل وہ بھی میری
 محبت کی انتہا ہی کیونکہ جب میں تمہاری تکلیف کو دیکھنے
 کی ہمت مکمل طور پر کھودیا کرتا تھا تو بے بسی کے
 احساسات میں تم پر برس پڑتا تھا۔ تمہیں ایک مثال دیتا
 ہوں، جب بچہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے خود کو چوٹ لگا
 ماہنامہ پاکیزہ۔

”لیکن آپ کے اس دوسرے ری ایکشن سے
 میں ہمیشہ ہی محروم رہی، سوچی سمجھی ترکیب کے مطابق یا
 نا سمجھی میں بھی اسے سینے سے پیچھ کر تسلی و تسفی کے دو
 بول تک تو کہہ نہ سکے، میری تکلیف پر آپ کی آنکھوں
 میں آنسوؤں کا اٹھنا تو مردانگی اور غیرت کے خلاف
 ہے ناں.....“ وہ طنز بے لچہ میں بولیں۔
 ”پہلی بعض لوگ اپنے پیار کا اظہار کرنے
 میں بالکل ہی پیدل ہوتے ہیں، ذرا دیکھو اس بیچاری
 غریب کو، بیکیس لڑکی ایسے مری ہوئی ہے جیسے ہمت
 سے زیادہ فٹ جڑ چھالیا ہو۔“ بلال نے موضوع بدلنے
 کے لیے چھمو کی طرف دیکھ کر مزاحیہ لہجے میں کہا۔
 ”بد بخت، گھوڑے بیچ کر سو گئی ہے، صبح اس کی خبر
 لیتی ہوں، تیس ہزار کم تنخواہ نہیں ہے میاں۔“ وہ ہونٹ
 چباتے ہوئے بولیں۔ ”اور بوجھی رزق حلال.....“
 ”آمنہ تم اسے ایک لفظ بھی غصے میں بولو گی تو یہ اسی
 وقت اپنا بچہ اٹھائے چلتی بنے گی، رات کو نیند قربان کرنا
 آسان نہیں ہے۔ میں اس سے بات کر لوں گا۔ یہ تو میری
 اولاد سے بھی کم عمری ہے، بے فکر ہو سمجھانے بجھانے کا کام
 تو مجھ پر ہی چھوڑ دو ویسے بیگم، عجیب زمانہ ہے کہ پیسے ہاتھ
 میں لیے پھرتے ہیں پھر بھی ملازمہ ڈھنگ کی نہیں ملتی۔“
 ”ٹھیک ہے خان صاحب..... میں اسے ایک
 مہینے بعد ہی رخصت کر دوں گی۔“ اگر اس کے یہی لہجہ
 رہے تو۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولیں۔
 ”بیگم اپنے اس شوہر کا ہی خیال کر لو، ایک بار جو
 بستر سے نکل جاتا ہوں تو پھر نیند واپس نہیں آتی،

چڑھے گا۔ اس کی تعلیم سونیوسوری سے شروع ہوئی اور یہ ہمارے بچوں کی طرح اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی جائے گا ان شاء اللہ.....! میرے رب نے مجھے ننگی کا ااک سنبری موقع دیا ہے، میں اسے کھوتا نہیں چاہتا۔“

”صاحب جی، ہر ایک ایسے ہی لارے لگاتا آیا ہے، مجھے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی آپ کی بات سن کر..... جب مطلب پورا ہو جاتا ہے نا تو، تو کون، میں کون..... لیکن میری ایک ہی شرط ہے کہ بچہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”شیم، یہ دیکھو میرا ہاتھ، اس کی انگلیاں پانچ ہیں ناں.....“ وہ نرم مامٹ سے بولے۔

”جی صاحب جی.....! وہ تو سب کی ہوتی ہیں۔“ وہ سر اثبات میں ہلا کر بولی۔ ”پانچ انگلیاں ہیں دونوں ہاتھوں کی ملاؤ تو دس.....! وہ آنکھیں مڑا کر بولی۔

”پھر آگے بولو کہ میں تمہیں کیا سمجھانا چاہتا ہوں، تم ہو تو ذہن، تمہارے لب و لہجے سے لگتا ہے کہ مدل تک تو پڑھا ہی ہوگا۔“ وہ اپنا سیت بھرے لہجے میں بولے۔

”صاحب جی اب آپ مجھے اتنا بھی تالائق نہ سمجھیں، اس پڑھے لکھے لوگوں کی کالونی میں کام کرتے ہوئے مجھے پندرہ سال ہو گئے، اپنی ماں کے ساتھ ہاتھ بنایا کرتی تھی، اور بچوں سے تو میں نے وہ کچھ سیکھا جو بڑے سکھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے ہیں۔“ وہ دوپٹے کا کونہ اپنی انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

”میں نے دسویں پاس کی ہے جی، استانی بننے کے خواب دیکھتی رہی مگر نوکری نہیں ملی تو ماں کی طرح گھر، گھر کام کرنے لگی۔“

”واہ..... تو میرے سوال کا جواب دو جلدی سے، تم تو میری سوچ سے زیادہ ہوشیار نکلیں شاہاں، اپنے بچے پر توجہ دو گی تو ایک دن یہ کسی دفتر کا انسر ہوگا۔“ وہ پرامید لہجے میں بولے۔

”سر جی..... پانچوں انگلیاں ایک جیسی نہیں ہیں، کوئی بڑی تو کوئی چھوٹی، کوئی موٹی تو کوئی دلی، انسان بھی ایسے ہی ہیں، صاحب جی میں آپ کی خدا

آنکھیں پھرا جاتی ہیں۔ اس لیے ہم دونوں کی پوری کوشش ہونی چاہیے کہ یہی لڑکی ہمارے گھر کا فرد بن کر رہے۔“ وہ سرگوشی میں بولے۔

”آپ نے درست کہا، میں جانتی ہوں کہ ہماری مجبوری بہت بھاری ہے ورنہ اسے اس گھر کی چوکت نہ ٹاپنے دیتی۔ نکل کو ہمارے جوان بیٹے بھی تو اسی گھر میں رہیں گے، ایسی کھڑی، جلی خروں والی لڑکی گھر میں رکھنا اپنے پاؤں پر کلبازی مارنے کے مترادف ہوتا ہے۔“ وہ متذہذب لہجے میں بولیں۔

”آف کہاں پہنچ گئی تمہاری سوچ، ہمارے بیٹے ایسے گھٹیا اور شرمناک کردار کے نہیں ہیں کہ ایک ملازمہ سے..... تو بہ استغفار.....“ وہ کانوں کا ہاتھ لگا کر بولے۔

”خان صاحب! یہ ذرا میں دیکھ چکی ہوں اپنے گھر میں۔ عشق اندھا ہوتا ہے، جوانی میں شیطان کا وار ہونا بے حد آسان اور سہل ہو جاتا ہے، آپ خود ہی تو کہا کرتے تھے آج کیسے بھول گئے؟“ وہ دھیمے لہجے میں بولیں تو بلال نے سر اٹھا کر زیر و پاؤں کے بلب کی مدھم اور ملجی روشنی میں جھمو کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں کس قدر معصوم، پرسکون اور پاکیزہ لگ رہی تھی کہ بلال دیکھتے ہی رہ گئے۔

☆☆☆

”میرے مالک میں نے حیرے سامنے سر تسلیم خم کر لیا کہ تو فرماتا ہے کہ میں مبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔“ بلال نے سجدے میں گڑ گڑاتے ہوئے اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ جھمو نے اس لمحے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے قدرے جھک محسوس کی۔ لیکن مجبوراً ان کے قریب سر اور آنکھیں جھکائے کھڑی ہو گئی۔ اس کا بیٹا ماں کی ناگوں سے لپٹ کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ تو بلال نے جانناز پر بیٹھے، بیٹھے ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور شیریں لہجے میں کہا۔

”شیم آج میرے ساتھ مارکیٹ چلو تاکہ اس معصوم بچے کے اچھے سے کپڑے خرید لیے جائیں، ہمارے گھر میں یہ بچہ ہمارے اصولوں کے مطابق پروان

اور آزمائش زدہ حالات کے درد اور تکلیف سے گزرے جو نہیں، جب بچہ دوا کے بغیر مر جاتا ہے اور بھوک کی وجہ سے وہ بڑھتا نہیں تو اس دکھ اور بے بسی کو آپ کیا جانیں.....؟ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم نے نہ جانے پیدائش سے پہلے ہی کون سا گناہ کر دیا تھا کہ جحشوں میں پیدا ہو گئے وہ بھی ترسے اور سکنے کے لیے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔“ وہ آہ بھر کر بولی۔

”گھر میں بیماری کی پریشانی اور بے بسی ہو تو ہنسنے کا کس کا فر کا من چاہے گا۔ تمہاری بیگم کے ساتھ زندگی کے پینتالیس سال بہت شاندار گزرے..... مگر چھ مہینوں کی عیاشی نے ان جیتے ہوئے حسین و دلنشین سالوں پر پانی ہی پھیر ڈالا۔ ایک وقت تھا کہ ہم دنیا گھومتے پھرتے، بچوں کے پاس وزٹ کرتے پوتے نواسوں کو گود میں لیے پھرتے ان سے کھیلتے مگر سب خواب ہی چکنا چور ہو گئے۔ دعا کرو کہ بیگم صاحبہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں۔“

”صاحب جی..... اب میں آگئی ہوں ناں..... میرا منا آپ کے ہمراہ اور میں آپ کی بیگم کے ساتھ۔ آپ کو کبھی چھوڑ کر نہیں جاؤں گی یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ سے جب آپ اپنی بیگم کے ساتھ دنیا گھومنے جائیں گے تو میں اس گھر کی ایسی چوکیداری کروں گی جیسے گھر کی مالکن کرتی ہے۔“ وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”ارے یہ تو دینی باتیں ہیں، تمہیں ایک ہزار زیادہ پر یہاں سے لوگ خرید سکتے ہیں، اس میں تمہارا قصور نہیں کیونکہ یہ لوگوں کی مجبوریاں ہیں، آخر اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خود غرض تو ہونا ہی پڑتا ہے۔“ وہ تنجید گی سے بولے۔

”ہائے صاحب جی..... میری قیمت آپ نے صرف ایک ہزار لگا کر میرا دل ہی توڑ دیا ہے۔ میں اپنی بستی میں کوئی عام سی لڑکی نہیں ہوں، میرے چرچے شوہر پر ہر جوان، اداہیز اور بوڑھا رشک کرتا ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”میرا شوہر تو نکلا قسمت کا وحشی اور میں... بد نصیب، نصیبو جی!“ وہ بھی خوب دل کھول کر بولی۔

”اوہو تم نے تو برا منالیا۔ دو تو ایسے ہی میں نے

رکری پر چین رکھی ہوں کیونکہ آپ لی زبان میں سچائی ہے، نہ تو دھوکا ہے نہ ہی لالچ کیا ہے یہ جو بیگمیں ہوئی ہیں ناں جی سارا مسئلہ ان کا ہے، یوں سمجھیں کہ ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلیاں کام کی نہ کار کی۔“ وہ خود اعتمادی سے بولی۔

”شاہاش“ انٹیلیجنٹ.....“ وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

”یہ بچہ ہمیشہ بیگمات کے کام میں رکاوٹ بنتا ہوگا۔ لیکن فکر کی قطعاً ضرورت نہیں، میں اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھوں گا، بچے پیار کو پہچانتے بھی ہیں اور اس کا جواب دینا بھی خوب جانتے ہیں، تم اپنی بیگم کو خوش رکھو، ان کا دل جیت لیا تو سمجھو کہ تم نے ایف اے کا امتحان پاس کر لیا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”جی صاحب جی! میں تو سوچ رہی تھی کہ اسے اس کی وادی کے پاس ہی چھوڑ دوں، بستی کے اسکول میں داخل کرادوں لیکن ہے ابھی چھوٹا۔ دو سال اوکھے سوکھے گزر جائیں، مہینے کا دو ہزار وادی کے ہاتھ پر رکھتی جاؤں گی وہ بھی خوش..... اور منا..... خوش تو نہیں ہوگا بس مجھے بہت یاد کرے گا۔ اس لیے اس کا مسئلہ سر نہیں اٹھائے گا۔“ وہ گہری سوچ بچار کے بعد بولی۔

”غریب کی ٹھٹی میں مجبوری ڈال دی جاتی ہے جی، یہ دکھ تو سہتا ہی پڑے گا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ وہ اس کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے گویا ہوئے۔ ”لیکن یاد رکھو کہ بچہ ماں کے زیر سایہ رہ کر ہی خود اعتمادی سیکھتا ہے، خود اعتمادی کا شخصیت، کردار اور اس کی زندگی پر کیا مثبت اثر پڑتا ہے، یہ پھر بتاؤں گا۔ اس وقت تو تم اپنی بیگم صاحبہ کی دن اور شب بھر کی روشنی اپنے ذہن میں محفوظ کرلو، بس انہیں خوش و خرم رکھنے کا یہی طریقہ ہے، اسے پلے سے باندھ لویا ذہن نشین کرلو..... فائدے میں رہو گی۔“

”صاحب جی، فکر نہ کریں..... دل پر لکھ لوں گی، دماغ تو ہر وقت ہی کن، کن انجیجروں کو سلجھاتا رہتا ہے، آپ کو کیا خبر.....؟ آپ بڑے لوگ بھی ان برے

بلال نے صوفے کے کٹھن کے نیچے ہاتھ ڈال کر چاکلیٹ نکال کر سننے کی طرف بڑھا دی۔ پہلے تو وہ ہچکچایا، شرمایا۔۔۔ پھر اس نے چاکلیٹ پکڑی اور لاؤنج سے بھاگتا ہوا ماں کے پاس پہنچ کر چاکلیٹ دکھاتے ہوئے بولا۔

”صاحب نے ثانی دی ہے ماما۔۔۔“

”ماما۔۔۔؟“ آمنہ نے حیران کن لہجہ میں کہا تو

وہ تیزی سے بولی۔

”جی بیگم جی۔۔۔ اپنے ابا کو بابا کہتا ہے، ہم نے اس کالونی میں جو دیکھا وہی کیا۔“

☆☆☆

”خان صاحب! ایک معما تو حل کر دیجیے۔۔۔“

چھوٹا کچھ اور اسمارٹ نہیں یا مجھے ہی شک ہے؟“ آمنہ نے گہری سوچ بچار کے بعد بلال سے سرگوشی کی۔

”ہاں بیگم ہے تو سہی، ملازموں کی کچھ خامیوں کو ہضم نہ کریں تو گھر جھگڑے کا اکھاڑا بن جاتا ہے،

میں نے تو پہلے دن سے ہی اسے حاضر جواب اور خود اعتماد پایا ہے، بیگم ہمیں اس کی اسمارٹ نیس سے کیا لینا

دینا؟ تمہاری جان مار کر خدمت کر رہی ہے، ہمیں اور کیا چاہیے؟ اس لیے ایسی انٹی سیدھی باتیں سوچ کر خود

کو مت الجھاؤ۔۔۔ ورنہ یہ بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“ وہ سمجھاتے ہوئے بولے۔

”خان صاحب۔۔۔ آپ کی یہ پرانی عادت ہے کہ آفس میں اپنے ماتحتوں کو ادھر ادھر میں تمام ملازموں کو

سر پر چڑھا کر خوب بگاڑ دیتے ہیں۔ پھر وہ میری تو ایک بات نہیں سنتے، آپ کے آگے پیچھے بھگتتا ڈال کر

پیسوں کی سلائی بنوڑتے رہتے ہیں۔ اب کی بار ایسا ہوا ناں تو قسم سے پھر آیا نہیں رکھوں گی، آپ ہی میرے

لیے کافی ہوں گے۔“ وہ منہ پھلا کر ناگواری سے بولیں۔

”یار مجھ پر ترس کھاؤ، عمر میں تم سے دس سال بڑا ہوں، راتوں کو جاگنا میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن

ہے، خدا کے لیے اپنے دل و دماغ کو شکوک و شبہات سے پاک رکھو تا کہ تمہاری ریکوری جلدی ہو سکے۔ آخر ابھی تم نے دو بیٹوں کے لیے لڑائیاں تلاش کرنی ہیں،

بول دیا تھا۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا جو تم سمجھ چکی ہو۔۔۔۔۔۔ سچ ہے کہ تم ان تمام نوکرائیوں سے الگ ہو، اگر تم میں یہ خصوصیات نہ ہوتیں تو میری بیگم تمہیں چھوٹے بھی نہ دیتیں، مجھے امید ہے کہ تم اس گھر میں نکل جانے کے تمام گزروں سے واقف ہو، آخر چند رہ سال یعنی بچپن سے ہی تیرے بکا رہو۔“ وہ خوشدلی سے بولے تو وہ ذرا سا پھسلی۔

”صاحب جی وہ آپ کے ساتھ منے کی شاپنگ کے لیے کب جاؤ گی؟ آپ دیکھنا کہ کسی صاحب کے

بچے سے کم نہیں لگے گا یہ۔“ وہ جھوٹے ہوئے بولی۔

”بھئی بچے تو سانچے ہوتے ہیں۔ تم خود ہی بتا دینا جب فرصت ملی چلے چلیں گے۔ لیکن اپنی بیگم کو بھنگ بھی

نہ پڑنے دینا۔ خواہ مخواہ اپ سیٹ ہو کر نئی مصیبت کھڑی کر دیں گی، یہ بڑے گھر کی بیویاں نہ جانے اس قدر شکی

مزاج کیوں ہوتی ہیں؟ حالانکہ کہاں گھر کی مالکن اور کہاں یہ گھر، گھر پھرنے والیاں لیکن انہیں نہ جانے کس بات کا

خطرہ چھین نہیں لینے دیتا۔ آمنہ بیماری سے پہلے ایسا ہرگز نہیں تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ فوراً چونکے اور سفید بالوں میں ہاتھ پھرنے لگے۔

”ادہ مائی گاڈ یہ باتیں نوکرائی سے کرنے والی تو نہیں، اُف یہ عمر ہی حواس باختگی کی ہے۔ خواہ مخواہ منہ

سے لفظ پھسلتے جاتے ہیں۔ بڑھا پاتا م ہی ہے باتونی پن کا۔“ وہ خود کھلی کر رہے تھے۔

”صاحب جی، پریشانی کی بات نہیں۔ آپ یہ بات یاد رکھیں، عورت چھوٹے گھر کی ہو یا بڑے گھر کی،

ہوتی وہ عورت ہی ہے۔ مجھے بتائیں کہ ان بیگمات کے سر پر کون سا دیار روشن ہے یا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے، جس

سے ہم محروم ہیں، تو مقدمہ کے کھیل ہیں صاحب جی کہ کوئی بنی مہارانی اور کوئی بنی نوکرائی۔۔۔۔۔۔ کوئی بنی بیگم جان

تو کوئی بنی وبال جان۔۔۔۔۔۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔

”شیم اگر تم نے کالج کا منہ دیکھ لیا ہوتا تو۔۔۔۔۔۔“

”میں کسی بیگم سے کم ہرگز نہیں ہوتی صاحب۔۔۔۔۔۔“ وہ ان کی بات اچک کر بولی۔ اور تیل کی آواز سننے پر فوراً آمنہ بیگم کے کمرے کی جانب بھاگی۔

جائے گا۔ آپ کے ہم دونوں سمندر ہو جائیں گے۔ یاد رکھیں کہ ہم دونوں ہی بہت جلد و دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ اب ہماری عمر نیشنل لینے کی نہیں، میں تو بیمار ہوں آپ کو بھی سوتے میں اسٹرک ہو جائے گا۔“ وہ آنسو بہانے لگیں۔

”تو پھر مجھ پر شک کرنا چھوڑ دو، جانتی ہو شک شادی کے رشتے کو کفن کی طرح اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے، اسے ہر ابھار بنے دو یار..... اور رونا دھونا بند کر دو.....“ وہ آنسو چھپکی دے کر بولے۔

”خان صاحب یہ آنسو خوشی کے ہیں نہ ہی شوقیہ گرتے ہیں۔ مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ عورت مرد کی ہر بات و حرکت کو شک کی نظر سے کب اور کیوں دیکھنے لیتی ہے۔“ وہ اک طویل آہ بھر کر بولیں۔ اور خاموش ہو کر اپنے آنسو پینے کی کوشش کرنے لگیں۔

”ایک تو تمہارے یہ مگر مجھ کے آنسو مجھے بہت بیزار کر دیتے ہیں ساٹھ سال کی عمر میں بھی یہ بچوں والی حرکت..... تم سوچو کہ میں ایک نادان جذباتی اور جھگڑاؤ... بچی کے اعتراضات کو کیونکر اہمیت دوں گا۔“ وہ زچ ہوتے ہوئے بولے۔ ”خدا را اب تو بڑی ہو جاؤ.....“ اسی سے جھمو بیٹے کی انگلی تھامے کمرے میں داخل ہوئی۔ دوسرے ہاتھ میں ٹرے تھی، جس میں دس بچے کی چائے اور دو پیالے فروٹ چائٹ کے تھے۔ اس نے پیگم صلیب کے پہلو میں تو لیا بچھا کر ٹرے اس پر رکھ دی اور کمرے کے ماحول کی کشیدگی کو محسوس کرتے ہوئے فوراً ہارنگل گئی۔

”میاں یہ جو ملازمین ہوتے ہیں ناں اگر یہ اپنے پہناؤنے سے مالک دیکھنے لگیں تو سمجھیں کہ ڈیزاسٹر کا آغاز ہو چکا ہے، اس کے پڑے دیکھتے ہیں آپ نے..... اور بیٹے کو کوئینسڈی میں اسٹران کے بچوں کے ساتھ داخلہ دلوانے کی کیا ضرورت تھی؟ پانچ سال کا ہو جاتا تو اپنی بستی کے اسکول میں اپنے جیسے بچوں میں آرام و سکون اور خوشی سے پڑھائی شروع کر دیتا۔ لیکن آپ نے تو مجھ سے مشورہ لیا اور نہ ہی آپ نے عقل و

سمجھنے کے پیچس دن اسی ایکٹویتی میں گزرتے تھے۔“ وہ سگار سگاتے ہوئے بولے۔

”ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ملازم کے ساتھ ایسا سلوک رکھو جو تم اپنے برابر کے لوگوں سے رکھتے ہو۔ بس بڑاؤ کے وژن تک پہنچ گیا۔ وہ ہوا جنتی اور مجھے جنت کی جستجو ہے ورنہ میری تہجد کی نمازوں کا کوئی فائدہ نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے خان صاحب..... اس چھوکری کو کہیں میرے برابر کا درجہ مت دے دیجیے گا۔ ان عورتوں کی نہ اپنی کوئی عزت ہوتی ہے نہ دوسروں کی عزت کا خیال رکھ سکتی ہیں، ان پر خدا کی لعنت نہ ہو تو یوں در، در نہ بھٹکتی پھریں۔ میں تو آپ سے بہت خوفزدہ رہنے لگی ہوں کیونکہ یہ عورت بہت شاطر اور باتونی ہے اور آپ کو باتونی لوگوں سے عشق ہو جاتا ہے پھر میری بھی پروا نہیں رہتی۔“ وہ بھراہمی ہوئی آواز میں بولیں۔

”پھر وہی مشکوک باتیں، دن بھر وہ تمہارے ساتھ جڑ کر بیٹھی رہتی ہے، کب کرتی ہے مجھ سے باتیں، خدا کے لیے اب نیا مقدمہ درج نہ کر دیتا۔ سونے سے پہلے تم اس کے انگوٹھے کوری سے باندھ کر اسے قید کر لیتی ہو، ہاتھ روک جانے، دوا کھانے اور پانی پینے کے لیے تم اس کی رسی کو کھینچتی ہو، میں نے تو اسے قابو نہیں رکھا ہوا، نہ ہی مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، پیگم ہماری زندگی کا پرائم ٹائم ایک ساتھ بہت خوب گزرا۔ اس وقت جب میں جوان تھا تب تم نے مجھے ڈھیل دی، بے لگام چھوڑے رکھا۔ اب میں اپنی عمر کے ستر سال کر اس کر چکا تو تم مجھ پر اس قدر شک کرنے لگی ہو کہ میرا دل چاہتا ہے، تمہارے شک کو یقین میں بدل ہی دوں تاکہ ہم دونوں ہی مطمئن ہو سکیں..... اور یہ روز، روز کی چیچقلش ختم ہو۔“ وہ بھویں چڑھا کر قدرے غصے سے بولے۔

”بہت انوکھی سوچ ہے آپ کی، اگر آپ نے ایسی بیہودہ حرکت کی تو گھر لڑائی جھگڑوں کا اکھاڑا بن

شور سے اس کے اثرات کو گہرائی میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ جانے آپ بھی کب بڑے ہوں گے، بالکل ہی بچوں والی حرکتیں آپ کو قطعاً زیب نہیں دیتیں۔“ وہ بدلہ لینے کے انداز میں بلیں تو بالال نے بھرپور تہقہ لگایا۔

”بھئی میں نے اپنی غلطی مان لی ہے، اب میں نے اپنا رویہ بدلاتو یہ لڑکی کسی دوسرے گھر میں لڑکی پکڑ سکتی ہے، ایسی صاف ستھری، سچی ہوئی لڑکیوں کے لیے نوکری کی کمی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو عیسیم کے آنے سے گھر میں رونق اور گہما گہمی نے نہیں زندہ ہونے کا احساس دلایا ہے۔ اس لیے ذرا سوچ سمجھ کر یہ تو آج ہی دوسری نوکری حاصل کر سکتی ہے۔“

”یہ آپ کی سوچ ہے، بے ٹکی اور فضول۔۔۔۔۔ ایسی لڑکیوں کو بیگمات اپنے گھر میں جھانکنے تک نہیں دیتیں، گھر میں جوان بیٹے اور ادیز عمر الوکا۔۔۔۔۔ شوہر ہوتا ہے خان صاحب ایک بات کہوں۔۔۔۔۔ برا تو نہیں مائیں گے، نہ ہی مجھ سے ٹپل و قال کریں گے نہ ہی کرا چھوڑ لاؤنج میں جاسوئیں گے؟“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”یار تمہاری کس، کس بات کا برا ماناؤں، تمہاری ہر بات ہی میرے دل میں نشتر بن کر چھ جاتی ہے۔ پھر خود کو سمجھا بھجا کر درگزر کرتا ہوں کہ بیمار بیوی سے بحث و مباحثہ کرنے کا فائدہ تو ہوگا نہیں۔۔۔۔۔ النادہ میرے گلے پڑ جائے گی۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟ جہاں سیکڑوں کینزے مجھ میں نکالے جاتے ہیں، وہاں ایک اور اڑدھا سہی۔۔۔۔۔ سینے کے لیے تیار ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے ڈارک براؤن ویل ویٹ کے پردے مکمل طور پر ادھر، ادھر ہٹا کر بولے۔ لان میں چھمو اسٹو نیا کے کٹھنے درخت کے سائے میں بیٹھی بیٹے کے بیک سے کلرڈ پینٹیلیس اور ڈرائنگ کیمس دیکھتے ہوئے اسے سینے سے لگائے خوشی کے آنسو بہا رہی تھی۔ وہ ایک دم سے نرم پڑ گئے، ترحم آمیز لہجے میں بولے۔

”آمنہ، کاش تم اٹھ سکتیں اور باہر کا نظارہ دیکھ سکتیں تو تمہیں اسد کو نو سو ری میڈ اؤنڈ لانے پر اعتراض نہ ہوتا۔ کیسے خوشی میں نہائی ہوئی ہے عیسیم۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ

کی رضا کے لیے ہمیں کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے، تکلیفیں اور بیماریاں رونو چکر ہو جاتی ہیں بیگم۔۔۔۔۔“

”خان صاحب خدا کے لیے عیسیم کے نام کا درو کرنا چھوڑ دیں۔۔۔۔۔ وہ ہنسمو ہے اور اس کا بیٹا سرو ہے اسد نہیں، انہیں اتنا اونچا مقام دے کر بہت بچھتا میں گے، چھوٹے برتن میں اتنا ہی دودھ ڈالیں جتنا اس کے اندر ساسکے، مجھے یہ بتائیں کہ ہر وقت کھانسی ہاتھ میں لیے پھرنے اور صبح شام واک اور یہ انداز کس کے لیے ہیں۔ ایسے رحم دل اور نرم مزاج تو آپ کبھی نہیں تھے۔ جتنی عنایتیں اور نوازشیں چھمو پر کی جا رہی ہیں، معاملہ کچھ گڑ بگڑ رہا ہے۔“ وہ معترض لہجے میں بولیں۔

”یار سمجھا کرو ناں۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یہ لڑکی چھوڑ کر یہ جاوہ جا ہونے کے لیے پرتولنے لگے۔ ہم اسے روک نہیں سکیں گے، اسے اس گھر میں سہولیات و آسائشات دیں گے تو یہ یہاں کی محتاج ہو جائے۔ اس کے علاوہ میرا اور کوئی مقصد نہیں۔۔۔۔۔ واک تو ایکٹور کھتی ہے، بلڈ شوگر کنٹرول رکھتی ہے۔“

”خان صاحب میں آپ کو یہی تو کہنا چاہ رہی تھی کہ ہم خود ہی کیوں نہ اسے چلا کر دیں۔ جس دن سے اس منحوس نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے گھر میں خوشست اور تقنع پھیل گیا ہے۔“ آمنہ نے چائے کی چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”میری چٹھی جس مجھے مطمئن نہیں ہونے والی۔“ اس بات کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی اور دونوں گہری سوچوں میں گم گھونٹ، گھونٹ چائے پیتے رہے۔

”تمہاری خوشی کی خاطر سوچنا پڑے گا۔ ملازمہ بدلنا کون سا مشکل ہے آمنہ لیکن ہم مشکل میں پڑ جائیں گے کیونکہ اس کم بخت نے ہمیں آرام بہت دیا ہے۔ میں سات گھنٹے کی نیند پوری لینے لگا ہوں، اتنی گہری اور میٹھی نیند سوتا ہوں کہ مجھے اس کے اٹھنے اور تمہیں ہاتھ روم لے جانے کی خبر تک نہیں ہوتی، اپنی حالت دیکھو۔۔۔۔۔ ہر دقت ٹھہری، اجلی نظر آتی ہو، تمہارا کرا، الماریاں اور ہاتھ روم قرینے سے سیٹ ہیں۔“

میرے احساسات کو پہچاننے کی کوشش کریں کہ میں ایک ہائراکیٹو خاتون تھی، کامیاب سوشل ورکر.... اور میرے آس پاس سہیلیاں کھیلوں کی طرح منڈلایا کرتی تھیں۔ سب کچھ لیکھتے چھوٹ گیا۔ یہ دنیا بھی صحت مند لوگوں کی ہمراہی میں چلتی ہے، ورنہ زندگی کی ہر خوشی بے وفا کی اور بے اعتنائی کا رویہ اختیار کر لیتی ہے، میں چوبیس گھنٹے اسی کمرے میں لی دی کے سامنے خود کو کیسے خوش رکھ سکتی ہوں، اب تو میرا دل اس قدر مردہ ہو گیا ہے کہ لان تک جانا بھی مجھے عذاب لگنے لگا ہے۔ یوں کچھ جیسے مجھ پر قیامت طاری ہو چکی ہے۔ لے دے کے آپ ہی مجھے ایسا سہارا نظر آتے ہیں جب میں آپ کو چھو سے گھیس لگاتے اور چھینر خانیاں کرتے دیکھتی ہوں ناں تو میرا دل کٹ جاتا ہے کہ کیا میں کب شب اور ہنس مذاق کے بھی قابل نہیں رہی۔ ”وہ آنسو گراتے اور ہاتھ مسلتے ہوئے بولیں۔ وہ مزید بھی کچھ کہیں کہ بالال صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

”خدا کے لیے آمنہ اپنی زندگی خراب کر دے۔ مجھے رسوا کر دو، خبردار جو ایسی فضول قیاس آرائیاں تم نے کسی سہیلی سے کیں۔“ وہ عجب خوفزدگی سے بولے۔

”آپ اسے فارغ کیوں نہیں کر دیتے؟ بس مجھے ملی، کچلی، بدبودار آیا ہی منظور ہے۔ کم از کم میرے بیڈ پر بیٹھنے کی جرات تو نہیں کرے گی۔ اس کی تنہی بار بے عزتی بھی کی۔ پیار سے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ مگر خاموشی سے ہنر دق دیکھے چلی جاتی ہے، آپ مجھے اس سوال کا جواب دیں کہ میں شک کیسے نہ کروں.....؟

میری برابری کرنے کی جرات اسے کس نے دی ہے؟ آپ کو میرے اعتراض کرنے کی وجہ سمجھ نہیں آرہیں، صرف منہ کالا کرنا ہی برائی نہیں، آپ کو کیسے سمجھاؤں۔“ ”میرے ہمدردانہ سلوک اور روتے نے ہی

اسے تمہارے ساتھ بیٹھنے کی جرات دی ہے آمنہ، اسے گھر کے فرو کی حیثیت سے دیکھو۔ اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے؟ صاف ستھری ہے، تمہاری خدمت چاری

سہلانے لگے۔ ”ہمیں اس سے جیسے کام چاہیے، وہ بخوبی سرانجام دے رہی ہے پھر گلہ کیوں ہے اس سے۔“ وہ خاموشی سے انہیں تنہی رہیں، وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کے ستھرے شیمپو کیے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولے۔

”آمنہ اب انہیں شیم سے ڈائے بھی کرالیا کرو..... یقین جانو کہ تم پہلے جیسی آمنہ جو کبھی خود کو نظر انداز نہیں کرتی تھیں ویسی ہی لگنے لگو گی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بہت بیمار لگنے لگی ہو۔ مجھ پر ہی ترس کھاؤ۔ بے چاشنک کے علاوہ تمہیں اور کوئی دوائی و جسمانی مسئلہ نہیں اور اب میری عمر دیکھو، غلط بات سوچتے ہوئے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ جب تم مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتی ہو تو میں خود اپنی نظروں سے ہی گر جاتا ہوں۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں بلال، مجھے اس تکلیف وہ بیماری میں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ آپ ہر آن مجھے کمزور دینے کا ہی سوچتے ہیں۔ میں ہی پتلی ہوں، سوری خان صاحب.....“ وہ کھسکی سی ہنسی کے ساتھ آنکھیں جھکا کر بولیں۔

”سوری کہنے کی ضرورت نہیں ہے آمنہ، تم جوانی میں تو شکی نہیں تھیں اب نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ وہ حیرت و حیرت سے بولے۔

”اس وقت میں بھی تو جوان اور توانا تھی۔ یہ ذہن ہی کم بخت مجھ میں موجودگی پر نالاں رہنے لگا ہے، آپ تو بیلدی ہیں۔“

”آمنہ خیر سے اب پہلے والے دن آنے والے ہیں، بادل چھٹ جانے والے ہیں۔ بشرطیکہ تم خود کو قلبی اور ذہنی طور پر مطمئن و خوش و خرم رکھو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری طرف سے بے فکر رہو۔“ وہ.....

بڑا امید نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولے۔

”تم کیا جتنی ہو کہ میں چھو کو بیگم جان کا رتبہ بخش دوں گا؟ ایسا تو مر کر بھی نہیں ہوگا۔“

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بہرین ملک سے قارئین صرف وائٹرن یونین یا مینی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: مرزا شمس فون نمبر: 0301-2454188

سرگوشین منیجر: سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

C-63 فیر 111 ایجنٹس ڈینس باؤسک اتھارٹی بین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35804200-35804300

میں دن و شب بھی ہے نہ رات ایک پاؤں پر کھڑی
رہتی ہے، اگر اچانکیت میں تمہارے بیڈ کی پریشانی
جاتی ہے تو کہاں سے برابر ہوگی۔ اللہ سے ڈرو اور
ہر وقت استغفار کا ورد جاری رکھو تا کہ تم پر اللہ تعالیٰ اپنا
افضل و کرم فرمائے۔ ”وہ ننھے پھلا کر بولے۔

”خبردار جو آئندہ ایسی بیہودہ بکواس کی۔“

”خان صاحب کبھی، کبھی ننھے یوں لگتا ہے جیسے
آپ کا دل بیمار ہوئی سے اکٹا گیا ہو۔ یہ سوچ مجھے لمبے
ہاتھوں سے نوچنے لگتی ہے۔“ وہ بھرائی آواز میں بے بسی
سے بولیں۔

”بیگم ایسی فضول اور جان لیوا سوچوں کو ہمیشہ کے
لیے الوداع کہہ دو۔ تم میری اور میں تمہارا ہوں آخری
سانس تک۔ خود کو اذیت اور مجھے ندامت دینے سے
تمہیں کیا حاصل ہوگا۔ فقط دکھ، درد اور غم.....“ وہ اس
کے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولے۔

”چلو چھوڑو یہ باتیں، خود کو ریلیکس کرو.....
تمہاری ٹرانکولائزرز کا وقت ہو گیا ہے شیم کہاں ہو، بیگم
صاحبہ کو داد دو۔“ انہوں نے بلند آواز میں کہا تو وہ جھٹ
سے کمرے میں آگئی۔

”ویکیو انہیں دوا کھلا دو تا کہ سکون سے سو سکیں۔
تم نے وقت نہیں دیکھا افسوس کی بات ہے، پلیر ایسی
کوٹا ہیاں چھوڑ دو۔“

”جی صاحب جی..... پانی اور گولی سائنڈ ٹیبل پر
رکھی ہوئی ہے، ابھی کھلائے دیتی ہوں۔“ وہ پھرتی سے
سائنڈ ٹیبل کی طرف بڑھ کر آنکھیں میکا کر بولی تو بال
بیل سے اٹھ کر ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئے۔

مجھو نے آمنہ کو گولی کھلا کر ناگوں کا مساج کرنا شروع
کیا۔ تو چندہ منٹوں میں ہی وہ گہری نیند میں چلا گئی۔

”بیگم جی کم از کم تین چار گھنٹے تو سوئی رہیں گی۔
میں موبائل پر ان کی دوا کے لیے الارم لگا کر سو جاتی
ہوں۔“ وہ اپنے گدے پر سوتے ہوئے بیٹے کی طرف
دھمکانا لگا ہوں سے دیکھ کر بڑبڑائی۔

”کاش میں تمہارا مقدر سنوار سکتی۔ صاحب

اللہ کرے آمنہ صحت یاب ہو کر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائے۔ بیچاری پر آزمائش کے لہراتے سائے چھڑے ہی نہیں رہے۔“ وہ سوئی ہوئی بیوی کی طرف ہمدردانہ ترس بھری نظروں سے دیکھ کر بڑبڑائے۔

”صاحب جی! اللہ مایاں خدمت کا بدلہ ضرور دے گا۔ ہندے کے پاس تو چند نوٹوں کے سوا اور بے ہی کیا ہے۔ بے لوث خدمت، خاطر اور محبت کو بندہ خرید کر سمجھتا ہے کہ حق ادا ہو گیا۔“ وہ فحش سے بولی۔ ”آپ نے مجھے اس کم کافر و توبت بالیا لیکن اس درجے سے محروم ہی رکھا۔“

”ایسی بات ہرگز نہیں شیم..... اگر تم نہ ہو تیں تو میرا تو ابھی تک جنازہ نکل چکا ہوتا۔ یہ برادری، دوست، احباب وغیرہ تو تماش بین ہیں، بس برے وقت کے انتظار میں ہماری طرف نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔ دو بیٹے اپنی زندگی میں خوش و خرم ہیں، ہم مریں یا جھیں ان کی بلا سے۔ دو بیٹے بھی امریکا جانے کے لیے پر تول رہے ہیں، اس گھر میں بیماری کی نحوست مایوسیت اور پریشانی کے ساتھ کوئی بھی نہیں رہتا چاہتا۔ رہ گئے تم اور میں.....“ اسی اثنا آمنہ نے کروٹ بدلی تو بلال نے اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور ٹھیل لیمپ آف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

”صاحب جی مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا،“ جھمو نے کمرے کی اس دھندلی روشنی میں ان کے قریب ہو کر کہا۔

”شیم یہاں بیگم ڈسٹرب ہو جائیں گی، ساتھ والے کمرے میں چلتے ہیں، کچھ تم اپنی سناؤ، کچھ میری سنو.....“

”صاحب جی اگر کسی نے دیکھ لیا تو بہت برا ہو جائے گا۔“ وہ ان کے ساتھ باہر آتے ہوئے بولی۔ ”کل ہی یہ خبر جھکیوں میں پھیل جائے گی، شوہر تو مجھے کچھ نہیں کہے گا البتہ سری میری چٹیا کاٹ کر گھر سے باہر نکال دے گی۔“ وہ سہم کر بولی۔

”آپ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنا کیوں نہیں بنا لیتے، مجھ میں کوئی کمی ہے کیا؟ عورت کی جوانی ہر خاں پر چھا جاتی ہے۔ نوکری کرتی ہوں آپ کی، ویسے بھی

کئی کا لبا جھروسا؟ بس دن بیوی کی بات مان لی۔ تم واپس جھگی میں وادی کے پاس اور میں دن بھر چار گھروں کی صفائی ستھرائی کر کے جب اپنے گھر پہنچوں گی تو حیران باب، میرا خون چوسنے کو میرے پرس کے ہر خانے کی تلاشی لے گا۔ اور آخر کار وہ میرے محنت کے پیسے نکالنے میں کامیاب ہو جائے گا اور پھر چل پڑے گا اپنے چرہ کی یاروں کی جانب..... کیا میری زندگی اسی گھن چکر میں ہی بیت جائے گی۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس زندگی پر..... اسے جینا نہیں کہتے..... بے شک بیگم مجھ سے خوب صورت اور بڑے گھر کی ہے لیکن اس حقیقت سے میں انکار کیوں کروں..... کہ وہ اپنی جوانی کی عمر گزار چکی ہے۔ ایک بیمار اور محتاج عورت شوہر کے لیے بھوسا ہے، جسے جب چاہے آگ لگا کر راکھ کر دے اور نئی نوپا دلہن لے آئے۔ اپنی زندگی کے بقیہ دن عیش و عشرت میں گزارنے کا اس کا بھی حق ہے اور میرا بھی۔ تو کیوں نہ میں ہی پہل کر دوں۔ بیگم جی اب میں اس گھر سے جانے والی نہیں بلکہ تم یہاں سے نکلو گی۔“ وہ ٹھٹھکی لگاے سوچے جا رہی تھی۔

”جھمو تم بھی سو جاؤ، کوئی ٹیلی بوجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ وہ ہاتھ روم سے نکل کر بولے۔

”صاحب جی کیا بتاؤ؟ بس آپ پر بڑا ہی ترس آنے لگا ہے۔“ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنی چٹیا کو گھماتے ہوئے ترجم آمیز نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

”ترس اپنی بیگم پر آ رہا ہے یا مجھ پر..... کچھ لفظوں کا ہیر پھیر کر دیا ہے تم نے۔“ وہ حیرت سے بولے۔

”جی آپ پر.....“ وہ نظریں جھکا کر ذرا سا شرم کر بولی۔ ”مجھ پر کیوں؟ خود پر ترس کھاؤ کہ ایک رات میں چار مرتبہ جانے کا مطلب ہے کہ نیند تو رخصت ہوئی ناں اور میں کسی تان کر سو جاتا ہوں۔“ وہ اس کا شرمنا دیکھ کر مضطرب ہو گئے..... دل نے سرگوشی کی۔ ”آخر تمہاری محنت رنگ لے ہی آئی ہے۔ اب یہ لڑکی ہمارے گھر کی لونڈی ہو گئی۔ اتنی سستی لیکن لا جواب.....“

ان حالات میں آپ پر جائز ہوں۔“ وہ کیسٹ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھا نہیں۔“ وہ مصحوبیت سے بولے۔

”صاحب جی لوئڈی مطلب ملازمہ، نوکرائی، مالک پر اپنا حق رکھتی ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھے، بیٹھے انٹرائی لے کر بولی۔

”کیا تمہارے حقوق میں ہم سے کوئی بات ہوئی ہے؟“ وہ غیر ارادی طور پر بیڈ پر بیٹھ کر تاسف بھرے لہجے میں بولے۔

”جی صاحب جی.....!“ وہ بڑھ کر ان کے سینے سے سر نکال کر بولی تو ایک دم سے وہ ٹھکے۔

”دشیم تم ہوش میں رہو..... ہنو یہاں سے اور بیگم کے کمرے میں جاؤ، میں نے تمہیں سمجھنے میں بہت غلطی کی ہے، دراصل تصور وار میں ہی ہوں۔“

”تم اس قدر حسین ہو، نمکین اور غزالی آنکھوں والی، ہر نی کے مانند قلائیں بھرتی ہوئی.....“ وہ ان کے گرد بازوؤں کا دائرہ تنگ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ آپ کے ہی الفاظ ہیں ناں..... اور پھر آپ نے مجھے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں تمہارا صرف صاحب جی نہیں ہوں، تمہارا خیر خواہ بھی ہوں، ہمدرد بھی، تمہیں ایک دن ایسی شاندار جگہ پر لے جاؤں گا کہ تم زندگی سے خوش ہو جاؤ گی۔“

”ہاں میں نے کہا تھا، مجھے یاد ہے..... پر تم غلط سمجھیں، تمہاری تعریف کرنا، گپ شپ لگانا تو یوں جھوٹ کہ اپنی بیٹی جیسی سمجھتا تھا اور شاندار جگہ کا مطلب کہ تمہارا بیٹا جب پڑھ لکھ کر میری طرح کا افسر بنے گا تو تم اپنی زندگی کو حسرت و تاسف سے نہیں دیکھو گی۔ تم نے تو میری ہر بات کا مطلب غلط نکالا۔“ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

”صاحب جی، میں آپ کی ان ہمدردیوں اور عنایتوں کا احسان چکانا چاہتی ہوں، جو نبی بیگم جی سندرست ہوئیں میرا آپ سے ناتا ختم ہو جائے گا۔ فی الحال میں آپ کی ضرورت پوری کر سکتی ہوں۔“ وہ بے باکی سے بولی۔

”کیونکہ مجھے آپ سے پیار ہو گیا ہے، میں آپ

کی خدمت کار کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوں۔ میں آپ کی حیثیت پہچانتی ہوں صاحب جی، تاحیات آپ دونوں کی ہاتھ بندھی غلام رہوں گی۔ صاحب جی میری مجبوری ہے نوکری..... جو منے کے جوان ہونے تک برقرار رہے گی اور آپ کی ضرورت بھی اسی کے ساتھ پوری ہوگی، جب تک منا اسی کالونی میں گھر نہیں خرید لیتا۔ یہی آپ کی خواہش ہے ناں.....“

”دشیم تم یہاں سے فوراً نکل جاؤ.....“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ سے اتارتے ہوئے بولے۔ ”میں نے گھر، گھر میں ایسے حرام کام ہوتے دیکھا ہے تو کیا اب اسی کو اپنے گھر کی خواست اور ندامت بنادوں۔“

”سوچ لیں صاحب جی، آپ کا جب دل مانے آپ کی غلام حاضر ہے۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ بلال وہیں ہی وق بیٹھے کچھ.... سوچتے ہوئے شیطان کی ہمراہی میں چلتے ہوئے دور دراز سرسبز و شاداب علاقوں میں گھومتے ہوئے مکمل طور پر اس کی گرفت میں چلے گئے۔

☆☆☆

”آخر میں جان تو صاحب جی کی بن ہی گئی ہوں۔“ وہ اپنے گدے پر لیٹی فخر و مسرت سے کروٹیں لے رہی تھی۔ ”زندگی نے میرے ساتھ جو انصاف برتا ہے، یہ میرے صبر و شکر کا صلہ ہے، اب سمجھ پائی ہوں کہ جیل کی ہر عورت پاک دامن کیوں نہیں؟ وہ مجھ سے پہلے اپنی حیثیت کو پہچان کر صاحبوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان بن گئی لیکن میں اس سے بڑھ کر ایک خواب دیکھ رہی ہوں، وہ پورا ضرور ہو گا ان شاء اللہ۔“

وہ عجب انداز سے سوچ رہی تھی۔

”بیگم مریوں نہیں جانی، اس کے جینے کا مقصد ہے کیا؟ خاوند کے لیے عذاب اور میرے لیے آزمائش..... کتنا ہی اچھا ہو، منائش میں سوتا رہے اور میں اپنی خود ساختہ جنت کا چکر لگا آؤں۔ کاش ایسا ہو جائے۔“ وہ حسرت و یاس سے سر اٹھا کر آمنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اسی اثنا بلال کمرے میں دے

سے دیکھا وہ جو نبی مکرمؐ کے لئے نکلے، منے نے فل والیوم میں روٹا شروع کر دیا۔

”چل پتر میں تجھے تو تیرے ابا کے پاس چھوڑتی ہوں، تمہاری سنڈی دادی تمہیں مجھ سے اچھا ہی پال لے گی۔ اس گھر میں میرے پاس سر کھانے کا وقت نہیں اور یہ کم بخت چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ چکی رہوں۔“ وہ بڑبڑاتی تو بیگم نے اسے آواز دی۔

”جھمو اسے تھوڑی دیر کے لیے باہر لے جاؤ، میری نیند خراب کر دی ہے اس نے۔“ وہ غصے سے بولیں۔ اسے ساتھ والے کمرے میں سلا کر میرے پاس آ جایا کرو۔“ ”نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے؟ بے وسائی ہو گئی ہے اسے۔ جو نبی آپ کے لیے اٹھنے لگتی ہوں، مجھے بالوں سے پکڑ لیتا ہے، اکیلا دوسرے کمرے میں کیسے سوئے گا؟ اسے تو عادت ہی نہیں۔“ وہ اسے پھکی دیتے ہوئے بولی تو بلال نے راک طویل آہ بھری اور آ منہ کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

”صاحب جی، اگر آپ نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟ کیسے چلتا میرا چولہا اور کیسے پلتا میرا بچہ.....؟“ اس کی پیشانی پسینے میں بھج گئی۔ ”صاحب جی جب یہ چیخ کر روتا ہے ناں تو بیگم جی اسے بہت موٹی، موٹی، گندی گالیاں دیتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دوں..... اور پھر بھی اس طرف منہ نہ کروں..... بس آپ کی محبت اور چاہت پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں، آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اس گھر سے نکال دی گئی تو پھر کسی کے گھر کام نہیں کروں گی، میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔

”بے فکر رہو، میری جان، اب تم ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رہو گی۔“ وہ اسے محبت آگئیں نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔

”صاحب جی، ہم جھکیوں میں رہنے والے لوگ نشی تو ہو سکتے ہیں۔ لیکن بے غیرت اور بے عزت ہونا..... یہ ہمارے خاندان کو چٹا نہیں..... میرا دامخ

خواب تو ہو ہی گیا تھا۔ پچھ آپ ہی اپنے بڑھاپے کا مان رکھ لیتے، مجھے دو چھپر مار کر گھر سے نکال دیتے۔“ وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”میں تو بے عزت ہو گئی اور اگر میرے شوہر کے کان میں اس کی بھنک بھی پڑ گئی تو اس کی غیرت مجھے اتار کئی کی طرح چن ڈالے گی۔“ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولی۔ ”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے صاحب جی۔“

”ہم تمہیں دنیا والوں سے چھین لیں گے چاندنی، تم نے تو ہماری تاریک راہوں میں روش کر نہیں چھیر کر نئی زندگی بخشی، جینا سکھایا، دنیا میں اکڑ کر چلنا سکھایا۔“ وہ احسان مند لہجے میں بولے۔ ”اب پچھتاؤ کیا؟ بس اپنی بیگم کو خوش رکھو جان۔ سب معمول سے چلتا رہے گا۔ خواہ خواہ پریشان ہو گئی ہو۔“

”صاحب جی بس دھڑکا رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ گھر کے تمام ملازم اور بیگم مجھے گھور رہے ہیں جیسے رگٹے ہاتھوں پکڑ لیا ہو، صاحب جی میں تو معصوم، نا تجربہ کار لڑکی تھی، آپ نے ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔“ وہ مکاری سے بولی۔

”جس دن آپ نے آنکھیں پھیر لیں تو میں اپنی نظروں سے دھڑام سے فرش پر آ گروں گی اور میرا شوہر، جلا داساں اور میرے بھائی اور دپور، جینہ میرے اوپر سے دندناتے ہوئے گزر جائیں گے۔ بتائیں کہ میں اس منے کو لے کر کہاں جاؤں گی؟“ وہ بناؤنی سسکیاں بھرنے لگی۔

”شیم، ہم کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دیں گے تو ایسا ظلم ہو گا ناں، خواہ خواہ ہی پریشان رہنا چھوڑ دو، جاؤ ڈکی کھلو، تمہارے لیے ایک خوب صورت جوڑا اور اسد کے لیے عید کا کرنا شلوار خرید کر لایا ہوں۔“ وہ خوشدلی سے بولے۔

”او جھمو کہاں مر گئی..... کتنی بار کہا ہے کہ میرے کمرے سے باہر قدم نکالا تو تمہاری چھٹی کر دوں گی۔“ ان کی لاؤنج تک آئی آواز چیرتی ہوئی ان کے کانوں میں زہر گھولنے لگی۔

جاتی ہوں لیکن صاحب جی چھو کر تو نہیں ہے ناں.....
ستر سال کا بڑھا، مجھے سوائے میٹھی، چڑی باتوں کے اور
کیا دے سکتا ہے۔“ وہ بھوس چڑھا کر بولی۔

”اچھا تو ایسا کرو کہ اپنا بستر بوریا اٹھاؤ اور یہاں
سے چلتی بنو، کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو میں تمہارا سر گنجا
کر کے تمہارے گلے میں انہی جوتیوں کا بار ڈالتی، منہ کالا
کر کے گدھے پر بٹھاتی اور اس کالونی میں دس چکر لگواتی
تا کہ تم دوبارہ اس طرف منہ کرنے کی جرأت نہ کر سکو.....“
”بیگم جی..... میرا قصور تو بتائیں، ایسی کون سی
غلطی کر دی ہے میں نے کہ آپ مجھے ذلیل و رسوا....
کرنے پر اتر آئی ہیں۔“ وہ ایک دم ڈھیمی پڑ گئی۔

”کیا میں نے آپ کے سہاگ کو لوٹ لیا ہے.....
ایسا وہم مت کریں بیگم جی..... کہاں آپ بیگم جان
اپنے شوہر کی اور کہاں میری حیثیت.....؟ وہ تو میرے
باپ برابر ہیں، نہ جانے آپ کو شک کیوں گزرا.....؟
میرا جینا حرام کرنے سے آپ کو کیا ملے گا۔“

”میں تمہارا جینا حرام کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں
سمجھیں تم، ذرا کان کھول کر سن لو کہ تم کل کی چھو کر
مجھ تجربے کا رعبوت کو چمکے کیسے دے سکتی ہو؟ میں سب
کھیل تماشے کا اور اک رکھتی ہوں، میری ٹانگوں سے
جان نکلی ہے، اس دماغ سے نہیں، نہ ہی قوت بصارت
زائل ہوئی ہے اور نہ ہی سماعت نے میرا ساتھ چھوڑا
ہے۔“ وہ پھر استحقاق سے چیخیں۔

”لو جی کر لو گل..... بیگم جی آپ کو غلط فہمی ہوئی
ہے، صاحب جی تو میرے ابا سے بھی عمر میں بڑے
ہیں بلکہ میرے دادا کے لگ بھگ ہیں، میں انہیں اسی
قابل احترام نظروں سے دیکھتی ہوں اور وہ مجھے اپنی
بیٹی ہی سمجھتے ہیں۔“ وہ شیریں لہجے میں بولی۔

”اچھا تو تمہارے گھٹیا خاندان میں باپ، بیٹی کا
غلط اور نا پاک تعلق بھی جڑتا ہے۔ واہ کیا خوب ہوتم
لوگ.....! اور آؤ میرے قریب.....“ وہ جھکمانہ لہجے
میں بولیں تو وہ ان کے قریب بیڈ پر بیٹھ کر ان کے
کندھے دبائے۔

”جاؤ بیگم۔“ وہ آہستگی سے بولے اور اسٹڈی
روم کی طرف چل دیے۔ جھمو، بیگم صاحبہ کے کمرے کی
طرف گالی گلوچ سننے کی تیاری کرتے ہوئے پہنچ گئی۔
”یہ بتاؤ جھمو کہ تم صاحب سے کس قسم کی باتیں
کرتی ہو، وہ ایک تعلیم یافتہ، بائیسویں گریڈ سے ریٹائرڈ
ایک جانے پچھانے افسر اور تم دو نکلے کی ان پڑھ اور
جاہل، بچگی میں رہنے والی عورت..... تم دونوں ایک
دوسرے سے ایسی کون سی راز دارانہ باتیں کرتے ہو۔“
ان کے لہجے میں شیم کے لیے ڈھیروں نفرت تھی۔

ادھر جھمو نظریں ان کے چہرے پر جمائے اپنا
نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر اپنے غصے پر قابو پانے کی
کوشش کرنے لگی۔

”آہ نکلیں نیچی کرو اور مجھے جواب دو۔“ وہ
دھاڑیں۔ وہ نظریں ادھر ادھر کر کے کھڑکی سے باہر
لان میں جھانکنے لگی۔ جہاں بلال اس کے بیٹے سے
کھیل رہے تھے۔

”آج ذرا مجھے میری الماری تک لے چلو، یقیناً
تم نے میرے قیمتی کپڑے، جوتیاں اور پرس چرا لیے
ہوں گے، فقیرنی کو گھر کا فرد بے کر خان صاحب نے
اچھا نہیں کیا۔“ وہ سخت نفرت بھرے لہجے میں بولیں۔
”بیگم جی میری بات ذرا غور سے سنئے گا۔“ جھمو

نے بھی ناگواری سے کہا۔ ”مجھے آپ کے ان استعمال
شدہ چیزوں سے کوئی غرض نہیں، یہ جوتیاں آپ کے
نصیب میں تو ہیں نہیں..... صفائی والی کو ہی دے دیں۔
اور تمام پرس اپنی سہیلیوں میں بانٹ دیں کیونکہ میں
استعمال شدہ چیزوں پر تھوکتی بھی نہیں..... آپ کی
زر خرید غلام نہیں ہوں کہ ہر وقت جوتے کھاتی
رہوں.....“ وہ بے نیازی سے کہتی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”واہ نواب زادی، میرے مرد کے بارے میں
کیا خیال ہے تمہارا..... کیوں تھکی رہتی ہو ہر وقت
صاحب میں، یہ قوف مرد پر بھروسہ کرنے والی عورت
جلد بادی ردھو کا کھائی جاتی ہے۔“

”مرد تو ہمیشہ نواکھوڑ گھوڑے کا سوار بیگم جی سب

خون دوڑ رہا ہے۔ تم نہیں جانتی ہو کہ وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں اور پھر میرے دو بھائی شیر جیسے تھے تو کیا ہی نگل جائیں گے..... اور تیرے خاندان کو خبر تک نہیں ہوگی، اگر تم اپنا اور اس بچے کا بھلا چاہتی ہو تو صاحب کے آنے سے پہلے یہاں سے دفعتاً ہو جاؤ..... وہ دھمکی دیتے ہوئے تو تکرار پر اتر آئی تھیں۔

”بیگم جی، آپ مجھے سیدھے طریقے سے نکال سکتی ہیں لیکن میں اس الزام کا اقرار نہیں کروں گی کیونکہ میں بے قصور ہوں۔“ وہ زار و قطار رونے لگی۔

”کلمہ ہی تو ذرا بلال کو گھر آنے دے..... وہ میرے ساتھ دھوکے بازی، فریب کاری اور بے وفائی تو کر سکتے ہیں لیکن جھوٹ ہرگز نہیں بولیں گے، وہ ایک سچے اور کھرے انسان ہیں۔“ وہ پُر تسکین لہجے میں بولیں تو جھمکو بھاگنے کے سے انداز میں باہر نکل گئی۔ دھڑکتے دل اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ لان میں نکلے تو بلال کو بچے کے ساتھ بال کھیلے ہوئے دیکھ کر ان کے قریب چلی گئی۔

”آپ تو مارکیٹ گئے تھے، اسے آئس کریم کھلانے، ہائے صاحب جی میں مرنے لگی ہوں، اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے، بیگم جی کو ہمارے عشق کی خبر ہوئے دو مہینے ہو گئے ہیں۔“

”وہ کہیے؟“ وہ حیرانی و خوفزدگی سے بولے۔

”ایسے نہیں ہو سکتا، وہ ناگوں سے محتاج ہم تک کیسے پہنچ سکتی ہے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے جان۔“

”آپ بھی بڑے معصوم ہی نکلے اور میں تو پرلے درجے کی بیوقوف اور تا مراد..... اور وہ بہت بڑے دل گردے والی عورت نکلیں کہ اس کمزوری اور محتاجی کی حالت میں بھی چور کو پکڑ لیا۔ میں بہت حیران ہوں صاحب جی.....“ وہ تڑپ کر بولی۔

”ارے جلدی سے بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ وہ.....

بلے قرار ہو کر کرسی پر بیٹھ گئے۔

”صاحب جی وہ بڑے وثوق سے دعویٰ کرتی ہیں کہ ہم دونوں کے تعلقات میں گڑبڑ ہے اور آپ

مجھے سیدھی بات کا اٹا جواب دیاتے ہیں؟“ وہ اس کا کان مروڑ کر بولیں۔ ”اس قرآن کریم پر ہاتھ رکھ کر اپنی بدچلتی اور بدکاری کا اعتراف کرو..... میں تمہیں معاف کر دوں گی لیکن اس گھر میں ایک منٹ بھی نہیں رکنے دوں گی اور نہ صاحب سے سوالات کروں گی، نہ ہی کالونی میں کسی کو تمہاری اصلیت سے آگاہ کروں گی، خدا کے لیے کسی اور گھر کا دروازہ کھٹکناؤ۔ جہاں تمہیں جوان صاحب کی اصلی قربت نصیب ہوگی۔ چھوڑ دو خان صاحب کو..... وہ ایسے تو ہر گز نہیں تھے۔“

”ہائے بیگم جی..... اللہ معافی.....! قرآن مجید کو بچ میں ہم کیوں لائیں؟ میں نے کچھ کیا ہوتا تو اپنے گناہ کا اعتراف ضرور کرتی، صاحب کی رحم دلی اور ہمدردی کو آپ نے بدکاری کا نام دے دیا۔ کسی بیوی ہیں آپ توبہ، توبہ.....“ وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولے۔

”اچھا یہ بات ہے تو سنو دھوکے باز اور جھوٹی عورت..... تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید کیے ہیں، تم مجھے ٹراٹکولاز رکھلا کر جو ناک کھیل رہی تھیں آج اس کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لو، میں نے پچھلے دو مہینے سے گولیاں کھانی چھوڑ دی ہیں، رات بھر جاگ کر میں نے اپنے شوہر کو بھی پہچانا اور تمہاری بے باکی، بے شرمی اور بے لحاظی کو بھی خوب پرکھا..... اور بار بار پرکھا کہ کہیں میں شک کی بنیاد پر..... تم سے زیادتی نہ کر دوں..... اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو اپنا جرم تسلیم کر لو۔ یقیناً جانو کہ تمہیں کچھ نہیں کہوں گی لیکن بلال کو اس گھر سے نکال دوں گی، میں اس کے پانچ بچوں کی ماں ہوں، کیا بیمار ہو کر میں کمزور ہو گئی ہوں؟ ایسا مت سمجھو بلکہ میں اپنے بچوں کی نو نظر ہو گئی ہوں۔ میری اولاد میری ایک آواز پر میرے پاس دوڑی آئے گی اور اس بدکار باپ کو اٹھا کر کسی اندھے کنویں میں پھینکنے میں ایک پل نہیں لگائے گی، تمہیں تو وہ کھڑے، کھڑے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے، ان میں خان خاندان کا ماہنامہ پاب کیڑہ۔ مارچ 2019ء

”نکاح کے بغیر میں واشتہ ہوں، مجھے آپ کی بیوی اور بچے کس بل بوتے پر یہاں رہنے دیں گے۔ نکاح کے دو بول عورت کے تحفظ کا قلعہ ہیں صاحب جی۔“

”پگلی! بہت عجیب سوچ ہے تمہاری۔۔۔۔۔ مجھ سے نکاح ناممکن ہے۔۔۔۔۔ میں پانچ جوان بچوں کا باپ ہوں۔۔۔۔۔ میری بیٹی کی سسرال والے اس کی ناک میں دم کر دیں گے۔ ہمارے معاشرے میں دوسری شادی قابلِ نفرت سمجھی جاتی ہے اور وہ بھی اپنی گھر کی ملازمہ سے۔۔۔۔۔ تو برا استغفار۔۔۔۔۔ میں تو سوچتے ہی پسینے میں جھج گیا ہوں۔۔۔۔۔ آئندہ ایسے دل دہلا دینے والے مشوروں سے محتاط رہنا۔“ وہ قدرے سختی سے بولے۔

”صاحب جی آج تک مجھے شوہر کے علاوہ کسی مرد نے جھوٹا کہ نہیں تھا۔ آپ نے مجھے بہلا بھلا کر اس طرف متوجہ کیا میرے بچے پر اپنی جان، مال اور محبت لٹائی درنہ پت کے قابو نہ آئی۔“ اور بھی جانے وہ کیا، کیا انکشافات کر رہی تھی اور بلال حق دق اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ ہی کی باتوں میں آکر میں نے اپنے شوہر سے جھگڑا کیا، گھر خراب کیا۔“

”چلو بس بہت ہو گیا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ تمہیں پیسہ چاہیے۔ بتاؤ کہ تمہاری قیمت کیا ہے، اس سے کوئی قیمت ادا کروں گا۔“ وہ ترخ کر بولے۔

”صاحب جی۔۔۔۔۔ عورت کی عزت انمول ہوتی ہے صاحب جی، میں آپ کو دنیا بھر میں نشر کر دوں گی، آج کل میڈیا کا دور ہے، میں اپنے حقوق کے حصول کے لیے وہاں تک جاؤں گی کیونکہ بڑا حامد دہی جب ذلت کے گھن چکروں میں پھنس جاتا ہے تو پھر موت ہی اسے رہا کر سکتی ہے۔ سوچ لیں۔“ وہ بڑی مکاری سے کہہ رہی تھی۔

”میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا، تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے چوڑیاں پہن رکھی ہیں جو ڈر، بہم کر دے کر بیٹھ جاؤں گا۔“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے لڑکھڑاہے گئے۔ جسم تھر تھرا پٹنے لگا اور دل کی آواز کو محسوس کرتے ہوئے اک، اک، اک کر بولے۔

”بائیں گڑ بڑ میں پہلے کس نے کی۔۔۔۔۔ اس کا فائدہ اٹھانے میں آگے کون بڑھا۔ یہ مت بھولیے گا۔ صاحب جی انہوں نے سونے کی دوا کھانی چھوڑ دی ہے۔ اور ہماری رات بھر کی تمام کارروائیوں کی انہیں شد بد رہی۔“ اس نے گویا انکشاف کیا۔

”صاحب جی انہوں نے اتنا بڑا دھماکا کیسے برداشت کیا ہوگا کہ کہاں وہ اور کہاں آپ نے مجھے ان کے برابر لڑا کر کیا پہنا دیجی کہ میں انہیں ہر بات پر ٹکا کر جواب دینے لگی تھی، یہ سوچ کر کہ ہم دو عورتیں ایک مرد کی حصے دار ہیں تو پھر میں انہیں مالکن کی حیثیت کیونکر دوں، میری نظروں میں ان کی وقعت ٹوٹے ہوئے فرنیچر کے مانند ہے جسے بے دردی سے ایک کونے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اور میں خود کو مہارانی کا درجہ دینے لگی ہوں۔ آپ نے مجھے جان کہہ کر پکارا تو میں تنگ جان بننے کے خواب دیکھنے لگی۔ آپ نے میرے ساتھ یہ ستم پر ستم کیوں ڈھائے؟ مجھے سبز باغ دکھانے کا نتیجہ کتنا بھیا تک نکلا کہ میرے شوہر نے میری منتیں کر ڈالیں لیکن میں نے اس سے طلاق حاصل کر کے ہی دم لیا۔ کیونکہ مجھے کہا تھا کہ میرے پیچھے آپ ہیں، آپ نے اس ضمن میں میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ مجھے اس نفل سے روکنا آپ کا فرض تھا صاحب جی۔۔۔۔۔“ وہ روتے ہوئے بولتی گئی۔

”اس کا حل بتاؤ اور رونا دھونا چھوڑ دو۔۔۔۔۔“ وہ متذبذب سے لہجے میں بولے۔

”وہ یہ کہ آپ مجھے سے نکاح کریں گے اور میں ایک بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں ہمیشہ کے لیے آپ کے ساتھ رہوں گی۔“ وہ مستحکم لہجے میں بولی۔

”اس گھر کو ایک جوان اور تندرست و توانا عورت کی ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میں نبھانے کے لیے ہمیشہ سے تیار رہی۔ آج بھی مجھے اپنا وفاق دار پائیں گے۔“

”مجھے تمہاری وفاق دہا پر رتی بھر شک نہیں۔“

نکاح کے بغیر بھی تو سب کچھ چل رہا ہے ناں۔۔۔۔۔ وہ نہایت سے بولے۔

”میں نے..... تو..... تم سے شادی کرنے کے وعدے
 دے دیے تھے۔ تمہاری رضا مندی کے بغیر اس گناہ
 عظیم کا آغاز ہرگز نہ ہوتا۔ اس لیے اپنے دماغ کو عرش
 معلیٰ سے تھوڑا نیچے لے آؤ بہت فائدہ ہے میں رہو گی۔“
 وہ بظاہر گر جتے برستے لہجے میں بولے ہوئے سوکھے
 پتے کی طرح لرز رہے تھے۔

”میری بات غور سے سنو..... بیگم صاحبہ کی برابری
 کرنے سے باز آ جاؤ، سارا بگاڑ ہی اس برابری کی وجہ
 سے ہوا ہے، میں دل و جان سے تمہارا ہندو اور خیر خواہ
 ہوں اور تم میرے وقار اور شان و شوکت کی قاتل بننا
 چاہتی ہو، جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ اور اس بچے کو
 لے کر ابھی اور اسی وقت گیٹ سے باہر نکل جاؤ، ورنہ تمہیں
 چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

”صاحبہ جی سوچ لیں اچھی طرح..... گھائے
 میں رہیں گے آپ، میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں تو پھر
 بھی قابل قبول ہوں کہ نہ میری عزت نہ حیثیت اپنا
 سوچیں.....“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔ ”آپ ایک وعاباز
 اور جھوٹے انسان ہیں۔“ وہ ان کی طرف انگلی
 اٹھاتے ہوئے بولی۔

”اپنی بیگم کو دعا دینا آپ جیسے مروجہ عزت اپنا
 فرض سمجھتے ہیں۔ میں آپ کے لیے اک چیونٹی کی حیثیت
 سے بھی کم تر ہوں..... یہ آپ کی غلط فہمی ہے کہ آپ مجھے
 روک دیتے ہوئے گزر جائیں گے۔ یاد رکھیں۔ یہی نازک،
 کمزور، بے ضرر چیونٹی جب وجود پر پھر جائے تو جسم
 خارش زدہ ہو جاتا ہے۔ بے شک ایسا ذاتی طور پر ہوتا ہے
 لیکن ایک بار تو وہ اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب
 ہو جاتی ہے ناں.....“ وہ ہنسنے پھلا کر بولی۔

”پلیس بلائیں پولیس کو، میں جانے کے لیے
 تیار ہوں۔“

”اپنی زبان کو لگام دو اور فوراً یہاں سے ونگ
 ہو جاؤ، وہ آنکھیں نکالنے ہوئے بولے۔ ”گناہ کی
 ترفیب دینے والی بھی خود اور..... اور.....“ وہ کف
 اڑا رہے تھے۔

”صاحبہ جی اگر مدد ہوئی ناں تو اس کا خمیازہ
 آپ کو بھگتنا پڑے گا۔ یہ جو آپ نے شرافت، انسانیت
 اور خوش خلقی کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ تارہ تار ہوئی تو
 اپنی برائی کو کس، کس سے چھپائیں گے۔ کالونی میں یہ
 کہانی جنم لے گی اور اس کے اثرات دور، دور تک
 جائیں گے۔“ وہ بچے کو اپنے ساتھ چمٹا کر بولی..... تو
 وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

”تمہیں میری طرف سے مکمل طور پر اجازت
 ہے۔ جیسا کرنا چاہتی ہو کر دیکھو، منہ کی کھاؤ گی۔“ وہ
 دھوکے سے بولے۔

”ٹھیک ہے صاحبہ جی..... یہ کام اسی گھر سے
 شروع کرنی ہوں، جہاں مجھے سبزی، باغ و کھا کر لوٹنا گیا
 تھا۔“ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔

”اگر تم نے بھی بہکانے کے ہتھکنڈے نہ
 آزمائے ہوتے تو مجھے ہمت ہی کیونکر ہوتی۔ ذرا اپنے
 گریبان میں جھانکو کہ سب سے پہلے عورت کی نیت میں
 فتور آتا ہے پھر وہ اس کا جال بنتی ہے اور جس شکار پر
 نظریں جمائے بیٹھی ہوتی ہے۔ اس پر موقع ملتے ہی جال
 پھینک دیتی ہے۔ اور اس پر غلبہ پالیتی ہے۔“ وہ رعب و
 دبدبے کے انداز میں بولے۔ ”یہ دھمکیاں اور تڑپاں
 کسی اور یار کو دنیا میں بلیک میل ہونے والا نہیں.....“

”آپ نے مجھ پر نئی الزام تراشی تھوپ دی۔
 بتائیں کہ میرا اس کالونی میں کون سا بار ہے، مجھے اپنے
 شوہر اور آپ کے سوا کسی نے چھوئے کی ہمت نہیں کی۔
 میں ہی ناواں لگی کر آپ کے تیر کے سامنے آ گئی۔“ وہ
 پھر زار و قہار رونے لگی۔

”خدا کے لیے رونا بند کرو، مالی ہماری طرف
 آ رہا ہے، اس کے کان میں معمولی سی بھک بھی پڑ گئی
 ناں تو بہت برا ہو جائے گا۔ آخر میں تم سے عمر کے اس
 حصے میں بھی جوانوں جیسی محبت کی۔ اور تمہاری عزت
 افزائی بھی کی۔ یہ سچا عشق ہی تو تھا۔“ وہ نرم پڑتے
 ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولے۔

”تو پھر نکاح کرنے میں حرج ہی کیا ہے؟ میں نے

غزل

کس خوشی کا میرے دل کو انتظار نہیں
مجھے کسی کی محبت پہ اعتبار نہیں
وہ کہہ رہا تھا کوئی اور راستہ جن لو
مجھے تو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں
یقین خود پہ مجھے تھا لیکن بہت زیادہ
مگر کسی پہ تجھی اب مجھ کو اعتبار نہیں
منار ہے ہیں سبھی سوگ آدمیت کا
اگرچہ لہجہ کسی کا بھی سوگوار نہیں
برس رہے ہیں یہ بادل سبھی کی چھت پر کنول
کہ موسموں پہ کسی کا بھی اختیار نہیں
کلام: یاسمین کنول، پسر در

☆☆☆

سلسلہ تو ہے شروع
سلسلے بھلاؤ گے
کر چکے جو وعدہ تم
بھول تو نہ جاؤ گے
لے کے امتحانِ درد
یونہی آزمائو گے
تجھ سے روٹھ جاؤں تو
کیا مجھے مناد گے
انتظار میں تیرے
عمر یونہی گزرے گی
میری یاد آئے تو
پھر سے لوٹ آؤ گے

کلام: فریدہ افتخار، اسلام آباد

کی تو اپنے شوہر سے آپ کی محبت میں ہی مدھوش ہو کر
طلاق لی تھی ناں..... آپ نے اس وقت مجھے منع کر دیا ہوتا تو
میں بچے کو یوں لاوارث اور یتیم نہ کرتی۔ میں تو اپنے بچے
کے لیے اس دلدل میں بھنسن گئی۔ میں نے اپنے جنگلی اسکول
کی استانیوں سے یہی درس سیکھا ہے کہ اگر زندگی کو بہتر
بنانے کا ایک بھی موقع ملتا ہے تو اسے سنہری بنا دو..... مجھے
اس وقت یہی سمجھ آئی تھی جیسے وہ تعلیم کی بات کر رہی ہوں
جس کی وجہ سے میں نے میٹرک اعلیٰ پوزیشن میں پاس
کر لیا۔ جب میں اس گھر میں آئی تو مجھے اپنی استانی کی بات
رو، رہ کر یاد آتی رہی تو میں نے سوچا کہ میں آپ جیسے خدا
ترس انسان کے زیر سایہ آپ کی خدمت کرتے ہوئے عمر
گزار دوں گی۔ میرے بچے کا مستقبل روشن ہو گیا تو میں
بکھنوں گی کہ ہمارے خاندان کے وارے نیارے ہو گئے۔
میں اسی طمع و لالچ کی اشتبا میں ایسی پھنسی کہ آپ کی میٹھی
زبان نے مجھے اپنا اسیر بنالیا اور پھر گناہ سرزد ہونے میں
پہ بھی برابر کے شریک بن گئے..... اب میں کہاں جاؤں؟
کئی گھر بتا دیں۔ جو مجھے سہارا دے سکے.....“

”بچی میں نے تمہیں یہاں سے جانے کے لیے
نہیں کہا۔ تم نے ہی الٹی سیدھی ڈیمانڈ پیش کر دیں تو
میں کیا کرتا..... غصے اور خفگی میں آتا تو ایک فطری عمل
ہے یاد رکھو کہ محبت بے مشروط ہو تو اس کی جڑیں بھی
کنزور نہیں ہوتیں۔ وہ پھلتی پھولتی رہتی ہے۔“ وہ اسے
تسل و تشفی دیتے ہوئے بولے۔ مالی پھولوں کی کیاری
سنگوڑی کر تے ہوئے بار، بار انہیں دیکھ رہا تھا۔

اسی اثنا دھلائی والی بوزھی عورت سر کھجباتے
ہوئے باہر آئی اور ان کے قریب پہنچ کر اپنے دوپٹے
سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے چھمو کی طرف کھانچا جانے
والی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

”چھمو تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ یتیم جی کو میں بڑی
اوکھی ہو کے غسل خانے میں بٹھا آئی ہوں، تمہیں
آوازیں دیتے ہوئے ان کا گلا خشک ہو گیا۔ جب میں
پہنچی تو وہ دھاڑیں مار رہی تھیں۔ صاحب جی! اسے
سمجھائیں کہ اگر یہ لڑکی اپنی ڈیوٹی نبھانے کے قابل

دیں تو سوزی چور جائے..... میں اپنی چھوٹی بہن کو بیگم جی کی خدمت کے لیے ابھی لے آتی ہوں، میری بہن جوانی میں بیوہ ہو گئی وہ یہاں مصروف ہو جائے گی۔ اس سائل کو تو سوائے سرفی یاؤ ڈر کے اور کچھ آتا نہیں..... میاں سے طلاق لے کر نہ جانے کس کو پھنسانے کے چکروں میں ہے۔ سمجھتی ہے کہ مجھے سرخاب کا پر لگ گیا۔ کچھ زیادہ ہی منہ لگا دیا ہے آپ نے اسے.....“ وہ نہایت سختی سے بولی۔ ”اب یہاں سے چلتی بنو..... پجاری وہ جتنی بیگم غسل خانے میں دہائی چارہ ہی میں۔ جس کام کے لیے انہوں نے تمہیں رکھا ہے، تم وہی بنو..... اگر میری ہڈیوں میں جان ہوتی ناں تو میں ان کی خدمت جی تے کھری نیت ناں کر دی“ وہ بے لای علی سے بولتی چلی گئی۔ اور جھمو سر جھکائے سنتی رہی۔

”اماں، تم بیگم صاحبہ کے پاس چلو، جھمو ابھی آتی ہے، اس کے بیٹے کا ایک مسئلہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا تیار کھڑا ملتا ہے۔“ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بہانہ بنا گئے تو اماں ہوں کہہ کر جھک کر جھمو کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”شیم اب سب کو تماشہ دکھاؤ..... بیگم صاحبہ نے جہیں کام میں کوتاہی برتنے کی وجہ سے ڈانٹ دیا ہے..... اپنا دل صاف رکھو، جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو پھر یہ رو نا دھونا کیا؟ چلو اٹھو شاباش۔“

”جی صاحب جی..... نوکرانی، ملازمہ اور بن فز... خریدی ہوئی لوٹدی..... تو کیا میں عمر بھر اسی لقب سے پکاری جاؤں گی۔“

وہ پھر آنسو گرانے لگی تو بلال کمر پر ہاتھ رکھ کر کہیں کی کرسی سے اٹھے اور ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دیتے ہوئے جھکے، جھکے انداز میں بیگم کے کمرے کی طرف چل دیے۔

”مجھے اپنا مقام، حیثیت پہچانا چاہیے، یہ بڑھا کھوسٹ کیوں کرے گا مجھ سے نکاح؟ اس پر چند دنوں

کی بہار ہے، مرکب جائے گا، جائے اس خدمت لڑائی میں کچھ تو سوچ ہی جائے گا۔ دل کا تو نرم ہے پتھارہ چل اٹھ پیاری جھمو..... بیگم کی برہنہ طعن کو درگزر کر اور اپنا اوسیدہ کر..... اسے مقصد حیات بنالے..... فائدے میں رہے گی۔“ وہ خود کھائی کرتی ہوئی اپنے بچے کو بوسے دیتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

”بلال میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گی، میری اس قدر انسٹلٹ، یہ میں شرم نہیں کر سکتی۔“ وہ آنسو بہاے بغیر منجم لہجے میں بولیں۔

”آمنہ، تمہیں وہم ہو گیا ہے اور وہم کا علاج کسی حکیم، ڈاکٹر اور معالج کے پاس نہیں۔ جب میں بھرپور جوان تھا تم نے مجھ پر بے تحاشا اعتبار کیا اور میں نے بھی تمہارے اعتبار کو کبھی نہیں پہنچائی۔ اس وقت میری عمر دیکھو یا..... آئینہ دیکھتا ہوں تو نہامت و تاسف سے فوراً وہاں سے نظر سہٹا لیتا ہوں، یہ وقت تہمت بازی کا نہیں، مجھ پر بھر و سار کھو۔“ وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔

”بلال میں نے دو مہینے خود کو سمجھانے میں لگائے، خود کو بیوقوف بناتی رہی کہ ایسا قبیح فعل آپ سے سرزد ہونا ناممکن ہے مگر میں نے اپنی آنکھوں سے رات کی تاریکی میں بہت کچھ دیکھا۔ جب آپ دونوں مجھ پر جھک کر یہ یقین کر لینا چاہتے تھے کہ میں گہری نیند میں چلی گئی ہوں تو آپ دونوں کمرے سے باہر نکل جاتے تھے یا نیچے پڑے اسی گدے پر.....“ وہ مزید کچھ کہہ نہ پائیں اور سسک اٹھیں۔

”افسوس کہ آپ ہرگز نہیں مانیں گے، تجربے کار چور رنگے ہاتھوں پکڑے بھی جائیں تو بھی اپنے گناہ کا اعتراف نہیں کرتے۔ یہی حال آپ کا ہے، آپ مانیں یا نہ مانیں، حقیقت مجھ پر آشکارا ہوئے دو مہینے ہو چکے ہیں، بہت صبر کر لیا میں نے..... اس دن کے کیچو کری کو آپ نے میرے تہ مقابل کھڑا کر کے بے وفائی، دغا بازی اور خود غرضی کا ثبوت دیا ہے، میں اپنے بیٹے کے ساتھ جاری ہوں اس عمر میں سماجی چاہے اپنا چ اور محتاج ہی

ہو، بہت کارآمد ہوتا ہے، اس کا ادراک آپ کو
 جانے کے بعد ہوگا۔“ وہ آزر دگی سے بولیں۔
 سے یہ امید نہیں تھی۔ لگتا ہے جوانی میں بھی نہ
 نے کتنے افسیر چلائے ہوں گے۔“

آمنہ! تم اپنے بیٹے کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو
 نہیں روکوں گا۔ یہ بجز یہ بھی کر دیکھو، اپنا گھر ہی
 کے لیے جنت ہے اس کے دروازے تم پر کھلے
 وند چاہے کتنی ہی عورتوں کے پاس جائے جو
 ی کا ہوتا ہے، وہ ان چالو عورتوں کا نہیں
 اگر مجھ سے غلطی سرزد ہو بھی گئی ہے تو اسے نظر
 ویتیں، ہم دونوں کے درمیان لحاظ داری اور
 تے کی پاسداری کی ایک مضبوط دیوار تو قائم
 افسوس کہ تم نے اسے ہی گرا دیا۔ اب ہم
 امل کر رہنا مشکل ہو گیا ہے۔ تم جانا چاہتی ہو تو
 یوں گا نہیں..... واپس آنا جاؤ گی مجھے خوش
 ہتے ہوئے پاؤ گی۔“ وہ پڑمردگی سے بولے اور
 سے باہر نکل گئے۔

☆☆☆

اپنا گھر اپنا ہی ہوتا ہے لیکن میں نے تو اپنا گھر
 بپ دیا جو اس کی حقدار نہیں تھی۔ آج بلال نے
 ی جنت کا حقدار تسلیم کرنے پر مہر ثبت کر دی۔
 مگی کی ضرورت تھی۔ ایسے ساتھی کی جو شب و
 سے کپ شپ بھی لگائے، مشورے بھی کرے
 کی تنہائیوں میں ان کا ساتھ بھی دے اور ان کا
 کر زندگی میں گامزن بھی رکھے۔ تصور میرا ہے
 انہیں محاف نہیں کر سکی۔ جنہوں نے میری
 میں بھی میرا ساتھ دیا۔ بچوں کی طرح میری
 ست کی..... ایک ماں بن کر عمر کے اس حصے میں
 ساتھ راتیں آنکھوں میں کاٹ دیں۔ میں نے
 صلہ دیا کہ پوری کالونی میں ایک سرگزشت چھوڑ
 کے سر پر آئی تھی آج میں ایک بے گھر اور...
 اں اور ساس کے روپ میں بے وقعت ہو گئی
 بچے اور بھو بھی مجھے ایک ناکام، بزدل اور

”خان صاحب مجھے آپ پر اعتماد اور بے تحاشا
 مان تھا۔ میں آپ کو آنکھیں (فرشتہ) کہہ کر پکارا کرتی
 تھی۔ یہ ایک سچائی تھی کہ میں نے بلا تامل ایک جوان
 لڑکی کو اپنے بیڈروم میں جگہ دے ڈالی اور وہ فرش سے
 اٹھ کر عرش تک آنے کے تمام حربے استعمال کرنے لگی
 اور مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔ مٹھکھو کھوڑے بنانے والا
 خاندان ہمارے برعکس مقابل اکٹھا ہوا اور میں پانیوں میں
 گھری ہوئی آج پانی کا ایک قطرہ بن گئی۔ اور خان
 صاحب آپ کیا ہیں..... میری جان، میرے دل آپ تو
 خاک کا ایک ذرہ بن گئے۔ یہ کس قدر ظالم اور جاہل وقت
 ہے کہ ہم دونوں کسی سے آنکھ اٹھا کر بات کرنے کی سکت
 ہی نہیں رکھتے تو پھر ہم میں دوری اور جدائی کیسی؟ ہمیں
 یکجائی، صلح و اتفاق اور صفائے دل سے ایک دوسرے کی
 قربت کی ضرورت ہے۔ دیکھو بلال میں نے داکر سے
 چلنا چھوڑ دیا ہے، میں نے ریٹائر کیا ہے کہ جب تک ہم

اپنا پوچھا۔ پاؤں پر اٹھا کر پے پی کاؤں لگاتے ہیں تو ہر قدم کھینچنے قدم سے زیادہ مضبوط اور متوازن ہوتا ہے۔ جب ہم دوسرے کے سہارے پر زندگی کو اس کا محتاج کر دیتے ہیں تو احساسِ زیاں ہمیں جیسے نہیں دیتا۔۔۔۔۔ پچھتاوا اور قلق ہمارا ہم سفر بن کر ہمیں ہر لحاظ سے لاغر کر دیتا ہے۔“ آمنہ نے چشمِ تصور سے دیکھا کہ بلال صاحب اس کی واپسی کے منتظر ہیں۔ جبکہ جھمو ان کے ساتھ ڈائمنگ چیئر پر بیٹھی خانساں کو کرما کر ماردنی لانے کا حکم صادر کر رہی ہے۔

”جھمو گھر تو میرا ہے بے دنیا بھر کے سامنے بیاہ کر سرسرا والوں نے سر پر تاج رکھ کر سجا دیا تھا میں تو مالکن ہی رہوں گی اور تم نکاح کے باوجود ایک کٹر ملازمہ اور بن مول لونڈی کا درجہ رکھو گی۔ کاغذ کی اک ناؤ کے سوا تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔۔۔۔۔“ یہ سوچتے ہوئے وہ آہستہ، آہستہ چھوٹے، چھوٹے قدم اٹھاتی پورچ میں آگئیں۔ ڈرائیور نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور تیزی سے انہیں سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

”میں پانی کا ایک قطرہ نہیں وسیع و عریض سمندر ہوں، جس میں بہت کچھ سایا ہوتا ہے۔ مجھے آج ہی اس کا علم ہوا ہے۔۔۔۔۔ مجھے اپنے گھر چھوڑ دو، اب میں اپنے پاؤں پر چل سکتی ہوں۔ وہاں خان صاحب میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولنے لگا۔ وہ شان بے نیازی سے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ جب دو گھنٹے کی مسافت طے کر کے وہ اپنے گھر کے گیٹ پر پہنچیں تو بلال کے ہمراہ جھمو انہیں خوش آمدید کہنے کے لیے پھولوں کے ہار لیے وہاں منتظر نظر آئے۔ غالباً میری آمد کی خبر ہوئے ہی مسرت و طمانیت سے مغلوب ہو کر ان تک پہنچا دی ہوگی۔ وہ ان کے قریب آہستہ، آہستہ چلتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ جھمو تو میری بہو سے ہزار گنا زیادہ قابلِ قبول ٹھہری کہ میرے انتظار میں دروازے پر کھڑی ہے۔۔۔۔۔ جب وہاں گئی تھی تو دروازہ کھلنے میں ہی آدھا گھنٹا لگ گیا تھا۔

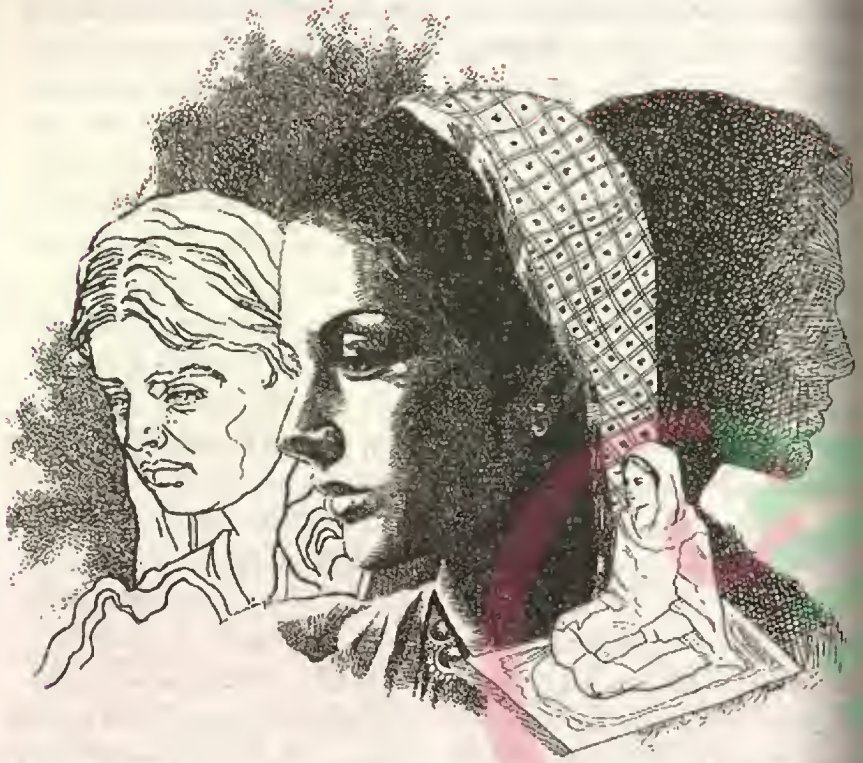
”تیکم جی۔۔۔۔۔! آج اس گھر میں آپ کی پسند کا کھانا تیار کیا گیا ہے۔ آپ کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اس گھر کا ہر چپا سچایا ہے۔ آپ کے پسندیدہ رنگ کا ڈریس استری کر کے ہاتھ روم میں لٹکا دیا ہے۔ آپ فریش ہو جائیں، میں کھانا لگوائی ہوں، آپ تو بہت کمزور ہو کر واپس آئی ہیں، اب میں آپ کا ویرا ہی خیال رکھوں گی جیسا مجھے سکھایا گیا تھا۔ اور میں آج بھی اسی گدے پر ہی آپ کے قدموں میں سوؤں گی۔ آپ کی معمولی سی آواز پر آپ مجھے خدمت کے لیے کمر بستہ پائیں گی۔“ وہ عقیدت مندانہ لہجے میں بول رہی تھی۔ یہ نیا رشتہ سوتن کا آمنہ پر کھل رہا تھا۔ یہ رشتہ بھی تو اسی حیثیت کا حقدار ہے جو آمنہ کا تھا۔۔۔۔۔ اس نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا جو کسی سہارے کا محتاج نہ تھا تو اسے محسوس ہوا کہ گھر کا چپا، چپا اسے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ بلال نے خوشی سے مغلوب ہو کر ان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

”خان صاحب میرا نیا تجربہ بہت کامیاب رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات پر سرتسلیم خم کر لیا ہے۔ ہم دونوں کے درمیان اب تیسرے کی ضرورت مجبوری بن چکی تھی۔۔۔۔۔ لیکن یاد رکھیے گا وہ قانون کہ اگر تم انصاف کر سکتے ہو۔ ورنہ ایک پرہیزگار کٹھن کرلو۔“ وہ پرسکون و اطمینان بھری سانس لے کر بولی۔

”آمنہ۔۔۔۔۔! اسی انصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے تم اس گھر کی بڑی بیگم جان اور شیم۔۔۔۔۔“ ”میں شیم اپنی بیگم جی کی پرانی خدمت گار۔“ جھمو نے بلال کے منہ سے بات اچک لی۔

”مجھے اس مقام کی شناخت کرانے کا بہت شکوہ۔۔۔۔۔ نکاح سے برابری کا درجہ حاصل کرنا ایک خواب تھا میرا۔۔۔۔۔ خوش فہمی تھی۔۔۔۔۔ میری حیثیت ایک خاندانی بیوی سے کم ہی رہے گی میں خود برابری کرنے والی کون ہوتی ہوں۔“ وہ خوشدلی سے بولی تو آمنہ نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا۔

ختم شد



ایک دن حوالی بیڑے کے ساتھ

عالمی یوم خواتین کے موقع پر ایک مثبت پیغام دیتی آسیہ عامر کی چشم کشا تحریر

منی کو فیڈر پلاتے ذہن تیزی سے اگلے کاموں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ منی دوبارہ سو گئی... تو اس نے بچن میں جا کر ایک چولہے پر دودھ گرم کرنے کے لیے رکھا اور دوسرے پر انڈا افرائی کرنے کے لیے ساس پیئں..... سب بچے الگ، الگ پسند کا ناشتا کرتے تھے اور اب اسکول کے لیے لٹچ بھی الگ، الگ وہ اسی میں ہلکان ہو جاتی۔ انڈا افرائی کر کے روٹی پکائی کیونکہ چھوٹے بیٹے نے کہا تھا کہ رات کا قیصر روٹی کے ساتھ کھاؤں گا۔ بڑی بیٹی کے لیے فرنج فراز بنائے۔ اس نے جب سے اسکول

صبح سرخ کی باجنگ کے ساتھ ہی سیکرہ کی آنکھ کھل گئی۔ جلدی، جلدی اٹھ کر وضو کیا اور فجر کی نماز پڑھی۔ تبیمات سے فارغ ہو کر قرآن پاک کے دور کو پڑھے اتنی دیر میں چھوٹی بیٹی اور سسلہ رونے لگی.... قرآن پاک کو احترام سے جزدان میں پلیٹ کر الماری کے اوپر رکھا اور جلدی سے منی کا فیڈر بنانے ووڑی کہ کہیں دوسرے بچے اور اس کا شوہر چھوٹی کے رونے کی آواز سے ڈسٹرب نہ ہو جائیں۔ نماز کے لیے تو حسب معمول اس نے شوہر اور ساس دونوں کو جگایا تھا لیکن انہیں نہیں اٹھنا تھا نہ اٹھے۔

جاننا شروع کیا تھا فرح فرارنے کے سوا کچھ میں نہیں کھا رہی تھی۔ اتنی دیر میں سات بجے کا الارم بج گیا۔ دونوں بچ باکس ٹرے میں اوپر نیچے رکھے اور ساتھ ہی انڈے کی پلیٹ، دودھ اور چائے کے کپ..... ٹرے میں رکھے اور پھر اتنی بھاری ٹرے اٹھا لے جلدی، جلدی باہر آئی کہ الارم بند کر دے کہ دھڑام سے عین سانس کے کمرے کے سامنے انڈے کی پلیٹ گر گئی جو ٹرے میں ٹیڑھی رہی ہوئی تھی۔ بدحواسی میں کپ میں سے دودھ اور چائے بھی چھلک اٹھے۔ اذان اور اس کے جگانے سے نہیں پر اس دھڑام کی آواز کے ساتھ ہی سانس صلیب کی آنکھ بھی کھل گئی۔

”اب آئی نہ تھی سرے، وہ دل ہی دل میں بولی۔“
 ”ارے خوبصورت صبح سویرے کیا کھڑا کر کے سب گھر والوں کی فینڈ حرام کر رہی ہو۔“ وہ دردناک سے پراگٹی تھیں۔ ”تم ثابت کیا کرنا چاہ رہی ہو بھی عورتیں اس وقت اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے لیے ناشتا بنا رہی ہوتی ہیں، تو کیا تم ہم پر احسان کر رہی ہو۔“
 ”وہ اماں.....“ سیکنے منمنائی۔

”بس آگے سے زبان چلوا..... میں کہتی ہوں جب تم سے کچھ ہوتا نہیں تو بازار سے ملکت، چپس منکوا کر بچوں کو بیچ میں دے دیا کر دو۔“ سیکنے نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا اور جا کر بیٹے کو جگایا تاکہ وہ جلدی سے تیار ہو سکے پھر اسے ناشتا بھی تو اپنے ہاتھ سے کروانا تھا۔ بیٹی کو آواز دی، شکر ہے اللہ نے بیٹی بھعدار دی تھی جو ایک ہی آواز پر اٹھ جاتی تھی، اتنی دیر میں جا کر بچوں کے یونیفارم استری کرنے لگی۔ اگرچہ ہمیشہ رات کو کر لیتی تھی، پانی کی بوتلوں میں پانی بھی بھر کر فریج میں رکھ دیتی تھی تاکہ صبح زیادہ افراتفری نہ پئے لیکن رات کو منی کو سلانے کے لیے لیٹی تو بچی سے پہلے خود ہی سو گئی۔ اس لیے اس وقت کپڑے استری کرنے پڑے۔ خیر جلدی، جلدی بچوں کو یونیفارم پہنا کر ناشتا کر دیا، ان کے بیک چیک کیے، بچ باکس اور پانی کی بوتلیں بیک میں رکھ کر بچوں کو گیت پر بھیجا کہ دین کا پارل منسلک رنج رہا تھا۔ اب شوہر کی تو الیاں شردع ہو گئی تھیں۔

”فجر کے وقت سے ابھی ہوتی ہو پر ہر روز وین

ہاں، بجا رہی ہوتی ہے، ہاں نہیں کرتی کیا ہو؟ اماں صبح کہتی ہیں دھیان تو کہیں اور ہوتا ہے۔“ شوہر کی دہائی پر دو چار گرم آنسو آنکھوں سے نکل کر اس کے دوپٹے میں چھپ گئے کہ ابھی رونے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے کہ تیور کے لیے کھانا بھی پکا تھا اور ناشتا بھی اور اماں کو بھی بیڈلی و بی تھی۔ وہ تو چائے پیے بغیر پاؤں بیڈ سے نیچے نہیں اتاریں گی۔ بچوں کے بیچے بچے ناشتے ڈھک کے رکھ دیے کہ فارغ ہو کر کھا لے گی۔ اماں جی کو چائے دینے گئی تو ساتھ ایک فرمائش لے آئی۔

”سیکنے آج میرا دل دیا کھانے کا چاہ رہا ہے۔“
 ”جی اماں ابھی پکا دیتی ہوں“ اب ایک چوتھے پر ولایا کہنے کے لیے رکھا دوسرے پر سالن..... ساتھ ہی آٹا گوندھ کر رکھ لیا۔ تیور کو ناشتے میں آلیٹ پر اٹھا پسند تھا۔ اس کے کپڑے ہاتھ روم میں رکھ کر اسے جگایا۔
 ”گرم پانی ڈال دیا بالٹی میں؟“ تیور نے رعب سے پوچھا۔

”آپ تو ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہیں۔“
 ”موسم بدل گیا ہے، بھی تو عقل کا استعمال کر لیا کرو۔ خود تو رات میں اوڑھ کر سو رہی تھیں، میں بھی انسان ہوں۔ مجھے بھی سردی لگتی ہے تمہیں تو کام نہ کرنے کا بہانہ چاہیے۔ بس اپنی ذات کی فکر ہی کرتی رہنا۔“ ایک ذرا سی بات پر اچھا خاصا ٹیکسچر سننے کو لگ گیا تھا۔

”اچھا، میں پانی گرم کر کے بالٹی میں ڈال دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر آ گئی ورنہ وہ، وہ گڑے مردے اکھڑتے کہ اللہ کی پناہ..... اس پہلے ”بجیرید“ سے فارغ ہونے کے بعد سیکنے کو یاد آیا کہ اسے تو پیاس بھی لگ رہی تھی اور بھوک بھی، نہار منہ پانی پینے کی عادت تھی، بچپن سے اب تو یہ عادت تھوڑی ہی پانی پیتی تھی۔ ابھی یاد آیا تو پانی لی لیا، پانی پینے پر بھی سانس کے طعنے سننے پڑتے کہ فارغ بیٹھنے کے بہانے پورے پانچ منٹ لگا کر پانی پیتی ہے، تو بے، پانی پینے میں بھی نزاکت ہے، ہوسورانی کی۔

سورج پوری آپ و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ رات کو بے شک، بلکی سی تنگی ہو جاتی تھی لیکن دن کے وقت وہی گرمی..... لال اینٹوں کے فرش کو جب برش سے رگڑ،

رگڑ کر صرف ڈال کر دھوا تو پسینے، پسینے ہو گئی۔ اس کے بعد بچن کی صفائی، کمروں کی صفائی، ہاتھ روم دھویا ان سب کاموں کے بیچ ہانڈی چولھا بھی کرتی رہی۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی کوشش ہوتی کہ نہادھو کر ظہر کی نماز بھی پڑھ لے۔ بچوں کے آنے کے بعد وہ انہی میں لگ جاتی۔ مٹی کو ہٹلا دھا کر تیار کر دیتی تو ساس کچھ دیر تو سنبھال ہی لیتی تھی اگر جو ان کی مرضی ہوتی۔ نماز پڑھ کر فارغ ہوتی تو برآمدے میں رکھے تخت پر اپنی سیدھی لیٹی اماں کسی سے فون پر چپک، چپک کر اسی کے متعلق کسی سے کچھ کہہ رہی تھیں جسے سن کر سیکینہ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”ارے ہماری بہورانی کا مت پوچھو وہ تو ایک بچے تک سوئی مری رہتی ہے۔ ہتا نہیں ساری رات کیا کرتی ہے جو سارا دن سو کر گزاری ہے ہم تو جو جگ اٹھتے ہیں پھر رات کو نبی بستر پر لیٹتے ہیں۔“ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے لگا کر ابھری تھی۔

”چل سیکینہ اپنا کام نہ پتا۔“ صحیح کہتے ہیں سیانے کبھی، کبھی لاعلمی رحمت ثابت ہوتی ہے، نہ اماں کی باتیں سنتی نہ پتا چلتا ان کے دل میں اس کے لیے کیا ہے۔

بچوں کے اسکول سے آنے کے بعد انہیں سلا کر پانی ابلا تھا اور اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ انہیں بوتلوں میں بھر کر فرنیج میں رکھا اور رات کے کھانے کے لیے اماں نے پلاؤ کی فرمائش کی تھی تو گوشت کی بخنی چولھے پر چڑھا دی۔ میٹھے میں چاکلیٹ ڈیزرٹ بنانے کی تیاری کی کیونکہ بچوں کو رات کھانے کے بعد میٹھا کھانے کی عادت تھی۔ ساتھ ہی لہسن اور نمائش کی چٹنی بنا کر بوتل میں بھر کر فرنیج میں رکھ دی۔ آدھا کام نیا کر کرے میں آئی کہ تھوڑی دیر کمر سیدھی کر لے تو دیکھا مٹی جاگ رہی تھی۔

”لو اب یہ نہیں سوئے گی، نہ ہی ماں کو سونے دے گی۔“ لہذا بچی کو گود میں اٹھا کر باہر لے آئی تاکہ بڑے بچے سکون سے سوتے رہیں۔ سوچا ابھی فارغ ہے تو کل کے دھلے ہوئے کپڑے تہ لگا کر رکھ دے۔ اتنے میں عصر کا وقت ہو گیا تھا۔ نماز پڑھنے سے پہلے بچوں کو چگایا، وہ بھی عصر کی نماز.... ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد شام کی چائے کے ساتھ بچوں کو ان کی پسند کے سینڈوچ بنا

کر دے۔ اب سیکینہ کو مغرب سے پہلے رات کے کھانے کی تیاری مکمل کر لینی تھی۔ کیونکہ مغرب کے بعد بچوں کو اسکول کا ہوم ورک کروانا تھا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہوئی تھی کہ تیمور آفس سے آ گیا۔

سیکینہ کی جب سے شادی ہوئی تھی اس کی شردع سے عادت تھی کہ وہ رات کا کھانا اپنے شوہر کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ لیکن آج لگ رہا تھا کہ بھوکا سونا پڑے گا کیونکہ پلاؤ کچھ زیادہ ہی مزیدار پکا تھا سب نے شوق سے اور کچھ زیادہ ہی کھالیا۔ اس کے لیے نہیں بچا تھا۔ اس نے چٹیل سے بچے چھچھ چاول نکالے جو تھوڑی سی سے تھے اور اسی کو پھنی کے ساتھ کھالیا۔ تیمور نے ٹوس بھی نہیں کیا کہ وہ کیا کھا رہی ہے۔ کھانے کے بعد وہ چائے بنانے چلی گئی۔ بچے تھوڑی دیر بی وی دیکھتے یا کوئی اسٹوری بک پڑھتے اور پھر سونے لیٹ جاتے۔ ان کاموں سے فارغ ہوئی تھی کہ اماں نے آکر بتایا کہ تمہاری امی کا فون آیا ہے۔

اماں کے فون کا سن کر اسے ایسا لگا کہ جیسے دلی سکون مل گیا ہو۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی۔ پورے دن کی تھکاوٹ اتر گئی ماں کی آواز سن کر سیکینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر اس نے جلدی سے اپنے اوپر قابو پایا اور بس، بس کر ان سے باتیں کرنے لگی۔

”ہاں امی بس کام تو خاص نہیں ہوتا، کام والی آتی ہے اور آج تو موسم بہت اچھا ہو رہا تھا تو تیمور کے ساتھ باہر گئے تھے۔ پھر شاپنگ بھی کی اور ہاں اللہ کا شکر ہے بس خیریت ہے۔ جی اماں بھی بہت خیال رکھتی ہیں۔“ وہ ماں کو جانے کیا، کیا تسلیاں دیتی رہی۔ یہی شاید ہر دوسری خواہی بچی کی کہانی ہے..... مگر سیکینہ نے یہ کہانی اپنی بہو کی فتنہ ہرگز نہیں دہرائی۔ اگرچہ وہ بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں مگر اعلیٰ اخلاق اور اقتدار کی پروردہ ضرور تھی۔ اپنا وقت تو اس نے جیسے تیسے گزرا لیا مگر اب وہ اپنی بہو کے لیے ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ جب وہ کوئی سیکینہ خو کو سہیلی یا پڑوسن سے باتیں کرے تو اپنی بہو کے متعلق بدگمانیوں سے بھر پور گفتگو اس نے تو اپنی بہو کو ہی اپنی سہیلی بنالیا تھا اور دنیا پر ثابت کیا تھا کہ بنت حوا ہی بنت حوا کی ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔

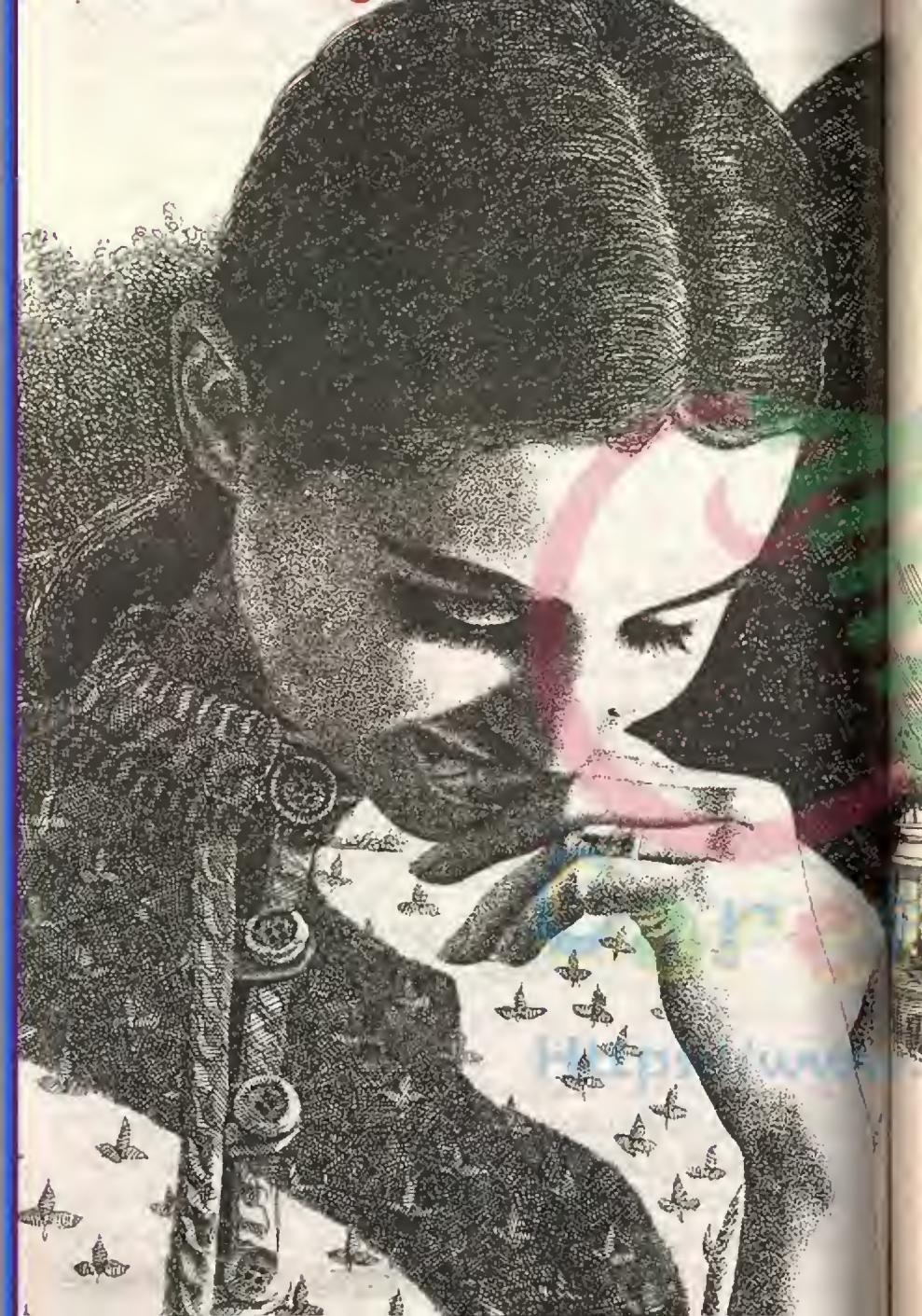


ایک لفظ محبت کا

نادیہ احمد



”باہر کوئی نہیں ہے۔“ دروازہ کھولا اس کا ہاتھ
تھم گیا۔
”پر میں نے آہٹ سنی ہے۔“ اس نے پلٹ کر
شرمندگی سے دیکھا۔
”دروازہ ہوا سے بچ رہا تھا۔“ پھر نے یہ سنجیدگی
لے وہ غیر جذباتی انداز میں بولیں تو اس کے دل کو کچھ
ہوا۔ تھکے، تھکے قدموں سے چلتی وہ لاؤنج کی بڑی سی
کھڑکی کے پاس رکھے صوفے پر گرنے کے سے انداز



ہے۔ جذبات کی عینک اتار کر حقیقت کی آنکھ سے دیکھو۔ یہ دنیا اور یہاں کے لوگ بہت ظالم ہیں۔ دل والوں کو تو بس وروہی سینے پڑتے ہیں۔“ آج اس بھینکی رات میں بارش کی جلت رنگ کسی سازی کی طرح شامل گفتگو تھی۔

اس دن کے بعد آج ان دونوں کے درمیان اتنی تفصیلی گفتگو ہو رہی تھی۔ شاید یہ موسم کا اثر تھا یا اس کی بے بسی اس پہل حاوی ہو رہی تھی۔ وہ اسے اس اذیت میں دیکھ کر بے قرار ہو رہی تھیں اسی لیے اتنی مایوسی کی باتیں کر رہی تھیں۔

”عقل، دل سے ہارتی جا رہی ہے۔ اب تو بس دل ہی دل ہے اور محبت ہی محبت۔“ آنکھیں موندے وہ بے بسی سے بولی۔ لاکھ کوشش کے باوجود پلکوں کی نمی بوند بن کر رخسار بھگوئے گئی تھی۔ بھینکی رات میں برستی آنکھیں قیامت ڈھانے لگیں۔

”اس ظالم دنیا کا درد سینے کا حوصلہ ہے مجھ میں.....“ انگلیاں مروڑتے اس کا اضطراب چھپائے نہ چھپتا تھا۔

”اور اگر وہ بے وفا نکلا؟“ اس نے خوف سے آنکھیں کھول دیں۔ دل اس پہ بڑی زور سے دھڑکا تھا۔ شاید کہیں بجلی گری تھی۔ شیشے کے پار روشنی کا جھماکا ہوا، ہو کر غائب ہو گیا تھا۔ پرفنائیں گونج تادیہ رکی رہی تھی۔

”سہہ پاؤ گی اس کی بے وفائی کا عذاب؟“ لب کا ہتی وہ خاموش رہی۔ جو اس نے کہا نہیں وہ بخوبی سمجھ سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سیاہ شیشوں والی گاڑی صدر دروازے پہ آکر رکی۔ دربان نے آگے بڑھ کر مٹو بانہ انداز میں ڈرائیو تک سیٹ کا دروازہ کھولا۔ گرے بیٹ، سیاہ قمیض، آنکھوں پہ سیاہ چشمہ لگائے ٹکڑا ٹکڑا ہوا پوری آن بان سے چلتا رامداری کی طرف بڑھا۔ اس کی آمد کی خبر تو صبح سے حویلی کی فضاؤں میں گردش کر رہی تھی لیکن

سی۔ سی۔ سی۔ سرف سے رخ پھیرے، نگاہ اس پہل برستی بارش کی بوندوں پہ پکی تھی۔ سیاہ سردرات اور تیز بارش کے ساتھ سنسنائی ہوا میں..... دل میں اٹھانے سے خوف نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

”تم کب تک اس کا انتظار کرو گی؟“ وہ بھی سامنے آئیں۔

”شاید آخری سانس تک۔“ بوندوں کی جھلمل جاری تھی۔ بھینکی مٹی کی سوندھی خوشبو کھڑکی کے کھلے پٹ سے اندر آرہی تھی۔

”اسے آتا ہوتا تو کب کالوٹ آتا۔“ اس بار بھی اسے دیکھنے سے اجتناب برتتے اس نے بس لان کی سیاہی مائل بیہوشی پر نظر ڈکا رکھی۔

”آپ تو کہتی تھیں اس گھر کے مرد اپنے قول کی لاج رکھتے ہیں۔ وعدہ کر کے پیچھے نہیں ہٹتے اس بات کا تو بہت یقین تھا آپ کو۔“ وہ یک دم پٹی۔ آنکھوں میں امید۔ چہرے پہ آس، لبوں پہ سوال لیے..... ایک آس تھی جو سانس کی ڈور سے جڑی تھی اور اتنے دنوں سے بس یہی ڈور تھا سہ وہ اس ہر جانی کی راہ دیکھ رہی تھی جو محبت کے رشتی و عمامے سے اس کا دل باندھ گیا تھا۔

”تم نے کب سے میری باتیں ماننا شروع کر دیں۔ تم نے تو زندگی بھر صرف وہ کیا جو تم نے چاہا، زندگی کو ویسے جیا جیسے جینے کی خواہش کی۔ اتنے برس بس اپنی ہی جمع تفریو میں گزار دیے پھر اچانک میری کہی بات کی اتنی اہمیت؟“ ایک بھینکی سی نمی لبوں پہ پھیلی۔ سیدوکانی کے آخری گھونٹ کی طرح بنا محسوس کیے اس نے جی کو اپنے اندر اتارنا چاہا تھا۔ کڑواہٹ روح تک پہنچ گئی تھی۔

”سالوں دماغ کی سختی رہی اسی لیے آپ کی باتیں سمجھ نہیں پائی۔ آج دل کی سن رہی ہوں تو آپ کے یقین“ یہ یقین کرنے کو دل چاہتا ہے۔“ اعتراف، محسوس کرتی تھیں کہ دیتا ہے وہ بھی اس اذیت کو

”اور میں چاہتی ہوں تم آج بھی دل کی باتوں پہ دھیان نہ دے کر بس دماغ کی سنو۔ وہ کرو جو عقل کہتی ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء 220

جبرو کے پہ نظر نکائے رملہ نے سب سے پہلے اسے اندر داخل ہوتے دیکھا اور پھر بے اختیار دوڑتی شاملہ کے کمرے میں جا پہنچی۔

”بھابی وہ آگئے۔“ پھولی سانس، بکھری زلفیں.....

وہ بے اختیاری سے بولی تو شیشے کے سامنے کھڑی ہار سنگار کرتی شاملہ کے لبوں پہ شریری مسکراہٹ پھیلی۔

”اس کی آمد کا عندیہ تو تمہارے گلاب ہوتے گالوں پہ لکھا ہے بنوا اب یہاں کھڑی کیا شرماری ہے۔ جا اس کے پاس۔“ کانوں میں آویزے سجاتے اس نے چھینر اتو وہ شرم سے سمت کی گئی۔

”ان کے پاس؟ حیا سے مرعہ تو نہ جاؤں گی میں ان کا سامنا کرتے۔“ رملہ نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے شرماتے ہوئے کہا۔

”تیرا کچھ نہیں ہو سکتا رملہ، وہ شہری بابو ہے۔ شرم و حیا سے مر جانے والیوں سے متاثر نہیں ہوگا۔ اعتماد سے آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے والی سے دل میل کھاتے ہیں ان پڑھے لکھے لڑکوں کے۔“ سدا کی دو دوک بات کرنے والی شاملہ دوپٹے کا پلوسر پہ جمائے تھیکے انداز میں پلٹی اور اپنا نازنی بھاری لباس سنبھالتی بیڈ پہ جا بیٹھی۔

”اس کے دل میں جگہ بنانی ہے تو اس کی توجہ حاصل کر۔“ شاملہ مزید بولی۔ رملہ اس کے سامنے بیٹھتے اس وسیع و عریض کمرے میں کسی مہارانی کی طرح بیٹھی اپنی بھابی سے مرعوب ہوئی تھی۔ شاملہ کی بات اس کے دل کو ٹپتی تھی۔

”یہ سب کچھ یقیناً آپ سے سچ لالہ نے کہا ہوگا۔

وہ تو ہر راز سے واقف ہیں ان کی.....“ اس نے کرید۔

جب سے دل کی بات زباں پہ آئی تھی وہ یونہی شاملہ بھابی کے گرد منڈلاتی ان کی باتیں سنا کرتی تھی۔ ان دنوں دل کے مبدلہ و نیاز انہی سے کرتی تھی۔

”تمہارے لالہ کا مزاج بہت سلجھا ہوا ہے لیکن اس چھوٹے نواب کا دماغ مختلف ہے۔ بابا سائیں اور ان کا سر چڑھایا جو ہے۔“ شاملہ نے ناک سے کبھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھٹکتے اسے گر کی بات بتائی۔ یہ آج کا نیا سبق تھا جو لڑائی نند کے گوش گزار کیا گیا تھا۔

گھر کے اگلو تے بیٹے کی بیوی ہونے کے ساتھ، ساتھ وہ رملہ کی ماموں زاد بھی تھی۔ اس ناتے شاملہ کا حویلی میں منصب کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ اس پہ بیٹا پیدا کر کے تو مزاج یونہی سا تو یہاں آسان پہ رہتے تھے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی کہ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہ تھا البتہ بیٹوں کو خوب اعلیٰ تعلیم دلوائی جاتی۔ کچھ یہی حال رملہ کا بھی تھا کہ اس نے اسکول کے بعد کالج کا مانت نہیں دیکھا تھا البتہ زندگی کے ساتھ، ساتھ ان دنوں محبت کا سبق وہ اپنی پیاری بھابی شاملہ سے پڑھ رہی تھی جو اس کی واحد رازدار تھی۔ ان دونوں کے درمیان روایتی نند بھادج والا تعلق تو تھا نہیں، ماں حیات تھی نہ ہی کوئی بہن تھی۔ ایسے میں شاملہ کی محبت اسے نعمت لگتی۔

”اسی لیے تو ڈر لگتا ہے۔“ رملہ کی کاجل بھری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ کہاں یہ دل تھا جو اس ظالم کے نام پہ ہی جلتی گسٹ سنبھلے لگتا تھا۔ بڑی، بڑی سیاہ آنکھوں میں جس اسی کی شبیہ سوتے جاگتے طواف کرتی تھی اور اس پر ستم کہ وہ مینوں بعد آکر بھی بے نیازی دکھاتا تھا۔

”ارے میری لاؤ پریشان کیوں ہوتی ہے جب پیار کیا تو پھر ڈرنا کا ہے کو۔“ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر پکارتے تسلی دی۔

”آپ نے لالہ سے بات کر لی؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”ان سے بات کرنے سے کیا حاصل، سیدھا بابا سائیں سے بات کروں گی۔ اب لاکھ سر پھرا سہی پر بابا سائیں کو نہ نہیں کر سکتا۔ ایک بار رشتہ طے ہو گیا تو کہاں جائے گا دامن بچا کر۔“ شاملہ نے اعتماد سے کہا تو رملہ کے سینے سے سکون کی سانس نکلی اور وہ ایک بار پھر مستقبل کے سنہری خوابوں میں کھو گئی۔ ابھی چند منٹ پہلے ہی تو وہ اس کی دید سے نظروں کو سیراب کر کے آئی تھی۔

”خیرے والا ہے تو کیا اس پہ چٹا بھی تو ہے یہ خیر۔ پورا شہر ادا ہے شہزادہ۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔

☆☆☆

”پورے دو ماہ بعد نسل دکھائی ہے کم ہے۔“ اقرار اس نے اسے سینے سے لگاتے میسر ہیجے میں کہا۔

”امتحان چل رہے تھے بابا سائیں ورنہ میں تو جلد آنے کی پوری کوشش کرتا ہوں۔“ وہ ہولے سے اس محبت بھرے شکوے پہ مسکرایا۔

”اب بھی میں نہ جلاتا تو تم نے کہاں آنا تھا۔ شہر میں خوب دل لگ گیا ہے تمہارا۔“ فائز نے نفی میں سر ہلاتے ان کا بازو دبایا۔

”شہر میں کیا رکھا ہے بابا سائیں۔ یہاں آپ ہیں، لالہ ہیں، گھر ہے، سب گھر والے ہیں۔ تعلیم کا مقصد نہ ہوتا تو بھلا میں وہاں اکیلا کیوں رہتا۔“

ابداری سے گزرتے رملہ کے کانوں سے فائز کی آواز ٹکرائی۔ وہ بابا سائیں کے ساتھ چٹا اپنے اسی مخصوص وردل کو چھو لینے والے انداز میں گفتگو کرتا اس پل رملہ کی دھڑکنیں بڑھ رہا تھا۔ ستون کے پیچھے سے اس نے بھانک کر دیکھا جہاں اقرار کھن کے ساتھ فائز اور مسیح لالہ اب بڑے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتے ہیں ورنہ کجی بات تو یہ ہے تمہاری عمر میں اس چھوٹے سے شہر میں ہمارا دل بھی نہیں لگتا تھا۔ اس وقت تمہارے ناٹا سائیں بھی ہم سے کسی ہی باتیں کیا کرتے تھے جیسے ہم آج تم سے کرتے ہیں۔“ اقرار الحسن نے اپنی ہی بات سے لطف اندوز ہوتے ہتھکڑیاں لگایا۔ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں تھے۔ صبح سے انہیں فائز کا انتظار تھا اور اب اسے دیکھ کر دل میں کون اتر گیا تھا۔ کچھ تو اس کے لیے فطری محبت تھی اور کچھ اس کی بے پناہ ذہانت اور ان سے خصوصی وابستگی کی جس کے باعث اقرار الحسن کے دل میں فائز کی جگہ اتنی جگہ ادا دے بھی بڑھ کر تھی۔

”آپ کا تو بچا نہیں بابا سائیں لیکن میں اپنی اور
 بڑی طرف سے کفر مکر رکھتا ہوں آپ کو کہہ جاؤں
 میں ہوں اپنے گھر اور آپ کو دل میں لیے کھوٹے
 س۔“ سمیع نے جتے جتے ہوئے چھوڑا تو انہوں نے بھی
 جواب دے کر تے سر ہلایا۔ صبح سے وہ بابا سائیں کی فائز

تھی جیسے فائز کا ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔

کے سوا کوئی توجہ سمجھتی بھی کیا۔ وہ خود کون سا جانتا تھا اندر اندر کیا گھڑی پک رہی ہے۔

”ہاں واقعی ایسی کیا بات ہوگی۔“ فائز نے زیر لب بڑبڑاتے خود کو تسلی دی اور سچ سے کچھ اور بات کرنے لگا۔

☆☆☆

انوار الحسن اپنے علاقے کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ بڑی زمینداری کے ساتھ شوگر مل، فٹور مل اور لاقعد ادھیپلوں کے باغات ان کی ملکیت تھے۔ سالوں سے اس علاقے میں ان کا ہم پلہ کوئی دوسرا گھرانہ نہ تھا۔ اقرار الحسن اور یاسمین ان کے دو ہی بچے تھے۔ خاندان میں تعلیم کا رجحان نہ تھا پر اقرار الحسن کو ان کی خواہش پر اعلیٰ تعلیم کی خاطر شہر بھیجا گیا تھا لیکن یاسمین بہت محنت سمجھت۔ کے بعد بس میٹرک ہی کر پائی تھی۔ انوار الحسن کا رعب و بدبہ ایسا تھا کہ اپنی اولاد بھی آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتی تھی کجا اپنی خواہشات کے لیے ضد کرتا۔ انوار الحسن نے بیٹی کو اتنا بڑھا کر بھی گویا برادری کی روایات سے ہٹ کر کچھ کام کیا تھا۔ اقرار الحسن کی شادی ان کے والد نے اپنی بہن کی بیٹی جنت خاتون سے طے کی تو انہوں نے باپ کی خواہش اور حکم پہ سر تسلیم خم کیا پر یاسمین نے تو جیسے ٹھان ہی لی تھی باپ سے بغاوت کرنے کی۔ چچا زاد یادگار کا رشہ ٹھکرا کر اس نے یاسر حسین کا انتخاب کیا۔

یاسر حسین، انوار الحسن کے فشی کا بیٹا تھا۔ شہر سے نیا، نیا گرجیوٹ ہو کر آیا تھا جب یاسمین اسے دل دے بیٹھی اور پھر باپ بھائی کے خلاف جا کر مرضی کی شادی کر کے شہر جا بسی۔ وہ بھائی کی لاڈلی نہ ہوتی تو باپ اسے اتنی ذلت اور شرمندگی پر جان سے ہی مار ڈالتے پر فرمانبردار بیٹے کی رحم کی درخواست قبول کرتے انہوں نے بس یاسمین سے اپنا ہر تعلق ختم کر کے اسے زمین جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ کچھ ایسی ضد اور خاندانی غرور تھا انوار الحسن کے خیر میں کہ پھر مرتے دم تک انہوں نے بیٹی کی صورت دیکھی نہ ہی بیٹی نے اپنا منہ دکھایا۔ ان کی وفات کے چند سال بعد ایک حادثے

”کمال ہے، کب سے آیا ہوں اور تم ملی بھی نہیں۔ اب بھی غیروں کی طرح نظر انداز کرتی بھاگی جا رہی ہو۔“ اس نے خود ہی احساس دلایا تو رملہ نے یوں چونک کر دیکھا جیسے واقعی وہ فائز کی وہاں موجودگی سے بے خبر تھی۔ بہر حال فائز نے ہی سلام کرنے میں پہل کی اور پھر خیریت دریافت کی۔ بہت لگے بندھے انداز میں فائز کو جواب دے کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ پیچھے فائز حیران، پریشان کھڑا رہ گیا۔

رملہ جو اس وقت فائز کی توجہ حاصل کرنا چاہتی تھی جانتی تھی سامنے چلی بھی گئی تو سب کے سچ نہ تو وہ اس سے ڈھنک سے بات کر پائے گا نہ ہی وہ اس کی طرف دھیان دے گا پر اب جس انداز سے اس نے اس کی موجودگی کو سر اسر نظر انداز کر کے انشروی دی تو فائز کی توجہ خود بخود اس کی طرف گئی تھی۔

”یہ رملہ کو کیا ہوا ہے۔ مجھ سے پردہ کرنے لگی ہے کیا؟“ ہال میں داخل ہوتے سچ کو دیکھ کر فائز نے بے اختیار پوچھا۔ رملہ کا اندازہ درست تھا فائز کو واقعی اس کے رویے نے چونکایا تھا۔ اسی لیے رملہ کے جاتے ہی اس نے اپنی حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”ڈھنک سے دعا سلام بھی نہیں کی۔ پہلے تو ایسا نہیں کرتی تھی آج تو بہت بدلی، بدلی سی لگ رہی ہے۔“ فائز اس بدلے ہوئے رویے کو نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔ وہ سب سالوں سے ایک ساتھ رہتے تھے۔ رملہ اس سے دو سال چھوٹی تھی اور فائز اس کا بالکل اسی طرح خیال رکھتا تھا جیسے سچ لالہ رکھتے تھے۔ اپنی کسی بھی ضرورت یا خواہش کے لیے وہ اس گھر میں ان تینوں پہ یکساں حق رکھتی تھی۔ سچ کی طرح رملہ، فائز کی بھی ذمے داری تھی پر اب جس طرح وہ اس سے بات کیے بنا جا رہی تھی فائز کے لیے اس کا ردیہ حیران کن تھا۔

”دیے کوئی خاص بات تو نہیں ہے تم خود ہی پوچھ لیتا۔ دیر سے آتے ہونا تو شاید خفا ہے ورنہ ایسی کیا بات ہوگی۔“ سچ خود بھی حیران تھا اور فی الفور اس

بالوں پر نکالا تھا۔ وہ اب سارہ کی طرف متوجہ ہی جو اپنے بن کباب کے آخری لقمے کھا رہی تھی۔ گھوم پھر کر وہ ایک بار پھر اسی موضوع کی طرف آگئی تھی جس کی وجہ سے وہ پچھلے کچھ عرصے سے شدید پریشان تھی اور جس کا حل اس کی سمجھ اور اختیار دونوں سے بالاتر تھا۔ اس بار لہجہ بھی تھوڑا اندہم تھا۔

”مسئلہ نہیں محترمہ آپ کے پاس مسائل ہیں اور میں ٹھہری ننھی سی جان اور یہ چنا منا سا دل ہے میرا۔“ کچپ میں فراز ڈبوتے سارہ نے استہزائیہ کہا۔ سین نے باقاعدہ اسے گھورا تھا۔

”جتنا منا سا دل ہے ناں تمہارا اس سے بھی چنا دماغ ہے۔“ نچ ٹائم ختم ہونے والا ہے اور تم نے اب تک کام کی بات نہیں بتائی۔“ گھری دیکھتے اس نے چڑ کر کہا مگر سارہ کے اطمینان میں وراڑ نہ ڈال پائی۔

”اے مسولین کی جانشین، ذرا چھری تلے دم لو۔ بتاتی ہوں تمہارے مسئلے کا حل بھی۔“ حلق تو تر کر لینے دو میری ماں، ویسے بھی تمہاری بس سنگل پہلی کو کرائی جانے والی خوفناک گھوریاں دیکھ، دیکھ کر میرا گلا سوجھ رہا ہے۔“ سارہ نے باقاعدہ گلے پہ ہاتھ رکھتے انتہائی معصوم شکل بنائی۔

”لو پو مرد یہ گرم کوئلہ ڈرنک اور جلدی بکو۔“ سین نے ننھی چھپاتے پاس پڑی لوک کی بوتل پٹختے کے سے انداز میں اس کے آگے رکھی۔

”ویسے اگر بچپن کی دوستی نہ ہوتی تو اتنی سڑی ہوئی باتوں کے بعد تمہیں گھاس بھی نہ ڈالتی۔“ سارہ پُرسکون سے انداز میں گھونٹ بھرنے لگی۔

”تم بتا رہی ہو یا میں جاؤں؟“ سین اب اس تاخیر سے بور ہو رہی تھی۔

”اچھا، اچھا بتاتی ہوں یا رخا کیوں ہوتی ہو۔“ اس کی دھمکی پہ سارہ نے ہاتھ کے اشارے سے حوصلہ دیا اور ایک ہی سانس میں بقیہ سو فٹ ڈرنک ختم کر کے گھری طویل سانس لی۔

دراصل سارہ سے بڑھ کر سین کو شاید ہی کوئی

میں سپرینٹنڈنٹ رہا ہے۔ انسان ہی ہے ناں کھانسی دھوکا۔ معاف کرو وغیرہ کو۔“ بس ایک سارہ ہی تھی جو غصے کی حالت میں بھی اسے چیمیزسکتی تھی کہ تعلق بہت پرانا تھا ورنہ کسی عام انسان کے بس کی بات تو نہیں تھی سین سے غصے کی حالت میں پڑنا لینا۔

”ذہنی بیمار لوگ ہیں یہ، انہیں لگتا ہے گھر سے باہر نکل لڑکی ترنوالہ ہے۔ کوئی نہیں سوچتا ہماری زندگی میں کیا مسائل ہیں۔ نہیں شوق نہیں سڑکوں پہ آوارہ گردی کرنے کا۔ ہم پر بھی تو ذتے داریاں ہو سکتی ہیں۔“ اپنا برگزیدہ مار کرتے وہ رنجیدہ سی ہوئی۔ پہلے ہی ذہن اتنا منتشر تھا کہ چھوٹی، چھوٹی باتیں بھی اس کا دماغ کھولا رہتی تھیں ورنہ پچھلے دو سال سے ملازمت کرتے وہ ایسی صورت حال سے بار بار گزری۔ اب تو ان اوجھی حرکتوں کی عادی ہو چکی تھی پر آج معاملہ مختلف تھا شاید اس کا مبر جواب دینے لگا تھا۔

زندگی آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں سے دو سال پہلے آغاز ہوا تھا۔ وہ غصے کی تیز بھی کہ یہ مزاج اسے وراثت میں ملا تھا پر زندگی میں جود کی کیفیت نے اسے حد درجہ چڑچڑایا تھا۔

”کون سی نئی بات ہے میری جان۔ یہاں تو زندگی گزر گئی یہی معاملات دیکھتے، دیکھتے۔ اب تو تمہیں بھی عادت ہو جانی چاہیے۔“ سین کے مقابلے میں سارہ خاصی متحمل مزاج تھی۔ بڑے سے بڑے مسئلے پر بھی وہ بے نیازی دکھاتی کہ سامنے والا اونگ رہ جاتا۔ سین کی زندگی کی طرح اس کے حالات بھی مشکل و عجیب تھے۔ وہ سارہ جیسی نارمل زندگی نہیں گزار رہی تھی پھر ایسا کیسے ممکن تھا اس کا رویہ بھی نارمل ہوتا۔ ایسے حالات انسان کی زبان میں کڑواہٹ بھردیتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ سین کے ساتھ بھی تھا۔ نارمل لڑکیوں والی کوئی بات تو اس میں بھی ہی نہیں۔

”چھوڑو خیر، یہ بتاؤ میرے مسئلے کا کیا حل سوچا؟“ اپنے بالوں کو سمیٹ کر انہیں پہلے سے زیادہ کس کر کچر میں جکڑتے اس نے اپنا سارا غصہ سر کے

خوبی کے معاملات سے بے پروا کی اسی لیے شاملہ کیا یہاں پورا کنٹرول تھا۔

”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔“
دودھ کا گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھتے اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اقرار اکنن نے سر کے اشارے سے انہیں اجازت دیتے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا تھا۔

”بابا سائیں رملہ کی شادی کا کیا سوچا ہے آپ نے؟“ اس نے جیسے لکھ میں کرید۔

”رملہ کی شادی کا ابھی کیا ذکر۔ نا سمجھ بچی ہے وہ تو۔“ اکلوتی لاڈلی بیٹی کو خود سے جدا کرنا اتنا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ اس کی شادی کا سوچ کر ہی دل اداس ہو جاتا تھا پراگھی تک تو دل کو کیسی تسلی تھی کہ وہ وقت دور ہے جب بیٹی کو بیاہ کر رخصت ہونا ہے۔

”دراصل میرے ملنے جلنے والوں نے ڈھکے چھپے لفظوں میں پیغام دیا ہے پراچھا رشتہ جب گھر میں موجود ہو تو باہر کا کیوں سوچتا۔“ شاملہ بھائی نے بات بناتے کن اکھیوں سے بابا سائیں کی طرف دیکھا۔
”کیا مطلب“ میں سمجھا نہیں؟“ وہ واقعی اس کا اشارہ نہیں سمجھتے تھے۔

”میں فائز کی بات کر رہی تھی بابا سائیں، رملہ چاہتی ہے اسے..... اور جہاں تک میرا خیال ہے فائز بھی اسے پسند کرتا ہے۔“ شاملہ نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ رملہ کی حد تک تو بات درست تھی اور شاملہ یہ ابھی طرح جانتی تھی لیکن فائز کا نام اس نے خود ہی لگا کر بات کو کور کیا تھا۔ اقرار اکنن کے چہرے پر بے پناہ حیرت چھپانے نہ چھپی تھی۔

چند سال پہلے تک رملہ، فائز سے کافی قریب تھی۔ عمر بڑھی تو تعلق میں ایک جھجک در آئی۔ فائز پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا۔ شاملہ کی آمد سے رملہ کا دھیان بھی بدلا اور وہ اس کی کمپنی انجوائے کرنے لگی۔ ویسے بھی ان کا خاندان بہت زیادہ روایتی تھا اور عورتوں سے مردوں کی بے تکلفی کو پسند نہیں کیا جاتا تھا ایسے میں رملہ اور فائز کے درمیان لحاظ اور فاصلہ بڑھ گیا تھا پھر بھی اس کا رویہ فائز سے نارٹل ہی تھا۔ یہ تو کچھ عرصے سے شاملہ بھائی کی

ہانی آسوں سے وہ دونوں ایک ساتھ تھیں پھر گریجویشن کے بعد ملازمت بھی ایک ہی کمپنی میں کرنے لگیں۔ اب اتنے طویل ساتھ اور اتنی کچی دوستی میں ایک دوسرے کے مزاج سے ہم آہنگی ہونا تو فطری بات تھی۔ اسی لیے لاکھ اختلافات اور کھرار کے باوجود وہ دونوں ایک دوسرے پہ انکھار بھی بہت کرتی تھیں۔

”دو لفظوں میں پھوٹو... نو فضول نائیں، چائیں۔“
سین نے چٹکی بجاتے اسے وارننگ دی۔

”کرایے دار۔“ سارہ نے گردن اگڑاتے اعلان کیا۔

”کرایے دار؟“ سین کے ماتھے پہ بل نمودار ہوئے۔ اچھے ہوئے لکھے میں اس نے سوال کیا پر سارہ اپنا شوذر بیگ اٹھائے کھڑی ہو گئی۔

”یہ کیسا حل ہے بھلا؟“ اپنی چیزیں سمیٹتے سین ابھی پر سارہ نے ہرگز توجہ نہ دی۔

”تم نے دو الفاظ کی مہلت دی تھی تو بتا دیا۔ اس سے آگے اب میں خاموش ہوں۔“ سین ہونٹ بھیچنے پیر پختی اس کے ساتھ چل پڑی۔

جانتی تھی اب سوئٹیں کروا کر ہی یہ لڑکی پوری بات بتائے گی۔

☆☆☆

”بابا سائیں کیا میں اندر آ سکتی ہوں؟“ شاملہ بھائی نے ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھا، دروازے میں کھڑے ہو کر اجازت مانگی۔ ساس کے انتقال کے بعد گھر کا سارا انتظام شاملہ کے پاس چلا آیا تھا۔

”ارے بہو وہاں کیوں کھڑی ہو اندر آؤ۔“ مگر میں خاتون خانہ کی کمی کو شاملہ نے بڑے احسن انداز میں پورا کیا تھا یہی وجہ تھی اقرار اکنن بہو کو بہت مان دیتے تھے۔ اور پھر شاملہ چونکہ اپنی ساس کی چیتھی تھی تو حویلی میں اس کا مقام بہت جلد بن گیا تھا۔ رملہ عمر میں چھوٹی تھی اور اس میں لاابالی پن بھی تھا۔ اسے تو بس ضد میں منوائی آتی تھیں، فرمائشیں کرنی آتی تھیں۔ وہ

ذہنی گفتگو نے اس کے دل میں فائز کے لیے احساسات کو بڑھا دیا۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی مگر بھائی کی یہ چھڑ چھاڑ اسے بھی اچھی لگنے لگی اور اب تو وہ کھل کے اقرار کرتی تھی کہ فائز اسے دل و جان سے پسند ہے۔ اسے دیکھنے کا نظریہ بدلاتا اس کا سامنا کرنے میں جھجک بھی ہونے لگی۔ وہ نادان تھی پر اس کے مقابلے میں شاملہ خاصی چالاک تھی۔ رملہ کم عمر تھی اور باپ بھائی کا خوف بھی پر شاملہ یہ ایسی کوئی روک ٹوک نہ تھی دوسرے وہ عمر کے اس جذباتی حصے سے گزر چکی تھی جہاں عقل کی ڈور دل سے بندھ جاتی ہے۔ اور اب تو دیسے بھی شادی شدہ تھی اور ساس کے نہ ہونے کے گرد میں ایک خاص رتبہ بھی حاصل ہو گیا تھا۔

گھر میں دو لوگوں کو پکھوں پہ بٹھایا جاتا تھا جن میں ایک تو اس کی چھوٹی نند رملہ تھی جس کی خوشی کی خاطر ساری دنیا کو چولھے میں بھی جھونکا جاسکتا تھا اور دوسرا اتحاد را بھکار۔ اور اصل میں یہ دونوں ہی شاملہ کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ شاملہ نے اپنی عقل لڑا کر حویلی میں اپنا اہم مقام بنالیا تھا یہی وجہ تھی اقرار احسن اس کی بہت سنتے تھے۔ اب بھی اس نے فائز اور رملہ کے رشتے کی بات دے دے، دے لفظوں میں ان کے کانوں میں ڈال دی تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی فائز کبھی رملہ کے لیے نہیں مانے گا اور ان حالات میں ظاہری بات ہے اقرار احسن کی نگاہوں سے ہی نہیں دل سے بھی اتر جائے گا۔ دوسری طرف رملہ تو اس کے ہاتھوں کٹ پٹی بنی ہوئی تھی۔ جیسے چاہتی نچالیتی۔

اقرار احسن کے لیے یہ انکشاف حیرت کا باعث تھا پھر بھی اس پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرنے کے بجائے وہ خاموش رہے تھے۔ انہوں نے کبھی خود سے اس طرف ... دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ فائز کو وہ اپنی اولاد مانتے تھے شاید اسی لیے وہ فائز کو رملہ کے حوالے سے نہیں سوچ پائے تھے۔ لیکن اب وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو ان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ بیٹی ہمیشہ نظروں کے سامنے ہوگی اور

پھر فائز تو ان کا سب سے چہیتا اور پیارا تھا۔ اس کی تربیت بھی اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔ اس سے بڑھ کر بہترین رشتہ لاڈلی بیٹی کے لیے دوسرا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ البتہ کچھ بھی کہنے سے پہلے انہوں نے خود فائز سے بات کرنے کا سوچا تھا۔

☆☆☆

طویل کاریڈور سے نکل کر وہ اب پارکنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اپنے آفس کے کنٹرولڈ نمبر پچر کی خشکی سے نکل کر کھلی فضا کی گرمی کا احساس شدید تھا۔ آنکھوں کو دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھنے کی خاطر اپنے سیاہ سن گلاسز نکال کر آنکھوں پہ سیٹ کرتے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ سہ پہر کے وقت حسب معمول پارکنگ گاڑیوں سے پُر تھی۔ دور کھڑی اپنی گاڑی کو لپٹا کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑی چابی سے گاڑی کو ان لاک کیا تھا۔ تیز قدموں سے چلتا وہ اب گاڑی تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے سیل فون پہ کوئی کال ملائی تھی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی اس کا بلیو ٹوٹھ آن ہو گیا تھا۔ دوسری طرف بیل جا رہی۔

”ہیلو عدن، کہو کیا احوال ہیں۔“ گاڑی کے اسپیکر میں سے فرقان کی آواز ابھری تھی۔

”میرا حال تو تب ٹھیک ہو گا جب تم مجھے میرے مطلب کی بات بتاؤ گے۔“ گاڑی اب مین روڈ پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ وہ محتاط انداز میں ڈرائیو کرتا قدرے سنجیدگی سے بولا۔

”تمہارا فنیٹی پرسنٹ کام ہو چکا ہے باقی فنیٹی پرسنٹ بھی شاید آج کل میں ہو جائے گا۔ ویسے تمہیں اندازہ نہیں اسے راضی کرنا کتنا مشکل ہے۔“ فرقان نے ہنستے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

”اندازہ ہو رہا ہے مجھے..... خیر..... میں تمہاری کنفرم کال کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب تک یہ کام مکمل نہیں ہو جاتا میں کہیں اور فوکس کر نہیں کر سکوں گا۔“ وہ گہری سوچ کے حصار میں تھا۔

”ویسے تم ڈائریکٹ کانٹیکٹ کیوں نہیں کرتے

آخر؟“ فرقان نے اپنے تئیں مشورہ دینے کی کوشش کی۔

”that's the last option“ اس

نے ایک دم اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”ویسے بھی وہ شاید اس پہ بھی راضی نہ ہوں۔“

اس نے لب بھینچتے مزید کہا۔

”چلو پھر سینکڑن پلان کو ہی فالو کرتے ہیں

ان شاء اللہ بازیو آنس ہوگا۔“ فرقان کی بات سے اسے

تسلی ہوئی تھی اگلے کچھ منٹ وہ دونوں اسی مسئلے پہ

ڈسکشن کرتے رہے تھے۔ جواب آنے کی صورت میں

فرقان کو آگے سے کیا کہنا ہے اور کس انداز میں بات

سنجانی ہے وہ اسے سمجھا رہا تھا۔ کال بند کرتے ہوئے

اس کا چہرہ پرسکون تھا جیسے کوئی بوجھ اترنے والا ہو۔

وہ اب اسٹیرنگ وچیل پہ لگے چند بیٹنوں کو پھیر رہا

تھا۔ گاڑی میں اس کا پسندیدہ میوزک بجنے لگا تھا۔

اسٹیرنگ پہ جی اس کی انگلیاں بے اختیار ٹیپ کر رہی

تھیں۔ یقیناً وہ اپنی ڈرائیو سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ اس بار زیادہ وقت رک نہیں۔ کا تھا۔ یونیورسٹی

میں داخلے شروع ہو چکے تھے اور اسے واپسی کی جلدی

تھی۔ یہاں ویسے بھی اس کی کوئی مصروفیت نہ تھی۔ روز

صبح وہ ادا سنج کے ساتھ فیکلٹی چلا جاتا یا پھر بابا سائیں

کے ساتھ زمینوں کا چکر لگا لیتا ایسے میں رملہ کا اس سے

سامنا کم ہی ہوا لیکن جب بھی وہ سامنے آتی اسے غیر

معمولی طور پہ نظر انداز کر دیتی۔ یہ پٹی بھی شاملہ بھابی

کی پڑھائی ہوئی تھی کہ جتنا ہو سکے اس کی نظروں میں تو

رہے پر بات چیت سے گریز کرے تاکہ فازن اس کے

بدلے ہوئے ردیے کو سوچے۔ اب بھی وہ اس کی آمد کی

منتظر ہال کمرے کے چکر لگا رہی تھی جب فازن اپنے

کمرے سے نکل کر بابا سائیں کے بلاوے پر ان کے

کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

”خیر تو ہے تم نے نولفٹ کا سلسلہ کیوں شروع

کر دیا بھی۔ جب سے آیا ہوں ایسے انگوڑ کر رہی ہو

جیسے میرے آنے سے تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑا۔“

اسے دیکھتے ہی رملہ انجمن بن کر وہاں سے گزرنے لگی

کہ فازن نے راستہ روک لیا۔

”وہ تو پہلے بھی نہیں پڑتا تھا۔“ اس نے گردن

موڑے کمال بے نیازی سے کہا۔ فازن نے فہمی دہائی۔

”اچھا جی تو پھر میں وہ سارا سامان شاملہ بھابی کو

دے دوں جو شہر سے تمہاری فرمائش پر لایا تھا کیونکہ

تمہیں تو اب میرے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔“ فازن حوصلی لوٹنے سے پہلے سب سے ہی پوچھا

کر رہا تھا کہ اگر کسی کو کوئی چیز چاہیے تو وہ بطور تحفہ ان کے

لیے لے آئے۔ رملہ کی فرمائشی لسٹ طویل ہوتی تھی اور

فازن وہ یا سب کچھ اس کا سامان کبھی نہیں بھولتا تھا ورنہ

آفت آجاتی تھی۔ اسے منانے کے چکر میں ان دونوں

کے دُنگے خرچ ہو جاتے تھے۔ اس بار بھی آنے سے

پہلے اس نے سب کے لیے شاپنگ کی تھی جس میں رملہ

کی شاپنگ سرفہرست تھی۔

”خبردار میری چیزیں اگر شاملہ بھابی کو دیں تو

مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی

تھی وہ یک دم بچی بن کر کھنگی کا اظہار کرنے لگی۔

”وہ تو خیر اب بھی کوئی نہیں ہے لیکن پتا تو چلے

بندے کا قصور کیا ہے؟“ اس نے اسے چڑایا۔

”شکوہ تو ایسے کر رہے ہیں جیسے میری بہت پروا

ہے آپ کو۔ شہر جا کر کبھی ایک فون کال تک تو کی نہیں

آپ نے مجھے۔“ حوصلی سے اسے اتنی بار کال کی جاتی

تھی کہ فازن کو خود کال کرنے کی ضرورت کم ہی پڑتی

تھی۔ رملہ پر بھی ایسی کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ بھی انٹر

اسے فون کرتی تھی پر اس کی انوکھی فرمائش نے فازن کو

حیران کیا تھا۔

”پڑھائی کر رہا ہوں وہاں۔ اب تمہیں کیا پتا

آگے جا کر اسٹڈیز کتنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ تم نے تو

میٹرک کے بعد کالج جانے سے صاف انکار کر دیا۔

حالانکہ میں بابا سائیں کو راضی کر سکتا تھا۔“ عام سے

لہجے میں کہتے اس نے قصداً رملہ کی بات کو نظر انداز کیا

اور پھر بات کا رخ ہی موڑ دیا۔

”مجھ سے نہیں ہوئی یہ پڑھائی دڑھائی۔“ خواہ
خواہ کتابیں چائے سے میرا تو سرد در در کرتا ہے۔“ رملہ
نے سر پہ ہاتھ مارتے منہ بنایا۔
”حالانکہ پڑھائی زندگی میں سب سے اہم
ہے۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”خیر جیسے تمہاری
خوشی۔“ اور پھر بات بدل دی۔

”تمہاری چیزیں میں نے رشیدہ کے ہاتھ تمہارے
کمرے میں بچھوا دی ہیں۔ کل میری واپسی ہے سو چاہوں نہ
جاؤں۔ بغیر خطا کے موڈ دکھارہی ہو بعد میں تو مشکل بھی نہ
رہے گی۔“ اپنی بات کے اختتام پر وہ توجہ جانے لگا تھا پر رملہ کی
سرکشی نے اس کے قدموں کو روک لیا۔

”یہ چہرہ نہیں دیکھو گی تو سانس کیسے آئے گی
بھلا۔“ وہ زربلب بڑبڑاتی کہ فائز کچھ سمجھ نہیں پایا۔
”کیا کہا؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ آپ کہیں جا رہے تھے؟“ اس کے
لہجے میں واضح گھبراہٹ تھی۔ اپنی احتیاط بے ساختگی پہ
خود کو کھڑے اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی تھی۔

”ہاں بابا سائیں نے اپنے کمرے میں بلایا تھا
شاید کوئی اہم بات کرنی ہے۔“ فائز، رملہ کی بدلی ہوئی
رنگت پہ چونکا۔ پر اسی وقت سخی لالہ وہاں آگئے۔ ویسے
بھی وہ بابا سائیں کے خصوصی بلاوے پہ حیران تھا۔

”تم یہاں کھڑے ہو فائز وہاں بابا سائیں تمہارا
بار بار پوچھ چکے ہیں۔“ سخی نے آتے ہی اسے بابا
سائیں کا پیغام سنایا جبکہ رملہ ان دونوں کو بوجھ بھٹکود دیکھ کر
کھسک گئی تھی۔

”میں بس جا رہی رہا تھا رملہ سے بات کرنے رک
گیا تھا۔“ سخی کو وضاحت کرتے وہ اس کے ساتھ ہی
جلدی سے باسائیں کے کمرے کی طرف چل پڑا تھا۔

☆☆☆

اقرار الحسن نے بلا تمہید اس سے رملہ اور اس کی
شاہدی کی بات کر دی تھی۔ انہیں شائد بھائی کی بات
قدر سے مناسب لگی تھی۔ فائز ان کے ہاتھوں کا پٹا انہیں
ان کی اولاد سے بڑھ کر عزیز تھا اور وہ جانتے تھے ان کی

جان سے پیار کی جگہ پھول گئے بڑھ کر رہے گا
پھر بھی انہوں نے کئی دن اس موضوع پر سوچا تھا پر اب
اس کی واپسی سے پہلے انہوں نے فائز سے اپنی خواہش
کا اظہار کر دیا تھا لیکن جو کچھ انہوں نے اس سے کہا وہ
فائز کے قدموں تلے سے زمین نکالنے کے لیے کافی
تھا۔ اسے شاک لگا تھا کیونکہ رملہ کو ہمیشہ اس نے اپنی
چھوٹی بہن سمجھا تھا اس سے بڑھ کر اس کے متعلق ایسی
کوئی بات سوچنا اس کے نزدیک جیسے گناہ تھا مگر اب بابا
سائیں کی باتیں..... اس کا ذہن وقتی طور پہ ماؤف
ہو گیا تھا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا انکار کرے یا اقرار۔ ہاں کرتا
ہے تو دل نہیں مانتا اور اگر صاف انکار کرتا ہے تو سامنے
بیٹھے اپنے پیارے بابا کے چہرے کی مسکراہٹ کا خون
ہوتا ہے۔ وہ عجیب غمخے کا شکار تھا۔ نہ کہتا جتنا آسان تھا
اس کے نتائج اتنے ہی تباہ کن پر ہاں کہنا بھی تو مشکل
ترین تھا۔ وہاں بیٹھے اسے اندازہ ہوا تھا کسی کے
احسانات کا بار لے کر اپنی مرضی کی زندگی گزارنا کس
قدر مشکل ہوتا ہے لیکن وہ بھی کیا کرتا اس کے پاس
دوسری کوئی چوسا کچھ تو نہیں تھی۔ رملہ کا بدلا سارو یہ،
جھکی جھکی نظریں اور شرم سے لال ہوتے
گال..... یہاں بیٹھا وہ اب سمجھ پایا تھا یہ کس بات کا
اشارہ ہے۔ سخی لالہ نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا تو
کیا وہ واقعی کچھ نہیں جانتے یا پھر بابا نے انہیں منع کیا
ہوگا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ سب بابا سائیں کی خواہش
ہو۔ اس نے سر پکڑ لیا تھا۔

”تمہارا کیا کہنا ہے فائز؟“ اسے خاموش پا کر
اقرار الحسن نے سوال کیا۔

”بابا سائیں میں..... میں کیا کہوں۔“ وہ واقعی
نہیں جانتا تھا اس اچانک پڑی مشکل پہ کیا جواب
دے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ چوما۔

”مجھے تم سے اسی فرما ہر داری کی امید تھی میرے
بچے۔“ اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹے۔ لے وہ اس کی مصیبت
خاموشی کو اس کی رضامندی سے تعبیر کر رہے تھے۔
بہت دیر تک وہ گلے لگائے اسے سراہتے رہے۔ اپنی

سارہ کے یہ جی جواں کی سی۔ کوئین کا ابھی آگے بڑھنے کا ارادہ تھا لیکن اس کے گھریلو حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ سارہ کے ریفرنس کی بدولت ہی اسے یہاں ملازمت آسانی سے مل گئی تھی لیکن تنخواہ بس گزرا رہے لائق تھی۔ سارہ خود بھی ایک مڈل کلاس گھر کی لڑکی تھی لیکن ملازمت اس کی ضرورت نہیں شوق تھا جو وہ وقت گزاری کی خاطر کر رہی تھی۔

سین کے لیے یہ ملازمت اور اس سے ملنے والے چند ہزار روپے بہت اہم تھے۔ پہلے والد کی شدید علالت اور ان کی وفات کے بعد اپنی بیوہ ماں کی ذمے داری سے اب اسی کے سر پر تھی۔ حالانکہ وہ خود ملازمت کرنا چاہتی تھیں لیکن سین کو ان کی بات سے اختلاف تھا۔ اس کا کہنا تھا جب اس کے باپ نے انہیں تمام عمر ملازمت نہیں کرنے دی تو وہ بھی انہیں یہ بوجھ اٹھانے نہیں دے گی۔ اس کا خندی مزاج اور اپنی بات پہ اڑ جانا بہت حد تک اپنے ڈیڈ جیسا تھا اور ایسا اس کی ماں کا کہنا تھا۔ وہ جانتی تھیں بہت کم عمری میں سین کے سر پر بڑی ذمے داریاں آن پڑی ہیں اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کئی ایام اس کی زندگی کا حسن اور جوانی کی بے پردائی چھین لے۔ وہ اسے زندگی میں بہت کچھ نہیں دے پاتی تھیں۔ وہ آسودگی جس کی ہر ماں باپ کو اپنی اولاد کے لیے خواہش ہوتی ہے۔ وہ فراغت جو کم عمری میں ہر انسان کا حق ہوتی ہے۔ یہ سوچ انہیں اندر ہی اندر پیشانی بھی کرتی تھی کہ اس پہ اس کی ہمت سے بڑھ کر بوجھ لا دیا گیا ہے لیکن وہ بھی بے بس تھیں کہ یہی تقدیر کا لکھا تھا جسے بدلنا ممکن نہ تھا تو بس صبر سے اچھے وقت کا انتظار ہی کیا جاسکتا تھا۔

دہ تپے ہوئے لہجے میں بولی تو سارہ نے کندھے اچکائے جو خود اپنے سامنے پڑے کمپیوٹر پہ ساتھ ساتھ ڈیٹا انٹری میں مصروف تھی۔

”تھینک یو، میں جانتی تھی تم کچھ ایسا ہی کنٹ کر دو گی۔ دہ کیا ہے ناں میں تمہاری طرح decadent (کامل) تو ہوں نہیں جو مزے کھو کر خزانہ کالنے کا نسخہ

منسوب اپنی امیدوں کا ذکر کرتے رہے۔ فائز اس مان کو توڑ نہ پایا اور چپ چاپ ان کے کمرے سے چلا آیا لیکن اضطراب تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا اس کے دل کی سلیٹ بھلے صاف تھی لیکن یہ بھی سچ تھا وہ رملہ کو اپنی سنگی بہن سمجھتا تھا۔ اسے اس تعلق سے سوچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا کیونکہ اپنے جیون ساتھی کے روپ میں جو خاکہ اس کے ذہن نے بنایا تھا رملہ اس پر کسی طور پوری نہیں اترتی تھی۔ اسے پیچور سوچ والی تعلیم یافتہ لڑکیاں متاثر کرتی تھیں۔ پھر ابھی سے شادی..... تو کیا اسے بابا سائیں کی خوشیوں پہ خود کا کیرئیر قربان کرنا ہوگا۔ یہ اس کی تعلیم کے اہم ترین سال تھے۔ اسے خود کو ان چکروں میں نہیں ڈالنا تھا۔

تمام رات بے سکوئی میں گزار کر صبح تک اس نے خود میں یہ ہمت جمع کی تھی کہ وہ بابا سائیں کو صبح بتادے گا مگر اس سے بھی پہلے حویلی کی فضاؤں میں فائز اور رملہ کا رشتہ طے ہونے کی بات گردش کر رہی تھی۔ منوں مٹھائی کے ٹوکے پوری برادری اور ملنے جلنے والوں میں بانٹنے کی تیاری کی جا رہی تھی۔ بابا سائیں کی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ سب سے بے اختیار اسے گلے لگا لیا اور مبارک دی۔ اس بار حویلی والوں کے چہروں پہ خوشی کے جتنے گہرے رنگ تھے فائز کے اندر اتنی ہی تاریکی اتر رہی تھی۔

وہ چپ چاپ بوجھل دل کے ساتھ شہر واپس چلا آیا تھا۔

☆☆☆

”تمہاری طرح انتہائی بھونڈا اور بکواس آئیڈیا ہے تمہارا۔“ موقع ملے ہی اپنے دماغ میں ہونے والی کھد بد کو کم کرنے وہ سارہ کے پاس چلی آئی تھی جس نے دو چار منتوں کے بعد اسے تفصیل بتا ہی دی تھی پر سین کا دماغ گھوم گیا تھا۔ آفس آکر وہ دونوں اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

یہ ایک پرائیویٹ کمپنی تھی جن کا اپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ دو سال پہلے گریجویشن کے بعد

دریافت کر لے۔ کسی الٹو سمٹنے کے بغیر پیسے کمانے کا
 فوری ذریعہ تو بس یہی ہو سکتا ہے۔ ”کمپیوٹر اسکیرین کی
 طرف دیکھتے سارہ نے نہایت حقیقت مندانہ تبصرہ کیا تھا۔
 وہ عادت سے مجبور ہمیشہ آدھی بات سن کر اس سے اوجھڑا
 نتیجہ اخذ کرنے میں مہارت رکھتی تھی اور سین کی اس جلد نفی
 رائے قائم کر لینے والی عادت کو سارہ بخوبی سمجھتی تھی۔ بہت
 زیادہ عقلمند لوگوں کی شخصیت کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ
 وہ کسی دوسرے کی رائے کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دیتے یا
 پھر اسے آخری آپشن کے طور پر رکھتے ہیں۔

”سارہ میڈم آپ بھول رہی ہیں۔ وہ گھر نہیں بھوت
 بنگلا ہے۔“ سارہ کی بات پہ لب بکھپتے وہ بے چینی سے بولی
 لیکن کہیں نہ کہیں خود دل کو بھی اس کا مشورہ مناسب لگا تھا۔
 پھر جیسے ہی گھر کا خیال آیا تو سین کا دل بیٹھنے لگا۔ اب ایسے
 مکان میں بھلا کون کرایہ دار رہنے پر راضی ہوتا۔
 ”ظاہر ہے آپ جیسی رائل آتما کی رہائش گاہ
 بھوت بنگلا ہی ہو سکتی ہے۔“ سارہ نے جھٹ جملہ مارا۔
 ”اچھا شٹ اپ۔“ سارہ کی بات پہ اس نے
 بھوس چڑھا لیں۔

”لو ہو گئی شٹ اپ، تم بتا دو اس سے بہتر
 پلان؟“ منہ میں قلم کا دوسرا سرواٹے وہ سوچ میں پڑ گئی
 کیونکہ اس کے پاس اگر مسئلے کا حل ہوتا تو سارہ سے
 دماغ ہی کیوں کھپائی۔ نہیں تھا اسی لیے تو اس کے سامنے
 اپنا دکھڑا رویا۔

”مئی سے بات کروں گی حالانکہ I'm not
 convinced“ سارہ جانتی تھی وہ قائل ہو رہی ہے
 مگر قبول کرتے تو سختہ سکتے کی ناک کھتی تھی۔

”ایسے سپر لیجنڈری آئیڈیل پر دیکھنا آئی بھی داد
 دیے بغیر نہیں رہ پائیں گی۔“ حالانکہ یہ کون سا اس کا اپنا
 پلان تھا۔ یہ تو جب سارہ نے اپنے بڑے بھائی سے
 ڈسکس کیا کہ بین ان دنوں مالی طور پر پریشان، اضافی
 آمدنی کے حصول کے لیے پارٹ ٹائم کچھ کرنا چاہتی
 ہے تو انہوں نے ہی مشورہ دیا کہ اتنے بڑے گھر کا کچھ
 حصہ کرایے پر دے کر بے آسانی اچھی آمدنی ہو سکتی ہے۔

”زیادہ از رومت۔ تم مئی سیکس ہو یہ میں اپنی
 طرح جانتی ہوں بس میرا ہی حوصلہ ہے جو برداشت کر
 رہی ہوں۔“ کرسی سے اٹھتے اس نے حساب چکایا۔
 ”اب یہ تو اللہ جانتا ہے کون کسے برداشت کر رہا
 ہے میری جان۔“ سارہ کی آواز پہ سرمارتی وہ سنجیدگی
 سے واپس اپنی میز پہ جا بیٹھی۔ اپنی میز پہ پڑی اسپریڈ
 شیٹ پہ غائب دماغی سے نگاہ ڈالتے اس کا دھیان
 منتشر تھا۔ ذہن اب پہلے سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔

تو کیا سارہ نے جو حل بتایا تھا واقعی وہ اتنا عملی
 ثابت ہو سکتا ہے اور اگر ایسا ہو جاتا ہے تو سین کو بغیر
 وقت اور محنت کے اچھا خاصہ ریلیف مل سکتا تھا۔ مگر یہ
 سب بظاہر جتنا سادہ اور آسان نظر آ رہا تھا کیا عملی طور
 پہ بھی یہ اتنا ہی آسان ہو جائے گا؟ ذہن میں اٹھتے
 خیالات کو جھٹکتے اس نے اپنے سامنے پڑے کمپیوٹر میں
 سے مائیکروسافٹ ایکسل کی فائل کھولی اور اکاؤنٹس
 ٹیلی کرنے لگی۔ اسے یہ فائل آج ہی کر اس چیک کے
 لیے اکاؤنٹس کو واپس بھجوانی تھی۔

☆☆☆

اس کی امید کے مطابق وہ اس کی منتظر تھیں۔ ان
 دنوں اس کا شیڈول اتنا سخت تھا کہ وہ انہیں مناسب
 وقت ہی نہیں دے پا رہا تھا۔ اکثر اسے گھر آتے، آتے
 رات ہو جاتی تھی۔ پھر آج کل شہر کا بھی چکر زیادہ ہی
 لگ رہا تھا جہاں وہ اپنا ہیڈ آفس منتقل کر رہا تھا۔ اب
 بھی وہ دو دن بعد شہر سے ہی لوٹا تھا۔

”میں پوچھتی ہوں کس بات کا روگ ہے جو یہ
 خانہ بدوشی کو گلے لگا رکھا ہے؟“ عدن نے نچلا لب
 دبائے اپنی مسکراہٹ کو روکا۔ وہ فقط اس کی منتظر ہی نہیں
 بلکہ اس سے خفا بھی تھیں۔

”آج یہاں تو کل وہاں، کبھی اس شہر، کبھی اس
 ملک..... نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی فکر۔“ وہ انہیں
 سلام کر کے ان کے پاس ہی صوفے پہ بیٹھ گیا تھا۔ وہ
 بدستور اپنی خفگی کا اظہار کر رہی تھیں۔

”کام میں بڑی ہوتا ہوں مام۔“ اپنی جیکٹ

دانا رپاں رکھے وہ اب ریٹیس انداز میں کرسوئے کی پشت سے لٹکائے بیٹھا تھا۔ دونوں بازو دوسری پشت پر باندھے اس نے ہلکے ہلکے انداز میں جواب دیا۔
 ”میںی تو کہہ رہی ہوں۔ کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو میری جان۔ تمہارے بڑوں نے یہ ڈھیر جاکدائیں اور وسیع کاروبار چھوڑا ہے تمہارے لیے پھر کیوں اپنی جان جلاتے ہو۔“ ہمیشہ کی طرح ان کی ایک ہی رٹ تھی۔
 ”بڑوں کی دولت پہ پیرا سامیٹ بن کر پلٹا رہوں۔ آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“ اس کے چہرے پہ ہلکی سی ہیزاری کی جھلک تھی لیکن ماں کے سامنے لہجہ و آواز دونوں دھمکتے تھے۔

”بڑوں نے اتنی محنت سے یہ سب بنایا، اب اپنی محنت سے اپنے اسکلز سے مجھے بھی تو اس کاروبار کو کسی مقام تک پہنچانا ہے ورنہ پھر کیا فائدہ ایسی ڈگریوں کا جنہیں علمی زندگی میں استعمال ہی نہ کر پایا۔“ اس نے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن دوسری طرف ہنوز وہی انداز تھا۔

”ایک تو مجھے اس گھر کے مردوں کی سمجھ نہیں آئی کبھی بھی سب کی اپنی ہی منطق رہی۔ اولاد ہے تو اس نے بھی اعلیٰ تعلیم کا ہتھیار نکال لیا۔ کوئی یہ نہیں سوچتا، اس محل جیسے گھر میں ماں اکیلے کیسی بولانی، بولانی پھرتی ہوگی۔ نوکروں کے آسرے چھوڑ کر تم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔“ اس بار لہجہ اور انداز دونوں تیز تھے۔ وہ ان کی شکایت کو سمجھتا تھا لیکن اسے دد کر کے قاصر تھا پھر بھی وہ انہیں اپنے گلے شکووں میں حق بجانب مانتا تھا۔ البتہ وہ اسے سرے سے سمجھتی ہی نہیں تھیں۔

”خیر اب تم دیکھنا، میں بھی اپنی تہائی دور کرنے کو جلد اس گھر میں بہو لے آؤں گی۔ تم بڑھاتے رہنا اپنا موکا رد بار۔“ وہ گویا دھمکی آمیز لہجے میں بولیں۔
 ”ٹھیک ہے کر لیجیے گا اسنے دل کی۔ آپ کو بھلا روک سکتا ہوں میں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بازو پھیلائے اور پاس بیٹھی ماں سے پلٹ گیا۔ اپنا سر ان کے شانے پہ لٹکائے اب وہ ان سے لاڈ لکرتا تھا۔

”اچھا ہنو، سب جتنی ہوں میں تمہیں۔ یہ بتاؤ کتنے دنوں کے لیے آئے ہو اور کتنے دن کا بن داس باقی ہے۔“ اس کے سر پہ ہلکی سی چپت رسید کرتے وہ محبت سے بولیں۔

”ابھی تو دو چار دن ہوں لیکن پھر شاید کچھ عرصے کے لیے جانا پڑے۔ میں ٹائم ٹو ٹائم ملنے آتا رہوں گا۔“ اب چونکہ ان کا موڈ کچھ بہتر تھا تو گلے ہاتھوں اگلا پروگرام بھی بتا دیا۔ انہوں نے شکوہ کناس نظروں سے دیکھا۔

”پلیز مام موڈ تو خراب نہ کریں۔ ابھی تو میں گھر آیا ہوں اور آپ نے آتے ہی شکوے شکایات کا ڈھیر لگا دیا۔ یہ نہیں بیٹے کو اپنے ہاتھ کے کپے مزیدار سے کھانے ہی کھلا دیں۔“ اب شکوہ کرنے کی باری اس کی تھی۔ بے اختیار ان کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی تھی اور ساتھ ہی بیٹے کے لیے بے تحاشا پیار۔ اسے کپڑے بدلنے کا کہہ کر وہ خود چکن میں اس کے کھانے کا بندوبست کرنے چلی گئی تھیں۔ اب وہ جتنے دن گھر تھا یہ تو طے تھا، اس کے لیے کھانا وہ خود ہی پکا میں گی۔

☆☆☆☆

بارش کے بعد ہونے والے جس کی وجہ سے فضا میں ٹھن کا راج تھا۔ بس کی کھلی کھڑکیوں سے بھی ہوا کا ایک جھونکا اندر نہ جھانکتا تھا۔ مسافروں کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بس اسٹاپ پہ رکی تو نئے اور پرانے مسافروں میں دھکم پیل شروع ہو گئی۔ سب ہی کو اپنی، اپنی منزل پہ پہنچنے کی جلدی تھی۔ وہ بھی خاصی مشکل سے اپنی جگہ بنائی بس سے نکل گئی۔ سفید ملل کے کڑھائی والے بڑے سے دوپٹے کو سلیتے سے چادر کی طرح لپیٹے اس نے وجود کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ کندھے پہ ایک درمیانے سائز کا سستا سا شولڈر بیگ لٹکا ہوا تھا جبکہ ہاتھ میں فائل تھی۔ تیز، تیز قدم اٹھاتی وہ سڑک کر اس کر کے اپنے محلے میں داخل ہو گئی لیکن جیسے ہی چوراہے پہ پہنچی یک دم ٹھٹک کر رک گئی۔

سیاہ کرتے اور سفید شلوار میں لمبوس دھوئیں کے

تھا اس لیے سن کر بھی ان سنی کیے جا رہا تھا مگر شاید دوسری طرف بھی محل اپنے عروج پہ تھا جو کال کرنے والا باز نہیں آ رہا تھا۔
 ”السلام علیکم لالہ۔“ تنگ آ کر اس نے کال اینڈ کر ہی لی تھی۔

”جیتے رہو، جیتے رہو۔ پر یہ تو بتاؤ ہماری کال کیوں اینڈ نہیں کر رہے۔“ سمجھنے والے نے اپنے ہنس مکھ انداز میں سوال کیا تھا۔

”کمرے میں نہیں تھا لالہ، فون بھول گیا تھا۔“ جھوٹ بولتے آواز خود بہ خود جھبی ہو گئی تھی۔

”تم شہر جا کر ایسے بے پروا تو کیسی نہیں ہوئے تھے جیسے اس بار محسوس ہو رہے ہو۔“ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ فائز کا بھجا، بھجا انداز وہ دور بیٹھے محسوس کر رہا تھا۔

”کلاسز شروع ہو چکی ہیں تو مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اسی لیے آپ کو شکایت ہوئی۔“ اس نے اپنے تئیں وضاحت دی۔ بڑا انجینی سالجہ تھا۔ سمجھنے کا ماتھا نہ تھا۔

”میں شکایت تو نہیں کر رہا شہزادے۔ تمہاری کمی تو ہم سب کو ہر پل محسوس ہوتی ہے۔ بس یوں سمجھو سب ہی مس کر رہے تھے تمہیں۔۔۔۔۔ خاص طور پر بابا سائیں۔“ اس کی اجنبیت کو نظر انداز کرتے سمجھنے والہا نہ پن سے جواب دیا۔

”میں کوشش کروں گا آج، کل میں بابا سائیں سے رابطہ کرنے کی۔“ اسے خود بھی احساس تھا وہ اس کی وجہ سے پریشان ہوں گے۔

”تم خوش نہیں ہو فائز؟“ سمجھنے کے اس اچانک سوال نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس کا لہجہ اور انداز واضح تھا تو یہ ظاہری بات بھی کسی نہ کسی کو تو محسوس ہونا ہی تھا۔
 ”اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے لالہ۔“ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ سمجھ تو جیسے حیران پریشان رہ گیا۔ صرف لہجہ ہی نہیں تعلق میں بھی اجنبیت نظر آتی تھی۔

”کچھ دوست آگئے ہیں لالہ، ابھی فون رکھتا ہوں بعد میں کال کروں گا۔“ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا فائز نے یک دم ہی کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

مغرولے اڑاتے اس شخص نے ایک شان سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ہر روز اسی وقت گھر پہنچتی تھی۔ یونیورسٹی سے سیدھی وہ ایک پرائیویٹ نیوشن سینٹر چلی جاتی تھی اور پھر وہاں سے واپسی پر گھر آتے آتے اسے باج بچ جاتے۔ محلے کی اس سگریٹ اور پان کی دکان پہ اکثر ہی مردوں کا جم غفیر دکھائی دیتا تھا جس پہ توجہ دیے بغیر وہ چپ چاپ تیزی سے نکل جاتی لیکن اس بد معاش کو کل پہلی بار اس نے اس دکان پہ کھڑے دیکھا تھا۔ وہ جن بے حیا نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اس کی روح تنک کانپ گئی تھی۔ اس کے انداز میں بے خونی بھی جیسے ابھی اس کا راستہ روک لے گا لیکن صد شکر شاید بہت سے لوگوں کی موجودگی نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھا تھا باوجود ہنس ایک نظر باز سائی شخص تھا۔ کل جب وہ گھر پہنچی تو اچھی خاصی گھبرائی ہوئی تھی لیکن صبح تک یہ واقعہ اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اب واپسی پہ بھی اس کے ذہن میں یہ شاید نہ تھا کہ وہ بد معاش وہاں موجود ہو گا لیکن اسے ایک بار پھر اپنے سامنے دیکھ کر اس کے ادا سان خطا ہو گئے تھے۔ وہ کوئی ڈرپوک اور سبکی ہوئی لڑکی نہیں تھی۔ سالہا سال سے اپنی بیوہ ماں کے ساتھ اس چھوٹے سے محلے میں زندگی گزار رہی تھی۔ کالج لائف سے ہی مشقت اس کی زندگی کا حصہ تھی۔ اسے راہ چلتے مردوں کے روئے دیکھ کر خوف نہیں آتا تھا کیونکہ وہ خود مختار رہتی تھی لیکن آج سے پہلے اس کا سامنا ایسی صورت حال سے نہیں ہوا تھا۔

شہر پہ ناکا دو پنا درست کرتے اس نے اپنی فائل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر سینے سے لگا لیا اور پھر اس پہ توجہ دیے بغیر اعتماد سے چلتی وہ اس دکان کے آگے سے گزری۔ سگریٹ کو اپنی دو انگلیوں میں مسلتے اس لفٹ کی نگاہوں نے گردن گھما کر اس کا تعاقب کیا تھا۔ گلی کا موڑ مڑ کر وہ اس کی نگاہوں سے اوچھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

اس کا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کال کون کر رہا ہے لیکن وہ بات کرنے کے موڑ میں نہیں

سچ سچ دوا تپا کھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔
لڑائی جھگڑا بحث مباحثہ اس کی فطرت کا حصہ نہیں تھا۔

☆☆☆

”تو تمہیں کیا ضرورت تھی اپنے سر کے کان میں پھونک مارنے کی۔ اپنا گھر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔“
اگلے دن ٹائل نے دو کی سونیا کر ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی تھی۔ متعصم تو اس کا ان کی ہمدردی حاصل کرنا تھا لیکن اُدھر تو فضیلت کے دل پہ چوٹ پڑی تھی۔ سامنے بیٹھے تابش نے بھی ماں کی طرف شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا۔

”آپ بھی بڑی بھولی ہو اماں۔ میں تو حویلی سے اس فائز کا پتا کٹا کٹا چاہ رہی تھی۔ خواہ مخواہ کا حصہ دار بن رہا ہے۔ سو فیصد یقین تھا مجھے کہ صاف انکار کر دے گا۔ بھلا اس ہنگامی لڑکی میں ایسا کیا ہے جو اس شہری بابو کا دل موہ لے۔“ اپنا دامن بچانے کی خاطر اس نے سچ اگل دیا تھا۔ انہیں بیٹی کی سوچ پہ حیرت ہوئی تھی بس پہلو بدل کر رہ گئیں لیکن تابش خود پہ قابو نہیں رکھ پایا تھا۔

”خیر اب ایسی بات تو مت کریں آپا۔ کس بات کی کمی ہے رملہ میں۔“ اس نے صاف صریحاً رملہ کی حمایت کی تھی۔ سچ تو یہ ہے وہ اسے شروع سے پسند کرتا تھا اور ماں کو بھی مانا چکا تھا۔ ویسے بھی فضیلت کو بھلا کیا اعتراض ہوتا تھا۔ ایک تو دہری رشتے دار ہی اس پہ اونچا خانہ دان، بہو کون سا خالی ہاتھ آتی۔ ساتھ میں بڑی جاگیر بھی تو جہیز میں آتی۔ وہ بیٹے کی خوشی پہ جھٹ جھٹ مان گئی تھیں لیکن حویلی سے رملہ اور فائز کی بات سنی ہونے کی خبر نکل تو ماں، بیٹے کی امیدوں پہ پانی پڑ گیا۔

”آئے ہائے، انہیں بڑی حمایتیں سوچ رہی ہیں۔ اماں ویسے معاملہ کیا ہے ذرا مجھے بھی تو بتا چلے۔“
ٹائل کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ بھائی کے بدلے ہوئے انداز کو محسوس کرتے اس نے فوراً جوت کی تھی۔
”جہیں بتانے سے فائدہ۔ تم نے تو کر لی ناں اپنی من مانی۔ ہم نے تو منگنی کے لڈو بول کی طرح حلق

پر پھونکا دیا۔ جس پر پہنچے تو سلائی ٹائل کا سارا دھیان ان دونوں کی گفتگو پر ہی تو تھا۔
اب جو سچ کے چہرے پہ ٹھکر کی لکیریں اسے ایک نئی کہانی سناری تھیں۔ یوں اچانک خاموشی سے اس سے پہلے تو کبھی کال بند نہیں ہوتی تھی۔

”کیا کہہ رہا تھا فائز؟“ بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔
”ہونہ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں۔“ اپنی ہی سوچوں کے حصار میں کھویا سچ اس کے سوال پہ چونکا تھا۔
”لگتا ہے آپ کی بہن سے رشتہ جوڑ کر خوش نہیں ہے آپ کا لاڈلا۔“ ٹائل نے دور کی کوڑی چمکنی تھی جو گئی تو ٹھیک نشانے پہ تھی کیونکہ سچ کے ماتھے پہ واضح مل نمودار ہوئے تھے۔

”تم سے کس نے کہا؟“ وہ اپنی عادت کے خلاف خاصے تیز لہجے میں بولا تھا۔

”اندھی نہیں ہوں میں۔۔۔۔۔ صاف دکھائی دے رہے ہیں اس کے تئور۔ اب میں نے تو یہ سوچا تھا چلو گھر کا لڑکا ہے۔ بابا سائیں کے کتنے احسان ہیں۔ رملہ کو خوش رکھے گا پر یہاں تو ابھی سے آنکھیں ماتھے پہ رکھ لیں۔“ ٹائل نے سچ بتا کر اس وقت اپنے ہی پاؤں پہ کھڑی ماری تھی۔ سچ پہلے ہی فائز کے رویتے سے شدید ڈسٹرب تھا اس کی بات سن کر مضطرب ہوا تھا۔

”تم نے۔۔۔۔۔ اوہ مانی گاؤ۔۔۔۔۔ یعنی یہ سب تم نے بابا سائیں کے کان میں ڈالا اور میں تو سمجھ رہا تھا یہ ان کی اپنی خواہش ہے۔“ اصل بات تو اسے اب معلوم ہوئی تھی۔
”ہاں تو کیا غلط کیا؟ رملہ بھی تو یہی چاہتی تھی۔“
اس نے جڑے سے رملہ کو بھی درمیان میں گھسیٹ لیا تھا جسے اس سچ تک لانے والی بھی وہ خود ہی تھی۔

”اب تو مجھے لگ رہا اسے بھی یہ پٹی پڑھانے والی تم ہی ہو۔ اس کا ذہن تو بچکانہ ہے۔“ رملہ کا نام سن کر تو سچ کو مزید غصہ آ گیا تھا۔

”لو بھلا، بہن اپنی قابو میں نہیں، غصہ مجھ پہ ایسے اتار رہے ہیں جیسے میری ہی غلطی ہو۔“ زرباب بڑبڑاتے اس نے پہلو بدلا۔

”کوئی خاص وجہ؟“ انہوں نے ابرو دو سوا لہ انداز میں اٹھائے۔ وہ دونوں اب اپنے، اپنے چائے کے گگ لیے لاؤنج میں آگئی تھیں۔

”تو آپ کے نزدیک یہ وجہ نہایت عام ہے کہ یہ گھر ہماری ملکیت نہیں۔“ سین نے چڑ کر ان حقائق کی طرف دھیان دلایا جنہیں وہ سراسر نظر انداز کر رہی تھیں اور وہ نہیں جانتی تھی کہ ایسا جان بوجھ کر کر رہی ہیں یا بے دھیانی میں اتنا بواج فراموش کر بیٹھی ہیں۔

”تم بھول رہی ہو میری جان، یہ گھر تمہاری ہی ملکیت ہے۔“ صوفے پہ بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنا گرما گرم چائے گگ سامنے دھری میز پر رکھا۔

”آدھا!“ سین صوفے پہ گرنے کے سے انداز میں ان کے پاس جا بیٹھی۔ موڈ سخت آف تھا۔ یہ بھی اس کے احتجاج کا ایک انداز ہوا کرتا تھا کہ جب موڈ خراب ہو اور کوئی اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا وہ یوٹی اپنا غصہ دکھاتی۔

”آدھا ہی سہی..... ہے تو تمہارا۔“ چائے گگ لیوں سے لگاتے وہ نہایت محل سے بولیں۔ اس کے برعکس ان کا چہرہ اور لہجہ دونوں پرسکون تھے۔

”میرا؟“ استہزاء سے ہنستے اس نے انگلی سے اپنی سمت اشارہ کیا۔ انہوں نے سر اثبات میں ہلاتے اعتراف کیا پردہ ایک دم تھپے سے اکھڑ گئی۔

”جی بالکل..... یہ محل جیسا گھر آدھا میری ملکیت ہے لیکن میرے کسی کام کا نہیں۔ کیونکہ میں صرف یہاں رہ سکتی ہوں اسے بچ نہیں سکتی۔“ طنز یہ انداز میں کہتے اس نے انہیں وہ شرط یاد دلانی جسے

جاننے کے بعد ہی سین کا اس گھر سے اور دوسرے معنوں میں زندگی سے دل اچاٹ ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس کی زندگی میں مصائب تو تھے لیکن جو صلے کی کمی نہ تھی کیونکہ وہ ان سے لڑ رہی تھی۔ یوں تو ہوش سنبھالتے ہی اس نے رشتوں کی بے بسی دیکھی تھی مگر اپنے پاپا کے

ہوتے اس نے بھی ان رشتوں سے کوئی توقع نہیں لگائی تھی لیکن اب جو روپ اس کے سامنے آیا تھا اس نے

سے اتارے۔ تابش کا بڑا دل تھا رملہ سے بیاہ کا۔“ فضیلت نے دھیمے لہجے میں شکوہ کرتے بیٹی کو بھی اس راز میں شریک کیا تھا پر اسے تو جیسے پتہ ہی لگ گئے تھے۔

”حد کرتی ہیں آپ بھی۔ سالوں سے اس تک چڑی کو نند بنا کر سر پہ بٹھا رکھا ہے اب بھائی بنا کر کلیجا جلاؤں۔ یہ تو ابھی سے میری زبان پکڑ رہا ہے کل کو گھر لے آتا تو میرا اس گھر میں داخلہ بھی بند کر دیتا۔“ شانکہ کی باتوں پہ چہرہ پٹختا تابش کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ تو بس دیکھتی ہی رہ گئی۔

”خیر اب اس بات سے کیا حاصل۔ جو ہوتا تھا ہو گیا۔“ فضیلت نے بات سنبھالتے ہوئے تسلی دی اور پاس پڑا پانڈن اکھول کر اپنے لیے پان بنانے لگی۔

☆☆☆

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھیں جب سین سیدھی ان کے پاس جا پہنچی اور ساری بات ماں کے گوش گزار کر دی۔ ”مشورہ تو اچھا دیا ہے سارہ نے۔“ ماں نے بھی وہی ڈہرایا تھا جو سارہ نے کہا تھا۔

”اوہ رینیکی؟ آپ کو یہ احمقانہ تجویز ایک اچھا مشورہ معلوم ہو رہی ہے۔“ وہ کچھ جڑبڑ ہوئی اور حسب عادت ان سے بھی بحث کا آغاز کر بیٹھی۔

سین اس وقت سے مستقل اسی مسئلے پہ سوچ رہی تھی۔ غم یہ تھا دو الگ، الگ جگہوں سے دو الگ جواب آرہے تھے۔ دل مان رہا تھا پردہ ماغ نہیں۔ وہ دماغ کی سننے والوں میں سے تھی جبکہ دل کہتا تھا سارہ کی بات میں دم ہے۔ اس سے آسان اور دیر پا حل بھی کیا سکتا ہے۔

”میرا خیال ہے کوئی مضائقہ بھی نہیں۔“ لیکن کیبنٹ بند کرتے انہوں نے کندھے اچکائے اور ایک نظر سین کے الجھے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبی کا ڈنڈا ٹاپ سے کمر نکائے اپنے ناخن چبارہی تھی ان کی بات پہ پلٹی اور تنک کر بولی۔

”مئی ہم یہ گھر کرایے پہ نہیں دے سکتے۔“ چائے دو گلوں میں انڈیل کر انہوں نے اپنا گگ اٹھایا دوسرا سین کی سمت کھسکایا۔

سے کٹ چھانٹ کے محروم ہیں اور ان کی کمی کی بدولت لاؤنج کی اندرونی دیوار بری طرح خراب اور سیلن زدہ ہو چکی تھی۔

شروع شروع میں وہ دونوں میاں، بیوی لان میں پودوں کی کانٹ چھانٹ کر لیا کرتے تھے پھر زندگی کے جھمیلوں میں یہ سلسلہ بھی کم ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ لان کی حالت اتنی بدل گئی کہ اب کسی باقاعدہ مالی کی ضرورت تھی وہ بھی مستقل بنیادوں پر۔ رہی کسی کسراں کے بابا کی بیماری نے پوری کردی جب سین کی ملازمت ہی وہ واحد آمدنی تھی جس سے گھر کا دال دلیا چل رہا تھا اس پر دوائیوں اور ڈاکٹروں کے کمر توڑ اخراجات تو بس اس جگہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

”یہ گھر بائیس سال سے مرمت نہیں ہوا می۔ بائیس سال سے بھی ان دیواروں کو روغن نہیں کرایا گیا کیونکہ ہم انورڈ نہیں کر سکتے تھے اور آج بھی کم از کم میری سیلری میں سے یہ سب نہیں ہو سکتے گا۔“ اس دو کنبال کے گھر کی مرمت کروانا اتنا آسان نہیں تھا۔ روزمرہ کی چھوٹی موٹی توڑ پھوٹ بھی کئی ہزار لے جاتی جبکہ انہی چند ہزار میں وہ دونوں اپنی گزر بسر کرتی تھیں۔ کسی بڑے کام کو کھولنا ایک پیئڈ ورا باکس کھولنے جیسا تھا جس میں لاکھوں لگ جاتے۔ یہی سوچ کر بھی ان سب چیزوں پہ وہیان نہ دیا اور بس صبر شکر سے وقت گزرتا رہا کہ ان کی ضرورت بھی تو محدود ہی تھی۔ لاؤنج اور ایک دبیز روم ان کے استعمال میں تھے۔ باقی کا سارا گھر بندی پڑا تھا۔ سوائے سارہ کے اور کوئی مہمان ان کے گھر آتے نہیں تھے کہ وہ دونوں ہی بہت زیادہ سوشل نہ تھیں۔ رشتے دار ملتے نہیں تھے تو جو جگہ انہوں نے استعمال کے لیے رکھی ہوئی تھی انہیں وہی بہت تھی۔

”میں سمجھ سکتی ہوں بیٹا لیکن اس میں ان لوگوں کا کیا قصور؟“ انہوں نے سمجھانا چاہا۔

”سارا قصور انہی کا ہے۔ یہ جو اذیت بھرے دن کاٹے ہیں ناں، ہم نے زندگی میں اور آج بھی غربت کی لکیر سے نیچے ٹر کر زندگی گزار رہے ہیں تو یہ سب انہی کا

”یہ بھی غنیمت ہے۔“ وہ ماں کا چہرہ دیکھ کر کہہ گئی۔ پتا نہیں یہ صبر اسے کیوں نہیں آتا تھا۔

”یہ آپ کہہ رہی ہیں می، آپ تو سب کچھ جانتی ہیں پھر بھی.....؟“ وہ شکوہ کیے پتا نہ رہ سکی۔

”کچھ بھی ہے سین، اپنی چھت ہونا بہت بڑی بات ہے۔ یہ گھر نہ ہوتا تو کرایوں میں دھکے کھانے پڑتے اور ہر ماہ کی چوڑی رقم کی ٹینشن الگ لگی رہتی۔“ وہ جہانم دیدہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک جوان بیٹی کی ماں بھی تھیں۔ جانتی تھیں ان پر اس گھر کی صورت ہی کتنی مہربانی برتی گئی ہے حالانکہ عمل تو ایسا ہرگز نہ تھا شاید قدرت کو اس عرصہ میں ان کا بیٹی کے ساتھ دور درج بھٹکانا منظور نہ تھا۔ اسی لیے تو سر پر یہ چھت تختے میں مل گئی۔

”واؤ..... یعنی آپ کو بھی لگتا ہے یہ سب ہم پر قدرت کا انعام ہے۔ اپنی فیاضی دیکھا کر ہم بے تاثر چٹان سے وزنی احسان کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔“ اس کے جملے ہوئے انداز پر انہوں نے بیٹی کا کندھا سہلاتے اسے کول ڈاؤن کرنا چاہا پردہ یک دم صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ کے اشارے سے ان کی توجہ وہاں دلائی جایی جس سے وہ خود بھی غافل نہ تھیں۔

”ذرا سرائٹا کر دیکھیں ان چھتوں کو یہ سیلن زدہ ہو رہی ہیں۔ اور یہ دیواریں چپک کریں۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ تمام لیا پردہ باز نہیں آئی۔

”وہ باہر لان نما جنگل کا حال دیکھا ہے آپ نے۔ یقیناً گیدڑ بیرا کر لیں گے وہاں چند مینوں میں۔“

ان کا ہاتھ تھا اس نے وہیں سے کھڑکی کی طرف اشارہ کرتے ان کی توجہ باہر کے منظر کی طرف دلائی۔ جگہ جگہ سے جلی ہوئی گھاس، بے ترتیب پودے اور ان کے نیچے اکیس بے شمار جنگلی جڑی بوٹیاں جواب اس جگہ کے حسن کو ماند کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا سالوں سے بھی اس قطعہ اراضی کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ لاؤنج کی دیوار پر چڑھی ٹیلیک سالہا سال ماہنامہ پاکیزہ۔

نصرت ہے۔“ حتیٰ کہ آپ کی آواز بھرائی تھی۔

”کیا چلا جاتا اس رئیس زادے کا جو اگر وہ اس گھر کو بیچنے کی صلاح مان لیتا۔ ایسی نہ جانے کتنی جائدادیں ہیں ان کی۔ ہمارے پاس تو بس یہی ایک ٹوٹا پھوٹا آسرا تھا۔ لیکن نہیں..... صاف انکار کر دیا منجوس نے۔“ آنکھوں میں اترتی نمی کو بے دردی سے غڑتے اس نے زچ ہو کر کہا۔

”اب اس نکیر کو کیا پیٹنا۔ جو ہو نہیں سکتا اس پہ واویلا مچانے اور جلتے کڑھنے سے کیا حاصل۔“ وہ ٹھیک کہتی تھیں۔ انسان بہت کچھ سوچتا ہے، بہت کچھ کرتا چاہتا۔ کچھ اس کے اختیار میں نہیں ہوتا کچھ قسمت میں..... اس لیے جو اللہ کی مرضی سے مل جائے اس پر شکر کرنا چاہیے جو نہ ملے اس پر صبر کرتے ہوئے بہتر کی دعا کرے۔ ایک دقت آتا ہے جب راستے خود آسان ہونے لگتے ہیں۔

”یہی تو رونا ہے کہ سب لاحاصل ہے۔ گھٹیا انسان کہتا ہے گھر نہیں کیے گا..... آدھا نہ پورا۔ ذرا سوچیں می اس شہر میں اس گئی گزری حالت میں ہونے کے باوجود یہ پراپرٹی کروڑوں کی ہے۔ ہمیں آدھے پیمیل جائیں تو ہم اپنے حساب سے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیتے، میری ادھوری تعلیم مکمل ہو جاتی....

اور...“ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتے اسے وہ وقت یاد آیا جب سین نے اپنی اماں، اپنی خودداری پہ قدغن لگاتے خود اس رئیس زادے کو کال کی اور تو اسے اپنی پریشانی کا احوال بھی مختصر انداز میں سناتے اس بات کے لیے قائل کرنا چاہا کہ وہ اس گھر کو بیٹنا چاہتی ہے۔ وہ اگر گھر بیٹنا نہ چاہے تو اس کے حصے کی قیمت سین کو ادا کر دے مگر اس نے تو دونوں ہی صورتوں کو ماننے سے بڑی رکھائی سے انکار کر دیا تھا۔ سین اس دقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی تعلیم چھوڑ کر اس نے ملازمت شروع کی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ وہ آگے بڑھے۔ ایسا ہو جاتا تو اس کے لیے بہت سے مرصے بے حد آسان ہو جاتے مگر کہہ کر بات بھی گنوا کی

بچوں کا مستقبل

آج کے بچوں کو کل کی اہمیت سے آگاہ کریں: ایک بچہ اقدار کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ والدین اسے ان سے آگاہ کرتے ہیں جبکہ اساتذہ ان اقدار سے بچوں کو وابستہ کرتے ہیں۔ بچہ غیر محسوس انداز سے اپنے بڑوں سے سیکھتا ہے اور ان کی کئی گنی باتوں کے بجائے ان کے اقدامات کی نقل کرتا ہے۔ اس لیے ہمیں بچوں کی موجودگی میں خاص طور پر اپنی باتوں، رویوں اور کاموں میں محتاط رہنا چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچیں کہ بچوں کو ہمارے خفیہ کاموں کا پتا نہیں لگے گا تو ہم بہت بڑی غلطی کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے گھر کے ماحول کا انسانی اقدار سے ہم آہنگ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اساتذہ کا بھی اپنے شاگردوں کے اندر مخصوص اقدار کو پیدا کرنے میں کردار اہم ہوتا ہے اور کچھ دیانت دار اور مخلص قسم کے اساتذہ نہایت ایمان داری سے یہ فریضہ سر انجام دے رہے ہیں۔ چونکہ معاشرہ اس شعبے کے لوگوں کو اہمیت نہیں دیتا اس لیے کئی غیر دیانتدار قسم کے لوگ بھی اسی شعبے میں آچکے ہیں جن کا مقصد صرف پیسے بٹورنا ہے اور وہ اپنی اہم ترین ذمے داری کو مکمل کرنے کے بجائے صرف آمدن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر معاشرے کو غیر انسانی بنانے کا عمل روک دیا جائے اور انتشار سے محفوظ کر دیا جائے تو ماحولیاتی عوامل کا پیچیدہ میٹ ورک جس میں گھر، اسکول، کمیونٹی، ذرائع ابلاغ اور معاشرے میں موجود عمومی خصوصیات شامل ہیں، فعال ہو سکتا ہے۔ تمام مخلوق کو مل کر بچوں کے اندر مثبت رویے کو پروان چڑھانا چاہیے تاکہ وہ اس جمہوری دنیا کے ذمے دار شہری بن سکیں۔

والدین اور اساتذہ کو اپنی ذمے داریاں پوری کرنا ہوں گی اور صرف اقدار کی تبلیغ نہیں کرنی ہوگی۔ انہیں اپنے بچوں کو عظیم ہستیوں کی کہانیاں سنانی چاہئیں، جن میں ان کی عدم تشدد، عالمی امن و انصاف کی بالادستی، حق و صداقت اور کمزوریوں سے محبت جیسی تعلیمات پائی جاتی ہیں۔

از: نیوفر خان، بہارہ کبود

پھر میں اخبار میں آید دے دوں؟ صدمہ سرور
 مان گئی تھیں۔

”بسمہ اللہ کرو۔ باقی اللہ آسانی کرے گا ان شاء
 اللہ۔“ اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے انہوں
 نے اثبات میں سر ہلایا۔

☆☆☆

”یار سین کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم اس
 سے مل لو۔ اگر مناسب نہ لگے تو پھر اخبار میں اشتہار
 دے دینا۔ کیوں آنٹی میں غلط تو نہیں کہہ رہی ہوں
 ناں۔“ سارہ نے ان کے بنائے کبابوں پہ ہاتھ صاف
 کرتے تعصفاً کہا۔

”مجھے تو خیر اس میں کوئی مضائقہ نہیں لگتا پھر
 جب تمہارا بھائی یہ گارنٹی دے رہا ہے تو یقیناً شریف
 انسان ہی ہوگا۔“ سین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا
 ہی تھا پر اس سے پہلے ہی انہوں نے بات شروع
 کر دی۔ اس کا منہ بس کھلے گا کھلا ہی رہ گیا۔

”شرافت کی گارنٹی، کرایے کی وقت پہ ادائیگی کی
 گارنٹی، اینڈ وائس کی گارنٹی۔ نکاح نامے کے علاوہ جس
 کاٹریکٹ پہ چاہیں دستخط کروالینے گا۔“ سین کو کن انکھوں
 سے دیکھتے سارہ حسب عادت اسے چھیڑنے سے باز
 نہیں آئی تھی۔

”شروع ہوگئی بس جھک مارنے۔“ سین.....
 بے ساختہ بولی۔ ”اور یہ ادھر رکھو واپس۔ دوکھا چکی ہو۔“
 اس کے ہاتھ سے تیسرا کباب کھینچ کر پلیٹ میں پیٹنے
 اس نے بدلہ چکا تھا۔

”کیا بد نظری ہے سین، کھانے دواے۔“ می
 کے گھورنے پہ وہ بس لب بھینچے خاموش رہی۔ انہوں
 نے خود ہی کباب اٹھا کر سارہ کی پلیٹ میں رکھا جسے
 اس نے باقاعدہ سین کو دکھا دکھا اور جتا، جتا کر کھانا
 شروع کر دیا تھا۔

”مجھے تو اس بندی پہ یقین نہیں کجا اس کی
 گارنٹیوں پہ ہوگا۔ یقیناً اس نے اسے چار کباب کھلا کر
 بھیجا ہوگا۔“ سین جل کر بولی۔

اسے اس گھر سے کوئی امید باقی رہی نہ تھی جس پہ اس کا
 اتنا بھی حق نہیں تھا کہ اسے اپنی پریشانی میں استعمال
 کر پائی۔ ماں کی زور زبردستی نہ ہوتی تو وہ اس وقت یہ
 گھر چھوڑ دینے کو ہی تیار ہوگئی تھی۔ اسے سڑک پہ رہنا
 منظور تھا مگر اس امیر زادے کی خیرات نہیں چاہیے
 تھی۔ مگر جذبات کو قتل نے قابو کر لیا تھا۔

”اور تمہاری کسی اچھی جگہ شادی بھی.....“ ہر ماں
 کی طرح اپنی جوان بیٹی کے لیے ان کے بھی خواب اور
 خواہشات تھیں جس کا برملا اظہار انہوں نے کر دیا تھا۔

”مجھ سے یہ بات دوبارہ مت کیجیے گا۔“ سین
 ماتھے پہ ہل ڈالے بولی۔

”اچھا نہیں کرتی لیکن وہ کرایے دار والی بات
 کر لیں۔“ انہوں نے فوراً سے بات مان لی۔ بحث
 میں وہ اس لڑکی سے کہاں جیت سکتی تھیں اسی لیے بہتر
 موضوع پہ لوٹ آئیں۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔
 ”سنگل فمیلی کے رہنے کی جگہ سے یہاں۔ کوئی
 دوسری فمیلی کیسے بیچ کرے گی۔“ ایک نئی کفیوژن.....
 اس کا مطلب وہ ہر پہلو پہ سوچتے ہوئے کرایے دار
 رکھنے کا فیصلہ تقریباً کر چکی تھی۔

”گیسٹ روم والے دو کمرے کسی پیچلر کو دیے
 جاسکتے ہیں۔ کوئی اسٹوڈنٹ وغیرہ ہو یا پھر ملازمت
 پیشہ۔ فمیلی والا جنجال بھی نہیں ہوگا اور ایسے لوگوں کی
 زیادہ ڈیمانڈ بھی نہیں ہوتی ہیں ویسے بھی زیادہ وقت تو
 وہ گھر سے باہر ہی رہتے ہیں۔“ گو بہت بڑا تھا پر گھر
 سنگل اسٹوری تھا اور مکمل تعمیر اس انداز میں ہوئی تھی کہ
 ایک ہی فمیلی رہ سکتی تھی۔ کل پانچ بیڈ روم تھے جن میں
 سے بس دو ہی ان کے استعمال میں تھے۔ گھر میں داخل
 ہوتے ہی دائیں طرف بنے گیسٹ روم اور اس سے
 ملحقہ ایک کمرہ امہان کی پرائیویسی کو مد نظر رکھ کر بنایا گیا
 تھا جو اتنے سالوں میں بھی استعمال ہوا تھا نہ کھولا گیا
 تھا۔ تو وہ سہہ کر بس وہی ایک آپشن چنتا تھا۔ سر ہلاتے
 اس نے ان سے اتفاق کیا تھا۔

بعد سے وہ کس اسی جلد فاصلہ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے لیے جیسے شام ڈھلے گھر واپس لوٹنا مصیبت بن گیا تھا۔ آج جو حد اس نے پار کی تھی اس کے بعد تو فاطمہ کا خوف بھی بجا تھا۔ وہ بچلے بہت بہادر اور پُر اعتماد لڑکی تھی لیکن کسی غنڈے مولائی کے راستہ روکنے سے ہونے والی ذلت بھلا کون عزت دار لڑکی برداشت کر سکتی ہے۔

”کبھی بے وقت کی پریشانی پڑ گئی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ تم پریشان نہ ہوکل سے میں خود بس اسٹاپ پہ آ جایا کروں گی تمہیں لینے۔ میں ساتھ ہوا کروں گی تو آئندہ خود ہی دفعان ہو جائے گا مردود۔“ طیبہ نے اسے تسلی دیتے حتیٰ فیصلہ سنایا تھا۔ وہ پرسکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”کانی پرانی تعمیر لگ رہی ہے اس گھر کی۔“ عدن نے کمرے کا جائزہ لیتے تبرہ کیا۔ گھر کے اس حصے کی سترائی صفائی بھی ایک مرحلہ تھی جو اس نے محی کے ساتھ حل کر لی تھی کیونکہ یہ ساڑھ بہت وقت سے بند تھی۔ دھول مٹی ایک طرف، عمارت کی حفاظت ان کی صفائی سے تو چھیننے والی نہیں تھی۔ سین نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دھیمسا مسکرایا پر سین کے تاثرات ضرورت سے زیادہ بنجیدہ تھے۔

”شاید نسل از سب۔“ یہ مذاق تھا یا طنز عدن سمجھنے سے قاصر تھا۔ ویسے طنز تھا کس پر اور مذاق لگ کیوں نہیں رہا تھا۔

”اتنے پیسوں میں اس گھر کی تعمیر نو کے متعلق سوچے گا بھی مت۔ یہاں جو ہے جیسا ہے قبول کرنا پڑے گا۔“ وہ تنبیہی انداز میں کہتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ عدن بھی پیچھے، پیچھے چلا آیا تھا جہاں لاؤنج میں اب اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ اسے دیکھ کر وہ... غیر مقدی انداز میں مسکرائیں۔ عدن نے بھی جواب میں مسکراتے ہوئے انہیں سلام کیا تھا۔ جس کا جواب خاصی شفقت سے دیا گیا تھا۔ سین کے سامنے والے صوفے کی نشست سنبھالتے وہ اب اس کی طرف متوجہ تھا جو اپنی والدہ کی نسبت بے حد بنجیدہ نظر آ رہی تھی۔

”کبابیوں کی ریزس می ٹیبل لگاتا ضرر نہ۔ وہ جاگیر دار ہے۔ اس شہر میں کام کی غرض سے رہنا چاہتا ہے۔ وہ تو بھائی نے ہی اسے کنوئس کیا کہ یہاں وہاں لے چوڑے کراپے بھرے گا تم لوگوں کا ہی فائدہ ہو جائے پر مجھے تو لگتا ہے آئی ہماری ٹیکہ براد ہونے لگی ہے۔“ سارہ سانس لیے بغیر شروع ہو گئی تھی۔

سین نے اس سے اخبار میں کراپے دار کے لیے اشتہار دینے کی بات کی تھی لیکن اس نے روک دیا اور پھر آفس سے واپسی پر اس کے ساتھ ہی گھر چلی آئی تھی۔ سین کے بجائے اس نے اس کی محی سے تفصیلاً بات کی تھی۔ بہر حال انہیں سارہ کی تجویز پسند آئی تھی اور انہوں نے اسے ادا کر دیا تھا۔ سین بھی ماں کے فیصلے پر خاموش ہو گئی تھی۔

☆☆☆

طیبہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی اور بے تحاشا دروازہ بند کر کے چٹنی چڑھا دی۔ ”کیا بات ہے فاطمہ یہ چہرے پہ ہوائیاں کیوں اڑی ہیں؟“

”امی وہ..... وہ جو لفنگا چوک پہ روزانہ کھڑا ہوتا تھا ناں۔“ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اس سے بات کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ چل کر نہیں بلکہ بھاگتی دوڑتی گھر تک پہنچی ہے۔

”ہاں..... ہاں..... کیا ہوا اس نے کوئی بد تمیزی تو نہیں کی؟“ طیبہ کا دل دہل گیا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ سینے پہ رکھا۔ بچی کی اڑی ہوئی رنگت اور ایسی پریشان صورت تو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

”نہیں بد تمیزی تو کوئی نہیں کی، پر آپ تو جانتی ہیں وہ کس انداز سے دیکھتا ہے۔ بڑی ڈھٹائی ہوئی ہے اس کے چہرے پہ اور آنکھوں کی بے باکی سے تو بے حد خوف آتا ہے۔ آج جب گلی میں مڑی تو وہ بھی پیچھے پیچھے آگیا۔ میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ شکر ہے پڑوس کے بچے گلی میں کھیل رہے تھے۔ شاید انہی کی وجہ سے آگے نہیں بڑھا۔“ کیا اچانک افتاد بھی کہ اس دن کے

پڑھے ہیں؟“ نکلیں اس کے چہرے پہ
گاڑے سوال کیا گیا تھا اور اس بل اسے اپنا آپ ایک
ایسے مشتبہ فرد سا محسوس ہوا تھا جس کو سامنے بٹھا کر
پولیس انکوائری کرتی ہے۔

”پڑھ چکا۔“ ماتھے پہ بل ڈالے ان چھٹی
نگاہوں سے وہ کچھ نروس ہوا پر خود پہ قابو پاتے نظر میں
جھکے مختصر بولا۔

”کتنا پڑھا ہے؟“ اس بار اس نے منہ اٹھا کر دیکھا۔
”یہ سب سوالات کرایہ نامہ میں لکھے ہیں آپ
نے؟“ آنکھوں میں حیرت لیے اس نے پوچھا۔

”ہاں..... نہیں.....“ سین کچھ گڑبڑائی۔ ”میرا
مطلب ہے اس شہر میں آمد کا مقصد؟“ پھر اپنے گلابی
ہونٹوں پہ زبان پھیرتے اس نے بڑے اعتماد سے
کہا۔ عدن نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”کاروبار کے سلسلے میں۔“ ٹھنکھارتے ہوئے اس
نے اپنا گلا صاف کیا اور نہایت اعتماد سے بولا۔ ”ویسے میں
نے ایم بی اے کیا ہے۔“ اس نے مزید تفصیل بتائی۔

”یہاں اس شہر میں کوئی واقفیت۔ میرا مطلب
کوئی گارنٹی دینے والا ہو؟“ حالانکہ اس سوال کے
پوچھنے کی کوئی تک نہیں تھی۔ سارہ نے ہی تو منع کیا تھا

اخبار میں اشتہار دینے سے اور بتایا تھا کہ اس کے بھائی
کا کوئی ملنے والا اس شہر کے کسی اچھے علاقے میں
کرایے پہ جگہ دیکھ رہا ہے تو بجائے کسی اجنبی کو رکھنے

کے اسی کو رکھ لو پر تین کے اندر صرف ایک وٹامن کی
شدید کمی تھی..... ”وٹامن بھر دسا۔“ گارنٹی تو سارہ کی
طرف سے موجود تھی پھر بھی محترمہ اس کی زبانی تصدیق

چاہتی تھیں۔ کیا پتا کوئی تضاد نکل آئے۔
”آپ کی کوئی سارہ کے بھائی جانتے ہیں
مجھے۔“ دو چھٹا سب بولا۔ سین ابھی کچھ مزید انکوائری کے

موڈ میں تھی پر ساتھ ہی اپنی می کے ہاتھ کا دباؤ اپنے
ہاتھ پر محسوس کرتے اس نے ایک نظر ان پہ ڈالی جن کی
آنکھوں میں التجا تھی کہ بس اب اور نہیں۔ آخر کو اتنا

موزوں کرایے دار ترقی جلدی انہیں کس طرح حل سکتا تھا

جو منہ مانگا کرایہ دینے پہ بخوشی راضی ہو گیا تھا۔
”سکیورٹی دے سکو گے؟“ اس نے پلٹ کر پوچھا۔
”جتنی آپ چاہیں۔“ بے فکری سے کندھے اچکا تے
دیے گئے جواب پہ سین کو آگ ہی لگ گئی تھی۔ (ایسا کوئی

رہس ہے تو اپنا مکمل ٹیکس نہیں خرید لیتا۔ ہونہ)
”بھئی، پانی کا بل آدھا دینا ہوگا۔“ وہ دو ٹوک
لہجے میں بولی۔

”آدھا کیوں؟“ عدن کی حیرانی عروج پہ تھی۔
”میٹر الگ نہیں اس لیے پہلے بتا رہی ہوں۔
بعد میں کوئی بحث یا لڑائی نہیں ہونی چاہیے۔“ اس نے

ہاتھ اٹھائے بحث ختم کی۔ عدن بس پچھلا لب سمیٹنے
خاموش ہو گیا۔ چند لمبے سکوت کے گزرے جسے اس کی
ماں کی نرم آواز نے توڑا تھا۔ اپنی طرف سے تناؤ کو کم

کرتے اپنے نئے کرایے دار کو ویٹم کم کرنے کی چھوٹی سی
کوشش کرتے انہوں نے خوشدلی سے کہا۔
”بیٹا صبح کا ناشتا آپ ہمارے ساتھ کرنا۔“

سین نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا جو اسے قصد آنظر
انداز کر رہی تھیں۔
”شکریہ آئی۔“ عدن پہلی بار مسکرایا تھا۔

”کیم میں ایک ہفتہ باقی ہے مگر آپ چاہیں تو کل
پرسوں بھی شفٹ ہو سکتے ہیں۔“ انکھرے لہجے میں کہتے
اس نے گفتگو کا اختتام کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ می کی

دریادہ اسے ہسٹنگی پڑنے لگے اس سین کو ہمیں ڈراپ
ہو جانا چاہیے تھا۔
”شکریہ میں پرسوں تک اپنا سامان لے آؤں گا۔“

عدن بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ حالی اس کی سمت
اچھالتے وہ تن تنہا کرتی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ عدن
بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے احساس ہوا ہاتھ سین کے متعلق

اس نے جتنا سنا تھا کم تھا اور یہ کرایے داری یقیناً اسے بہت
مہنگی پڑنے والی تھی۔
☆☆☆

کھانے کی میز پر گھر کے سب لوگ موجود تھے۔
سربراہی کرسی پہ اقرار الحسن براجمان تھے۔ فائز کے سوا

قال نہیں ہوئے تھے۔

☆☆☆

وہ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں تو عدن اپنا بیگ پیک کر رہا تھا۔ بیڈ پر اس کے کپڑے، کتائیں، لیپ ٹاپ اور ضروری سامان بکھرا ہوا تھا جنہیں وہ ترتیب سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتا جا رہا تھا۔ سفید پولو شرٹ اور سیاہ ٹراڈز میں اپنے بے ترتیب سے بالوں کے ساتھ وہ اس وقت خاصا مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

”ہوگئی تمہاری پیکنگ؟“ ان کا موڈ خاصا آف تھا پھر بھی وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔

”بس وہی کر رہا ہوں۔ صبح دس گیارہ بجے تک نکلوں گا۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر مصروف سے لہجے میں ان کے پوچھے بغیر ہی اپنا پلان بھی بتا دیا تھا۔

”یہ چیزیں رکھ لوں پھر کچھ دیر دادا جان کے ساتھ بیٹھوں گا۔“ اس بار مسکراتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔ وہ اس کے بیڈ کے کونے پر بیٹھ گئیں ساتھ ساتھ اس کے کپڑے تیر کر کے اس کے سوٹ کیس میں رکھنے لگیں۔

”کبھی، کبھی میں سوچتی ہوں عدن، کاش تمہاری زندگی میں میرا بھی وہی مقام ہوتا جو اپنے دادا کا ہے۔“ ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔ عدن جو اپنی بک شیلف سے چند کتائیں نکال رہا تھا چونک کر رک گیا۔

”آپ تو آپ ہیں مام، آپ کا بھلا کسی دوسرے تعلق سے کیا موازنہ؟“ وہ ان کے پاس چلا آیا۔ ان کا ہاتھ تھامے بڑے پیار سے بولا تھا پر انہوں نے اس کی تردید کرتے نفی میں سر ہلایا۔

”ان کی خاطر اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ آئے حالانکہ میں نے منع بھی کیا تھا۔ کتنے شوق سے تمہیں تمہارے پاپا نے لندن بھجوا یا تھا لیکن دادا کے لیے تم نے اپنے مستقبل کا بھی نہیں سوچا۔“ اس نے ہولے سے سر جھٹکا۔ باپ کی اچانک موت کا غم ہی کیا کم تھا کہ جان سے پیارے دادا کو دل کے عارضے نے آگھیرا۔ وہ جانتا تھا تنہا ماں کس طرح ان کی دیکھ بھال کر سکے گی۔ وہ چار سال سے وہاں تھا۔ گریجویشن کے بعد

سب ہی اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ ان کی کرسی کے برابر اس آج بھی اس کی کرسی خالی تھی۔

”فائز کی کوئی کال آئی؟“ اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے انہوں نے بارعب لہجے میں سوال کیا۔ رملہ نے کن انکھیں سے باپ اور بھائی کی طرف دیکھا۔

”آخری بار آپ سے ہی بات ہوئی تھی اس کی بابا سائیں۔“ صبح کا نوالہ توڑتا ہاتھ رک گیا تھا۔ بڑے متوازن لہجے میں جواب دے کر وہ اب ان کی اگلی بات کا منتظر تھا۔

”جب سے یہ لڑکا واپس شہر گیا ہے پلٹ کر حویلی نہیں آیا۔“ سالن کا ڈونگا میز پر واپس رکھتے وہ خاصی سنجیدگی سے بولے۔ صبح کو بھی اندر ہی اندر یہ تشویش لاحق تھی کہ تین، چار ماہ سے زیادہ ہو چکے ہیں مگر فائز نے حویلی کا چکر نہیں لگایا لیکن وہ بابا سائیں کی طرح اس کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔

”پہلا سال ہے اس کا یونیورسٹی میں بابا سائیں، آپ تو جانتے ہیں کتنا اسٹریس رہتا ہے۔“ اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”اب ایسا بھی کیا پڑھائی کو سر پر سوار کرنا کہ انسان چیخے ٹھہراؤں کو بھول جائے۔“ پاس بیٹھی شامکہ نے فوراً لقمہ دیا تھا۔ سب ہی نے اس کی طرف گردن کھما کر دیکھا تھا۔

”تم کہہ سکتی ہو..... یونیورسٹی تو دور کی بات تمہیں تو کالج کا راستہ بھی نہیں معلوم۔“ صبح کا لہجہ ختم تھے۔

”صبح“ اقرار انہوں نے ٹوکا۔

”معذرت چاہتا ہوں بابا سائیں لیکن آپ تو فائز کی طبیعت سے واقف ہیں، وہ اسٹڈیز کے معاملے میں کتنا سنجیدہ ہے۔ دیے پچھلی بار میری بات ہوئی تھی اس سے تو کہہ رہا تھا جلد چکر لگائے گا۔“ اس نے فوری معذرت کرتے انہیں تسلی دلائی تھی۔

”یہ تو وہ مجھے پچھلے کئی ماہ سے کہہ رہا ہے۔ خیر کل صبح بات کروں گا اس سے۔ تم کھانا کھاؤ۔“ شاید وہ

پوسٹ کر لیجئے۔ یہی اپنی اپنی کر چکا تھا۔ یہی حالات ہی ایسے بنے وہ پاکستان لوٹ آیا۔ پاپا کے بعد کاروبار کی دیکھ بھال دادا جان ہی تو کرتے تھے لیکن اب سب کچھ اسے ہی دیکھنا تھا پھر اس نے مقامی یونیورسٹی سے ہی دو سال پہلے اپنا ماسٹرز مکمل کیا تھا اور اس دوران زمینوں کے مسائل اور کاروبار کو بھی پوری توجہ دی۔

”تو کیا میرے لیے اپنا یہ سفر ملتوی نہیں کر سکتے؟“ اس نے بے اختیار لب بچھ لیا۔

”میں جلدی واپس آ جاؤں گا مام، ویسے بھی کون سا پہلی بار جا رہا ہوں۔“ ان کا ہاتھ تھا اس نے وضاحت دی تھی۔

”ہاں پر اس بار جانے کیوں میرا دل گھبرا رہا ہے۔ جیسے کچھ الٹا ہونے والا ہو۔“ وہ اپنی بے چینی بیان کرنے سے قاصر تھیں۔

”کچھ نہیں ہوگا ان شاء اللہ۔ خواہ مخواہ مت سوچیں۔۔۔ بلکہ مجھے امید ہے آگے سب کچھ اچھا ہی ہوگا۔“ وہ اپنی ماں کی وہی طبیعت سے واقف تھا۔ جس بات میں ان کی مرضی نہیں ہوتی انہیں اس کے متعلق دہم اور خدشات ہونے لگتے۔ یہ ان کا عدل کو روکنے کا ایک بہانہ ہوتا تھا۔

”آپ پلیز میرا سوٹ کیس پیک کر دیں اور یہ کتا بیس بھی۔ میں ذرا دادا جان سے مل آؤں۔ وہ پھر سو جائیں گے۔“ انہیں پچکارنا وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ پیچھے وہ اس کا سامان سلیپے سے اس کے سوٹ کیس میں رکھنے لگی تھیں۔

☆☆☆

اس بھیکے دن کے آغاز میں سستی عروج پہنچی اور اس کا یونیورسٹی جانے کا سرے سے موڈ ہی نہ تھا لیکن جانا اہم تھا۔ بادلوں کی سیاہی دوپہر میں بھی رات کا نظارہ دے رہی تھی۔ پچھلی رات مسلسل بارش کے باوجود صبح سے پاول تنا کھڑا تھا اور ہلکی بوند باندی اب بھی جاری تھی۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکل کر ان سب کا رخ کینے ٹیریا کی طرف تھا جب سامنے کے منظر نے اس کے

خندوں کو جکڑ لیا تھا۔ کچھ ایسے کہ وہ چلتے، چلتے رک گیا تھا۔ بولتے، بولتے اپنی اگلی بات کہنا بھول گیا تھا۔ وہ چار دوستوں کا گروہ اس وقت اکٹھا کسی کسی اسائنمنٹ کے متعلق بات کر رہا تھا جو بھی کلاس میں نکلنے سے پہلے پروفیسر شجاع صدیقی نے انہیں کلاس ڈسکشن کے لیے دی تھی۔ price elasticity of demand

کے موضوع پہ اپنا نقطہ نظر بیان کرتے فائز کی زبان کو بریک لگا تھا۔ ایک ننگ اسے دیکھتے فائز کو احساس ہوا تھا کہ خوب صورتی کا اگر کوئی بیانا مقرر کیا جاسکتا تو شاید وہ یہی منظر ہوتا۔ آسانی رنگ کے کرتے پہ بڑا سفید دوپٹا اوڑھے، اپنا جرنل سینے پہ بندھے ہاتھوں میں تھا، بارش کی ہنسی بوندوں کو چہرے پہ سمیٹتی وہ بے تحاشا مسکرا رہی تھی۔ گنڈنڈی پہ پلٹی، اپنی تھیلی سے خوش گپیوں میں محو، ہلکی بوندوں میں پھنسی وہ اس کی نظروں سے۔۔۔ بے نیاز بس چند لمحوں میں منظر سے غائب ہو چکی تھی۔

فائز کو اس منظر نے عجیب طریقے سے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ نگاہیں ہٹانا بھول گیا تھا۔ اس کے دوست جو کچھ آگے بڑھ گئے تھے ان سب نے ایک ساتھ فائز کا رکنا اور خاموشی کو محسوس کرتے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ان کی نظروں سے الجھتا وہ ایک بار پھر ان کے ساتھ چل پڑا تھا لیکن اب یہ بھول چکا تھا کہ وہ کیا بات کر رہا تھا اور موضوع کیا تھا۔ اس کے دوستوں میں سے کسی نے بھی فائز کی نظروں کا رخ نہیں دیکھا تھا۔ اب ان سب نے اس کا رکنا اور خاموش ہونا ایک ساتھ محسوس کیا تھا۔ وہ بہترین مقرر تھا اور شاندار انداز میں سامنے والے کو قائل کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کلاسز کے آغاز میں ہی وہ اساتذہ اور طلبہ کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا کیونکہ اس کی جس مشاہدہ اور سیکھنے کی صلاحیت بہت تیز تھی لیکن اس وقت روانی سے کہتا کچھ لکھوں میں وہ اب خالی الذہن ان سب کے سامنے کھڑا انہیں حیران کر رہا تھا۔ ان سب نے ہی باری، باری اس سے خیریت دریافت کی تھی بہر حال جلد ہی وہ مسکراتا ان سب کی گفتگو میں ایک بار پھر شامل ہو چکا تھا مگر اس کا وہ بیان

اب بھی اسی لڑکی کی طرف تھا جسے اس نے پہلے فائز نے
بھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ ان کے ڈیپارٹمنٹ کی نہیں
تھی۔ ویسے بھی یہ یونیورسٹی کا آغاز تھا اور اس قلیل وقت
میں سب سے تعارف ممکن بھی کہاں تھا۔ چند لمحوں کی
بھٹکی نگاہ میں وہ کسی گمان کی طرح اس کی زندگی میں آئی
تھی اور وہ ہم بن کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆☆☆

دو دن بعد عدن اپنے مختصر سامان کے ساتھ وہاں
شفٹ ہو گیا تھا۔ وہ اس شہر میں ابھی نہیں تھا کیونکہ اس
نے اسی شہر کی مقامی یونیورسٹی سے اپنا ایم بی اے مکمل کیا
تھا۔ اتفاق سے سارہ کا بھائی اس کا یونیورسٹی فیلو تھا۔ اس
وقت وہ یونیورسٹی ہاسٹل میں رہتا تھا لیکن اب اسے مستقل
رہائش درکار تھی۔ بغیر کسی چون و چرا اس نے سین کو ایک
سوئیڈن ایڈوانس کے طور پر پکڑا دی تھی۔ ان دونوں ماں
بٹی سے اپنی حیرت چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

”تمی کیا پکایا ہے بڑے زوروں کی بھوک لگی
ہے۔“ دیکھ مشروں میں گنگنائی وہ گھر میں داخل ہوئی
اور اپنا ہینڈ بیگ صوفے پر پھینکتی خود بھی وہیں ڈھیر ہو گئی۔
سال کے آخری دنوں میں فنانشیل کلوزنگ کی وجہ سے
اس کا ورک لوڈ زیادہ تھا اسی لیے آج بھی وہ معمول
سے لیٹ ہو گئی تھی..... لیکن کل سے اپنا آپ بڑا ہلکا ہلکا
لگ رہا تھا جیسے ذہن سے کوئی وزنی بوجھ اتر گیا ہو اس
لیے موڈ خوشگوار تھا۔

”چکن کڑا ہی، تمہاری فیورٹ۔“ انہوں نے
مسکراتے ہوئے محبت سے کہا جسے سن کر سین کی بھوک
چمک اٹھی تھی۔

”واہ تو بس لے آئیں جلدی سے آج لُچ بھی
غیب نہیں ہوا اس اکاؤنٹس کلوزنگ کے چکر میں۔“
دونوں ہاتھ ملتی وہ کچن کی طرف بڑھی۔ اس وقت تو واقعی
بیٹ میں چوہے ڈسکو ڈانس کر رہے تھے۔ اپنے پسندیدہ
کھانے کا سن کر بے اختیار منہ میں پانی آ گیا تھا۔

”ہاتھ دھو لو پہلے جا کر اور سنو! عدن کو بھی
بالو۔“ کچن میں رکھی چھوٹی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی کھینچتے

اسے شاک لگا تھا۔ سائن نکال کر بالوں میں ڈالنے
انہوں نے اسے سنجیدہ نظروں سے دیکھا لیکن اس نے
کوئی اثر نہیں لیا تھا۔

”کس خوشی میں یہاں لنگر بانٹا جا رہا ہے؟ کہ
عدن کو بھی بالو۔“ چڑ کر کہتے اس نے آنکھیں
گھمائیں۔ پہلے ہی ان کی مہربانی سے صبح کا ناشتا گرما
گرم سرد ہو رہا تھا اس لات صاحب کو۔ لیکن اب اتنے
بھی کیا ٹھٹک کہ لُچ اور ڈرنج بھی نہیں سے پکا پکایا لے گا۔
اسے ماں کی یہ بے جا عنایات ہرگز پسند نہیں آئی تھیں۔
”حد کر لی ہو سین، بیچارہ اکیلا ہے۔ ابھی تو ٹھیک
سے ایڈجسٹ بھی نہیں ہوا، اب کیا پکائے گا اس وقت۔
کیا ہو گیا جو ایک نام ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالے
گا۔“ انہوں نے تعصلاً سمجھایا۔ سین کو ان کی طرف داری
ہرگز پسند نہیں آئی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کرایے دار کی
موجودگی میں اپنی پرائیویسی کھونے سے خوفزدہ تھی یہ اور
بات کہ حد درجہ مجبوری میں یہ فیصلہ کیا تھا اور ظاہر ہے
ایڈوانس اور کرایے کی رقم ہاتھ میں آتے ہی کچھ ریلیف
بھی محسوس ہوا تھا پر اس کے بدلے اس کی چوبیس گھنٹے
کی مداخلت اسے تو ہرگز منظور نہ تھی۔

”کیوں خواہ مخواہ کرایے دار کو سر پہ چڑھا رہی
ہیں آپ۔ ویسے بھی مجھے تو مشکوک سا لگتا ہے۔“ وہ
پراسرار انداز میں بولی۔ اپنے تئیں سیدھی سا دی گھریلو
سی ماں کو ڈرانا مقصد تھا مگر وہ بھی اپنی اولاد کے سب
حربوں سے بخوبی واقف تھیں۔ الٹا اسی کو سنا دیں۔
”تمہیں اس دنیا میں کون مشکوک نہیں لگتا؟“

”تم جارہی ہو یا بس بلا لاؤں۔“ سائن کا ڈونگا
اس کے سامنے بچ کر انہوں نے دو ٹوک وارننگ دی
تھی۔ سین لب بھینپے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”جارہی ہوں۔ ہر وقت بلیک میل کرتی رہتی
ہیں۔“ ہار ماننے والے انداز میں بڑبڑاتی وہ پیر پختی
سکرے سے نکل گئی تھی۔ پیچھے سے مسز حسین نے
دھیما سا مسکراتے سر بلایا۔ وہ جانتی تھیں ان کی بیٹی
کی ضد اور ہٹ دھرمی کو بس ان کی بلیک میلنگ ہی

توڑ سکتی ہے۔

”میں..... وہ پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ لگ رہا
مہینوں سے پیاسے ہیں۔“ کچھ گڑبڑا کر اس نے
وضاحت دی۔

”اس ملک میں تو انسان بھی پیاسے ہیں۔“ وہ
جل کر بولتی اسے لاجواب کر گئی تھی۔

”اور اس پانی کا بل بھی آتا ہے مسٹر اتا پانی
ضائع کرنا ہم انور ڈنہیں کر سکتے۔“ غصے سے کہتے اس
نے عس بند کیا اور پلٹ کر عدن کو کھا جانے والی نظروں
سے دیکھا۔ اب کرایے دار ہے تو اپنی حد میں رہے۔

”اتنی اچھی جگہ ہے یہ لیکن لان کا حال اتنا خراب۔
میرا ایک دوست ہے اگر آپ چاہیں تو میں اسے لان کی
صاف صفائی اور دکھ بھال کے لیے بلا سکتا ہوں۔“ عدن
نے اس کے روئے کو کیمرا انداز کرتے کہا۔

”آپ نے مایلوں سے دوستیاں رکھی ہوئی
ہیں؟“ سین نے پلٹ کر معمولات انداز میں پوچھا۔

”مالی نہیں اس کا لینڈ اسکیپنگ کا بزنس ہے۔
پروفیشنلی لان کو مینین کرتے ہیں۔“ اس نے بہ مشکل
خود کو سنجیدہ رکھتے تفصیل بتائی۔

”اوہ، ٹھیکس بٹ نو ٹھیکس۔ ہم اتنی شاہ خرچیاں
انور ڈنہیں کر سکتے۔“ ہاتھ نہاتے اس نے تیز لہجے میں کہا
اور قدم بڑے پھانک کی طرف بڑھا دیے۔

”وہ یہ سب فری کرے گا۔“ سین کے قدم عدن
کی آواز پر تھم گئے تھے۔

”ریسکی.....؟ کیا آپ کا دوست حاتم طائی کے
گھرانے سے ہے جو بغیر جان پہچان اس جنگل کو باغ
عدن بنا دے گا۔“ پلٹ کر دونوں بازو سینے پہ باندھے
اس نے ابرو اٹھا کر سوال کیا۔

”بنا یا تو ہے وہ میرا دوست ہے۔“ وہ خجالت سے

مسکرایا اور اس وقت اسے اپنا آپ دنیا کے احق ترین
انسان سا لگا تھا جو خواہ خواہ اس الٹی ٹھوڑی کی لڑکی سے
دماغ کھپا رہا ہے۔ پر وہ بھی کیا کرتا کہ جب اوکھلی میں
سر دے دیا تھا تو پھر یہ سب تو جھیلنا ہی تھا۔ سین نے سر
ہلاتے ایسا تاثر دیا جیسے کہہ رہی ہو (خوب سمجھ رہی

☆☆☆

نئی جگہ کی اجنبیت تھی یا پھر گھٹ جو اسے تمام
رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی پھر بھی وہ حسب معمول
جاگ گیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ کا صبح خیز تھا آج بھی اپنے
معمول پہ بستر سے اٹھ بیٹھا جبکہ دوسری طرف ابھی
خاموشی کا دور دورہ تھا۔ اسی وقت ماں کا فون بھی آ گیا
تھا جو ہمیشہ کی طرح اس کی وجہ سے بے حد گھر مند تھیں۔

اپنی سستی اور بے خوابی کی ادا زاری کم کرنے کے
لیے اس نے سوچا کیوں نہ جاگنگ ہی کر لی جائے۔

فیصلہ ہوتے ہی وہ اپنا ٹریک سوٹ پہنے باہر نکل آیا۔
علاقہ تو سارا اس کا دیکھا بھالا ہی تھا۔ موسم بھی خوشگوار تھا
کہ صبح میں خزاں کی ٹھنڈک کی آمیزش سکون دینے لگی
تھی۔ قریبی پارک کے تین چکر لگا کر وہ جب تک گھر
پہنچا تو چڑھ چکا تھا۔ ڈرائیو دے سے گزرتے اس نے
ایک نظر دائیں طرف لان کی خشک گھاس پہ ڈالی اور پھر
تاسف سے سر ہلاتا اپنے پورشن میں مگس گیا۔

دوسری جانب یقیناً سویرا ہو چکا تھا کیونکہ وقفے،
وقفے سے ان دونوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔
شاور لینے کے بعد تیار ہو کر وہ واپس لان کی طرف چلا
آیا۔ سامنے لگے تل کے ساتھ ایک بڑا کا پائپ لگا تھا جو
شاید فرش دھونے کے لیے رکھا گیا تھا۔ عدن نے تل کھول
کر پائپ سے لان کی زرد گھاس کو پانی دینا شروع کر
دیا۔ ساتھ ہی ساتھ زرب لب وہ لپکا سا گھٹنا بھی رہا تھا۔

کندھے پہ اپنا شولڈر بیگ سیٹ کرتی سین نے
صدر دروازے سے نکلنے پر نظر دیکھا تو اسے حیرت کا
شدید جھٹکا لگا تھا۔ عدن جو اپنی ہی دھن میں لان میں
پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا اس کی آمد سے بے خبر اب بھی
گھٹناتار ہا تھا۔ سین کا مضبوط جواب دے گیا تھا۔

”ارے اوکا لا پانی کی سری دیوی یہ کیا لہک لہک
کے سیلاب لے آئے ہو یہاں۔“ وہ تن کرنی وہاں
پہنچی تھی اور جاتے ساتھ ایک دم حملہ کیا تھا کہ بیچارے
عدن کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔

سوچنے کی باتیں

☆ بعض اوقات دعائیں رب کے فیصلے نہیں بدلتیں مگر آپ کا دل بدل دیتی ہیں اور رب کے فیصلے کے مطابق کر دیتی ہیں۔

☆ اچھے وقت کی ایک خامی ہے کہ جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ برے وقت کی ایک خوبی ہے کہ ہمیشہ نہیں رہتا۔

☆ کامیاب زندگی گزارنا چاہتے ہو تو ہمیشہ یاد رکھو پاؤں بے شک پھسل جائے لیکن زبان کو نہ پھسلے دو۔

☆ آج کل ہے حساب نہیں بکل حساب ہو گا عمل نہیں۔

☆ جھوٹ بول کر حیت جانے سے بہتر ہے۔ سچ بول کر ہار جاؤ۔

☆ خوب صورتی ظاہر نہیں باطن میں ہوتی ہے جو بصیرت رکھنے والی آنکھ ہی دیکھ پاتی ہے۔

☆ از نادیدہ، راول پنڈی

آپ ریڈی ہیں تو چلیں میں جانے سے پہلے آپ کو گروہی کردادوں۔“ ہاتھ جنز کی جیبوں میں ڈالے وہ خوشگوار لہجے میں کہتا سین کو نظر انداز کر کے اب ان کی طرف متوجہ تھا۔

”میں تو کہہ رہی تھی پہلے ناشتا کرو۔ اچھا چلو میں بس اپنا بیگ لے کر آتی ہوں۔“ وہ جانے کے لیے چلیں لیکن یہ سین کی برداشت کی حد تھی۔ اسے تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ سب ہو کیا رہا ہے۔

”آپ اس کے ساتھ جائیں گی؟“ وہ ناقابل یقین حیرت سے بولی۔

”ہاں تو.....؟“

”پیدل پیر گھشتی بھی تو جاؤں گی۔ تھینکس ٹو

عدن، بیچارہ اپنا راستہ کھوٹا کر کے نیچے ساتھ لے جا رہا

ہے۔“ سنجیدگی سے کہیں وہ سر جھکتی اندر چلی گئیں۔

سین نے گردن گھما کر ایک نظر بائیں کھڑے عدن کو

دیکھا جو فاتح مسکراہٹ سے اسی کو دیکھ رہا تھا اور پھر جیر

راکھ ہی تو ہو گیا تھا۔

”شکر یہ آئی لیکن ابھی مجھے بالکل بھوک نہیں۔

عدن کا خیال تھا کہ شاید وہ اب خاموشی سے فحش کے لیے نکل جائے گی پر شوکی قسمت ابھی استحصال و رہی تھی اسی لیے تو نکل رات سے لے کر اب تک سین کی زیرک نگاہ اتنی بڑی چیز کا انور کر گئی تھی۔

”یہ گاڑی کس کی ہے؟“ ڈرائیو وے پہ کھڑی

رائیو جہازی سائز گاڑی پہ سین کی نگاہ اتفاق سے

آپ پڑی تھی۔ رات کو شاید اندھیرے کی وجہ سے یا پھر

تھکاوٹ اور بھوک کا غلبہ تھا جو وہ پاس سے گزر کر بھی

اسے نظر انداز کر گئی اور اب سارا دھیان اس پر تھا۔

”میری گاڑی ہے۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو

آفس تک لفٹ دے سکتا ہوں۔“ خوش اسلوبی سے آخر

کرتے وہ دھیما سا مسکرایا۔

”اتنی بڑی گاڑی ہے تو اسی میں رہ لیتے۔“ سین

کو واقعی یقین نہیں آ رہا تھا۔

”سوری۔“ عدن کو اس کی سرگوشی سنا نہیں دی تھی۔

”شکر یہ..... میں بس کے سفر کی عادی ہوں اور

اسی میں زیادہ کمفرٹئبل محسوس کرتی ہوں۔“ خود پہ قابو

پاتے وہ سنجیدگی سے بولی۔ عدن نے بے پروائی سے

کندھے اچکائے۔ سین کو اب وہ پہلے سے بھی زیادہ

منطوق لگ رہا تھا۔ آخر کو اتنا ریس زیادہ ان کے ٹوٹے

پھوٹے دو کمرے کرایہ پہ لے کر کیوں رہ رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے اندر کا غبار باہر نکالتی خوش قسمتی

سے می کی آمد ہو گئی تھی۔

”کیوں بحث کر رہی ہو صبح صبح۔ روز تو دیر ہو رہی

کا شور مچایا ہوتا ہے آج دیر نہیں ہو رہی تمہیں۔“ ان کی

بروقت ایٹری پہ عدن نے سکون کی سانس لی جبکہ سین

نے گڑبڑا کر ہاتھ پر بندھی گھڑی کو دیکھا اور پھر چور

نظروں سے پاس کھڑے عدن کو، جو اب بھی اسی

اطمینان کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”آئیں بیٹا آپ بھی ناشتا کر لیں۔“ وہ اب

عدن کی طرف متوجہ تھیں۔ اس محبت پر سین کا دل جل کر

راکھ ہی تو ہو گیا تھا۔

”شکر یہ آئی لیکن ابھی مجھے بالکل بھوک نہیں۔

اس سرسری تصادم کو فائز نے جلد ہی فراموش کر دیا تھا پر فقط اگلی ملاقات تک جو ان دونوں کی یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ہوئی تھی جہاں وہ سالانہ مباحثوں کے شرکا میں سے ایک تھی جبکہ فائز دوستوں کے اصرار پر ان کے ساتھ ہال میں بیٹھے سامعین میں شامل تھا۔ ”آزادی رائے اور راداداری“ کے موضوع پہ تقریر کرتی ”فاطمہ رضوی“ کا دوسرا تاثر ”فائز حسین“ کے لیے پہلے سے زیادہ متاثر کن تھا۔ بالوں کو کچھ میں سینے، سرخ ڈھیلے سے کرتے پر سفید دوپٹا اوڑھے اپنے سادہ سے حلیے میں بھی اس کی شخصیت غیر معمولی تھی۔ اس کا لب و لہجہ، اس کی موضوع پہ گرفت، اس کا.... بے تحاشا اعتماد سامنے بیٹھے ہر شخص کو بے انتہا متاثر کر رہا تھا جو اس کی تقریر کے اختتام پر بجتی تالیوں کے شور نے ثابت کیا تھا۔ اس بار فائز نے اسے دور سے بیٹھے دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اپنے دوستوں کے ساتھ اس شام کی بہترین مقررہ کی نرائی جیتنے پہ اسے مبارکباد بھی دی تھی جسے اس نے نہایت وقار کے ساتھ قبول کیا تھا۔

اس سے تیسری ملاقات تک فائز اس کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس ملاقات کے اختتام تک ان کے درمیان رسمی گفتگو سے جٹ کر غیر رسمی باتوں کا آغاز بھی فائز کی ہی کوشش سے ہوا تھا ورنہ فاطمہ بہت زیادہ لیے دیے رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ زیادہ سوشل نہیں تھی اور اس کا دوستوں کا سرکل بھی محدود رہتا تھا۔ ان کا ڈیپارٹمنٹ مختلف تھا، فائز انکس کس کا تھا، فاطمہ انگلش لٹریچر سے تعلق رکھتی تھی۔ فائز کی طرح اس کا تعلق کسی ایلٹ کلاس سے نہیں تھا پھر بھی ان دونوں کی دوستی ان کی متفقہ سوچ کا نتیجہ تھی۔ ان کے خیالات اور زندگی سے متعلق نقطہ نظر میں خاصی ہم آہنگی پائی جاتی تھی جو ان دونوں کو بڑے کم وقت میں ایک دوسرے کے قریب لائی تھی۔ شروع میں فاطمہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے فائز کے دہم دگمان

میں بھی نہیں تھا کہ کچھ عرصہ بعد ان کا تعلق محبت کا درج اختیار کر جائے گا۔ اپنے پاؤں میں بندھی رملہ سے منگنی کی زنجیر فائز کو پہلے روز سے جھپٹی تھی پر بابا سائیں کی خوشی کی خاطر وہ چپ چاپ اس رشتے کو نبھانے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن اس کا خود سے کیا عہد دل میں آئے محبت کے طوفان میں کانڈ کی کشتی ثابت ہوا تھا جو پہلی ہی موج کی تاب نہ لا کر ڈوب گئی تھی۔ فاطمہ، فائز کو پسند کرنے کے باوجود اس تعلق کو محبت کا نام دینے کو تیار نہ تھی کیونکہ وہ اپنے اور فائز کے درمیان جائل اسٹینس کی وسیع خلیج سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی دل کے رشتے معاشرے میں گھڑی دولت کی تفصیل کو پار نہیں کر پاتے لیکن فائز کی یقین دہانی اور روز بروز بڑھتی چاہت اس کے فیصلے میں دراڑ لے آئی تھی۔

”وقت بہت بدل چکا ہے فاطمہ، تمہیں کیا لگتا ہے اس انفارمیشن کے زمانے میں سوسائٹی کے پیر آج بھی دولت نے جکڑے ہیں۔“ اسے قائل کرتے فائز حسین، رملہ سے قائم تعلق میں بندھی اپنی ذات کو قصداً فراموش کر چکا تھا۔

”سوسائٹی کو دولت نے جکڑا ہے، یہ میں نہیں جانتی فائز پر محبت کی بد قسمتی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تاریخ گواہ ہے یہ معاشرہ محبت کرنے والوں کو ایک ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔“ اس دنیا کو پرکھنے کا تجربہ ان دونوں کے پاس کتابی حد تک تھا۔ عملی زندگی سے ان دونوں کا ہی دور، دور تک واسطہ نہ تھا۔ دو الگ دنیاؤں کے لوگ ہونے کے باوجود ان کے اصول ایک سے تھے پروہ نہیں جانتے تھے دنیا کا سبق کتابوں میں نہیں ہوتا۔ یہ عمل کی کسوٹی پہ عقل سے پرکھے جانے کا کھیل ہے جو بنا زخم کھائے نہیں ملا کرتا۔

”یہ ہماری زندگی ہے، تمہارا لٹریچر نہیں کہ مجھے رومیو جولیٹ کی مثال دے کر قائل کر لوگی۔ میں اگر راہ محبت میں اس مقام تک پہنچا ہوں تو پھر اس رشتے کو تکمیل تک بھی پہنچاؤں گا۔ یہ فائز حسین کا وعدہ ہے تم سے۔“ اور یہ وعدہ کرتے فائز حسین نے اپنے دل

میں ایک اور عہد کیا تھا۔ رملہ سے شادی نہ کرنے کا عہد۔ وہ بابا سائیں کے احسانات اتارنے کی خاطر اپنی محبت کا خون نہیں کرے گا۔ (تو کیا اپنے حسن کے اعتبار کا خون کر پاؤ گے؟) ضمیر کے پکڑوں کو نظر انداز کرتے اس نے فاطمہ کو یقین دہانی کرائی تھی۔ یقین و بے یقینی کی ٹلی جلی کیفیت میں ابھی فاطمہ کے دل نے فائز کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا۔

☆☆☆

”مجھے سو فیصد یقین ہے معاملہ کچھ اور ہے۔“ گھر سے بس اسباب، بس سے دفتر تک اندر ہول اٹھ رہے تھے لہذا آفس پہنچ کر سب سے پہلے اس نے اپنی داستان سارہ کے گوش گزار کی تھی۔ اپنا کمپیوٹر آن کرتے سارہ نے نہایت خاموشی سے تمام قصہ سنا تھا۔ ”اچھا تو تمہارے خیال میں کیا معاملہ ہو سکتا ہے۔“ ”را“ کا ایجنٹ ہے جو تحریب کاری کرنے تمہارے گھر پناہ لینے آ گیا ہے؟“ سین کی تشویش پہ سارہ کا رد عمل بے حد پر سکون تھا۔ یعنی جوابات اس کے لیے پیاڑھی سارہ کے لیے وہ رائی کا دانہ نکلی تھی۔ دل تو چاہا اس کا سر پھاڑ دے۔ ایک تو اسے اس چوہن میں پھنسانے والی بھی یہی محترمہ تھی اس پہ کیا ”کول ایکسپریشن“ تھے جبکہ خود سین کی جان پہ بٹی تھی۔

”آئی ایم سیریس۔“ خود پہ ضبط کرتے اس نے سنجیدگی سے کہا۔ دوسری طرف بھی سارہ تھی۔ ”آئی ایم ڈیم سیریس سین۔“ حد کرتی ہو تم بھی۔ فرقان بھائی کا دوست ہے۔ دو سال یونیورسٹی میں پڑھا ہے ان کے ساتھ۔ بتایا ہے انہوں نے کہ اچھے وبل آف لوگ ہیں۔ زمینیں وغیرہ ہیں۔ اس شہر میں اپنا آفس سیٹ کرنا چاہتا ہے تو چلا آیا شہر۔“ سارہ نے رلی روائی بات ایک بار پھر ہرا دی تھی۔

”یار اسے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“ سین کی اپنی ہی نزالی منطق تھی۔ ”ضرورت تو تمہیں بھی نہیں۔“ سارہ نے ابرو اٹھا کر جتایا۔ وہ اپنی کرسی پہ باقاعدہ جمول رہی تھی۔

رئیل اسٹیٹ ایڈوائزر

DHA. KARACHI
DHA. City Karachi
BAHRIA TOWN KARACHI

میں خرید و فروخت کے لیے مستند نام

ریاض حسین

ایڈریس: راحت کمرشل لین 2

DHA PHASE 6 KARACHI

فون نمبر: 0300-3658964

میں کیا ہے۔ ٹال..... ڈارک..... ہینڈسم؟“ سارہ اچانک یاؤ آنے پر بولی۔

”انتہا فضول کیسے بول لیتی ہو تم سارہ۔“ سین اٹھ کھڑی ہوئی۔ جانتی تھی مطلب کی بات کرنے کا اس بندی کا موڈ نہیں ہے۔ اسی لیے یہ فضول سوچ رہی ہے۔ ”میری جان اسٹیمنا..... اور کیا.....“ سارہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ سین ایک ٹک اسے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”اوہ بابائیں ہے وہ جاسوس، پچارہ شریف انسان ہے۔ ایک گاڑی کیا دیکھ لی اس کی تمہیں ہارٹ ایکٹ ہو گیا۔“ سارہ نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔ سین مٹھیاں بچھنے مارچ پاسٹ کرتی اپنی میز کی طرف چلی گئی۔ کام میں مصروف ہو جانے کے باوجود دھیان بار، بار عدن کی طرف جارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کی چھٹی حس اسے مطلع کر رہی تھی کہ جو دکھ رہا ہے ویسا کچھ ہے نہیں اور ایک حساب سے شاید ٹھیک ہی پیغام دے رہی تھی۔

☆☆☆

نوبے تک گھر کے سب لوگ اپنے، اپنے کمروں میں سونے چلے جاتے تھے۔ دس بجے تک تو نوکر چاکر بھی سوچکے ہوتے تھے۔ بتا آواز کے وہ اپنے کمرے سے نکل کر ہال میں داخل ہوئی۔ گھب اندھیرے میں بس دیوڑھی میں روشن بلب کی روشنی کھڑکیوں کے پردوں سے چھن، چھن کر آرہی تھی۔ کوئی آہٹ کیے بغیر وہ ٹیلی فون اسٹینڈ کی طرف بڑھی اور اس بدھم روشنی میں جلدی، جلدی وہ نہر ملانے لگی جو اسے زبانی یاد تھا۔ فون چند ہیوں کے بعد بڑی بیزار سی ریسو کیا گیا تھا۔ ”کیوں فون کیا ہے؟“ اس کی آواز پہ وہ بے تحاشا بھڑک گیا تھا۔

”یہ کیا انداز ہیں بات کرنے کے۔ کیا میں اب آپ کو فون بھی نہیں کر سکتی؟“ وہ بے تحاشا حیرت اور پریشانی سے بولی تھی۔ اسے فائز سے اس قدر اجنبیت کی امید نہیں تھی۔

بابا سائیں جاتے ہیں تم اس وقت مجھ سے بات کر رہی ہو؟“ پاس رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھتے اس نے سوال کیا تھا۔

”تو کیا انہیں سامنے بٹھا کر بات کروں۔ حد کرتے ہیں آپ بھی، ایسے جتا رہے ہیں جیسے پہلی بار آپ کو فون کیا ہے۔“ فائز نے بے اختیار لب بچھنے۔ وہ تو اس سے پہلے بھی دن کے اجالے میں بھی سب گھر والوں کے علم میں ہی اس سے بات کرتی تھی۔ اس چھپن چھپائی کے کھیل میں کہیں فائز کو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ رملہ سے شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔

”پہلے کی بات اور تھی رملہ، میں نہیں چاہتا گھر والے میرے متعلق شبہات کا شکار ہوں۔“ وہ اس کے بچکانہ رویے اور کم عقلی سے واقف تھا حتی المقدور اپنے کچھ کو قابو میں رکھتے اس نے اسے طریقے سے سمجھایا تھا۔ ”شبہ کیا، آخر ہمارے درمیان رشتہ قائم ہو چکا ہے۔“ یہی تو رونا تھا وہ کہاں یہ رشتہ چاہتا تھا اور کون سا اسے قائم رکھنے کا خواہاں تھا۔ یہی کوشش تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے اقرار الحسن کو دل کی بات بتا دے۔

”اسی لیے میں اب محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ تم بھی احتیاط کرنا اور آئندہ مجھے کال مت کرنا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اور اگر کوئی ضروری کام ہو تو؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”تو بابا سائیں یا سب لالہ کو پیغام دے دینا۔“ رملہ کا جواب سنے بغیر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔ رملہ کا داغ چٹختے لگا تھا۔ تو ٹائم لگ بھائی جو اسے فائز سے متعلق باتیں بتا رہی ہیں وہ سب سچائی پر مبنی ہیں۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس نے فائز کے چند ماہ پہلے اور اب کے انداز گفتگو کا موازنہ کرتے ٹائم لگ بھائی کی باتوں سے نتیجہ اخذ کیا تھا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا تھا۔

☆☆☆

اس نے گھر میں قدم رکھا تو سامنے کا منظر دیکھ کر

منتخب ٹوٹکے

برتنوں کو محفوظ رکھنے کے لیے: نان اسٹک برتنوں کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے تھوڑا سا سلاڈ کا تیل لے کر نان اسٹک۔۔ برتنوں پر ملیں۔ اس سے ان کی پالش محفوظ رہے گی۔

جوتوں کی پالش کے لیے: کیلے کا چھلکا چروے کے جوتوں پر ملیں۔ اس عمل سے جوتوں کی پالش دیر تک محفوظ رہے گی۔

بلیک ہیڈز ختم کرنے کے لیے: چہرے پر بلیک ہیڈز ہو گئے ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ٹماٹر کاٹ کر فریج میں رکھ دیں۔ جب خوب بچ ہو جائیں تو انہیں چہرے پر ملیں۔ جو بلیک ہیڈز ہیں وہ نکل جائیں گے اور چہرہ صاف و شفاف ہو جائے گا۔

مرسلہ: حمیرا اقبال، کوٹری

”تمہارا کرا دو پہر میں ہو گیا تھا لیکن وہاں کی صفائی کا وقت نہیں ملا تو تم میرے کمرے میں سو جانا۔“ انہوں نے اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر اسے تفصیل سنائی تھی۔ وہ خود بھی دوسرے برش سے دیوار کے نچلے بجے ہوئے حصے پر روغن کر رہی تھیں۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہیں آیا آخر یہ بیٹھے بٹھائے انہیں پینٹ کی کیا سوچھی۔ وہ بھی اس سے مشورہ کئے بغیر۔

”اور یقیناً آپ نے آج کھانا بھی نہیں پکایا ہوگا۔“ دھیمے لہجے میں اس نے شکوہ کیا تھا۔

”کہاں سے پکا کھانا، صبح تمہارے جانے کے بعد سے تو ہم دونوں اس سب میں پھنسے ہیں۔ دیسے میں تو کہہ رہی تھی ایک مزدور کو بلا لیتے ہیں لیکن یہ عدن کہنے لگا چھوڑیں ہم خود ہی کر لیں گے۔ بس اسی نے میرے ساتھ جا کر سارا پینٹ کا سامان خریدا۔“ تو یہ سب اس فتنے کی منصوبہ بندی ہے۔ چار دن ہوئے اسے ان کے گھر کرایے دار کی حیثیت سے رہنے آئے ہوئے اور اس گھر کے فیصلے کرنے لگا۔ دل تو چاہ رہا تھا

اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ ایک بل کو تو لگا شاید کی اور گھر میں داخل ہو گئی تھی پر ماں کی موجودگی سے ثابت تھا کہ گھر تو اپنا ہی ہے پھر ایسی حالت بھلا کیسے ہو گئی۔ جب صبح چھوڑ کر گئی تھی تو ہر شے اپنی جگہ پر موجود تھی۔ زمین آسمان کے بیچ اسی مقام پہ پالی جاتی تھی اور اب یہ حال تھا کہ مختصر سا سامان اٹھا کر لاؤنج کے کونے میں جمع کیا ہوا تھا جسے چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لاؤنج کے کونے میں ایک چار ٹانگوں والی میز بھی پڑی تھی جس پہ عدن لڑکا ہاتھ میں پینٹ برش تھا دے دیوار پہ کوچیاں لگا رہا تھا جبکہ میسر پہ کپڑا لپیٹے، پینٹ کی باٹلی سے پینٹ بھر کر اس کے ڈبے میں ڈالنے کے بعد میز کی گھبراہٹ سے اس کی مدد کر رہی تھیں۔ اس نے باقاعدہ پوری آنکھیں کھول کر کمرے کا جائزہ لیا تھا جس کی تقریباً تین دیواروں پر روغن ہو چکا تھا۔ آخری دیوار پر عدن اپنی مہارت لٹاتا آڑھے ترچے اسٹرک لگا رہا تھا۔ اس کی دہاں موجودگی سے بے خبر وہ دونوں اپنے کام میں مگن تھے۔

”اب یہ کیا ہو رہا ہے؟“ سین کی آواز پہ ان دونوں نے گردن گھما کر سرسری سے انداز میں دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

”اللہ نے اتنی بڑی اور حسین آنکھیں دی ہیں۔ دکھائی نہیں دے رہا پینٹ ہو رہا ہے۔“ ممی نے البتہ اس کی طرف دیکھے بغیر نگڑا توڑ جواب دیا تھا۔

”وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے کہ یہ پینٹ ہو رہا ہے مگر کس خوشی میں اور کس کی اجازت سے؟“ وہ حیران سی ان کی شکل دیکھنے لگی۔

”میرا خیال ہے مجھے تم سے پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب تک شاید میں تمہاری ماں ہوں۔“ جتاتے سے انداز میں فطرت کرتے انہوں نے سنجیدگی سے سین کی طرف دیکھا تھا۔ سیاہ چمک والی شارٹ شرٹ کے ساتھ اپنی پسندیدہ جینز اور گلے میں منظر کے اشکال میں دوپٹا لپیٹے وہ خاموش تھی، ہنسی لگ رہی تھی۔ بالوں کو کچھ میں جکڑ رکھا تھا جس سے چٹیلیں باہر نکل رہی تھیں۔

”ممی آپ.....“ وہ انہیں خفا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ابھی اس نامراد کوکان سے پکڑ کر باہر کا راستہ دکھائے
لیکن اس نے تو اس کی ماں کو ہی اپنا حاتی بنالیا تھا۔
”اچھا ہے ناں ایڈوچر ہو گیا۔ ایک دو دن لگیں
مے لیکن دیواریں صاف ہو جائیں گی۔“ وہ ہنسنے ہوئے
بولتا تھا جیسے ساری زندگی دیواروں پہ رنگ درون ہی
کر رہا ہو۔

”اللہ تمہیں خوش رکھے بننا۔“ می کے شفقت
بھرے لہجے پر اس کے اندر تک آگ لگ گئی تھی۔ کچھ
دیر اور یہاں کھڑی رہے گی تو منہ سے کچھ نہ کچھ نکل
جائے گا اس لیے کھک لینا مناسب تھا پر ماں نے آواز
دے کر روک لیا۔

”اچھا سب سنو، فریج میں اٹلے رکھے ہیں تم
ایسا کرو جلدی سے آلیٹ بنا لو اور ساتھ پراٹھے۔ عدن
کو بھی بھوک لگ رہی ہوگی۔“ اچھا تو ساری فکر عدن کی
تھی۔ جینی صبح کی بھوک پیاسی گھر واپس آئی ہے اس کا
کوئی خیال ہی نہیں۔

”یعنی آفس سے آکر آج کوکنگ بھی میں کروں
گی؟“ جل جل کر اب تو وہ خاک ہو رہی تھی۔

”آلیٹ بنانا بھی کوکنگ کہلاتا ہے کیا؟“ عدن
نے لقمہ دیا۔ اس کا انداز ہلکا چھلکا تھا۔

”اسے تو پکن میں گھسنائی مصیبت لگتا ہے۔“

می نے اس کی تائید میں ہنسنے ہوئے سین کا راز فاش
کیا۔ وہ چپ چاپ کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں چلی
آئی جہاں لاؤنج جیسا ہی نظارہ تھا۔ لیکن ایک بات تو
تھی کمرہ صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ سامان بے ترتیب تھا
اور فرش کی بھی صفائی نہیں ہوئی تھی لیکن دیواریں چمک
رہی تھیں پر سین اس کی داد اس شخص کو دینے کے موڈ میں
ہرگز نہیں تھی۔ کپڑے بدل کر اور ہاتھ منہ دھو کر وہ پکن
میں چلی آئی۔

”اب اس نوابزادے کے لیے آلیٹ اور
پراٹھے بھی میں بناؤں۔“ فریج سے مطلوبہ سامان نکال
کر کاؤنٹر پہ رکھتے وہ زرب پر بڑائی۔
”مجھ نہیں آ رہا آخر یہاں ہر کوئی اس کا اتنا فور

کیوں کر رہا ہے۔“ اسے چند دن پہلے کا سارہ کا رویہ
بھی یاد آیا تھا جو بتا جانے اس کی حمایت کر رہی تھی اور
می تو خیر اس کے لیے کچھ زیادہ ہی جذباتی نظر آ رہی
تھیں۔ باؤل میں بیاز کاٹتے بے اختیار اس کی آنکھوں
میں پانی آ گیا تھا۔

☆☆☆

”تم مجھ پہ اعتبار نہیں کرتی یا کرنا نہیں چاہتیں؟“
بڑی سنجیدگی سے سوال کیا گیا تھا۔

”زندگی بڑی سفاک ہے فائز اور میں اس سے
مزید دکھ کشید کرنے کی خواہش نہیں رکھتی۔“ پونیو رشی
کیسے ٹیریا میں بیٹھے اس کی آنکھوں میں دیکھتے فائز نے
وہاں درو کی ہلکی سی رتن دیکھی تھی۔

”یار لوگ تو محبت پا کر آسمانوں میں اڑنے لگتے
ہیں اور ایک تم ہو، میں دل تمہارے قدموں میں رکھ رہا
ہوں اور تم ٹھوکر مار کر آگے نکل رہی ہو۔“ اپنی بات پہ
زور دیتے اس نے سامنے رکھی میز پر ہاتھ مارا۔

”ایسی بات نہیں فائز، میں کبھی تمہیں ہرٹ کرنا
نہیں چاہتی لیکن میں اپنی آنکھوں کی اوقات سے
واقف ہوں، اسی لیے وہ خواب دیکھنے سے گریز کرتی

ہوں جو ان کی حیثیت سے بڑھ کر ہیں۔“ وہ ضرورت
سے زیادہ حقیقت پسند تھی۔ فائز پر اعتبار بھی تھا کہ دل
کو ابھی دیتا تھا پر کلاس ڈیفرنس اگنور کرنے والی چیز نہیں
ہوتی۔ اسی لیے نڈل کلاس لڑکیوں کو بہت محتاط رہنے کی
ضرورت ہوتی ہے۔ کیا تا کب کوئی امیر زادہ محبت کے
نام کا فریب دے کر زندگی ویران کر جائے۔

”ان آنکھوں کو محبت کے خواب دیکھنے سے
روک کر تم خود پر ہی نہیں مجھ پر بھی ظلم کر رہی ہو
فاطمہ۔ تم کیا ہو، تمہاری حیثیت کیا ہے یہ میرے دل
سے پوچھو۔“

”فائز تمہارا اور میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ تم آسمان
ہو میں زمین۔“

”یہ محبت ہے جگ نہیں اور پلیز یہ دقیا نوی باتیں
کر کے میری چاہت کی توہین تو مت کرو۔“ فائز نے ہاتھ

اٹھا کر تیز سبکے میں کہہ کر اسے مزید چمکے کہنے سے روکا۔

”وہ سب کہنا بہت آسان ہوتا ہے فائز وقت آنے پر.....“ وہ کہنا چاہتی تھی وقت بدلنے دین نہیں لگتی، محبت کے وعید اور ضروری نہیں ہر آرزو مانس پر پورے بھی اتر پائیں۔

”تم سے محبت کی ہے تو مرتے دم تک بھائوں گا۔ نہ یقین آئے تو سر کر دکھا دوں!“ اس نے دونوں کہتے فاطمہ کی بات کاٹی تھی۔

”فصل باتیں مت کرو۔“ اس نے بے اختیار ٹوکا۔

”کیا کروں تم پیار محبت کی باتیں سننا ہی نہیں چاہتیں۔“ مسکراتے ہوئے اس کے اعتراف محبت پر فاطمہ جھینسی گئی تھی۔

چوٹے کے سامنے چوکی پر بیٹھی، گھٹنوں پہ گال نکائے وہ فائز کے تصور میں ڈوبی تھی جب دروازے پر کھڑی طیبہ کی آواز پہ چوٹک کر اس نے سر اٹھایا۔ اپنی اور فائز کی گفتگو کو دل ہی دل میں دہراتے اس کے گال باقاعدہ بلش کر رہے تھے۔

”آپ کچھ کہہ رہی تھیں امی؟“ اپنے وحیان میں مگن اس نے ماں کی آواز پر بھی توجہ نہیں دی تھی جو اسے باورچی خانے کے باہر سے پکار رہی تھیں۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں بیٹا تم ہو کہ سن ہی نہیں رہیں اور یہ کیا؟ سارا دووہ ابل گیا۔“ طیبہ نے بے اختیار ماتھے پہ ہاتھ مارا۔

”اُف..... ف میرے اللہ، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔“ فاطمہ نے گھبرا کر چوٹے کی طرف دیکھا جہاں پمپلی سے دووہ ابل، ابل کر باہر گر رہا تھا۔ اس نے جلدی جلدی چوٹا بند کر کے صافی سے گرا ہوا دووہ صاف کیا۔ وہ خاموش کھڑی اسے دیکھتی رہیں پھر بنا کچھ کہے واپس لوٹ گئیں۔

”سب ٹھیک تو ہے ناں فاطمہ، میں دیکھ رہی ہوں کچھ عرصے سے تم بہت کھوٹی، کھوٹی سی رہتی ہو۔“ کچھ دیر بعد فاطمہ کمرے میں آئی تو انہیں جاگتا پایا۔ اسے اندازہ ہوا وہ شاید اسی کی منتظر تھیں۔ فاطمہ نگاہ ملائے بغیر اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گئی جب خاموشی میں

لوک لہجہ

خان صاحب کے رابطے اور چمپے کی زبان پر تو خیر نادر ہندو کی چھاپ تھی لیکن بولتے اپنے ہی کھرے، کھٹکتے پشتون لہجے میں تھے جو کانوں کو بھلا لگتا تھا۔ اس کے مقابلے میں بشارت کو اپنا لہجہ بالکل سپاٹ اور بے نمک لگا۔ پشتون اردو لہجے میں تنگ ایجاز اور تند و تازہ مہکار ہے جو کسی منہم اور ذومعنی بات کی رد و اور نہیں۔ یہ کوئٹہ، لنگار تالہ لہجہ مٹھلوک سرگوشیوں کا لہجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح پنجابی اردو لہجے میں ایک کشادگی، گرم جوشی اور گھلاوٹ کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں میدانی دریاؤں کا پات اور دھیرج اور ول دریا پار ملک سے۔ اور سچ، سچ راستہ بنانے کے لیے اپنی لہری لنگر کاٹ پر پورا اعتماد۔ بلوچ لہجے میں ایک ہوک سی، ایک ہسکتی پہاڑی گونج اور دلا آویز خشکی کیفیت کے علاوہ ایک چوٹا پن بھی ہے جو سنگلاخ کوہ اور وشت بے آب اپنے آزادوں کو بخش دیتے ہیں۔ سندھی اردو لہجہ لہکتا، لہراتا لیریکل (lyrical) لہجہ ہے۔ ایک لٹک، ایک مہراں موج جو اپنے آپ کو چوم، چوم کر آگے بڑھتی ہے۔ اردو کے علاقائی لہجوں میں وہ لوک ٹھاٹ، مٹھاس اور رس ہے جس کا ہمارے گھسے بٹے نکسالی اور شہری لہجے میں دور، دور شائبہ نہیں ملتا۔ لوک لہجے کی آمیزش سے جو نیا اردو لہجہ ابھرا ہے اس میں بڑی توانائی، تازگی، لوچ اور سمانی ہے۔

بھرے ہیں یہاں چارستوں سے دریا

اقتباس: ”آبِ گم“ از مشتاق احمد پوٹھی

انتخاب: ناہم شاہد، کراچی

نخل ماں کی نظر بھری آواز گونجی۔
 کر اس نے اپنے بس میں کیا ہے۔ اس کا دماغ
 انکشاف پہ انکشاف کیے جا رہا تھا۔

سامنے بیٹھا عدن مزے لے، لے کر کھانے کو
 ایسے انجوائے کر رہا تھا جیسے سامنے آلیٹ نہیں بریانی،
 کو فتنے سچے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کو یہاں وہاں کی
 باتیں سن رہا تھا۔ اپنے علاقے کے قصے، وہاں کی
 روایات، حالات حاضرہ پہ اچھا سا تہرہ..... وہ تقریباً
 ہر موضوع پہ بات کر رہا تھا جسے وہ نہایت دلچسپی سے
 سنتیں خود بھی اپنی رائے دے رہی تھیں۔

”ارے سین تم نے اتنی جلدی ہاتھ کیوں روک
 لیا۔ ٹھیک سے کھاؤ ناں۔“ وہ جوابے ہی دھیان میں
 بیٹھی کڑھ رہی تھی ماں کی آواز پہ یک دم چونکی۔
 ”بھوک نہیں ہے مجھے۔“ عدن کی سمت دیکھتے
 وہ بڑی سنجیدگی سے بولی تھی۔

”بھئی ہم دونوں کو تو بہت بھوک لگی ہے۔ سارا
 دن بہت ہی زیادہ بڑی گزر رہا۔ ویسے عدن کچی بات
 ہے یہ خیال مجھے یاسین کو تو آیا ہی نہیں کہ تھوڑا تھوڑا
 کر کے ہم خود دیواروں پہ وائنٹ واش کر سکتے ہیں۔
 ویک اینڈ تو اکثر یونی گزر جاتے ہیں۔ اب دیکھو ناں
 ایسے تو خرچ محسوس بھی نہیں ہوا۔“ انہوں نے کھلے دل
 سے عدن کو سراہتے ہوئے کریڈٹ دیا تھا۔

”جی ہاں یہ سب تو مفت ہو گیا۔“ پانی کا گلاس
 منہ سے لگاتے اس نے طنز کیا۔

”ایک طرح سے مفت ہی سمجھو۔ بس میٹرل
 خریدنا اور میٹر می کرایے پہ لائے۔ یہی مزدوروں کو لگا
 لیتے تو ڈبل پیسے لگ جاتے۔“ اس کے لہجے کو نظر انداز
 کرتے وہ عام سے انداز میں بولیں۔

”تھینک یو سوچ بیٹا تمہاری وجہ سے اٹھنے بیٹھنے
 کی جگہ کیسی صاف ہو گئی ہے۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“
 انہوں نے عدن کا تہہ دل سے شکر یہ ادا کرتے اسے
 ساتھ ہی دعاؤں کا تحفہ بھی دے ڈالا۔

”شکر یہ کیسا آٹنی! یہ تو بس یونی مجھے خیال آ گیا
 دیواریں بڑی گندی ہو رہی ہیں چلو ایڈ وچر ہی آگیا۔“

”دل اور دماغ میں سے کس کی بات مانی
 چاہیے امی؟“ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے
 اس نے ان سوال کیا تھا۔
 ”وہ، جو صحیح ہو۔“ جواب مختصر اور جامع تھا۔
 ”اور یہ کیسے پتا چلے گا؟“ اس نے کروٹ بدل
 کر ماں کی طرف دیکھا۔

”یہ وقت بتاتا ہے میری جان۔ کیونکہ وقت آنے پر
 جو صحیح ہوگا اپنا آپ ثابت کر دے گا۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔
 جیسے بن کے بھی بیٹی کی ولی کیفیات پڑھ رہی ہوں۔
 ”آپ مجھے کنفیوز کر رہی ہیں۔“ وہ اب بھی تھی۔
 ”اور تم مجھے اس کا نام نہیں بتا رہی ہو۔“ انہوں
 نے بے ساختہ سوال کیا تھا۔ فاطمہ نے بے اختیار لب
 کاٹے۔ ہولے ہولے وہ انہیں فائز کے متعلق بتانے
 لگی تھی۔ اور یہ بھی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔
 رات گئے تک وہ دونوں اس موضوع پہ بات کرتی
 رہیں رہاں کو سب کچھ بتا کر فاطمہ کے دل سے بھاری
 بوجھ اتر گیا تھا۔

☆☆☆

اس کا منہ اب تک سو جا ہوا تھا جس پر حیرت انگیز
 طور پر ان دونوں میں سے کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔
 چلو وہ تو غیر تھا پھر اسے کون سی سین کی فکر تھی..... حیرت
 تو اسے ماں پہ ہو رہی تھی جو فقط چند روز پہلے آئے اجنبی
 کراہیہ وار سے اس درجہ لگاؤ دکھانے لگی تھیں کہ اپنی ہی
 اولاد کو نظر انداز کیے جا رہی تھیں۔ اس کی تو کچھ سمجھ میں
 نہیں آ رہا تھا، بقول سارہ کے یہ کاروبار کے چکر میں آیا
 ہے۔ اب پتا نہیں کاروبار کربھی رہا ہے یا بس یہیں گھر
 میں ڈیرے ڈال کر بیٹھا اس کی بیوی بھالی ماں کو بہکا رہا
 ہے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے ایسی چکنی چپڑی حرکتیں کر کے
 ان سے یہ گھر ہی ہتھیلے کے چکر میں ہو۔ اب آج
 کے نفسا نفسی کے دور میں بھلا کس کا اعتبار کیا جاسکتا
 ہے۔ کرایے دار تو یوں بھی قبضہ گرد پ کے نام سے
 بدنام ہوتے ہیں۔ پتا نہیں انہیں کیسی، کیسی کہانیاں سنا

بس راز اسنادیت ہے۔ ہم پیسے کو اپنی بھوری بنالیتے ہیں۔ پیسے اہم ہوتے ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ انسان ان کے سامنے غلام بن جائے۔“ وہ بس یونہی بات برائے تبصرہ کرتا ساتھ ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

”اپنے منہ میں چاول ہوں تو دوسروں کی بھوک، بھوک نہیں لگتی ہے۔ کبھی اپنی زمینوں پہ کام کرتے غریب مزارعوں سے جا کر پوچھیے پیسے کی قدر و قیمت کیا ہے۔ جنہیں پیدا ہونے پر کانوں میں سکوں کی جھنجھاہٹ سنائی جائے وہ کیا جانیں چند ہزار کی تنخواہ کے لیے پورا مہینہ انتظار کرتے، بسوں کے دھکے کھاتے جوتی گھس جاتی ہے۔ بات کرتے ہیں پیسوں کی قدر و قیمت کی۔“ سین نے پچھلے دو گھنٹے کی بھڑاس ایک ہی دار میں ڈائریکٹ اس پہ نکالی تھی۔ وہ ایک ننگ اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”سوری میں تو بس یونہی بات برائے بات کر رہا تھا۔ آپ نے اسے پرسل لے لیا۔“ فی الفور معذرت کرتے اس نے ہاتھ میں پکڑ لیا واپس دین چھوڑ دیا تھا۔

”ایک سکوی زی۔“ وہ اب خاصا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ کرسی سے اٹھ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ سین نے پاس بٹھی ماں کی چھتھی نگاہیں خود پر محسوس کرتے ان کی طرف دیکھا۔ وہ شدید خفگی میں اسی کو دیکھ رہی تھیں۔ کندھے اچکائے سین میز پہ پڑے برتن اٹھا کر سنک میں رکھنے لگی۔ وہ کچھ بھی کہے بنا ہی سن سے نکل گئی تھیں۔

☆☆☆

”یہ میں کیا سن رہی ہوں بھالی عدن اب شہر میں کاروبار کرے گا۔“ ان کی نند نے بیٹھے ہی سوال داغا تھا۔ ”شہر میں“ بھی“ کاروبار کرے گا۔ کہہ رہا ہے وہاں بڑا آفس کھولنا ہے۔“ مختصر لفظوں میں اسے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔ وہ خود بھی تو بس اتنا ہی جانتی تھیں۔

”حد کرتے ہیں آپ لوگ بھی۔ منع ہی نہیں کیا اسے۔ جانتے بھی ہیں اس شہر میں کتنے دھوکے باز لوگ رہتے ہیں۔ وہ تو جب پڑھنے گیا تھا تب بھی میرا دل نہیں مانتا تھا۔ اب تو آپ کو اسے روکنا چاہیے تھا۔“

شکایت بھرے لہجے میں راز داری تھی۔

”تمہارا خون ہے۔ سرکشی تو رگوں میں دوڑتی ہے۔ تمہارے خاندان میں کبھی کسی نے میری بات مانی ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو میں نے بھی کان میں ڈال دیا ہے۔ جلد ہی پاؤں میں شادی کی بیڑی ڈال دوں گی۔ بہو لے آؤں گی تو خود ہی یہاں دل لگ جائے گا صاحبزادے کا۔“ وہ بھلا خود کون سا راضی تھیں۔ سب سے بڑا دھڑکا تو دل کو یہی تھا کہیں اتفاقاً ان سے ملاقات ہی نہ ہو جائے۔ درخت کٹ بھی جائیں تو جڑیں سلامت رہتی ہیں۔ کتنی مشکل سے تو جان چھوٹی تھی۔ اپنی پریشانی میں بھی وہ عادتاً غلطی کا لمبہ سرال پہ ڈالنا نہ بھولی تھیں۔ البتہ ذومعنی سے انداز میں زیب التسا کے معصوم چہرے پہ نگاہ ڈالتے انہوں نے بڑے مان سے اپنی بات کہی تھی۔ سامنے بیٹھی زیب کے چہرے پہ کئی رنگ ایک ساتھ نمودار ہوئے تھے۔ سر جھکائے اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبایا اور پھر صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”مہماں نا نا جان سے مل کر آتی ہوں۔“ ماں نے سر ہلا کر اجازت دی تھی۔ کاسنی پر بچڑ کر تاشلوار پہ بڑی سی چادر اوڑھ دھو ہمیشہ کی طرح سادہ پُر دکش لگ رہی تھی۔ اس پہ چہرے کی معصومیت اسے اور بھی حسین بناتی تھی۔ ”شرما گئی۔“ اس کے کمرے سے نکلتے ہی انہوں نے مسکرا کر تبصرہ کیا تھا۔ ملازم میز پہ چائے کے ساتھ لوازمات سجا رہا تھا۔

آپ نے عدن سے زیب التسا کے حوالے سے بات کی؟“ اپنے چائے کے کپ میں شکر ملاتے اس نے بھانوج کی طرف امید بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”کہہ تو دیا بھوپتی پسند کی لاڈ لگی۔ اور بھلا اسے کیا اعتراض ہوگا۔ پھر جب دادا کا حکم ہوگا تو چوں بھی نہیں کرے گا۔“ بڑے فخر سے انہوں نے بیٹے کی تابعداری اور اسے اختیارات کو سراہتے ہوئے اسے تفصیل بتائی تھی۔ سکون اس کے چہرے پہ بھی طواف کرنے لگا تھا۔

اختتامی حصہ اگلے ماہ

ظلم..... مذمتِ الہی

اختیار ہونے کی صورت میں دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ کتاب و سنت میں اس کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔ بے شمار لوگوں کو اپنے ظلم کی بنا پر دنیا ہی میں سزا مل جاتی ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ بہت سے ظالموں کی بستیوں کو ان کے ظلم کی نحوست کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا۔

ظلم کو گناہ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے کو بالکل پسند نہیں کرتا..... اور نہ ہی ظالموں کو نجات دے گا۔ قیامت کے روز ظالموں کا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار..... صابروں کو آزمانے کے لیے اللہ تعالیٰ ظالموں کو ذلیل دے دیتا ہے۔ مگر جب کسی کا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے فوراً اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور نیست و نابود کر دیتا ہے۔ یعنی ظلم کرنے والوں کے لیے دنیا میں بھی ہلاکت اور بربادی ہے اور آخرت میں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

☆☆☆

ظلم کھلی گمراہی ہے اور گمراہی کا مطلب ہے اللہ کی راہ سے ہٹ جانا..... ظلم انسان کو راہِ حق سے بہت دور کر دیتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”کیا خوب دیکھنے، سننے والے ہوں گے اس دن جبکہ ہمارے سامنے حاضر ہوں گے لیکن آج تو یہ ظالم لوگ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔“ (سورہ مریم)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اللہ تعالیٰ

تمام حمد دے اللہ رب العزت کے لیے ہے جس نے اس کائنات کو تخلیق کیا۔ جو ہمارا خالق اور مالک ہے..... اور وہی لائقِ عبادت ہے۔

اللہ اتیرا نام ہے جو تیرے سوا کسی اور کے لیے نہیں، یہ صرف تیرے لیے ہی ہے۔ اللہ وہ ہے جسے روزِ ازل میں ہر روح نے مانا کہ تو ہمارا رب ہے۔ ہر کوئی تیرا طالب ہے اور تو اس کا مطلوب..... ہر بندے کی منزل تو ہی ہے۔ ہم تیرے ہیں اے میرے رب اور تو ہمارا ہے..... درمیان میں کچھ بھی نہیں..... تیرا نام اللہ کہنے سے دل سکون کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے۔ جسے تو نے چاہا میرے رب اپنی معرفت سے مالا مال کر دیا۔

اے اللہ رحمت نازل فرما، اپنے پیارے حبیب سرور کو نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر..... درود و سلام ہو ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر..... ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر.....

ہمارا آج کا موضوع ظلم ہے..... ظلم کے لغوی معنی ہیں، ستم، بے انصافی، زبردستی، زیادتی یعنی کسی کے جائز حق کو اپنی طاقت یا اختیار کی بنا پر چھین لینا ظلم کہلاتا ہے۔ مطلب کسی چیز یا انسان کو اس کی جائز جگہ اور جائز حق سے محروم کرنا، عام لفظوں میں اس طرح کہ ٹوپی کا مقام سر ہے، اسے قدموں میں رکھنا ٹوپی کے ساتھ ظلم ہے۔ شریعت اسلامیہ میں ظلم، زیادتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ کسی کے ساتھ کسی کے حقوق پر دست درازی نہ کی جائے۔ اسلام میں امارت، قوت، سلی، برتری، حکومت، صاحب

ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“ (سورہ بقرہ)

ہدایت اسے ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اطاعت گزار ہو چونکہ ظالم اطاعت گزاری میں نہیں ہوتا اس لیے اسے ہدایت نہیں ملتی۔ ظلم گناہ ہے، ہدایت سراپائیکی ہے..... ظلم تاریکی ہے، ہدایت اجالا ہے، ظلم دوزخ میں لے جانے والا فعل ہے جبکہ ہدایت یافتہ لوگ اہل جنت ہیں۔

☆☆☆

اللہ تعالیٰ نے تین قسم کے حقوق مقرر کیے ہیں۔

1۔ پہلا حق اللہ تعالیٰ کا ہے کہ اس خالق کائنات کی فرمانبرداری کی جائے۔

2۔ دوسرا حق۔ انسان کے جسم کا اپنا حق ہے کہ وہ اپنی جان کو اس راہ پر نہیں چلاتا بلکہ غلط راستہ اختیار کرتا ہے۔

3۔ تیسرا حق دوسری مخلوق کا ہے۔ اگر انسان دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے تو وہ دوسرے کے ساتھ ظلم کرتا ہے۔ دنیاوی معاملات میں عموماً تیسری قسم کا ظلم عام ہے جس سے دوسری مخلوقات کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ظلم خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو آخرت میں اس کی سزا ضرور ملے گی۔ حاکم وقت کی کرسی پر بیٹھ کر رعایا کے حقوق ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ انصاف کا ترازو ہاتھ میں لے کر انصاف نہ کرنا ظلم ہے۔ جانور رکھ کر ان کی خوراک کا بندوبست نہ کرنا ظلم ہے، نوکر رکھ کر ان کے ساتھ انسانی تقاضوں کے مطابق حقوق ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ ظالم کی فلاح نہ ہوگی۔ ان کو دین اور دنیا دونوں میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس گناہ کو کبیرہ سے بچنے کے لیے بہت تاکید فرمائی ہے اور ظلم کی مذمت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ہیں کہ ”جس نے اپنے بھائی پر ظلم کیا ہو، آبروریزی کر کے یا کسی اور طرح تو اس روز سے پہلے اس سے معاف کر لے جبکہ اس کے پاس دینار ہوگا نہ درہم..... اگر اس کے پاس نیک اعمال ہوئے تو اس ظلم کے برابر اس سے لے لیے جائیں گے اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کے گناہ

نے اس پر پڑا دل دیے جائیں گے۔“

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ”اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے یہاں تک کہ جب پکڑتا ہے تو چھوڑتا نہیں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک آدمی کو تین باتوں کی تاکید فرمائی۔

(i) موت کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ اور باتوں کا دھیان نہ رہے۔

(ii) اللہ پاک کا خوب شکر کرو کہ اس سے نعت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(iii) دعا کا خوب اہتمام کرو کیا جانے کب قبول ہو جائے..... اور تین باتوں سے منع فرمایا۔

(i) عہد مت توڑو اور نہ ہی نقص عہد میں کسی کا تعاون کرو۔

(ii) کسی پر ظلم کرنے سے بہت ہی بچو کہ اللہ تعالیٰ مظلوم کی مدد فرماتے ہیں۔

(iii) کمزور فریب سے پرہیز رکھو کہ اس کا وبال اپنے اوپر ہی پڑتا ہے۔

ایک ظالم بادشاہ نے شاندار محل بنوایا۔ ایک مفلس بڑھیا آئی اس نے محل کے پہلو میں اپنی کنیا بانی جس میں وہ سکون سے رہتی تھی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے محل کے ارد گرد چکر لگایا تو اسے بڑھیا کی کنیا نظر آئی۔ اس نے پوچھا۔ یہ کس کی ہے؟ بتایا کہ یہ ایک بڑھیا کی ہے جو اس میں رہتی ہے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اس جھوپڑی کو گرا دو..... لہذا اس کے حکم پر غریب بڑھیا کی جھوپڑی گرا دی گئی۔ جب وہ بوڑھی عورت واپس آئی تو اس نے اپنی منہدم کنیا کو دیکھ کر پوچھا۔ اسے کس نے گرایا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اسے بادشاہ نے گرایا ہے۔ تب بڑھیا نے آسمان کی طرف سر اٹھایا۔

اور کہا۔ ”اے اللہ! اگر میں یہاں حاضر نہیں تھی تو تو کہاں تھا؟“ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ محل کو اس کے رہنے والوں پر الٹ دو..... اور ایسا ہی کیا گیا۔

ہوں کہ ہمیشہ خوف و امید کے درمیان رہوں۔

☆☆☆

ایک دفعہ حضرت بایزید بسطامیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کا پھر کون ہے؟ آپؒ نے فرمایا کہ ایک بڑھیا ہے..... پھر پوچھا وہ کیسے، کس طرح؟ آپؒ نے کہ ایک روز میں تو حید اور شوق کے ایسے جوش میں تھا کہ کسی اور چیز کی گنجائش نہ رہ گئی تھی میں نے خود ہو کر جنگل میں چلا گیا۔ وہاں ایک بڑھیا لی جو اپنے سر پر بو بھ لیے ہوئے آ رہی تھی۔ اس نے حضرت بایزیدؒ سے کہا کہ میرے وزن کو اٹھاؤ میں اس کو اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ ادھر میری یہ حالت تھی کہ میں خود کو نہیں اٹھا سکتا تھا، میں نے ایک شیر کی طرف اشارہ کیا وہ آیا میں نے وہ بوجھ شیر کی پشت پر رکھ دیا اور اس بڑھیا سے کہا جب تو شہر میں جائے تو اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھ کو نہ پہچانے..... لیکن بڑھیا نے کہا کہ میں نے ایک ظالم اور ایک رعنا کو دیکھا۔ میں نے کہا وہ کس طرح..... بڑھیا نے کہا کہ اے بایزیدؒ! کیا یہ شیر مکلف ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا نہیں ہے۔ مست بڑھیا بولی کہ خدا نے تکلیف نہیں دی تو اس کو تکلیف دے رہا ہے۔ یہ ظلم نہیں ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے کہا بے شک یہ ظلم ہے..... تب بڑھیا بولی۔ کہ باوجود اس ظلم کے چاہتا ہے کہ شہر کے لوگ جان جائیں کہ شیر بھی تیرے مطیع ہیں اور تو صاحب کرامت ہے کیا یہ رعنا ہی نہیں ہے؟ حضرت بایزیدؒ نے فرمایا۔ میں توبہ کرتا ہوں اس فعل سے اور اس بات کا حضرت بایزید بسطامیؒ پر بہت زیادہ اثر ہوا۔

حضرت میمون بن مہرانؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرے اور اس سے معافی نہ طلب کر سکے اس کا موقع ہاتھ سے نکل جائے تو اسے چاہیے کہ ہر نماز کے بعد مظلوم کے لیے استغفار کرے کیونکہ اس طرح سے وہ اس ظلم سے سبکدوش ہو جائے گا ان شاء اللہ.....

☆☆☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مٹنا ہوں کے دفتر تین قسم کے ہیں۔ ایک دفتر اولوں کو وہ نہیں بخشے گا وہ

گرفتار کر لیا۔ اور ان ہی میں سے کسی جابر و ظالم کو بھی نے آپؐ سے کہا کہ میرا ظلم بنا دیجیے۔ آپؐ نے فرمایا۔ میں ہرگز نہیں بنا سکتا..... اور جب ظلم نہ بنانے کی آپؐ سے وجہ پوچھی گئی تو آپؐ نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے کہ محشر میں فرشتوں سے کہا جائے گا کہ ظالموں کو ان کے معاونین کے ہمراہ اٹھاؤ، لہذا میں ایک ظالم کا معاون نہیں بن سکتا۔ کس نے اپنے بیٹے کے لیے ایک استاد مقرر کیا جو اسے تعلیم دیتا تھا اور ادب سکھاتا تھا۔ جب وہ بچہ مکمل طور پر علم و فضل سے بہرہ ور ہو گیا تو استاد نے اسے بلایا اور بغیر کسی جرم اور بغیر کسی سبب کے اسے انتہائی دردناک سزا دی۔

اس لڑکے نے استاد کے اس رویتے کو بہت ہی برا سمجھا اور دل میں اس کی طرف سے عداوت پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہو گیا اس کے والد کا انتقال ہو گیا اور باپ کے بعد وہ بادشاہ بن گیا..... بادشاہی سنبھالنے ہی اس نے استاد کو بلا کر پوچھا کہ آپؐ نے فلاں دن بغیر کسی جرم اور بغیر کسی سبب کے مجھے اتنی دردناک سزایوں دی تھی؟ استاد نے کہا..... اے بادشاہ.....! جب تو علم و فضل کے کمال تک پہنچ گیا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ باپ کے بعد آپ ہی بادشاہ بنو گے لہذا میں نے سوچا کہ آپ کو سزا کا ذائقہ اور ظلم کی تکلیف موافق کر دوں تاکہ اس کے بعد آپ کسی پر ظلم نہ کرو..... بادشاہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے پھر اس نے اسے استاد کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ان کے اخراجات کی ادائیگی کا حکم صادر کر دیا۔

☆☆☆

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس نے ظالم کی اس کے ظلم پر امداد کی یا اسے ایسی بات سکھائی جس سے وہ کسی مسلمان کا حق باطل کر سکے تو وہ اللہ کے غضب میں گرفتار ہو گیا۔

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اہل علم کا علم نہ سکھانا ظلم ہے۔ حضرت سید احمد کبیر رفاہیؒ کا ارشاد ہے کہ ظلم سے مراد خواہشات نفسانی کی اطاعت ہے میں تمہیں کہتا

ہو مگر ان کا حق نہیں لوٹا اور ان سے ظلم دور کرتا ہے۔

2- قوم کا رہنما لوگ جس کی پیروی کریں وہ طاقتور اور کمزور کے درمیان فیصلہ نہیں کر سکتا اور خواہشات نفسانی کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔

3- گھر کا سربراہ جو اپنے گھر والوں اور اولاد کو اللہ کی اطاعت کا حکم نہیں دیتا اور نہ ہی انہیں دینی امور کی تعلیم دیتا ہے۔

4- ایسا آدمی جو اجرت پر مزدور لا کر اس سے کام کروا کر اجرت نہیں دیتا۔

5- وہ آدمی جو اپنی بیوی کا حق مہر دبا کر اس سے زیادتی کرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حقوق کو پیدا کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے التجائی کی کہ باری تعالیٰ تو کس کا ساتھ دے گا..... اللہ نے فرمایا۔

میں مظلوم کے ساتھ ہوں تاکہ اسے اس کا حق دیا جائے۔ حضرت ابی امامہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن ظالم آئے گا وہ پل صراط پر پہنچے گا تو مظلوم اس کے سامنے آجائے گا۔ مظلوم آکر اس سے اس کی تمام نیکیاں اس کے ظلم کے بدلے میں لے لیں گے..... اور اس کے ظلم کی بنا پر اس کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔

☆☆☆

حضرت عمر دینار سے مروی ہے کہ ایک ساحل پر رہنے والے اسرائیلی شخص نے سنا کہ ایک شخص پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ”دیکھو مجھے اور آگاہ ہو جاؤ میری حالت دیکھ کر پھر کسی پر ظلم نہ کرے۔“

اسرائیلی شخص نے اس کے قریب پہنچ کر پوچھا..... اے اللہ کے بندے! تیرا کیا معاملہ ہے اس شخص نے کہا..... میں ایک سبائی تھا ایک دن اس ساحل پر آیا تو میں نے ایک شخص کو جھپٹی کا شکار کرتے دیکھا اس نے میرے سامنے ایک جھپٹی پکڑی میں نے اس سے کہا کہ یہ مجھے دے، دے اس نے انکار کیا۔ میں نے کہا میرے ہاتھ فروخت کر دے اس نے اس بات سے بھی انکار کیا میں نے اس کے سر پر ایک کوڑا رسید کیا اور جھپٹی

اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے۔ (اس کی ذات میں یا اس کی صفات میں جس نے بھی کسی دوسرے کو شریک کیا تو یہ سب سے بڑا ظلم ہے اور یہ شرک ہے جس کی معافی نہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

دوسرے دفتر والوں کو اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا جنہوں نے بندوں پر ظلم کیا ہوگا یہاں تک کہ ایک کا دوسرے سے بدلہ لیا جائے گا، تیسرا وہ جس کی اللہ تعالیٰ کو پروا نہیں، وہ بندوں کا ظلم ہے۔ اور وہ بندوں اور اللہ کے درمیان ہے۔ بس یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ چاہے اسے عذاب دے اور چاہے تو اسے درگزر کرے۔

آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”ظلم قیامت کے اندھیروں میں سے ایک ہے جس نے ظلم سے ایک باشت بھرز زمین حاصل کی اللہ تعالیٰ اس کے گلے میں ایسی سات زمینوں کا طوق بنا کر ڈالے گا۔“ حضرت ابو ہریرہؓ کا ارشاد ہے کہ ”ظالم کے ظلم کے خوف سے کبھی سرخاب بھی گھونٹے میں سر جاتا ہے۔“

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ حبشہ سے واپس آنے پر مہاجرین سے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ مجھے وہ بات بتاؤ جو تم نے وہاں دیکھی ہو..... حضرت قتیبہؓ نے کہا کہ میں عرض کرتا ہوں..... ہم ایک روز وہاں بیٹھے تھے وہاں سے ایک بوڑھی عورت سر پر پانی کا گھڑا اٹھاے گزری اور ایک نوجوان نے اسے دھکا دیا۔ وہ گزری اور اس کا گھڑا ٹوٹ گیا۔ وہ کہنے لگی کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدل کرے گا تو میرا اور تیرا وہ فیصلہ فرمائے گا..... تجھے تیرے غرور کی سزا ضرور ملے گی۔ اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو کیسے فلاح دے گا جو طاقتوروں سے کمزوروں کا بدلہ نہیں ولا سکتی؟“ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ پانچ لوگ ایسے ہیں جن پر اللہ غضب ناک ہے، چاہے انہیں اپنے غضب کا نشانہ دنیا میں بنائے یا آخرت میں عذاب دے۔

1- قوم کا وہ حاکم جو رعایا سے اپنا حقوق حاصل کرتا

چھین لی اور اسے ہاتھ میں لٹکا لے کر لیے جا رہا تھا کہ
 اچانک اس پھلی نے میرا انگوٹھا پکڑ لیا میں نے بہت چاہا
 کہ کسی طرح اپنا انگوٹھا چھڑا لوں مگر نہ ہوسکا..... میرے
 انگوٹھے میں پھلی کے جتنے دانت تھے اتنے سوراخ ہو گئے
 اور میرا انگوٹھا سڑ گیا۔ میں نے طبیب کو دکھایا تو اس نے کہا
 کہ یہ آٹک ہے اگر تو اپنا انگوٹھا کٹوائے گا نہیں تو ہلاک
 ہو جائے گا..... میں نے انگوٹھا کٹوایا..... تو پھر پھوڑا
 میری ہتھیلی میں ہو گیا..... اس طبیب نے کہا ہتھیلی کٹوانی
 پڑے گی۔ میں نے ہتھیلی کٹوادی پھر یہ پھوڑا کھائی میں
 ہو گیا۔ پھر کھائی بھی کٹوادی تو یہ پھوڑا بازو میں ہو گیا جب
 میں نے یہ حالت دیکھی تو میں بھاگ لکھا ایک دن میں اسی
 طرح چنچن پھر رہا تھا سانس ہی ایک درخت نظر آیا تو میں
 اس کے سائے میں جا کر بیٹھ گیا وہاں مجھ پر غنودگی سی
 طاری ہو گئی۔ خواب میں ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ تو
 کب تک ایک، ایک کر کے اپنے اعضا کٹوائے گا حقدار کو
 اس کا حق پہنچا دے تب اس سے نجات پائے گا۔ مجھے فوراً
 حق والی بات سمجھ آ گئی کہ یہ ارشاد اللہ تعالیٰ ہی کی طرف
 سے ہے۔ چنانچہ میں اس ساحل پر آیا تو دیکھا وہی شخص
 جال پھینکے بیٹھا ہے، جب اس نے جال کھینچا تو اس
 میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ میں اس کے قریب گیا اور
 کہا..... اے اللہ کے بندے میں تیرا غلام ہوں..... اس
 نے کہا تو کون ہے؟ تب میں نے بتایا کہ میں وہی سپاہی
 ہوں جس نے تمہارے سر پر کوڑا مارا تھا اور پھلی تم سے
 چھین لی تھی۔ پھر میں نے اسے اپنا ہاتھ دکھایا جسے دیکھ کر
 اس نے اللہ کی بلا سے پناہ مانگی اور بولا میں نے تجھے
 معاف کیا۔ جیسے ہی اس نے یہ بات کہی میرے زخم سے
 کیڑے گرنے لگے۔ جب میں واپس آنے لگا تو اس نے
 مجھ سے کہا۔ ٹھہرو مجھ سے نا انصافی ہوئی کہ ایک پھلی کے
 عوض میں نے تجھے بدو عادی اور وہ قول بھی ہو گئی..... پھر
 مجھے اپنے مکان پر لے گیا اور گھر جا کر اس نے دس ہزار
 درہم دیے اور کہا کہ اس سے اپنا گزارہ کرو اور پھر مزید دس
 ہزار درہم دیے کہ انہیں اپنے پڑوس کے اور قریب کے
 غریب غریب میں تقسیم کرو..... تب میں نے اس سے کہا کہ

خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دیں کہ آپ نے کیا کہہ کر بدو عادی
 تھی۔ اس نے کہا جب تو نے میرے سر پر کوڑا مارا اور پھلی
 چھین لی تو میں آسمان کی طرف سر اٹھا کر رویا۔ اور
 کہا..... ”اے رب! تو نے اسے اور مجھے پیدا کیا اور اسے
 مجھ سے قوی بنایا اور مجھے کمزور بنایا۔ پھر اسے مجھ پر مسلط کیا
 نہ تو نے مجھے بچایا نہ مجھے اتنی طاقت دی کہ اس کے ظلم سے
 محفوظ رہتا اور اپنے آپ کو بچاتا..... میں تجھ سے سوال کرتا
 ہوں کہ تو اسے مخلوقات کے واسطے عبرت بناوے۔“ (اللہ
 مظلوم کی بدو عاسے ہر ایک کو اپنی پناہ میں رکھے، آمین)

☆☆☆

حضرت ابوسلمہ دارائی نے جب حج کا احرام
 باندھا تو تلبیہ کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ قافلہ ایک میل تک
 چلا گیا اور آپ کو کجاوے میں غشی آ گئی پھر اتفاقاً وہاں احمد
 بن ابی الجوارریؒ جو آپ کے ساتھ تھے ان سے
 فرمایا..... اے احمد! اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ
 السلام کی طرف وحی فرمائی کہ نبی اسرائیل کے ظالموں
 سے کہہ دو کہ مجھے یاد نہ کیا کریں کیونکہ ان میں سے جو
 مجھے یاد کرتا ہے میں اس کو لعنت کرتا ہوں جب تک وہ
 مجھے یاد کرتا رہے..... اے احمد! افسوس ہم کیونکر مامون
 ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر لعنت نہیں کرتا حالانکہ ہم نے اپنے
 اوپر اور غیروں پر ظلم کیا ہے۔

☆☆☆

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جناب
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا
 ہے کہ قسم ہے مجھ کو اپنے عزت و جلال کی میں جلد یا بدیر
 ظالم سے بدلہ ضرور لوں گا اس سے بھی بدلہ لوں گا جو باوجود
 قدرت کے مظلوم کی امداد نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب
 سے پوچھا کہ تم جانتے ہو مفسد کیسا ہوتا ہے؟ صحابہ نے
 عرض کیا کہ ہم میں مفسد وہ کہلاتا ہے جس کے پاس مال و
 متاع نہ ہو..... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
 ”میری امت میں بڑا مفسد وہ ہے کہ قیامت کے دن نماز،
 روزہ، زکوٰۃ سب کو لے کر آئے لیکن اس کے ساتھ یہ ہے

اپنی امان میں رکھیں۔ (آمین) ☆☆☆

حرف آخر..... انتہائی نادم دل کے ساتھ اپنی تمام کوتاہیوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ میری ہر اس غلطی کو کوتاہی کی وجہ دانستہ یا نادانستہ اس مضمون کی تیاری میں ہوگئی ہو مجھے معاف کر دے..... مجھے معاف کر دے..... کہ وہ بہت معاف کرنے والا عظیم رب ہے۔

☆☆☆

ان تمام قابل احترام ہستیوں کے نام جن کی کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے..... آمین۔

- 1- مکاشفۃ القلوب..... حضرت امام محمد الغزالی
- 2- اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... ڈاکٹر محمد عبدالحی صاحب
- 3- کرامات الایلاء..... حضرت امام عبداللہ یافعی
- 4- تزکیۃ القلوب..... علامہ عالم نقری
- 5- بہشتی زیور..... علامہ عالم نقری
- 6- اسلامی تربیتی نصاب..... پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری صاحب، جلد دوم

☆☆☆

کہ نبی کریم ﷺ اٹھائے تو بہت لڑائی ہوئی۔ اس کا حال کھالیا۔ کسی کا خون کیا کسی کو مارا..... پس اس کی کچھ نیکیاں ایک کوئل گئیں اور کچھ دوسرے کوئل گئیں اور اگر ان کے حقوق کے بدلے ادا ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہو گئیں تو ان حق داروں کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے اور اس کو دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔“ اللہ اکبر! حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا قول ہے کہ بعض اوقات انسان زمانے کے قذیب و فراز اور اپنے برے حالات سے تنگ آکر اللہ تعالیٰ کے خلاف اظہارِ ناخوشی کرتا ہے اور اپنی مصیبت و پریشانی رنج و اضطراب میں ظلم و زیادتی کو اس عظیم رب کی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے جو کہ انتہائی غلط بات ہے۔ اس کی دعاؤں، التجاؤں اور حاجت روائی میں تاخیر ہو جائے تو یقیناً اس میں اللہ کی مصلحت ہوتی ہے کیونکہ اللہ ہمیشہ اپنے بندوں پر رحم و کرم فرماتا ہے۔ ذرہ برابر ظلم و زیادتی نہیں کرتا۔“ بندوں پر جو بھی عذاب آتا ہے وہ ان کی اپنی ہی بد اعمالیوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے..... بے شک اللہ اپنے بندوں پر ظالم ہرگز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کے ظلم سے محفوظ رکھے ہمارے ہاتھ سے زبان سے، ہمارے تمام اعضا سے کسی کی ذات کو کوئی تکلیف یا دکھ نہ پہنچے..... اور وہ ہمارے نامہ اعمال میں ظلم کے طور پر لکھ لیا جائے اللہ ہمیں اس سے

چند باتیں بنوں کے ساتھ

سب سے پہلے ساجدہ ظفر کمالیہ سے..... پیاری بہن آپ نے کیسے سوچ لیا کہ میں نے آپ کو فراموش کر دیا..... ایسا نہیں مجھے اپنی تمام بہنیں ان کے تبرے ان کے نام سب بہت عزیز ہیں ہاں نادانگی میں اگر کوئی نام رہ جائے تو قطعاً ایسا نہیں کہ میں بھول گئی۔ آپ لوگ تو میرے دل میں رہتے ہیں اور یہ سب آپ کی دعا میں ہیں جو اللہ تعالیٰ مجھ سے یہ کام لے رہا ہے۔

محترمہ اسما شاہد، ثریا فرخ، فرخندہ جعفری، نسیم کوثر، فریدہ ہاشمی اور سلسلی غزل آپ تمام بہنوں کا

بہت شکر یہ..... جزاک اللہ..... آپ عامر آپ کی بات نوٹ کر لی گئی ہے۔ ان شاء اللہ، اللہ کے کرم سے پورا کرنے کی کوشش کروں گی..... اور وہ تمام بہنیں جو بیمار ہیں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان کو شفاء کاملہ عطا فرمائے، آمین..... خصوصی طور پر دعا گو ہوں اپنی پیاری بہن یاسمین رشید کے لیے اللہ تعالیٰ ان کو صحت و تندرستی کے ساتھ ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے، آمین۔

نزہت آپ کے لیے اور عذرا جی کے لیے ڈھیروں، ڈھیروں دعا میں اللہ آپ کو سلامت رکھے، آمین..... امی آمین۔

معاشرتی موضوعات پر کبھی گفتگو کی تو کبھی قلم چلاتی
ہماری مایہ ناز قلم کار و کامیاب ڈراما نگار

شگفتہ بھٹی

سے دل خوش گن ملاقات



سوچا اپنے باذوق قارئین کے لیے مختلف گفتگو و مچر لطف
خیالات کی مالک اور زندگی کے حقائق پر روانی سے قلم
چلانے والی ہستی سے خصوصی ملاقات کی جائے بلکہ ان کی
خوش بیانی سے اپنے قارئین کو بھی مستفید کیا جائے۔ جہاں

عزیز بہنو! پڑخلوس دعاؤں کے نذرانے لیے ایک
مرتبہ پھر آپ کی بزم میں حاضر ہیں۔ چناب موسم بہاراں
کی آمد ہو چکی ہے ایسے میں ہر کوئی خوشگوار بیت اور گفتگو
مزاجی کے پیرائے میں ڈھلا نظر آ رہا ہے۔ ہم نے بھی

ہم نے پاکیزہ کی دیرینہ دوست، نامور فلم کار اور ڈراما نگار گلشنہ بھٹی سے دل خوش کن اور شگفتگی سے پر بات چیت کا اہتمام کر ڈالا تو انہیں بہنو! آپ کی پسندیدہ لکھاری سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

☆☆☆

پاکیزہ: گلشنہ سے لب و لہجے کی مالک گلشنہ بھٹی آپ کو ہم اس بزم میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کیا لگ رہا ہے یہاں آنا.....؟
گلشنہ بھٹی: پاکیزہ کی محفل میں آنا بے حد اچھا لگ رہا ہے۔

پاکیزہ: ہاں اپنوں میں آ کر تو اچھا ہی لگتا ہے مگر اب کے وقفہ کچھ زیادہ ہو گیا اس کی کوئی خاص وجہ؟
گلشنہ بھٹی: آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس بار میں ایک طویل عرصے بعد پاکیزہ کی محفل میں حاضر ہو رہی ہوں، دراصل افسانہ اور ناول لکھنے مجھے بہت دقت ہو گیا۔ چھوٹی موٹی تحریریں تو دھڑا دھڑھکتی رہتی ہوں مگر ناول بہت نظر انداز ہو رہا ہے اس کی وجہ کچھ تو میری طویل بیماری رہی پھر گھر گھریلو ذمے داریاں اور ڈرامے لکھنے کی مصروفیت..... ان سب کی وجہ سے پرنٹ میڈیا سے دوری واقعی طویل ہو گئی۔ (جی ہاں اسی لیے تو یہ موقع فراہم کیا ہے)

پاکیزہ: گلشنہ آپ کو معلوم ہے پاکیزہ کی اس بزم میں سوالات کا سلسلہ ذرا الگ نوعیت کا ہے آپ تیار ہیں ناں.....؟

گلشنہ بھٹی: پاکیزہ کے منفرد سوالات کے جوابات کے لیے میں دل تھام کر تیار ہوں۔ (شکریہ، نوازش)

پاکیزہ: اللہ آپ کو صحت سے رکھے، اچھا یہ بتائیں ماہنامہ پاکیزہ سے آپ کی وابستگی پرانی ہے کچھ پہلی آمد کا احوال بتائیں گی کہ کب دوستی کا یہ رشتہ استوار ہوا؟

گلشنہ بھٹی: پاکیزہ پڑھنے کا سلسلہ تو لاکھین سے شروع ہوا۔ اسکول کے زمانے میں جب نیم، دہم کا دور تھا تو سہیلیاں مل کر ایک ہی رسالے کی ایک ہی کہانی کو

پولنڈ میں جما کر پڑھتی تھیں کہ صفحات بھی ایک ساتھ ہی پلٹے جاتے تھے تیزی سے پڑھ لینے والی سہیلیاں بے چینی سے باتوں کو گھورتی تھیں کہ جلدی سے صفحہ پلٹو۔ پاکیزہ کے ساتھ بہت حسین یادیں وابستہ ہیں اور میرا پہلا افسانہ جو پاکیزہ میں چھپا وہ 1988ء کا دور تھا اور تب ہر چھپنے والا افسانہ سمجھیں خود کو ایک فائن میں لے جاتا تھا اور کئی دنوں تک دل و دماغ ایک لطف و سرور کی کیفیت میں رہتے تھے۔ (اچھا، بہت خوب)

پاکیزہ: اچھا پہلے اپنے اس شوق کے آغاز کا تھوڑا حال بتائیں کہ اس لکھنے کی صلاحیت کو کیسے دریافت کیا؟

گلشنہ بھٹی: لکھنے کا آغاز بچپن سے بچوں کی کہانیاں پڑھتے، پڑھتے ہی ہوا۔ جب نئی کلاس میں آ کر نیا تعلیمی کورس ہاتھ میں آتا تو میری فیورٹ کتاب اردو کی کتاب ہوتی تھی جو میں ساری کی ساری ایک ہی دن میں پڑھ لیتی تھی۔ میری اردو بہت شاندار تھی اور اس میں میری امی جان کی محنت کا کمال تھا جو مجھے پڑھنے اور لکھنے کی مشقیں بار بار کرواتی تھیں۔ پہلی کہانی میں نے اپنے اردو



گلشنہ بھٹی اپنے شریک سفر بابر شہزاد کے ہمراہ

لکھی..... ”اتفاق میں برکت“ یہ وہ کہانی تھی جو میں نے کورس کی کتاب سے یاد کر کے نہیں بلکہ اپنے دماغ سے سوچ کر لکھی تھی اور اس پر مجھے اپنی لکچر سے پہلے ڈانٹ اور پھر انعام ملا تھا اس کے بعد اردو کی کہانی یا مضمون سلیبس سے یاد کر کے کبھی نہیں لکھا ہمیشہ خود سوچ کر نئی طرز پر لکھا۔ بچوں کی کہانیاں جب میں چھٹی جماعت میں تھی تو بچوں کے جنگ میں چھپنا شروع ہوئیں اور پھر نو نہال، بچوں کا باغ اور تعلیم و تربیت میں چھٹی رہیں..... پھول میں تو کچھ عرصہ پہلے تک لکھتی رہی..... ڈائجسٹ میں افسانے کا آغاز 1986ء سے ہوا۔ (ماشاء اللہ بہت خوب..... تربیت کی سیرجی درجہ بدرجہ ملے گی)

پاکیزہ ♦..... آپ کے مطالعے اور مشاہدے میں زیادہ تر کیسے موضوعات ہوتے ہیں کہ جنہیں پڑھ کر، دیکھ کر آپ کے اندر خود کچھ لکھنے کی تحریک زور پکڑنے لگتی ہے؟

شگفتہ بھٹی ♦..... میرے مطالعے میں زیادہ تر اسلامی لٹریچر ہوتا ہے..... ادب میں بھی میں اصلاحی ادب کو ترجیح دیتی ہوں۔ اگرچہ مجھے منٹو، ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب، بانو قدیر، اشفاق احمد، امرتا برتیم، عصمت چغتائی اور خدیجہ مستور بھی بہت پسند ہیں۔ مگر میں ادب برائے زندگی اور زندگی برائے بندگی کی قائل ہوں..... میرے موضوعات زیادہ تر چادر اور چادر دیواری سے جڑے مسائل ہیں اور میرے لکھنے کی تحریک بھی ایمان، محبت اور خاندان کی کہانیوں سے ہی زور پکڑتی ہے۔

پاکیزہ ♦..... رائٹر یا شاعر پیدا کی ہوتا ہے، اس بات سے کس حد تک متفق ہیں؟

شگفتہ بھٹی ♦..... رائٹر یا شاعر پیدا کی ہوتا ہے..... میں اس سے سو فیصد متفق ہوں..... ہر بچے کو اللہ کچھ صلاحیتیں پیدا کی طور پر دیتا کرتا ہے۔ اور لکھنے کی صلاحیت ازلی نعمت ہے بس دقت اور حالات کے ساتھ یہ پرورش پاتی اور نکھرتی جاتی ہے۔ (بالکل درست..... صلاحیت اور رجحان کے بغیر کسی شے میں ترقی ممکن نہیں) پاکیزہ ♦..... نامور، کامیاب، مقبول عام ادیب،

شگفتہ بھٹی ♦..... کوئی شاعر، ادیب یا مصنف تبھی بام عروج پر پہنچتا ہے جب وہ اپنی اس خدا داد صلاحیت کو پورے اخلاص سے ایک اہم فریضہ سمجھ کر اصلاح معاشرہ کے لیے انجام دے..... اور وہ لکھے جو ہر ایک کے دل کو چھو کر اس کے دود پر ہم کی طرح لگے..... ویسے مسلسل اور انتھک محنت اور مستقل مزاجی سے اور شہرت کی خواہش سے متبرا ہو کر لکھنے والا لازمی بام عروج کو پہنچتا ہے۔ مقصدیت کے بغیر محض ذہنی تفریح اور عیاشی فراہم کرنے والی تحریریں اور مصنف جلدی گناہ ہو جاتے ہیں۔

پاکیزہ ♦..... آپ نے انسانوں سے آغاز کیا پھر ڈراما نگاری کی طرف کیسے آئیں؟

شگفتہ بھٹی ♦..... ڈراما نگاری کی طرف مجھے میرے ناول ہی لائے..... ایک مشہور پروڈیوسر نے میرے ایک ناول کو پڑھا اور مجھ سے رابطہ کیا..... اور پھر مجھے لگا کہ الیکٹرک میڈیا یعنی ٹی وی چینلوں سے بھی اپنا پیغام موثر طریقے سے معاشرے تک پہنچایا جاسکتا ہے۔

پاکیزہ ♦..... آج کا دور تو لگتا ہے اسکرپٹ رائٹنگ کا ہے۔ کیا ہر ادیب، مصنف اس صلاحیت سے بھی مالا مال ہوتا ہے یا یہ زبردستی اختیار کرتا ہے؟

شگفتہ بھٹی ♦..... بلاشبہ..... اسکرپٹ رائٹنگ کا دور ہے لیکن اسکرپٹ لکھنا بھی ایسے ہی ہے جیسے ایک معیاری افسانہ یا ناول لکھنا..... البتہ اسکرپٹ رائٹنگ کی ایک خاص تکنیک ہے جسے بہر حال سمجھنا پڑتا ہے..... مجھے بھی یہ تکنیک سمجھنے میں تھوڑا بہت دقت لگا تھا لیکن ہاں سیکھنے سے اسکرپٹ لکھنا آ جاتا ہے۔ البتہ اسے زبردستی اختیار کرنے سے معیار تو نہیں بن سکتا۔ (جی ہاں درست کہا، ہر شعبے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں)

پاکیزہ ♦..... بیس پچیس سال پہلے کا ڈائجسٹ ادب اور آج کے پاپولرکشن میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟

شگفتہ بھٹی ♦..... بیس پچیس سال پہلے کے اور آج کے ڈائجسٹ ادب میں وہی فرق ہے جو خدا داد صلاحیت رکھنے والے مقصدی اور اصلاحی ادب لکھنے والوں اور



رائٹر شگفتہ بھٹی بڑے فسرز ندفہد حسین کے ساتھ

رائٹرز کی کہانیوں میں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ معذرت کے ساتھ کہوں گی، آج شوق اور شہرت کی خاطر لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔۔۔۔۔ اس لیے کہانی میں حقیقت کم اور فکشن زیادہ ہے۔۔۔۔۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ اسلام اور دین کو بھی فکشن بنا کر محض اپنے نام کی انفرادیت کے لیے لکھا جا رہا ہے۔ (بڑی گہری بات کہہ دی شگفتہ)

پاکیزہ ♦۔۔۔۔۔ کہتے ہیں خواتین ہی خواتین کے مسائل سمجھ سکتی ہیں، جیسی آج خواتین ڈراما نگاران کی بہتات ہے اور زیادہ تر گھریلو رشتوں کے مابین تعلقات کو زیرِ قلم لایا جا رہا ہے۔ کیا یہ محدود طرزِ فکر نہیں؟

ہمارے ٹی وی چینلوں کو تو صرف اور صرف یا تو روتی چٹتی عورت پر کہانی چاہیے یا پھر رونے اور برباد کر کے گھر اجاڑ دینے والی عورت پر۔۔۔۔۔ باقی سب آئیڈیاز اور کہانیوں کو تو آج کے چینلوں کی نوکری میں ڈال دیتے ہیں۔ بھی آج کسی کو اصلاحِ معاشرہ کی ضرورت نہیں بلکہ ریٹنگ کے ہائی گراف کی ضرورت ہے۔ (یہی تو روتا ہے، اسی مادیت پرستی نے کیا ان کے اپنے گھروں کے ماحول اور تربیت کو متاثر نہیں کیا ہوگا)

پاکیزہ ♦۔۔۔۔۔ اچھا سنجیدہ گفتگو تو چلتی رہے گی، یہ کچھ ضروری امور تھے جن کے متعلق پوچھا گیا۔ اب یہ بتائیں کہ دورِ حاضر میں اور مستقبل میں بھی ان ڈائجسٹ رائٹرز اور پاپولر فکشن لکھنے والوں کو کیا مقام ہے؟

شگفتہ بھٹی ♦۔۔۔۔۔ دورِ حاضر میں جو لوگ معیاری کام کر رہے ہیں ان کا معاشرے میں اور اپنے مداحوں کے دلوں میں بہت بلند مقام ہے۔۔۔۔۔ باقی جو بحث عرصہ دراز سے ڈائجسٹ رائٹر اور ایک ادبی لکھاری

شگفتہ بھٹی ♦۔۔۔۔۔ خواتین رائٹرز کی تعداد واقعی ماشاء اللہ ڈراما نگاری میں بڑھ گئی ہے مگر افسوس کہ خواتین اب خواتین کے حقیقی مسائل کو اجاگر کرنے کے بجائے ان کے منفی کردار کو پروڈیو اسکریپٹ پر زیادہ دیکھا رہی ہیں۔ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ طرزِ فکر محدود ہے بھی تو سانس، بہو، ظالم نندہ اور جاہل مردوں کے گرد ہی ہر کہانی گھومے جا رہی ہے۔ (یہی تو افسوس ہوتا ہے، تنگ نظری اور ظاہری شوٹا میں گھری خواتین کو مزید جہالت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے)

پاکیزہ ♦۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے جس طرح وسیع کیونز پر امجد اسلام امجد، اصغر عدیم سید، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ نے اسکرپٹ رائٹنگ کی۔ اب اس ہنر کا فقدان ہے آپ کا کیا خیال ہے؟

شگفتہ بھٹی ♦۔۔۔۔۔ کاش پھر سے ان نامور لکھاریوں جیسا لکھنے کی اجازت ہمیں۔۔۔۔۔ مطلب آج کے ڈراما نگار کو بھی چینلوں مالکان اور ادرا باب اختیار دے دیں۔ مگر افسوس

کے مقام کی پہلی آڑی ہے وہ ہنوز دہری لکڑی ہے (معدرت کے ساتھ) ادبی رسالوں میں بے ادب اور غیر معیاری کہانیاں لکھنے والے آج بھی ڈائجسٹ کے بہترین لکھاریوں کو لکھاری کی نہیں مانتے اور میرے خیال میں یہ محض ان کے دماغ کا فتور ہے اور کچھ نہیں..... (خود پرستی اور خود ستائی کے بجائے خود سازی پیدا ہو جائے تو آفاقی ادب تخلیق پاتا ہے)

پاکیزہ..... آج کل مختصر کہانیاں انٹرنیٹ پر دی جارہی ہیں اور رائرز کی ایک بڑی کھپ جلدی، جلدی تیار کی جارہی ہے یہ رجحان کیسا ہے؟

گھٹتہ بھٹی..... مختصر کہانیاں انٹرنیٹ پر لکھنے والوں کی جتنی جلدی، جلدی کھپ تیار کر کے ان سے جو کام کر دیا جارہا ہے وہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی پانی کا بلبلہ بڑا ہو کر تیزی سے آسمان کی طرف اڑتا ہے مگر چند لمحوں کی اڑان کے بعد پھٹ کر ختم ہو جاتا ہے۔

پاکیزہ..... کیا صرف کہانیاں لکھ کر حتی ادب، حتی تحریر ادا ہو سکتا ہے؟

گھٹتہ بھٹی..... بالکل کہانی کا راچی، معیاری

اور سبق آموز کہانیاں لکھ کر حتی ادب ادا کر سکتا ہے۔ وہ لوگوں کے ذہن کی منفی سوچوں کو، مثبت سوچوں اور تلخ ردیوں کو محبت میں بدل دے تو یہ ایک جہادی کام ہے۔

(جی بالکل درست کہا)

پاکیزہ..... میرا مطلب ہے جیسے گفتگو میں تاثیر جب ہی آتی ہے جب بولنے والا باطل اور اٹلی کردار کا ہو اسی طرح کا معاملہ مصنف کے ساتھ بھی ہوتا ہے یا نہیں.....؟ میں محض لکھ دیا جیسی تو ہر تحریر میں وہ گہرائی د گہرائی نہیں ہوتی جو پڑھنے والے کو ایک دم سونپے پر مجبور کر دے..... آپ کیا کہیں گی اس بارے میں.....؟

گھٹتہ بھٹی..... جی میں آپ کے مطلب سے سو فیصد متفق ہوں کیونکہ بنا عمل کے محض الفاظ تاثیر نہیں رکھ سکتے..... جی تو آج کل دن اور فلسفے پر بہت گہری کہانیوں کے رائٹرز کی جب عملی زندگی لوگوں کے سامنے آتی ہے تو وہ اس کہانی اور کہانی کا رد و نوں سے بدظن ہو جاتے ہیں اور یہ افسوس ناک صورت حال ہے۔ (جی ہے تو..... اگر سمجھ

آجائے

پاکیزہ..... آج جب کوئی تحریر منظر عام پر آنے سے پہلے ہی اس کا لکھنے والا چاہے وہ نو آموز ہی ہو مشاہیرے اور اعزازے پر بات کرنے لگتا ہے تو کچھ عجیب لگتا ہے، آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

گھٹتہ بھٹی..... مشاہیرے یا اعزازے یا سہاں کے بہترین ایوارڈ کے حصول کے لیے لکھنے والوں کو وقتی طور پر یہ سب نصیب بھی ہو جاتا ہے مگر دائمی عزت ہمیشہ بے لوث اور بے غرض لوگوں کو ملتی ہے جو لکھنے کو پروفیشن سے زیادہ اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

پاکیزہ..... آپ کی بات کسی حد تک درست مگر وہ

جو William Wordsworth نے کہا تھا ناں کہ

ادیب یا شاعر کا اظہار کیا ہے؟ spontaneous

overflow of powerful feelings

..... صلاحیتیں اپنا اظہار تو چاہتی ہی ہیں اور اپنے آپ کو خود

منوائی ہیں۔ آپ کے اندر کا ہنر خود بولتا ہے.....

انعامات، اعزازات، بخششیں اور اسناد لوگ عطا کرتے

ہیں، آپ کے ٹیلنٹ کو دیکھ کر..... کس حد تک یہ بات

درست ہے؟

گھٹتہ بھٹی..... ہمارے یہاں اعزازات مانگنے

والے اور ایسوں کو جان بوجھ کر دوسروں کا حق مار کے دینے

والے بہت ہیں..... اب ان معاملات میں بھی غرض اور

ذاتی تعلقات و معاملات کا بہت عمل دخل ہے لیکن

تاقیات مت جو ایک بات حق رہے گی، وہ ہے..... اللہ جسے چاہے

عزت دے اور عزت اسی کو دیتا ہے جو اس کا حق دار

ہے۔ (واہ کیا بات کی ہے بہت خوب)

پاکیزہ..... اچھا کچھ اپنی ذاتی زندگی کے بارے

میں بھی بتائیں، کہانیاں تو آپ نے خوب لکھیں۔ اپنی

زندگی کی کہانی کے بارے میں بتائیں آپ کے اس مکلم

کاغذ کے شوق نے گھر والوں اور ارد گرد کے لوگوں سے

کس حد تک پریرانی پائی؟

گھٹتہ بھٹی..... ذاتی زندگی الحمد للہ بہت اچھی

ہے..... خوشی اور غم کے ذائقے کو اللہ نے مناسب اور

مزے دار رکھا ہوا ہے..... کبھی تلخ کبھی شیریں..... جہاں



چھوٹا بیٹا محمد زید

افزائی اور اعتماد آپ کو کامیابی کی سیر جیوں پر ڈمگائے نہیں دیتا آپ کیا کہیں گی اس بارے میں؟

ٹکفٹہ بھٹی ۞..... جی ڈمگاتے قدموں کو گھر سے ایک سنبھالنے والا ضرور ہوتا ہے جیسے مجھے میری ای حوصلہ نہ دیتیں تو شاید میں بھی آج ٹکفٹہ بھٹی نہ ہوتی۔ (ٹکفٹہ بھٹی تو ہوتیں پر کامیاب قلم کار و نامور مصنفہ کے ساتھ نہیں لگے ہوتے)

پاکیزہ ۞..... اب تک کے ادبی کارنامے کتابی شکل میں بھی آئے؟

ٹکفٹہ بھٹی ۞..... میرے دس ناول کتابی شکل میں موجود ہیں..... مزید ان شاء اللہ جلد منظر عام پر آئیں گے۔ (مبارک!)

پاکیزہ ۞..... آج کل کیا مصروفیات ہیں؟ گھریلو زندگی کو ان مصروفیات کے ساتھ کس طرح نبھاتی ہیں؟

ٹکفٹہ بھٹی ۞..... آج کل بچوں کے ادب پر کام کرنے کا ارادہ ہے جسے اللہ کرے جلدی انجام تک لے آؤں..... بانی گھر، بچوں اور خاندان کی ذمہ داریاں ہیں جنہیں نبھانے کے لیے لکھنے کو بہت قربان کرنا پڑتا ہے اکثر مفتوں اور مہینوں پر ایثار چلتا رہتا ہے۔ (جی یہ ایثار تو اکثر چلتا ہے۔)

پاکیزہ ۞..... اپنی فیملی کا مختصر تعارف بھی ضرور کروائیں؟

ٹکفٹہ بھٹی ۞..... میرے شوہر بابر شہزادو کیمیکل

بہنی فاطمہ

لکھاری کے طور پر گھر اور خاندان سے پزیرائی کا معاملہ ہے تو یہاں بھی گھر کی مرغی دال برابر ہے..... باقی تو کبھی کسی نے خاص حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ایک میری امی جان تھیں جو میری ہر تحریر پر کاٹ کر سنبھال لیتیں اور میرے ہر انعام کو سچا کر رکھتی تھیں اور اب میرے بچے الحمد للہ میرا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ (ارے ہاں یہ تو ہوتا ہی ہے خیر..... مگر وہی لوگ چپکے، چپکے خوش بھی ہوتے ہیں بس اظہار نہیں کرتے اور جو بدخواہ ہوتے ہیں تو ان کے عمل سے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے)

پاکیزہ ۞..... ویسے آج بھی ذرا مشکل سے ہی قبول کیا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ ارے لڑکی تو افسانوں کہانیوں کی باتیں کرتی ہے، زندگی کی حقیقتوں سے دور ہوگی..... کیوں ایسا نہیں ہے کیا؟

ٹکفٹہ بھٹی ۞..... جی ایسا آج بھی ہوتا ہوگا مگر پہلے کے معاملے کی نسبت بہت کم..... کیونکہ جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا تو میری امی کو بہت طعنے سننے پڑے بہت سی ناراضیاں کو سہنا پڑا تھا لیکن انہوں نے مجھے تب بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا تھا تو آج بھی جہاں چراغ بجھانے والی پھونکیں ہوتی ہیں وہیں ایک ہاتھ بار، بار اس چراغ کو جلائے میں بھی مصروف رہتا ہے۔ (یہی تو وہ حوصلہ اور مدد ہوتی ہے۔ جو کامیابی کے زینے پر چڑھنے میں مددگار ہوتی ہے، بس ہمت نہیں ہارنی چاہیے)

پاکیزہ ۞..... اصل میں گھر والوں کی ہی حوصلہ

انجیر میں کر جاب کسی اور شے میں کر رہے ہیں۔ بچوں میں..... بڑا بیٹا فہد حسین میڈیا سائنسز میں BS فاضل ایئر میں ہے۔ پھر بیٹی فاطمہ ہے فیشن ڈیزائننگ BS کے تھرڈ سمسٹر میں اور پھر بیٹا محمد زید..... ایف ایس سی سینٹر ایئر میں..... امی اللہ کو چاری ہو گئیں..... ابو کو اللہ صحت و سلامتی دے..... ہم پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں بھائی اللہ..... (اللہ آپ دونوں کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنی نصیب ہوں۔ اے امی آمین)

پاکیزہ!..... آپ کے بچوں میں یہ صلاحیت کس حد تک آئی؟

گفتہ بھئی!..... میرے دونوں بیٹوں میں لکھنے کی صلاحیت الحمد للہ موجود ہے بڑا بیٹا فہد تو ماشاء اللہ اسکرپٹ رائٹنگ کر رہا ہے۔ اس کا رجحان قلم کی طرف زیادہ ہے اور ویب سیریز لکھ رہا ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ!..... نئی نسل کی تربیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔ آج کی ماؤں کو بے حد ٹھن مراحط کا سامنا ہے، کچھ گاؤں کریں؟

گفتہ بھئی!..... آج کی ماں بچوں کی تربیت کے معاملے میں غیر سنجیدہ ہے۔ ورکنگ وومن ہے تب بھی اور باؤس وائف ہے تب بھی..... ہر کام جانفشانی سے تو کر رہی ہے، بچوں کی ضرورتوں کو اہمیت دیتی ہے لیکن تربیت کو نہیں..... اور اسی وجہ سے بچوں کے ذہنی اور معاشرتی مسائل بڑھتے جا رہے ہیں۔ میرا ماؤں کو پیغام ہے..... بچوں کی تربیت کو اولین ترجیح دیں، ان پر محنت کریں..... یہی ہماری دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہیں۔ بلاشبہ بہت ٹھن کام ہے مگر اسے ہر حال میں ان کے پورے حقوق سے آگاہ ہونا چاہیے اور انہیں ادا کرنا چاہیے۔ (بالکل درست کہا..... دعا ہے کہ آج کی ماں ہم سمیت اپنی اس سب سے بڑی ذمہ داری کو عبادت سمجھ کر بہ احسن پورا کرے، آمین)

پاکیزہ!..... اچھا اپنی پسند ناپسند سے بھی ہمارے بڑھنے والوں کو آگاہ کریں؟ من پسند لباس، خوشبو، ذائقہ، تفریحی مقام کھانا، جملہ، رشتہ، وقت، شخصیت، تہوار اور ادیب یا ادیبہ بھی.....؟

گفتہ بھئی!..... من پسند لباس شلوار قمیض دوپٹا..... خوشبو پھولوں میں چنبیلی، موتیا اور پرنیوم جارلی..... ذائقہ نمکین، تفریحی مقام، اسلام آباد..... کھانا..... پلاؤ اور شامی کباب، سردیوں میں ساگ، ویسے کچھ بھی ناپسند نہیں..... رشتہ ماں کا..... پہلے اچھی ماں اچھی لگتی تھی اب خود ماں ہونا اچھا لگتا ہے۔ وقت شام کا..... تہوار، دونوں عیدیں، شخصیت پیارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم..... ادیب، ممتاز مفتی..... ادیبہ بانو قدسہ۔

پاکیزہ!..... بہترین زندگی گزارنے کے تین کامیاب نسخے؟

گفتہ بھئی!..... ایثار، محبت اور شکر گزاری۔

پاکیزہ!..... کیا ہم ارد گرد کے سب لوگوں کو بیک وقت خوش رکھ سکتے ہیں، ہاں تو کیسے؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

گفتہ بھئی!..... سب کو بیک وقت خوش رکھنا مشکل ہے مگر کوشش کرتے رہنا چاہیے اور بہترین طریقہ درگزر اور حسد سے دل پاک رکھنا ہے اور سب سے ضروری کام ہے جو آپ سے ناراض ہے اسے مٹانے میں پہل کر لیں۔ (جی ہاں کہا تو درست ہے مگر اتنا کا بھاری بھر کم پہاڑ کیسے سر کیا جائے)

پاکیزہ!..... آپ نے اپنی تحریروں میں کن نکات کو، کن اصلاحی پہلو یا تفریحی پہلوؤں کو توجہ نظر رکھا؟

گفتہ بھئی!..... میری تحریروں میں عورت کو اپنے حقوق کے ساتھ فرائض کی یاد دہانی ہے اور گھر کو اجاڑنے کے بجائے بسائے رکھنے کی تلقین..... کیونکہ عورت اگر اچھی اور باعمل ہو تو گھر، خاندان اور اعلیٰ نسلیں تک سنور جاتی ہیں۔ مگر مضبوط ہوں تو معاشرہ مستحکم ہوتا ہے، ان سب کی بنیاد عورت کے کردار اور عمل پر منحصر ہے اور میری کہانی میں تفریح طبع کے ساتھ یہی سبق ملتا ہے..... بس کوشش کرتی ہوں ویسے کوئی نا مح نہیں ہوں خود میں ہزار کیاں، کوتاہیاں رکھتی ہوں۔ (دوہر شخص میں ہوتی ہیں مگر شگفتہ اپنا کام تو کرتے رہتا چاہیے ناں)

پاکیزہ!..... زیادہ لطف تمس میں آیا..... افسانہ، ناول یا اب ذرا ناگاری میں؟



گھٹتے جیسی..... زیادہ
 لطف ہمیشہ ناول لکھنے میں آیا.....
 وہاں چینل کی پالیسی اور مرضی
 آڑے نہیں آتی۔ (بس جلدی
 سے اس نے لطف لے ہی لیں)
 پاکیزہ..... قاری کا
 معیار مطالعہ کیا ہوتا ہے؟ کیا
 ادیب بنانا ہے، ماحول بنانا ہے یا
 معاشرتی اقدار؟
 گھٹتے جیسی..... قاری کا

گھٹتے جیسی اور پارسہ ادا صنفیان (ایران) کی سیر کرتے ہوئے

کوئی مشورہ، تنقید، تحریف، کوئی پیام سلام؟
 گھٹتے جیسی..... پاکیزہ کی یہ بزم بہت منفرد اور
 پیاری تھی..... یہ سلسلہ جاری رہتا چاہیے۔
 پاکیزہ! بہت نوازش گھٹتے..... آپ کے ساتھ گفتگو
 کرتا اور آپ کے نادر خیالات سے آگاہی بہت حسین
 تجربہ رہا گویا ہم ایک لائونج میں بیٹھے دل کی باتیں کر رہے
 ہیں۔ اللہ آپ کے زور قلم اور صلاحیتوں کو دوام
 بخشنے..... اکی آمین.....

☆☆☆

جی تو بہنو! آپ کو بھی ہماری پیاری رائٹر کی کھری،
 کھری اور ہر لطف باتیں یقیناً پسند آتی ہوں گی۔ بس اسی
 طرح ہم آپ کی فرمائشیں پوری کرتے رہیں گے۔ اس
 بزم کے بارے میں اپنی جتنی آرا سے ضرور نوازیے گا۔
 چلتے، چلتے بس ایک چھوٹی سی کام کی بات ضرور یاد
 رکھیں..... خود بھی خوش رہیں۔ اپنے پیاروں کو بھی خوش
 رکھیں اور دوسروں کو خوش دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھیں۔ اسی
 پیغام کے ساتھ اجازت..... پھر حاضر ہوں گے۔ ان شاء اللہ

جنوں کے راستے یوں تو کھٹن سے لگتے ہیں
 مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
 زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
 عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

معیار جو ادیب بنانا ہے وہ
 میرے خیال میں معاشرتی اقدار ہونا چاہیے۔ باقی ہر ایک
 کا ماحول اس کے پسندیدہ ادب پر اثر انداز ضرور ہوتا ہے
 یعنی اپنے ماحول کے مطابق قاری ویسا ہی ادب پسند کرتا
 ہے۔

پاکیزہ..... نئے لکھنے والوں کے لیے کوئی پیغام،
 کوئی نئی بات بتانا چاہیں گی؟
 گھٹتے جیسی..... خدا را! شہرت کی خاطر مت
 لکھیں..... دولت کی خاطر مت لکھیں..... مالی ضرورت
 پوری کرنے کے لیے ضرور لکھیں۔ لیکن بے مقصدیت اور
 بے راہ روی پڑتی مت لکھیں۔ اپنی بنیوں، بہنوں اور بہوؤں
 کی اصلاح کے لیے لکھیں، بگاڑ کے لیے مت لکھیں۔ (اللہ
 کرے آپ کی باتیں سب کے دلوں میں بھی اتریں)
 پاکیزہ..... پاکیزہ قارئین کے نام کوئی خوب
 صورت بات؟ کوئی یادگار جملہ، کوئی خوشگوار تجربہ.....؟

گھٹتے جیسی..... خوب صورت بات جو میری
 از و واجی زندگی کے ہر غم کا دوا بنی..... میری ایک بہت
 پیاری دوست صائمہ عزیز نے کہی تھی..... ”گھٹتے، ہم اپنے
 نصیب دوبارہ نہیں لکھوا سکتے۔ مگر اپنے ممبر اور شکر سے
 زندگی کو خوشی سے گزارنا سیکھ سکتے ہیں..... اپنی مایوسیوں کو
 اپنی خوشیوں سے امیدوں اور کامیابیوں میں بدل سکتے
 ہیں.....“ یہی خوب صورت بات نسخہ کارگر ہے۔ جو مجھے
 بھی نہیں بھولتی۔ (واہ بہت خوب)

پاکیزہ..... ہماری اس بزم میں آکر کیسا لگا.....



عالمی یوم نسوان اور حقوق نسوان

شائستہ زریں

میں نہیں، کئی خواتین بے خبر ہیں کہ ان کا بھی کوئی دن منایا جاتا ہے اور ایسی خواتین بھی موجود ہیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ برسا برس کی جہد مسلسل کے باوجود.....

ندوہ سورج نکلتا ہے نہ اپنے دن بدلتے ہیں امید کے دیے بجھنے نہیں دیتیں۔ منوائے جانے والے بعض حقوق ایسے بھی ہیں جو عالمی یوم نسوان کے اولین برسوں سے آج تک ارباب اختیار و اقتدار کی ذاتی توجہ کے طالب ہیں۔

ان ہی امور کے پیش نظر ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کر کے شرکاء سے معلوم کیا کہ..... سوال: کیا آپ عالمی یوم نسوان منانے کے حق میں ہیں؟

سوال ۲: آپ کے خیال میں خواتین کے وہ کون سے حقوق ہیں جو ایک صدی کی جدوجہد کے باوجود بھی تسلیم نہیں کیے گئے؟

ڈاکٹر شائستہ آفندی

(بن سرجن)

۱: بالکل، میں حق میں ہوں کہ کسی بھی صورت میں خواتین کا عالمی دن منایا جائے۔ خواتین کی بہتری کے لیے کچھ ضرور ہونا چاہیے۔

۲: آج تک خواتین کو وہ عزت نہیں مل سکی جس کی وہ حقدار ہیں اور اس کے لیے سب سے پہلے خواتین کو اپنی عزت خود کرنی ہوگی۔ اس کے بعد خواتین کو ایک دوسرے کی عزت کرنی ہوگی۔ اسی طرح معاشرے میں

معزز قرار نہیں! گزشتہ صدی سے اقوام متحدہ سے پاس کردہ مل کے تحت مختلف ایام منانے کا آغاز ہوا جو رداں صدی میں پرنٹ، الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے طفیل زیادہ شدت سے زور پکڑتا جا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہے کہ عوام تک اس کی رسائی ہو رہی ہے۔ ورنہ تو پہلے یہ خوشی خواص اور وہ بھی محض متعلقہ افراد تک محدود تھی۔ مغربی ممالک سے جنم لینے والے ان میں سے بعض ایام محض ان کی ضرورت تھے کہ وہاں اپنوں کو بیکانہ بنا کر سال میں ایک دن ان کے نام کر کے ان کو ان کی اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ یہ روشنی بھی محض ایک دن ان کے حصے میں آئی ہے ورنہ سال کے ۳۶۵ دن ان کے نصیب میں، تنہائی کا اندھیرا، یادوں کا ریل اور انتظار کا بکھیرا ہوتا ہے۔ بعض دن حقوق کے نام پر بھی منائے جاتے ہیں ان ہی میں سے ایک عالمی یوم نسوان بھی ہے۔ امریکی محنت کش خواتین نے اپنے اوقات کار میں کمی، بہتر اجرت اور حق رائے دہی کے استعمال کے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کی اور جلوس نکالا جسے اس وقت تو تشدد سے ناکام بنا ڈالا لیکن جو چنگاری سنگ اٹھی تھی اس کے شعلے بھڑکتے رہے۔ بالآخر اقوام متحدہ نے عالمی سطح پر سال میں ایک دن خواتین سے منسوب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں ایک صدی کا عرصہ بیت گیا خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہی ہیں اور دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی عالمی یوم خواتین منایا جاتا ہے بعض خواتین یہ دن منانے کے حق



ان کی عزت ہونی اور ماؤں کو اپنے بیٹوں کی تربیت میں یہ بات لازمی شامل کرنی چاہیے کہ وہ خواتین کی عزت کریں اپنی ماں، بہنوں، بیٹیوں اور خاص طور پر اپنی شریک حیات کی کہ وہی خاندان کو آگے چلاتی ہیں۔

پروفیسر شاہدہ حسن

(ماہر تعلیم)

۱: اس دن کا مقصد خواتین کے حقوق کا تحفظ اور معاشرے کو ان کے حقوق سے آگاہ کرنا، ان پر قسم کے تشدد سے گریز کرنا، تعلیم، صحت اور معاشی آزادی کی بہترین سہولیات فراہم کرنا ہے۔ مگر آپ دیکھ سکتی ہیں کہ جس سماج میں بحیثیت مجموعی ہر سطح پر ناہمواری، منافقت، استحصال اور انتہا پسندی کا دور دورہ ہو رہا ہے مرد و عورت دونوں کی حالت کم و بیش یکساں ہی ہوتی ہے۔ ایک مدت سے ہمارے ملک میں رکی و رواہی طور پر یہ دن منایا جا رہا ہے۔ اور آئندہ بھی اس کے منانے میں کوئی حرج نہیں۔ مگر غور کیجیے کہ اس دن ہوتا کیا ہے؟ بس تھوڑی سی باتیں، شور شرابہ اور سیمینار منعقد ہو جاتے ہیں، تقریریں کی جاتی ہیں، جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ بے شک عورتوں کے حوالے سے کچھ نئے قوانین، کڑشتہ کچھ برسوں میں ضرور متعارف کروائے گئے ہیں۔ مگر وہی ردیوں میں تو آج تک کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ خواتین کی ٹڈیل کے ایسے، ایسے بھیانک واقعات روزانہ مسلسل سامنے آتے ہیں کہ یقین نہیں آتا اور اس میں جاہل اور ان پڑھ لوگوں کے ساتھ، ساتھ پڑھا لکھا اور معزز طبقہ بھی ملوث ہے۔

ان کی ایدہ و سادہ زندگی سے یا کوئی مل پاس کرانے سے ہرگز نہیں ہوتا۔ انہیں جب تک پوری قوت سے سماج میں نافذ نہ کر دیا جائے اور اس کے لیے سزا جزا طے نہ کی جائے یہ مردہ دے اثر ہیں۔ اس حوالے سے ہم ترقی پزیر اقوام کے معاملات تو یقیناً بہت ناگفتہ بہ ہیں۔ یہاں تو عورت کو ابھی انسان کا درجہ دینے میں بھی بڑا تذبذب موجود ہے۔ ان کی آواز کی اہمیت ہے، نہ احترام ہے، نہ ان کے جذبات و احساسات اور نفسیاتی، معاشی اور فکری ضرورتوں کا کوئی احساس۔ کچھ این جی اوز کوششیں کرتی رہتی ہیں تو کچھ نہ کچھ قوانین بنا دیے جاتے ہیں۔



مل پاس ہو جاتے ہیں مگر ان کے اطلاق کی صورت حال بے حد بائوس کن ہے۔

میں ایک رپورٹ پڑھ رہی تھی ۲۰۰۰ء میں انٹرنیشنل کیونٹی نے خواتین کے لیے اپنے آٹھ

ترقیاتی منصوبوں کا اعلان کیا تھا۔ اس میں عورتوں کی خود مختاری، معنی مساوات، بچوں کی پیدائش کے دت ماؤں کی اموات پر کنٹرول، عورتوں کا معاشی استحکام، ملکی سیاست اور فیصلہ سازی میں ان کا بھرپور حصہ اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ان کی بلا امتیاز شراکت، مساوی اجرت وغیرہ، وغیرہ جیسے منصوبے شامل تھے۔ مگر اب ۲۰۱۸ء کی تفصیلات سے پتا چلا ہے کہ اس سارے ٹارگٹ کو حاصل کرنے میں انہیں بھی مکمل کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ جس کی توقع کی گئی تھی۔ صرف تعلیم کے شعبے میں معنی امتیاز کو ختم کرنے میں کامیابی ملی ہے۔ باقی شعبوں میں کوششیں کی جا رہی ہیں۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ وہاں (یعنی مغرب میں) عورتیں اپنے حقوق کے لیے بہت سرگرم ہیں اور

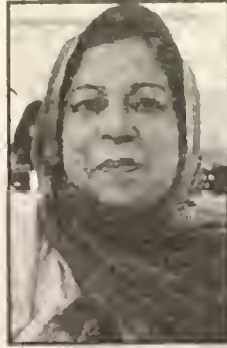
اور اس کا جواب ہے۔ اگر اس کا جواب ہے کہ اس کا جواب ہے۔
 ہے۔ حکومتی سطح پر اس سلسلے میں کوئی کام ہوتا
 چاہیے۔ جہاں تک این جی اوز کا تعلق ہے وہاں تو
 صرف نمائش اور دکھاوا ہے اور کچھ نہیں۔

سیما مناف

(قلم کار)

ا: ہرگز نہیں میں کسی بھی دن کو منانے کے حق میں
 نہیں ہوں۔ سارے دن ہمارے ہیں۔ چاہے والدین
 کا خاص دن ہو۔ محبت کا خاص دن ہو یا خواتین کا خاص
 دن۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پورے سال تو ہم

غفلت میں پڑے
 رہیں اور ایک مخصوص
 دن کو منا کر ہر ذمے
 داری سے بری الذمہ
 ہو جائیں۔ یہ دن منانا
 مغرب کی ایجاد ہے،
 ان کے پاس اپنوں
 کے لیے وقت ہی نہیں۔
 اس لیے وہ صرف
 ایک دن اس شخص



کو اہمیت دے کر خوش ہو جاتے ہیں۔ اور رہی آج ن
 عورت؟ تو صدیوں پہلے میرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ
 وسلم نے اس کے حقوق دے کر سب کو بتا دیا تھا کہ
 اسلام میں عورت، ماں، بہن، بیوی، بیٹی کی کیا اہمیت
 ہے؟ (جسے ہم سب بخوبی جانتے ہیں) پھر ہمیں کیا
 ضرورت ہے اس دن کو منانے کی، ہاں مغرب کو ہوگی،
 ہمیں نہیں ہے۔

۲: شہر کی عورت کو تو وہ سارے حقوق حاصل ہیں۔
 وہ گھر میں بھی ملکہ ہے۔ باہر نکلتی ہے پڑھنے کے لیے،
 کمانے کے لیے، تفریح کرنے کے لیے، میل ملاپ
 کے لیے، درس دینے اور سننے کے لیے پھر اسے اور کون
 سے حقوق چاہئیں؟ ہاں گاؤں کی عورت کا اب تک
 احتیصال ہو رہا ہے۔ وہ گھر سنبھالنے کے ساتھ، ساتھ
 کھیتوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کام کرتی ہے۔ پھر
 بھی شوہر اور سرال والوں سے جوتے کھاتی

شازیہ انوار

(جوائنٹ ایڈیٹر اور سینئر

منیجر ہم نیٹ ورک لمیٹڈ)

ا: ضرور منانا چاہیے۔ اس بحث سے قطع نظر کہ
 سارے دن کس کے ہوتے ہیں اور کس کے نہیں اگر ہم
 سال کا ایک دن صرف اور صرف خواتین کے نام سے
 منسوب کر دیں اس دن اس کے خوالے سے کچھ اچھی
 باتیں کر لی جائیں تو میں نہیں سمجھتی کہ اس میں کوئی
 مضائقہ ہے۔



۲: آپ کے
 جواب سے پہلے میں
 ایک سوال کرنا چاہوں
 گی کہ عورتوں کو کون
 سے حقوق حاصل
 ہوئے ہیں؟ آج ہمیں
 جو عورتیں معاشرے
 میں فعال نظر آ رہی ہیں
 کیا وہ کسی کی جدوجہد کا

نتیجہ ہیں؟ اگر ایسا کوئی سمجھتا ہے تو وہ بالکل غلط ہے۔
 آج بالخصوص مشرقی معاشرے میں جتنی بھی خواتین
 آپ کو گھروں سے باہر نکل کر کام کرتی نظر آ رہی ہیں،
 وہ ایک تو ان ٹی بھر پڑھے لکھے مردوں کی مرہون
 منت ہے جنہوں نے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو تعلیم کے
 زیور سے آراستہ کیا، ان پر اعتماد کیا اور انہیں اپنی زندگی
 اپنے مطابق گزارنے کا حق دیا یا پھر ہماری عورتیں ان
 مردوں کی وجہ سے گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور ہیں جو
 اپنے گھروں کے معاشی مسائل حل کرنے سے قاصر
 ہیں۔ علاوہ ازیں خواتین کو ان کے کون سے حقوق
 حاصل ہوئے ہیں؟ کیا ہماری عورت کو معاشرہ عزت کی

ہیں اور دہی کیا شہری خواتین بھی محض اس ڈر سے اپنا یہ حق چھوڑ دیتی ہیں کہ ”لوگ کیا کہیں گے“ حالانکہ لوگ کچھ نہیں کہتے۔ یہ ہمارے ذہن کی اختراع ہے۔ ہمارے وزیر اعظم نے خواتین کے حقوق کے لیے ایک سبیل بنایا ہے اور خاص طور پر دراشت کے لیے۔ ہم کو چاہیے کہ اس آسانی سے فائدہ اٹھائیں۔

شگفتہ فرحت

(سماجی و ثقافتی شخصیت)

۱: بالکل حق میں ہوں، عورتوں کا استحصال برسوں سے جاری ہے۔ اگر یہ عالمی دن عورتوں کے نام سے منسوب ہے تو ہم خواتین اپنے حقوق کے لیے کیوں نہ اپنی آواز بلند کریں۔



۲: دراشت میں خواتین کا جائز حصہ، شوہر سے علیحدگی کی صورت میں۔ عدالت عالیہ میں عورت کی گواہی کی صورت میں ایک آواز کا مکمل نہ ہونا (یعنی دو عورتوں پر مشتمل گواہی) کار و کاری، زنا بالجبر، تیزاب گردی پر سخت قوانین کا نفاذ نہ ہونا۔ اور اس کا نفاذ جب ہی ممکن ہے جب عورت کو با اختیار بنایا جائے۔ گھر سے لے کر صوبائی اسمبلی تک، قومی اسمبلی، سینیٹ میں ان کی تعداد، آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے تو یہ تمام قوانین نافذ ہو سکتے ہیں۔

انجیلین ملک

(ٹی وی آرٹسٹ)

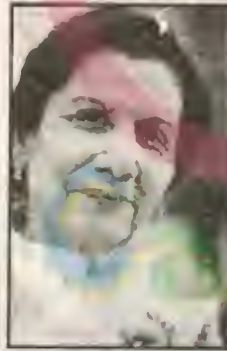
۱: ہمیں ابھی آگہی کی ضرورت ہے۔ جس طرح ہم اور دوسرے دن مناتے ہیں اسی طرح ہمیں خواتین کا

کی طرف سے خوش آمدید کہا جاتا ہے؟ عورت پر مبنی لکھی ہو، ان پڑھ، گھریلو ہو یا ملازمت پیشہ اسے ایک ہی طرح کے مسائل اور نظروں کا سامنا ہے، گزری ہوئی ایک صدی میں کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ عورت عزت چاہتی ہے اور معاشرے کو اسے سنت نبوی کے مطابق عزت دینی چاہیے۔ جب آپ عورت کو خواہ وہ آپ کی بہن ہو یا کسی اور کی، آپ کی ماں ہو یا کسی اور کی عزت دیں گے تو عورت کا مقام خود بخود بلند ہوگا اس کے جملہ حقوق اسے حاصل ہو جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہوگا کیسے؟ یہ میں کروں گی اور آپ کریں گی اپنی اولاد کی تربیت کے ذریعے۔ بہ صورت دیگر اگلی ایک صدی کے بعد بھی ہم سے یہی سوال کیے جا رہے ہوں گے۔

طلعت ترین

(صحافی)

۱: جی بالکل منانا چاہیے۔ اس سے بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک احساس زندہ رہتا ہے کہ ہمارا یعنی خواتین کا کوئی وجود ہے۔ بعض لوگ صرف فیشن کے طور پر یہ دن مناتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس دن ان خواتین کو ڈھونڈ کر ان کی مدد کرنی چاہیے جو کمپری میں زندگی گزار رہی ہیں۔



۲: یوں تو ایک نہیں بیسیوں حقوق ہیں جو ایک عورت کو نہیں ملتے لیکن ایک حق ایسا ہے جو بد قسمتی سے آج تک نہیں ملا۔ اس کی وجہ کوئی اور نہیں عورت کا اپنا ڈر ہے اور وہ ہے دراشت کا حق جو اللہ تعالیٰ نے عورت کو دیا ہے۔ ماں باپ لڑکی کو پال پوس کر شادی کر کے

(ٹی وی آرٹسٹ)

۱: میں عالمی یوم خواتین منانے کے حق میں ہوں کیونکہ عورت محض ایک عورت نہیں ہے بلکہ وہ کئی بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ اسی لیے اگر ہم اس دنیا سے خاتون کا لفظ نکال دیں تو یہ دنیا مکمل ہے کہ عورت سے جڑا ہر رشتہ اس کے بغیر مکمل ہے مثلاً شوہر، بیوی کے بغیر اولاد ماں کے بغیر وغیرہ اور ان تمام رشتوں کو بنانے اور بنانے میں عورت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔



وہ صرف اپنے لیے ہی نہیں جیتی بلکہ خود سے وابستہ ہر رشتے کا خیال رکھتی ہے۔ ان کے لیے سوچتی ہے۔ ان کے لیے دن رات محنت کرتی ہے، جدوجہد کرتی ہے اور یہ صرف ایک طبقے کی

عورت کی بات نہیں ہے تمام طبقوں کی خواتین کا بھی معمول ہے۔ اور خواتین کی اہلیت اور قدر کو تسلیم کرنے کے لیے سال میں ایک دن ان کے لیے رکھ کر ان کی ستائش کریں۔ اور خواتین کو احساس دلائیں کہ پوری دنیا آج ان کے لیے ایسا دن منا رہی ہے جس میں خواتین کی ساری جدوجہد کو سلام پیش کیا جا رہا ہے۔

۲: میں نے حال ہی میں نويس بين الاقوامی خواتین سربراہی مذاکرے میں شرکت کی۔ جہاں مجھے خصوصی آپس میں بطور اعلیٰ سفارت کار کے مدعو کیا گیا کہ میں اپنے اٹھیلک کے مخصوص پروگرام کے بارے میں بات کروں۔ اس مذاکرے میں کئی خواتین نے تقریریں کیں۔ اپنے تجربات بیان کیے۔ ان تمام خواتین نے خواہ ان کا تعلق کسی بھی پروفیشن سے تھا، اب تک خواتین کے جس حق کو تسلیم نہ کیے جانے کی سب

اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ دوسرے بندے کی ویلو کیا ہے؟ وہ لوگ جن کو خواتین کی مشکلات کا احساس ہی نہیں ہے وہ ان کی مشکلات محسوس کریں



اور جس طرح اور دوسرے دن منائے جاتے ہیں بالکل اسی طرح یہ خواتین کا حق ہے کہ ان کی ویلو کا احساس دلانے کے لیے سال میں ایک دن ان کے نام ضرور کر

کے ان کو داد دیں کہ کیسے وہ مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں اور اس دن ان کی صلاحیتوں کو سراہا جائے۔ خواتین کے جدوجہد اور ان کی اہمیت کو تسلیم کرنا چاہیے۔

۳: میں نہیں جانتی لوگ کنفیوزڈ ہوتے ہیں کہ فیمنیزم کیا ہے؟ اور وہ بین امپاورمنٹ کیا ہے؟ عورت کو اختیارات کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال سے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوال جو ہے کہ عوامی امپاورڈ یہ سوال ہی نہیں اٹھنا چاہیے۔ اور کسی بھی انسان کو یہ اختیار نہیں دینا چاہیے کہ وہ خواتین کا استحصال کرے عورت کو اس کی مرضی سے کام کرنا چاہیے۔ مختلف سطح پر خواتین کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ جب ہی تو ہم ان کے حقوق بہتری اور باختیار بنانے کی بات کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ مردوں کا معاشرہ ہے جہاں تمام اصول و قوانین بھی مردوں کے بنائے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ میں اس بات پر یقین نہیں رکھتی کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان سے بڑا ہے۔ بحیثیت انسان مرد اور عورت میں مساوات ضروری ہے۔ صنفی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ عورتوں کو بھی باختیار ہونا چاہیے، ان کو بھی مردوں کے مساوی حقوق ملنے چاہئیں۔ یہ آج تک نہ ہوسکا۔

بچے آپ کا سرمایہ

اب یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ بچپن کا ماحول ہی بچوں کے رویے اور ان کی نشوونما کا تعین کرتا ہے۔ بچوں کی نشوونما میں گھر والوں کا سلوک ان کے آپس کے تعلق پر منحصر ہوتا ہے۔ آپس کے تعلقات کا دار و مدار بھی گھریلو ماحول اور گھر کے افراد کے اس رویے اور اسٹائل پر منحصر ہوتا ہے جو وہ بچے کے لیے ظاہر کرتے ہیں۔ والدین کا اہم کام بچوں کی ذہنی، جسمانی، معاشی اور اخلاقی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ بچے وہ خورد و پودے ہوتے ہیں جنہیں نشوونما پانے کے لیے قدرتی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ ماں کا پیار اور محبت بچے کو تحفظ فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں بچہ مختلف رویے سیکھتا ہے۔

خوشگوار خاندانی ماحول بچوں کو آگے بڑھنے میں مدد دیتا ہے جبکہ ناخوشگوار خاندانی ماحول ارتداد جذباتی ٹینشن پیدا کرتے ہیں۔ جو بچوں کی صلاحیتوں پر نہایت منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ والدین کو اس بات کو محسوس کرنا چاہیے کہ فیملی کے کمزور تعلقات بچے کو عدم تحفظ فراہم کرتے ہیں جس کے ذریعے بچہ بہتر طور پر پتے سیکھ نہیں سکے گا اور والدین کی توجہ اور اعتماد حاصل نہیں کر پائے گا۔

جو نائیں اپنے ازدواجی تعلق میں بہتر انداز سے زندگی گزار رہی ہوتی ہیں ان کے بچے نسبتاً زیادہ فرمانبردار اور باکردار ہوتے ہیں۔ شخصیت کے دوسرے پہلو براہ راست ازدواجی زندگی سے اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ ان کے کئی عوامل ہو سکتے ہیں۔ بچے کا فرمانبردار یا خوشرو ہونے کا تعلق گھر کے ماحول سے ہوتا ہے اور اس بارے میں دو آرائیں ہیں کہ بچے کی دیکھ بھال کے لیے جو طریقہ کار اپنایا جاتا ہے وہ بچے کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

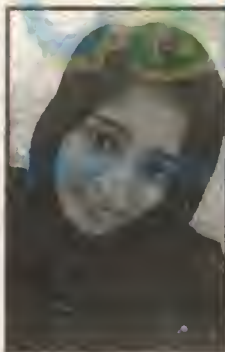
مرسلہ: صاحبزادہ و بی

پیشہ ورانہ سطح پر عورت کی ناقدری۔ عورت کو سرمایہ نہیں جاتا، اس کی اہمیت کم کی جاتی ہے۔ مرد سمجھتے ہیں کہ عورت کو صرف گھر اور بچن تک محدود رہنا چاہیے۔ لیکن بد قسمتی سے جب عورت باہر نکلتی ہے، کام کرتی ہے تو چاہے وہ تعلیمی اور پیشہ ورانہ لحاظ سے مردوں کے برابر یا ان سے بہتر ہی کیوں نہ ہو اس کو وہ قبولیت نہیں ملتی جو اس کا حق ہے۔ مرد اگر عورت کا ماتحت ہے تو اس کو برا لگتا ہے کہ اس کی باس ایک عورت ہے۔ اگر عورت اپنے بچوں اور فیملی کو دیکھنے کے لیے جلدی گھر چلی جاتی ہے تو اسے یہ بھی برا لگتا ہے ایسے مسائل ہر پیشے میں ہوتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ مرد پیشہ ورانہ میدان میں عورت کی محنت، قابلیت اور اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کی کارکردگی کی ستائش اور حوصلہ افزائی کریں۔ میرے نزدیک مرد کے ساتھ ایک ہی پلیٹ فارم پر اس کے برابر محنت کرنے والی عورت کا حق ہے کہ اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اسے بھی وہ تمام سہولتیں اور عزت دی جائے جو مرد کو حاصل ہیں۔ آج تک عورت کے اس حق کو تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔

شنا شاہد

(لیکچرار ابلاغ عامہ)

۱: عالمی یوم خواتین منانے سے خواتین کو ان کا مطلوبہ مقام مل سکتا تو اتنے برسوں میں مل چکا ہوتا۔



ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کو مظلومیت کی تصویر بنانے کے بجائے اسے چٹان کی طرح مضبوط بنایا جائے اور مساوات کی بنیاد پر عملی شعبہ جات میں آگے آنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔

شوش اور غلط افہامات وہاں بھی عورت صدی صد با اختیار نہیں۔ جبکہ اسلام نے خواتین کو بے شمار حقوق سے سرفراز کیا ہے جو انہیں میسر آجائیں تو وہ عزت، وقار اور اعتماد سے سرائھا کر جی سکتی ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے معاشرے میں ان میں سے بعض حقوق کی پامالی عام ہے اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف اسلامی تعلیمات سے... بے بہرہ ہونا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے باشعور اور باہمت خواتین جو اپنی قوت فکر اور جذبہ عمل سے اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہی ہیں باہم متحد ہو کر ایک دوسرے کے حقوق کو تحفظ دیں اور اپنے سے کمزور اور ایسی خواتین کو ان کا جائز مقام دلانے کی ہر ممکن کوشش کریں جو اپنے حقوق کی پامالی کی اذیت تو جھیل رہی ہیں لیکن تا مساعد حالات کی بنا پر ان حقوق کے حصول کی کوشش نہیں کر پاتیں۔ جب خواتین ایک دوسرے کے حقوق کی پاسبانی کے لیے صحت مند سوچ، اعلیٰ ظرفی، وسیع افئری، کشادہ دلی سے کوشاں ہوں گی تو کامیابی یقینی ہے۔ قابل فخر ہے اپنی حوصلے والی صنف نازک جو اپنی گھریلو اور بیرونی ذمے داریاں نہایت خوش اسلوبی اور فطر شاسی سے نبھا رہی ہے۔ اس کی شانہ روز کی خدمت گزاریوں اور کادشوں کو خراج تحسین پیش کرنے اور خواتین کی عظمت کو تسلیم کرنے کے لیے سال میں ایک دن بہت ناکافی ہے۔ یہ عمل سال بھر جاری و ساری رہنا چاہیے ان کو سراہنا چاہیے کہ یہ ستائش خواتین کے لیے کسی ناک سے کم نہیں ہوتی جو ان کو ایک نئے عزم، حوصلے اور لگن سے بھر پور توانائی کے ساتھ زندگی کے ہر عمار پر سرگرم عمل رکھتی ہے۔ یہ خوش رنگی خواتین کے باطن میں موجود ہوگی تو یقیناً ان کے دم سے تصویر کائنات میں رنگ ہی رنگ ہوں گے شرط یہ کہ اس رنگ کو زندگی نہ لگایا جائے محض زبانی جمع خرچ تک نہیں بلکہ عملی طور پر عظمت نسواں کا اعتراف کیا جائے۔ لیکن سال میں ایک دن نہیں ہر اس دن، اس پل اور اس ساعت جب اس کا کوئی بھی فعل لائق ستائش ہو۔

بہت نسواں مدد خدا

☆☆☆

جس طرح مرد کھانا پکانے سے لے کر ملک کی باگ ڈور سنبھالنے تک ہر کام میں عملی طور پر سرگرم ہے بالکل ویسے ہی عورت بھی مختلف علوم میں درجہ کمال تک پہنچ سکتی ہے۔ خواتین میں بھی وہی ذہانت، وہی علوم و افکار اور خوبیاں موجود ہیں جو کہ دنیا میں کسی بھی کامیاب مرد میں موجود ہیں۔ پھر کیا سبب ہے کہ اتنی طویل جدوجہد کے بعد بھی خواتین کو ترقی کے یکساں مواقع میسر نہیں۔ عورت کے ساتھ نا انصافی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ میں عورت کو صرف تاریخ کے حاشیے پر جگہ دی گئی ہے۔ صدیوں سے عورت یہی چاہتی ہے کہ اسے بحیثیت انسان تسلیم کیا جائے اس نا انصافی کے خلاف دنیا بھر کی خواتین اپنے حقوق کی جنگ لڑتے ہوئے اپنا اصل مقام پانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ عورت کمزور نہیں ہے جب ہی فطرت نے مرد کے بجائے عورت کو تخلیق کے لیے چنا ہے۔ ضروری ہے کہ عورت کو تمام شعبہ جات میں آنے کا موقع دیا جائے پارلیمنٹ اور حکومت میں برابر کی سیٹیں دی جائیں۔ ہر ادارے، ہر پلیٹ فارم پر مرد اور عورت کی یکساں نمائندگی ہو کہ دونوں ہی نوع انسانی سے تعلق رکھتے ہیں... مختلف پلیٹ فارم پر خواتین کے حقوق کی بات کی جاتی ہے لیکن دینیم ایسا درمٹ کی بات نہیں کی جاتی۔ وہ کیسے اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکتی ہیں؟ اس سلسلے میں مختلف تربیتی پروگرام منفقہ ہونے چاہئیں۔ تاکہ خواتین اپنے آپ کو کمزور تصور نہ کریں۔

معزز پاکیزہ بہنو!

خواتین کے اب تک تسلیم نہ کیے جانے والے جن حقوق کی سب سے زیادہ بات ہوئی ان میں خواتین کو با اختیار بنانا۔ کام کے مقام پر ان کو مردوں کے مساوی اہمیت اور مراعات دینا اور خواتین کو عزت و دینائیں۔ ایشیائی ممالک کو تو چھوڑیں مغربی ممالک جہاں سے آزادی

مزاح نگاری، کمال کی صنف ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں..... مگر ایسی شہر زنی بخاطر اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ کرنل محمد خان..... اردو مزاح نگاری کا ایک نہایت معتبر و معروف نام ہے، اس ماہ اپنے باوق بڑھنے والوں کے لیے ہم نے اپنے نامور مزاح نگار کی تصنیف بسملت روی سے اقتباسات منتخب کیے ہیں جس سے یقیناً آپ جیسے باوق قارئین لطف اندوز ہوں گے۔

کھانے بیک وقت نازل ہوئے۔ یعنی کوئی دس پیرے چار، چار پلیٹیں اٹھائے شش جہات سے میز پر چنے گئے اور اس موسلا دھار سرس کے بعد جب پیرے چھٹ گئے تو میز پر جل جھل کا عالم تھا۔ پلیٹوں کا کھوسے سے کھوا چھٹا تھا پوری چالیس پلیٹیں میز پر کیسے سا گئیں؟ گزارش ہے کہ یہ ہماری پاکستانی ڈز پلیٹیں نہ تھیں بلکہ چینی کی چالیس باشعیاں ششیاں تھیں جن میں ہم وطن میں مہبانوں کو چلغوزے پیش کرتے ہیں یا پانچو تیروں کو پتھروں میں دانہ کھلاتے ہیں..... ہم سوچنے لگے کہ ہیرت میں تیروں کو کس چیز میں دانہ ڈالتے ہوں گے اور مہبانوں کو کس برتن میں چلغوزے پیش کرتے ہوں گے۔ بادام کے خول میں یا مونگ پھلی کے جھلکے ہیں؟ لیکن چالیس ششیاں تھیں ہی باشعیا کیوں نہ ہوں، آخر چالیس ہوتی ہیں، چنانچہ ہم نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو کسی نے سستی کر دینے لگی۔ لیکن دیکھا کہ دو پیرے اس خدمت پر مامور کر دیے گئے ہیں کہ اگر کسی سستی کا میز کے کنارے سے پاؤں پھلے تو اسے سہارا دے کہ پھر منجھدار میں ڈال دیں۔ ان ہیرت کے قواعد کے بغیر دو بیڑا تو ان پلیٹوں سے آرام سے کھا سکتے تھے لیکن دو انسان آرام سے نہیں کھا سکتے تھے۔ ہم نے دلیدت پوچھا۔

”آپ کو ان کھانوں کے نام بھی آتے ہیں؟“

”چند ایک کے تو آتے ہیں لیکن سارے ناموں کا حافظہ جامد اور ہرے ادھر نہیں ملے گا۔“ رہا ان چالیس کھانوں کا ذائقہ تو شاید تیروں اور دلیدوں کے لیے باعث کشش ہو مگر ہمیں بہت محظوظ نہ کر سکا۔ کسمو اور کاروں کے معاملے میں ہیرت بے شک بے مثال تھی لیکن کھانے کے معاملے میں بھی رسیاں شہر لاہور دیاں۔ چنانچہ ہم نے اپنے لاہور پر عجبانہ فخر کیا اور اسے باو صبا کے ہاتھ کھلا بھیجا کہ عالم میں مجھ سے لاکھ سہی تو مگر

کھانا کھانے کے آداب تندر سے سیکھیے

ہیرت میں ہماری آخری سرکاری مصروفیت ہر کاری اس لیے کہ اس پر ہمیں کئی اختیار نہ تھا..... اس شب کا ڈر تھا جس کے ختم اور منکر ولید تھے۔ ہماری شرط فقط اتنی تھی کہ ہمیں خالص لبنانی کھا کھلا یا جائے کیونکہ اگر بڑی کھانوں سے ہمارا منی پہلے ہی بے حد ملوث اور بھروسہ ہو چکا تھا اور ہمارا مستقبل قریب بھی..... جسے انگلستان میں گزارنا تھا۔ خاصا تاریک تھا چنانچہ ولید نے ایک خالص لبنانی ریسٹوران یلڈز لا رہا انتخاب کیا۔ ریسٹوران میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ محل میں داخل ہوئے ہیں اور ماحول میں بھی وہی شرافت نظر آئی جو محلات میں ہوتی چاہیے۔ چندی مہمان بیٹھے تھے مگر شکل صورت سے بڑے چیدہ ولید سے ہر پوچھ تو بڑی سادگی سے بولا۔

”یہ محل تو اس لیے لگتا ہے کہ لیلڈز لا کہتے ہیں گل کہیں اور شرافت کی جو عالم اس لیے آتی ہے کہ یہاں آتے ہی شرف لوگ ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”شرفا کی تو کراچی میں بھی کئی نہیں..... لیکن کھانے کے وقت ہر طعام گاہ کے دروازے پر ایک غیر شریفانہ کیو لگ جاتی ہے۔“

”یہ خالص آبادی کا مسئلہ ہے۔ سارے لبنان میں اتنے لوگ نہیں بیٹھے جتنے کراچی سلہبا کی گود میں پلتے ہیں۔“

شریفانہ ماحول کی دو گونہ وجہ سمجھ میں آگئی تو ولید کے اشارے پر کھانا آنا بلکہ بڑا شروع ہوا۔ یہ اس قسم کا ڈر نہ تھا جس میں چار پانچ کھانے کے بعد دیگرے مہمان کے پہلو سے اس کے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ اس ڈر میں مختلف رنگ و نسل کی چٹنیاں، مرے اور اچار چھوڑ کر پورے چالیس کھانے تھے۔ جی ہاں ہم نے ایک، ایک کر کے گئے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ شاید کوئی غصہ نہ آدی ان کی تعداد پوچھ بیٹھنے..... اور چالیس کے چالیس

نادام تاشے کی قرب میں جاے اور حسن سلوک سجا کر لائیں۔ اتنے میں ہماری کشتی کی ہم نشین بھی الوداع کہنے آئی۔ ہمیں سوٹ کیس میں کپڑے بند کرتے دیکھ کر ہمارے مستقبل کے منصوبوں کے متعلق سوال کرنے لگی۔ جب ہمارے منصوبوں کی تفصیل سنی تو رشک سے چور ہو کر ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں سیر جہاں کا شوق رو رہا کہہ رہا تھا کہ غائب اگر سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں حج کا ثواب نذر کروں مجھ حضور کی لیکن اس کے لیے زرببادل کا انتظام بھی ہو سکتا تو جرات کا انتظام کیسے ہوتا؟

سرگشتہ غبارِ رسوم و قیود تھا
اتنے میں عبدالرحمن کا رے کر آگیا اور ہمیں ہوائی اڈے کو لے اڑا۔

یہ صحرا ابھل رہا تھا

کھڑکی سے باہر جھانکا تو معلوم ہوا کہ دیارِ وطن سے کوسوں نکل آئے ہیں۔ وہ خطہ خاک جس پر ہم اتر رہے تھے، خطہ پاک نہ تھا بلکہ پانچ سیل کی بلندی سے بھی آہستہ نظر آتا تھا۔ یہ صحرا تھا اور کوئی صحرا سمحرا اچھا، پھیل اور چوٹ۔ ہم نے اپنے حافظے کے جغرافیہ وال حصے سے اس صحرا کا نام پوچھا تو حافظ نے اپنی معصومیت کا اظہار کیا۔ ہمیں انھیں یہ بھی کہ ہمارے علم نقشہ کے مطابق وہاں سمندر ہونا چاہیے یا ساحل سمندر جہاں نقری بادبانوں والی خواتین کشتیاں رواں ہوں اور کسکساران ساحل رو پھینکی ریت پر غسل آفتابی میں رو بنگلے لیے ہوں تاکہ اوپر سے ہمارا طیارہ گزرے تو ان تلک پوشوں کو کچھ چھپائے نہ بنے۔ ہمیں پورا علم ہے کہ جہاں دیکھنے والوں اور دیکھے جانے والوں کے درمیان پانچ سیل کا عودی فاصلہ حاکم ہو وہاں کوئی قابل فہم اعضا ابرا نظر نہیں آتے۔ تاہم اتنا اس ہے کہ ایسا سوچنے میں کیا حرج ہے؟ رعنائی پر بے شک ہمارا تصرف نہیں لیکن رعنائی خیال تو کسی کی جاگیر نہیں اور یہ ہمارا نہیں خاک و دیدور کا نسخہ ہے۔

سے خیال حسن میں، حسن عمل کا سا خیال
لیکن اس لحق و حق صحرا کے نظارے سے ہمارے خیال کا
حسن بری طرح رنگ آلود ہو گیا۔ ہاں ایک فائدہ ہوا کہ یہ انجمن
ایک تقریب ملاقات کا بہانہ بن گئی اور ہم نے پاس سے گزرتی ہوئیں کو غمخوار کر پوچھا۔ ”یہ صحرا کہاں سے آگیا؟“
بولی ”جہاں تک میرا علم ہے یہ صحرا سیمیں رہتا ہے۔۔۔“

بہر حال یہ ایران ہے۔۔۔“

والا ایران، وہ آواز رکنا یاد دلاؤ گشتِ معلیٰ والا ایران؟ وہ آوازوں اور غزاولوں والا ایران؟ وہ لمبوں اور قریوں والا ایران؟ وہ۔۔۔“
”معاف کر دیجئے گا۔“ انزہوش ایک دلاویز بے صبری سے بولی۔ ”ایران کے چند پرند کی فہرست تو بہت طویل ہے اور مجھے دوسرے مہمان بھی بلارہے ہیں۔ کیا میں کوئی فوری خدمت بجا لاسکتی ہوں؟ مثلاً اسپرہ۔۔۔“

ہم اتنے بوز جتے تو تھے کہ مدد صحرا سے جانبر ہونے کے لیے ہمیں اسپرہ پیش کی جاتی لیکن اتنے بجے بھی نہ تھے کہ ہمارے منہ میں ٹپل وے دیا جاتا۔ بہر حال اسپرہ کی چٹک چٹک نے ہم نے شکر ہے کہ ساتھ مگر نہایت دقتوں سے ٹھکرا دی۔ ہمیں خوش دیکھ کر ہوش بولی۔

”آپ چند گھنٹے صبر کریں۔ بیروت میں آپ کو اتنی لمبلیں اور قریاں ملیں گی کہ چک لائے میں اتنی چڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔“
اور پھر ایک رواں دواں، مسکراتی ٹھنکتی لہری طرح آگے بڑھ گئی اور ساتھ ہی ہمارے جملہ شکوے اور شکایتیں بہالے گئی۔ نیز کچھ روشنی بھی چمک لے گئی۔ روشنی ماند پڑی تو ہم نے بھی آنکھیں موند لیں کہ کچھلی رات بہت تھکے جاگے، لیٹ گئے آرام کیا۔ بیروت تک جانچ کھنے کا سفر تھا۔ کہیں انڈیا کی نواحی فضا میں سچ کے لیے جاگے بلکہ جگائے گئے۔ سچ تو خبر لذیذ تھا ہی لیکن ہم پوریا اثران و گوشت کے ذائقے کا تھا بلکہ ذائقے کے مزے کا جس نے ہمیں اور ہمارے ہم نفس کو غامضی مہار جانا دیا۔ ہمیں ریاست چک لالہ کا اور انہیں ریاست میر پور حال پرینڈ فورڈ کا۔

پھر دفعتاً بیروت آگیا اور ہماری بین الاقوامی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اس کی پہلی غلامت یہ تھی کہ جو بھی ہم جہاز سے اترے، ہم سے زیادہ توجہ ہمارے پاسپورٹ کو دی جانے لگی۔ گویا پاکستان سے ہم پاسپورٹ لے کر نہیں آئے تھے بلکہ پاسپورٹ ہمیں لے کر آیا تھا۔ اور یہ جاننے کے لیے کہ ہمارا وجود لبنان کے لیے مفید ہے یا مضر، ہماری بخش۔ سے زیادہ ہمارے پاسپورٹ کی بخش نوبلی تھی۔ جب ہمارے پاسپورٹ کی صحت تحریک لگی تو ہماری سندھ بھی تسلیم کر لی تھی۔ گویا ہماری حالت ان دراستانی شہزادوں سے مختلف نہ تھی جن کی جان طوطے، مینا میں ہوتی تھی۔ ہماری جان پاسپورٹ میں تھی۔ چنانچہ ہم نے اسے جو ماہ سینے سے لگایا اور جس چیز کو کسی دروازہ کی تہ میں پھینک دیتے تھے، اب دل کی تہ میں جگہ دی۔ یہ ہو چکا تو ہم اللہ کر کے دونوں ہاتھوں سے سامان اٹھایا اور چل پڑے۔ ہم مہاراجگی سے ہونگ سے اترتے ہی معزول ہو گئے تھے۔ اور کسم کے راستے کچھ عربی، کچھ انگریزی، کچھ سچ، کچھ جھوٹ بولنے اڑ پورٹ سے باہر نکلے۔



مدیرہ

بہنوں کی محفل

خط کتابت کے لیے: پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612, 021.35386783, 021.35802552, Ext: 122.107

بیاری پاکیزہ، بہنو! السلام علیکم رحمۃ اللہ وبرکاتہ!
تمام حمد و ستائش اس ذات والا صفات کو زیبا جو کل کائنات کا خلق کرنے والا ہے۔ یکساں وحدہ لا شریک ہے اور کروڑوں درود و سلام حبیب خدا رحمت اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس پر جو وہی تخلیق کائنات ہیں۔ پروردگار عالم کے حضور دست بستہ دعا گو ہیں کہ اپنے عزیزانہ غیب سے وہ سب کچھ عطا کرے جو ہمارے حق میں بہترین ہو۔ ہمارے وطن پاکستان میں امن و سکون کی فضا اور خوش حالی رہے اور تمام اہل وطن اس کی ترقی و تیک نامی کے لیے کوشاں رہیں۔ (الہی آمین)

☆☆☆

ماہنامہ پاکیزہ کے دیرینہ اور پر خلوص ساتھیوں، پچھلے کچھ عرصے سے محترمہ عذرا رسول باقاعدگی سے آپ بہنوں سے مخاطب ہو رہی ہیں۔ آغاز محفل میں وہ جہاں اپنی رائے رکھنا ذکر کر لیتی ہیں وہاں اپنی قابل قدر قاری بہنوں کی جواب طلب باتوں کا جواب بھی ضرور دیتی ہیں سو اس مرتبہ بھی ان کا بھرپور تیار کیے کے مراحل میں حاضر اللہ تعالیٰ کو کچھ اور سی منظور تھا..... کہ بروز جمعہ 22 فروری عین اذان فجر کے وقت ادارے کے بانی و روح رواں جناب معراج رسول طویل علالت کے بعد اپنے خالقِ حق سے جا ملے۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون..... اس عظیم سانحے کے بعد عذرا صاحبہ کے لیے بقیہ پیراگراف مکمل کرنا ناممکن تھا جس وہ اپنے تمام قارئین سے سورہ فاتحہ اور دعائے مغفرت کی درخواست ہی کر پائیں۔ ہمیں پورا اندازہ ہے کہ یہ صدمہ آپ قارئین کے لیے بھی ناقابل برداشت ہے۔ ہم نے نہایت فسر و دلی و شکستہ دلی سے اس محفل کو مرتب کیا ہے۔ ہمارے قارئین اور رائٹرز کی سرگرمیاں اور ان کی خوشی غمی بھی ہمیشہ براہِ کی عزیز ہے۔

عزیز قارئین، معراج رسول کے انتقال پر ہلال کی خبر پھیلنے ہی خون کا لڑ، امی میلو اور بیانات آنا شروع ہو گئے تھے اگر آپ لوگ بھی اپنے تاثرات کا اظہار کرنا چاہیں تو مختصراً لکھ کر جلد از جلد بھیج دیں۔ اپریل 2019ء کا شمارہ اگرچہ سالگرہ جنسری تھا مگر اس مرتبہ معراج رسول نمبر ہوگا..... جناب معراج رسول کی ادبی و سماجی خدمات کے لیے جتنا کجا جائے بلاشبہ کم ہی ہوگا۔ اور حسبِ رادیت سنت خبری دروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درودِ ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پڑیشانیوں کو رقیق کرے اور تمام مسلمانانِ عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ شاعرہ و مصنفہ سہاس قل کا تازہ ترین شعری مجموعہ محبت پھر شروع کرلو شائع ہو گیا ہے۔ کتاب کا احتساب سہاس نے اپنے والدین کے نام کیا ہے۔ 160 صفحات پر مشتمل اس مجموعے کی قیمت چار سو روپے ہے اور ہر دن ملک کے لیے 15 ڈالر مقرر کی گئی ہے۔ کتابت اور پرنٹنگ کا معاہدہ نہایت اعلیٰ ہے اور سرور دہی گئی نگاہ کے پھولوں سے سجا ہوا ہے، وابطے کے لیے ایڈریس subasgull@gmail.com اور فون 03332267520 (بہت مبارک ہو سہاس گل)

میں مصنف کی ادبی خدمات پر شعر و ادب کی چند شخصیات نے اظہارِ رائے کیا۔

☆ مستقل تبصرہ نگار آسیر عامر، کراچی کے نتیجے احمد علی اور بھائی محمد نبی کے نام کی اس ماہ ساگرہ ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ اس ماہ راسٹر تبصرہ نگار اور شاعر ہما علی، اسلام آباد کو جی سائلر مبارک ہوں مطلب ہما کی اپنی ساگرہ، ان کے شوہر صاحب کی اور سب سے بڑھ کر ہماری شادی کی ساگرہ..... (بے حد مبارک باد اور دل دے جائیں)

☆ نوجوان شاعر خرم خورشید کی خوب صورت اور پُر اثر شاعری پر مبنی مجموعہ کلام غم بھی گم نہیں ہوتے شائع ہو گیا ہے۔ دلکش سرورق اور خوب صورت کاغذ نے کتاب کی تزئین و آرائش میں اضافہ کیا ہے، کتاب کا انتساب خرم نے اپنی والدہ، بہن اور بیٹی کے نام کیا ہے گویا مصنفہ پاک کی اہمیت واضح کی ہے۔ 160 صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت 600 روپے ہے اور اسے مفت کو بیلی کیسٹرن اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ رابطے کے لیے 4455990... 0092340 اور ای میل info@guftugu.com ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار و ماسٹر نگار حمیرا انجم وحید، واہ کینٹ کے بہنوئی رمیز اختر اپنے والدین کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہوئے۔ (مبارک باد)

☆ مصنفہ عذرا آفتاب لندن میں مقیم اپنے بچوں سے مل کر وہیں پاکستان پہنچ گئی ہیں۔ (الحمد للہ)

☆ مستقل قاری حدیث اختر، حاصل پور وادی جان نئی گئی ہیں۔ (بے حد مبارک باد)

☆ شاعر و فریڈہ خانم نے راسٹر گھنٹہ لاہور کے بزم وارث شاہ میں مہمان خانم کی حیثیت سے شرکت کی۔ فریڈہ خانم کے حوالے سے دوسری خبر یہ ہے کہ ان کو ہریان فاؤنڈیشن کی طرف سے حکیم محمد سعید شہید کی ساگرہ کے موقع پر ان کی شاعری پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اور ان کی شاعری کا دوسرا شعری مجموعہ من شائع ہو گیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ مستقل پاکیزہ قاری ٹیلور احمد، لاہور کے پیارے بیٹے کی شادی اس ماہ ہو کر قرار پائی ہے۔ (مبارک ہو)

☆ راسٹر شہینہ گل اپنے شوہر اور ساس صاحبہ کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل کرنے سعودی عرب روانہ ہوئیں۔ (مبارک ہو)

☆ جمیرہ آف کامرس کی طرف سے عطیہ ہدایت اللہ اور نسیم فضل خالق کو خیرہ بختون خواہ کی بہترین خواتین راسٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔ (مبارکوں)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری عصمت، اکاڑہ کے بڑے بھائی حاجی غلام عباس اور چھوٹے بھائی ڈاکٹر سرور چوہدری کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔ عصمت کی بھانجی ناہیدہ اصغر کو بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ جبکہ مختار اس بی بی جو بریٹ کے عارضے میں مبتلا ہیں انہیں بھی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ مستقل تبصرہ نگار صاحب آصف کی طبیعت ان دنوں خراب ہے۔

☆ مصنفہ عذرا آفتاب آج کل کمر کی تکلیف کے عارضے میں مبتلا ہیں۔

☆ شاعرہ پاکیزہ قاری فریڈہ خانم کی مکمل صحت یابی کے لیے خصوصی دعا۔

انتقالِ بڑھال

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار نسیم کوثر کے شوہر کی اس ماہ دسویں برسی ہے۔

☆ شاعرہ فریڈہ خانم کی کزن رخسانہ سعید رضائے الہی سے انتقال کر گئیں۔

☆ مصنفہ حیات بخاری مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔

تمام مرحومین کے درجات کی بلندی کے لیے دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆☆☆

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کچے شیشے خطوط کی جانب.....

☆ طیبہ فخر مغل، راول پنڈی سے۔ ”نزہت یہ کیا جادو ہے کہ ہر بار ادا دے میں آپ کچھ کہنے کا کہہ کر سب کچھ کہہ

ڈاکٹر ہیں ماشاء اللہ..... (بہت شکر یہ) انشاء اللہ آفریدی جی کے ناول کی ابتداء لی افسانہ جاتی جاری ہیں دوپہا ناول کے لیے سیٹ
 بیلٹ باندھ لیں کیونکہ اڑان کافی بلند ہوگی۔ (جی بے شک) حیا بخاری، شیریں حیدر اور درخت سراج کی تحاریر کا اختتام بالکل
 مناسب انداز میں ہوا۔ فرحتی عجم جی نے ایک سبق آموز افسانہ خوب لکھا جو لوگ اپنی جڑوں سے ناتا توڑ دیتے ہیں وہ یونہی منہ
 کے بل گر جاتے ہیں۔ قرۃ العین سکندر کی مینا نے بھی کافی متاثر کیا کاش بھائی اسی طرح سے اپنی بہنوں کا ہمیشہ دفاع کرتے رہا
 کریں۔ مصنفہ نے ایک مثبت پیغام دیا اپنی تحریر کے لیے تدریس سے منہ ہوں، عذرا ایسا، نہ بہت اصغر، آمینہ جواد اور تمام پاکیزہ
 کی ٹیم کی۔ فریدہ حسینی کے ایڈیٹر نے تو دورِ حاضر کی سب سے صحیح حقیقت کو واضح کیا اور لکھنے کے انداز نے واقعی مزہ دیا، مبارک
 باد۔ سیمار ضار آپ کی سوداگری نے تو بین مول خرید لیا کہ اسی موضوع پر میری تحریر ادھوری پڑی ہے لیکن اب ضرورت نہیں
 پڑے گی کیونکہ ایک مکمل مصنفہ نے اس موضوع کو مکمل طور پر احاطہ تحریر میں لا کر بہت ہی خوب صورت الفاظ کی ہمراہی میں ایک بہترین
 سبق قارئین تک پہنچا دیا۔ صفحہ تو ایسی تحریر ہے کہ اس کے لیے جتنا لکھو کم ہے البتہ اس پر مکمل تبصرہ کہانی کے اختتام پر ہی کرنے کا ارادہ
 ہے۔ فی الحال پیاری وردان نوشین جی کے لیے بہت ساری دعائیں کہ صفحہ ایک یادگار تحریر رہے گی ان شاء اللہ..... عائشہ تنویری کی
 تیرے آس پاس میں مجھے اپنی بیٹی کی شادی کا دن یاد آ گیا کہ لوگ واقعی شکل صورت کے سوا زینے میں لازمی پڑتے ہیں۔ میری
 بیٹی بھی بے تحاشا حسین ہے ماشاء اللہ..... تو بہت سارے لوگوں کو میرے داماد کے لیے یہی کہی گئی کہ وہ میری بیٹی کے مقابلے کم
 وجاہت رکھتا ہے لیکن اصل چیز چہرہ نہیں عادات ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو نیک سیرت لوگ ٹھیں، ماشاء اللہ عائشہ آپ نے
 بہت اچھا لکھا۔ سر پرانہ سنے سال کے موضوع پر ایک مختصر افسانہ قاصد کی مناسبت سے مریم نے لکھا یا اس میں ہیر دے سر
 پرانہ کا تو ایسے کڑواں پھلا کہ بچاری ہیر دکن کو خوب دلایا ایسے لڑکے کی تو اختتام میں جھٹھول دل ہونی چاہیے تھی..... اب
 ایک سرے جو طاری ہونے لگا ہے ایک نار کے پتوں، جی ہاں بالکل یہ سارہ کوئی اور نہیں ہیں من جاں بازم والی سحر ساجد ہی
 ہیں کمال کرنے والی خاتون بہت مبارکاں وہ بھی پیشگی۔ فائزہ شیخ نے بھی سولٹی لکھ کر اسی فلسفے کو اجاگر کیا کہ خوب صورتی سب
 کچھ نہیں ہوتی ہے۔ شیدہ گل نے بہت خوب صورت ناول لکھا ماشاء اللہ..... بہت اچھی لکھاری بن کر ابھری ہیں، آئندہ بھی ان کی
 تحاریر کا انتظار رہے گا۔ تحسین گل کی سب مایا ہے نے تو سامنے کے ایک واقعے کی یاد دلا دی، یہ بات سچ ہے اب یہ بات بھی
 قابل غور تھی کہ بچے دو سے زیادہ ہوں اور جن کی تو ایک لڑکی ایک لڑکا ہو جائے تو وہ سمجھتے ہیں اب ہم نے دنیا فتح
 کر لی لیکن قدرت نے کیا لکھ کر رکھا ہوتا ہے اس سے ایک دم بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے،
 آمین۔ سیما بنت عاصم نے اپنوں کی بے بسی، ردیوں کی بد صورتی اور کرداروں کو جس طرح لکھا گویا سب مجھے آس پاس محسوس
 ہوتا رہا جیسے میں اس تحریر کو پڑھتے اس تحریر کا ایک کٹا ہوا حصہ بن گئی جو موجود تھا لیکن ظاہر نہ تھا۔ جی اتنی ہی دلکش ہیرائے میں لکھی گئی
 تحریر تھی راکھ جو کئی لاکھ کی گئی بہت اچھی لکھی مصنفہ کو مبارک باد..... اختر شجاعت کی تحریر کے بغیر تو ہمیں پاکیزہ دیران لگے گا، یہ
 الگ بات ہے کہ اختر شجاعت جی نے میرا نام بھی نہیں لکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ اب وہ سارے جہان کے نام تو لکھنے سے
 رہیں، اللہ تعالیٰ ان کو خوش رکھے بہت اچھی باتیں انہوں نے ہم تک پہنچائیں، خوش رہیں آمین۔ فاطمہ حسن سے گفتگو واقعی بہت
 مفید اور دلچسپ رہی۔ واہ جی ماشاء اللہ..... آسیر عامر جیتی رہیں بہت خوب صورت انداز میں آپ نے نیلوفر جی سے ملاقات کا
 احوال تحریر کیا اور سب ہی کہیں بہت پیاری لگ رہی تھیں لیکن اب نہ بہت، آمینہ جی زیادہ تر نظر آتی ہیں، عذرا آپ کا دایاں بازو
 بنی اور یہ سچ بھی ہے کہ پاکیزہ واقعی روز بروز دھنسا رہے تو اس میں ان دونوں سکھوں کی بہت زیادہ محنت کا کمال ہے اور ہم ان کے
 ممنون ہیں کہ جب بھی ہم نے عذرا ایسا آمینہ تک تینوں کو پکارا تو بہت ہی محبت سے ہماری بے گئی باتوں کو لکھی انہوں نے
 برداشت بھی کیا اور مطمئن بھی۔ بہت شکر یہ..... (ارے ڈیر یہ تو ہمارا فرض ہے ناں) بہنوں کی محفل میں بہت اچھا لگتا ہے جب
 ہماری قاری کہیں اور لکھاری کہیں تحریر کی تعریف کرتی ہیں تو حوصلہ دو چند ہو جاتا ہے ان تمام بہنوں کا شکر یہ جنہوں نے سراہا اور
 سب بہنوں کا شکر یہ کہ جنہوں نے میری بیٹی کی شادی کی مبارک باد دی اور پاکیزہ کا شکر یہ کہ وہ ہماری ہر تحریر آپ دوستوں تک
 پہنچاتا ہے سلامت رہے ہمارا پاکیزہ..... اب اپنے ناول کے شائع ہونے کی خوش سنبھالے نہیں سنبھال رہی امید ہے قارئین
 ہماری تحریر کی کمی بیشی پہ معاف کر دیں گی اور تنقید میں ہتھ ہولا رکھنے کی پالیسی رکھیں گی معصوم سادل ڈر رہا ہے۔ (تقریف کے

سب کی بہترین شہین تھا۔ سارا ادا بجست میاثر کی تھا اس بار تیرہ کرنے کا موقع مل گیا اللہ تعالیٰ سب کو سلامت رکھے اور بہنوں کی محفلیں بچتی رہیں، آمین....." (بے حد تفصیلی خط کا شکریہ سب کے خطوط شامل کرنا ہوتا ہے جس میں اس لیے فنی چلائی پڑی)

کچھ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "خوب صورت مردوق سے سجا فروری کا پاکیزہ جلدی مل گیا۔ وین کی باتیں اور شجاعت پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ فاطمہ حسن جو کہ معروف ادیبہ اور شاعرہ ہیں سے گفتگو پسند آئی۔ ان کے بارے میں بہت کچھ جان کر بہت ہی اچھا لگا۔ ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام پڑھ کر یوں لگے جیسے ہم بھی وہاں موجود تھے اگر تصاویر ٹکڑ ہوتی تو اور مزہ آجاتا۔ ہم تو کبھی ہو گئے کہ ہم اس تقریب میں کیوں موجود نہیں تھے۔ پھر سوچا کہ کراچی سے بہاول نگر کا فاصلہ ایک ہزار کلومیٹر ہے تو کیا بہاول تو ہمارا وہاں پہنچا ہوا ہے، ہمیں تو لگتا ہے کہ ہمیں کراچی میں گھر بیٹنا چاہیے تاکہ ہر ایک دو دو بعد پاکیزہ کی تقریب میں تو شریک ہو جایا کریں گے۔ (آپ آئیے تو کسی) نیلوفر عباسی آپلی جب ریڈیو پر کرکٹ پر رگرا گزرا کرتی تھیں ان کے پروگرامز میں میرے مہاں جانی پرس افضل شاہین بہت سے انعامات جیتے تھے اور یہ بات ہماری شادی سے پہلے کی بات ہے۔ عذرا آپ کی بہت پرانی رائٹر خالدہ ہم ملیں، ہم انہیں مبارکباد دیں گے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری نند فریدہ جاوید غفری کے بھائی عبدالمنان خان اور فریدہ اور امینہ عنایت کو مکمل صحت دے اور عالیہ بخاری کے شوہر اور نصیر آصف خان کے جواں سال بہنوں کی وراثت میں جگہ دے اور لواحقین کو ہر مکمل عطا فرمائے، آمین..... مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ میں نے جو خیریں دس جنوری کو بھیجیں تھیں وہ فروری کے شمارے میں جو کہ مجھے میں تاریخ کو ملے شام ہو چکی ہیں۔" (حیرت نہ کیجیے، ایسے ہی ہوتا ہے، تیرے کا شکریہ)

کچھ فریدہ جاوید غفری، لاہور سے۔ "فروری کا شمارہ پاکیزہ اپنے دلکش ناول کے ساتھ ملا۔ مجھے کچھ کہنا ہے بے حد اچھا لگا۔ اس مرتبہ سب کے افسانے بہت اچھے لگے۔ طیبہ عنبر منٹل کا ناول طواف آرزو بے حد پسند آیا مبارکباد، طیبہ جی۔ بے حد سلام دعا سی طرح اچھا، اچھا لگتی ہو شکریہ۔ ماہ نور کی شادی کی بے حد مبارکباد۔ کافذی رشتے، ایک کی مینا ہو گا مری، سر پرانہ، سلونی، سب پایا ہے بہترین خیریں سب کو مبارکباد۔ دروازہ نوشین اور سجادہ ظفر کے یاد کرنے کا شکریہ۔ دروازہ نوشین جی صفہ ناول کی بات ہی اور ہے کیا شاعرانہ دل لکھا ہے مزہ آگیا۔ پاکیزہ تو ہمارا فورٹ میگزین سے، میٹرک سے اسے پڑھ رہے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں شگفتہ شقیق کی نعت نے دل کو سرد دیا۔ یاسمین سکول کی غزل بہترین لگی۔ نظم فریدہ و افتخار کی اچھی لگی۔ اپنی بھابی پروین افضل کا لطیفہ پڑھ کر ہنسی آئی۔ روٹی بھی کھاتی ہے، پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ لکھنؤ سنگتانی ہوں میں سب نے اچھا لکھا۔ طاہرہ بی آپ خوشاب میں کس جگہ رہتی ہیں؟ کیونکہ ہمارا خوشاب آتا جانا لگا رہتا ہے۔ ہماری نانو خوشاب کلی نمبر 5 میں رہتی ہیں۔ (چلیں ڈاک خانے مل گئے) پروین بھابی دعاؤں کا بے حد شکریہ۔" (تیرے کا شکریہ..... دعاؤں کے لیے جزا اللہ..... ہم بھی آپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعا گو رہتے ہیں)

کچھ فرحت احمد گلشن حدیدہ کراچی سے۔ "امید کرتی ہوں خیریت سے ہوں گی۔ بہنوں کی محفل میں عذرا بانی کی حاضری دل کو خوش کر دیتی ہے۔ ان کے خلوص اور محبت کے ہم تو اداس ہیں ہر ایک سے ایسے ملتی ہیں کہ سامنے والے کو ایسا لگتا ہے جیسے میرے بھائی کی جان بچان اور ملنا ملنا ہے، انہیں تو یاد بھی نہ ہو مگر مجھے تو یہ بات بھولی ہی نہیں ہے کہ ایک کتاب کی روفا کی تقریب بھی۔ ہائی ٹی کے وقت وہ میری پلیٹ میں اپنے ہاتھوں سے چیزیں رکھ رہی تھیں حالانکہ پہلی ملاقات میری عمر بولنے کا انداز ایسا کہ دل موہ لے۔ میرے خیال میں جو بھی ان سے ایک مرتبہ ملا ان کے خلوص اور محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اللہ تعالیٰ انہیں ذخیروں خوشیاں اور زندگی میں اطمینان اور سکھ نصیب کرے، آمین۔ (جی بالکل وہ ایسی ہی ہیں آپ بھی شریف لائیں اور ملیں) سب سے پہلے تو ذکر کروں گی نیلوفر عباسی کے اعزاز میں دی گئی باری کا پڑھ کر بے حد اچھا لگا۔ اپنی کی خود کو بھی بے حد محسوس ہوئی۔ کافی سال پہلے اسی طرح کی ایک تقریب میں جس میں نیلوفر صاحبہ بھی شریف لائی تھیں۔ میں بھی شریک ہوئی تھی اور ان کے ساتھ تصویریں بھی بنوائی تھیں۔ اور سب کو دکھائیں بھی تھیں۔ ہمارے لیے تو یہی اعزاز کی بات ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ ملاقات ہو یا بات ہو۔ (جی آپ آنے کی ہاں بھریں تو آپکی دفعہ ضرور یاد رکھیں گے) اب آتی ہوں تیرے کی جانب..... سب سے پہلے جنوری کے شمارے میں شائع ہونے والی عقیدہ حق کی تحریر حاصل لا حاصل کی تحریف کر دی گئی۔ بہت اچھی تحریر۔ ناول طواف آرزو کا پہلا حصہ پسند آیا۔ دوسرے ناول، تیرے آس پاس میں صبیحہ کا انعام ہوا اچھا تھا مگر تشنہ تھا۔ صبیحہ کی والدہ کو تو کبھی بھی کم حیثیت خواہ وہ ہائی ہو یا پست پسند ہی نہیں آتا تھا۔ وہ کس طرح راضی ہوئیں۔ صفہ بہترین جارہا ہے۔ افسانوں میں سب ہی اچھے لگے۔ مگر خاص طور پر ایڈیٹر کیوں

کے لیے نہایت سبق آموز تحریر ہے۔ اس کے علاوہ بانی تمام سلسلے جن میں بہنوں کی محفل بر فہرست ہے۔ ہمیشہ ہی پسند آتی ہیں، بہت پسند آئے۔ اور خاص طور پر میں ہامی، اسلام آباد کی نظم کا ذکر کرنا چاہوں گی جو مجھے بے حد پسند آئی۔ ماں ہونے کے ناتے دل کو چھو گئی۔ فاطمہ حسن صاحبہ کا انٹرویو بھی اچھا لگا۔ تمام علیل بہنوں اور متعلقین کے لیے دعا گو ہوں اور کامیابیوں، خوشیوں میں برابر کی شریک ہوں۔ اور خاص طور پر میری جانب سے محترمہ عالیہ بخاری اور فصیحہ آصف خان کو قریبیت پہنچا دیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ دے اور عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے۔“ (جی بالکل ان تک پہنچ گئی ہے۔ تبصرے کا شکریہ۔ ہاں آپ نے جو نوٹیشن کے لیے میسر بھیجا ہے وہ دو تین سال پہلے لگ چکا ہے۔ مجھے یاد آ گیا پڑھا ہوا ہے)

✍️ نیکم ناظم حسین، راولپنڈی۔ پاکیزہ کے حصول میں آپ کو جو پریشانی ہوئی اس کے لیے معذرت آئندہ خیال رکھیں گے۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ، لکھنؤ کی تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔

✍️ افراتجٹ، ٹنجن آباد۔ آپ کا پرانا خط موصول ہوا یقیناً بہت تاخیر ہو گئی اب مارچ کے شمارے پر 18 تاریخ سے پہلے، پہلے تبصرہ بھیج دیجیے۔ پاکیزہ کے مضامین پسند کرنے کا شکریہ..... آپ کے اشعار تو کتنے رچتے ہیں۔

✍️ شامینہ مبارک، ہالا..... پاکیزہ پسند کرنے کا بہت شکریہ، کبھی، کبھی آپ کی دینی جی رائے رو جاتی ہے تو دل چھو نہ کیا کریں۔ آپ لوگ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہتے ہیں۔

بھہ آسا شاید، لاہور سے۔ "بغیر کسی مبالغہ آرائی کے اس دفعہ اداریہ ہر دو لحاظ سے سرفہرست رہا کہ کسی بھی تہذیب اور تہوار کو پوائنٹ آؤٹ کیے بغیر اتنی کاریگری سے اسے متاثر پیغام جزاک اللہ زہت آئی..... سلسلے دار ناول اچھے طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں، کاغذی رشتے میں ایک اتنے قابل اور well-settled ڈاکٹر کا ایسا زوال سمجھ میں نہیں آیا۔ مغرب کی عورت کے لیے اتنا bias نہیں ہونا چاہیے۔ (ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں) بہر حال تصویر کا ایک رخ ہو سکتا ہے اب اگر یہی نگاہ ایک ہی مینار پر لا کر لیا جائے تو بھروہی کی آخر بھابیوں کو ہمیشہ ظالم جاہل دکھانا کہاں کا انصاف ہے۔ طوائف آرزو پر تبصرہ ہانی ہے۔ مگر طوائف کا لفظ صرف کعبہ کے ساتھ ہی چلتا ہے کہانی کا عنوان ہو یا روزمرہ کی گفت و شنید میں ان الفاظ کا استعمال مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ تقاضائے تقدس ہے۔ (طوائف کے مطلب تو چکر لگانے کے ہیں۔ عام بول چال میں تو بولا جاتا ہے ناں) ایڈیٹر پر لحاظ سے ایک متاثر کن کہانی تھی نتائج کی پروا کیے بغیر کوئی بھی قدم اٹھانا حماقت ہی ہے۔ اگر کسی کو بھی یہ کہانی پڑھ کر حش آگئی تو مقصد پورا ہو گیا۔ عرصہ ہوا کہ اس کی کتاب میں ایک کہانی بہرہ دیا پڑھی تھی۔ سو ادگری میں ہی کیا ہر جگہ لوگ ڈوب رہے، تبصرے کر دیا اور کرنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ سر پرائز اور سلونی دونوں ہی مختصر کہانیاں سر پرائز میں آخر تک surprise ہی رہا کہ کیا کہنے کی کوشش کی گئی جبکہ سلونی کا پیغام واضح اور جاندار تھا۔ سایہ اور شرم میں سب کچھ پرفیکٹ دکھایا گیا۔ سیاست عام کام کا انداز بیان اور لفظی متاثر ہو گئی۔ سب بابا ہے میں موضوع اور اختصار دونوں بہترین تھے۔ آخر شجاعت اللہ تعالیٰ آپ کو سدا خوش رکھے اور آپ ہماری اصلاحی اس طرح کرتی رہیں۔ (بہت جانتے تبصرے کا شکریہ.....)

بھہ سعدیہ کاظمی، کراچی سے۔ "آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ آپ کی بدولت آج میری اس معتبر سہمی سے بات ہو گئی جن کے بارے میں سوچ، سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہونے لگتی تھی کہ جب بھی ان سے بات ہوئی تو میں کیا بات کروں گی جی ہاں دردناک نوٹیشن مجھے لگ رہا ہے کہ میں ساتویں آسمان پہ ہوں اتنی میٹھی آواز کہ بندہ خود بخود ہی کھپتے چلا جائے۔ میں شکر گزار ہوں آپ کی اور پاکیزہ کی کہ جس کی وجہ سے میری آدمی ملاقات ممکن ہوئی بہت، بہت شکریہ نزہت، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے آمین۔ (آپ کا شکریہ..... اس قدر سراہنے کا۔ آپ بھی اتنی ہی پیاری ہیں) ماہ جنوری کے پاکیزہ نے تو مجھے درطہ حریت میں ڈال دیا۔ رفعت سرانج کے خوب صورت ناول کا خوب صورت اختتام پڑھنا چاہتی تھی مگر خیر اختتام اچھا تھا۔ زارا کا انجام اپنی نیک طبیعت ماں کی بدولت پھر بھی بہت اچھا رہا۔ اس مادہ دو نئے سلسلے شروع ہوئے دونوں ہی اچھے لگے۔ اب آگے دیکھتے ہیں کہ کون دل میں جگہ بناتا ہے۔ صفحہ 7 تو کیا ہی کہنے ہمیشہ کی طرح قلب پر اثر ڈال گئی۔ نزہت، صفحہ کے حوالے سے میں بہنوں کو بتا چاہتی ہوں کہ صفحہ نے واقعی میری زندگی میں بہت مثبت طریقے سے اپنا اثر ڈالا ہے۔ گو کہ میں نماز تو پہلے بھی پڑھتی تھی مگر پھر بھی کبھی، کبھی کوتاہی اور بے پروائی ہو جاتی تھی مگر جیسے، جیسے صفحہ پڑھتی تھی اللہ کی عبادت کا شوق دل میں جڑ پکڑتا چلا گیا۔ شکریہ اللہ تعالیٰ کا کہ نماز کی پابندی کے ساتھ، ساتھ میں اب باقاعدگی سے سجدہ کی نماز بھی ادا کر رہی ہوں اور دعا کرتی ہوں کہ تمام ہمیشہ بھی اگر کوشش کریں تو اسی طرح نماز

اور عبادات کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ایسی ہی توفیق عطا کرے، آمین۔ اور دودھ تو شیش کو صحت کے ساتھ زندگی دے آمین۔ (بہت خوب سجدہ، اللہ تعالیٰ سب ہی کو نیک بنائے) ماہ جنوری میں اساطیر کی ریگ زار بہت خوب صورت تحریر بھی واقعی عورت ہو یا مرد زبان کی محاسن یا زبان کی انسانی کو اس کی اہمیت سے آگاہی دلاتی ہے۔ یہ زبان تو ہے جو مثنوی میں کسی کے دل میں جگہ بنا ڈالے اور جب چاہے بندہ نظروں سے گر جائے۔ مبارک باد کی مستحق ہیں اساطیر، خواتین کی اکثریت اس کہانی سے سبق حاصل کرے گی اور آپ کو وعادے کی۔ ویاہ اور ثقافتوں سے ملاقات بھی دلچسپ رہی۔ اس باوجود ہدایت میں آخر شجاعت کی خوب صورت تحریر پر وہ پوشی کے حوالے سے لکھی گئی تھی اور ہم خواتین کی اکثریت ایسی ہے کہ ہم واقعی کسی کاراز، راز نہیں رکھتیں۔ بات بھی ایک امانت کی طرح ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی کے راز کو امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کریں گے تو اللہ بھی ہمارے عیبوں کی پردہ پوشی کرے گا۔ باقی تو سارے افسانے کہانیاں حسب معمول اچھے ہیں۔ ایک بار پھر زہت کا بہت، بہت شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکیزہ کو اور عذرا رسول کے جن کو گل و گھڑا بنائے رکھے، آمین۔ (جزاک اللہ خیر! انتہا پیار کرنے والی قاری ہمیں ہوں تو یہ چمن ان شاء اللہ سدا بہار ہے گا)

بھو ساجدہ ظفر، کمالیہ سے۔ ”ٹھنڈی، ٹھنڈی ہو اؤں کے سبک پاکیزہ فردوسی کا شمار نظر نواز ہوا تو سرورق کی حسین کی جانب نظر کر۔ جم گئیں کیونکہ حسین کچھ اداس، اداس ہی نظر آ رہی تھی کہ جیسے اس کے کان میں درد ہو۔ اور دودھ کا اثر کم کرنے کے لیے ٹائیس کا بوجھ اتارنا چاہ رہی ہو۔ (واہ کیا استوری بنائی ہے) ادارہ خوب صورت اور سبق آموز تھا۔ جس میں جدیدیت اور ماضی کے درمیان ربط قائم کر کے خوب صورت باتیں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانوں میں سیرا رضا ردا کا افسانہ سوداگر اور سریم شہزاد کا افسانہ سر پران پڑھ سکی ہوں جو قابل تعریف ہیں۔ شمع ہدایت میں آخر شجاعت صاحبہ کا بدگمانی، ممانعت الہی ایک سیر حاصل مضمون تھا۔ جسے موصوفہ نے نہایت عرق ریزی سے ترتیب دیا ہے۔ مضمون میں ایک جگہ انہوں نے تحریر کیا ہے کہ برائی کے دوسرے ڈالنا شیطان کا کام ہے۔ اس کی تکذیب کرنی ہے۔ مگر تکذیب کیسے کرنی ہے یہ نہیں بتایا۔ مگر کسی کے علم میں ہو تو ضرور بتا دے۔ وہ آئے بزم۔ میں بین الاقوامی شہرت یافتہ ادیب و شاعرہ فاطمہ حسن سے دلکش گفتگو میں مل کر گزری۔ اور ان کا پسندیدہ شعر۔

ہوا چلے گی تو خوشبو میری بھی پھینکی
..... میں درخشاں ہوں اپنے ہاتھ کے رنگ

میں نے اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا (بالکل ٹھیک کیا) ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام کی تقریب کی رنگ کسٹری آسیر عامر نے بہت خوب صورت انداز میں پیش کی۔ نیلوفر عباسی کے ہم بہت پرانے فن ہیں جب وہ ریڈیو کے کرسٹل پر دیگر گرامز میں اپنی آواز کا جادو جگایا کرتی تھیں۔ کتاب دہشتی کارخانہ موجودہ حالات کے لحاظ سے وقت کی ضرورت اور اہم سرے تھا۔ شاید اہل علم کے خیالات و نظریات پڑھ کر موجودہ سہل پھر کتابوں کی جانب راغب ہو جائے۔ گوشہ نظر انٹ میں چوہدری سردار محمد خان عزیز کی کتاب دعوت الحائف کے اقتباسات زیادہ متاثر نہ کر سکے کیونکہ اکثر اقتباسات الحائف کی شکل میں ہم پہلے ہی پڑھ چکے ہیں۔ بہنوں کی محفل میں قارئین بہنوں سے آدھی ملاقات بھی ہو جاتی ہے اور ان کی مزید اسرگرمیاں پڑھ کر دل فرط مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ عالیہ بخاری کے شوہر کے انتقال پر ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ پاکیزہ ڈائری میں نازنین آفریدی کے فضائل ذکر پسند آئے۔ میں اکثر مستغنی ہوں میں معیاری اشعار پڑھنے کو ملے۔ جبکہ بزم پاکیزہ میں انعامی سوالات کے علاوہ نسیم کوثر، مبراچی اور پروین افضل شاہین کے سوالات بھی دلچسپ تھے۔ پروین افضل شاہین کی تجویز کی ہم ٹیڈ ورنڈر تائید کرتے ہیں کہ پاکیزہ ڈائری اور اشعار کے صفحات پر بھی منتخب تحریر اور اشعار پر انعامات دینے کا سلسلہ شروع کیا جائے جیسا کہ چند برس قبل ہو کر رہا تھا۔ (ہاں ضرور غور کیا جائے گا)

بھو خولہ سعید جاوید، کراچی سے۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کی بہت ممنون ہوں جنوری کے شمارے میں اپنا خط دیکھ کر انتہائی خوش ہوئی۔ تمام افسانے اور مستقل سلسلے قابل تعریف ہوتے ہیں۔ مجھے اپنا افسانہ نہ چھینے کا بہت افسوس تھا لیکن یقین جانیں آخر شجاعت نے میری اتنی عزت افزائی کی کہ افسانہ بہت پیچھے رہ گیا۔ دل بدلنے پر اللہ قادر ہے اور آخر شجاعت آپ اللہ کی پسندیدہ اور خوش نصیب ہیں، میرے لیے بھی دعا کریں کہ دل کی دنیا بدل جائے آپ آج جس مقام پر ہیں وہاں آپ نے میرے نام سے مجھے یاد کر کے معتبر کر دیا۔ اللہ پاک آپ کو اور آپ کی اولاد کو اس جہان اور اگلی دنیا میں بہترین اجر سے نوازے۔ (اکی آمین) شادی سے پہلے بہت سارے کام بھی کیے اور ہر سالہ بھی پڑھا لیکن شادی ایسا امتحان ثابت ہوئی جہاں عرصہ دراز کے بعد

آجائیں گی۔ اتم بول، لاہور۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکر ہے..... آپ کی دونوں کہانیاں قابل اشاعت ہیں تمہارا انتظار کر لیں۔ جلد

کھ صاحبہ آخر فریدی، بازار سے۔ "بائی مجھے پورے کا پورا پاکیزہ پسند ہے۔ سارے پاکیزہ میں لکھنے اور پڑھنے والوں کو سلام.....
 کھ سائرہ ہشتال، کراچی سے۔ "پاکیزہ کے تمام ریڈرز اینڈ رائٹرز کو میری جانب سے سلام۔ نئے سال کا پہلا شمار شروع سے آخر
 تک شاندار تھا۔ تمام رائٹرز نے اچھا لکھا مگر انا طالعہ سب میں بازی لے گئیں۔ یقین کر لیں ریگ کرار بڑھ کر میرے آنسو نکل آئے، واقعی
 میاں، بیوی کی ناچانی ٹپٹیں تباہ کر دیتی ہے۔ محبت لفظ ہے لیکن کا اختتام شاندار و حسب توقع تھا۔ رفت آئی بھی بڑی سبک خرامی سے کہانی
 کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ نئے سلسلے اور ناولز برتہرہ ادھار رہا۔ نسیم کوثر کی کوئٹہ کی میری تحریر بہترین تھی بہتر لگی اس کے لیے شکر ہے..... گھوکی چندا
 میں گھوکی معصومیت، اماں کی سادگی اور چندا کے ظلم نے بہت متاثر کیا۔ اور ہاں میں آپ سب سے ناراض ہوں کی نے مجھ ناچیز کی تحریر پر
 تبصرہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ مجھے ہم تو تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے قبول کرنے والوں میں سے ہیں۔ ایسی سے مزید حد ہے یا..... نہ بہت
 آپنی ایمانداری سے بتا سکتا تھا کہ اسٹوری بھی میری اور ہاں میمونہ غور شید علی کا انٹرویو جلد ہی سے شامل کر لیں۔" (ارے دل چھوٹا نہ
 کرو۔ تم نے دو جنوری، فروری کی محفل نور سے نہیں پڑھی۔ ہاں تمہاری فرمائش جلد پوری کی جائے گی)

کھ فرخندہ جعفری، مہجرات سے۔ "فروری کا پاکیزہ بڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اس محنت کا ثمر دے۔
 آمین۔ میرا سارا رنگ اتار دو، انشاء آخر فریدی، نار، بحر ساجد، دونوں ناول ابھی دوسری قسط میں ہیں۔ کچھ قسطیں چلیں گی تو کہانیاں
 نکھریں گی۔ (فرخندہ آپ کا جنوری کا بھی تبصرہ دل گیا پورے ہو گئی اس لیے فروری کا بھی لگا رہے ہیں) یہ کہاں نہیں کر دل ہے، رفت
 سراج صاحبہ نے جان تو خوش سے کہانی کو پروان چڑھایا ہے۔ صفہ، دروازہ نو شین خان کی کمال کی تحریر ہے۔ اس میں رائٹرز جو
 نقشہ قرار دے سکتے ہیں اس کے علاوہ کچھ چاہے دل دلیں گیا ہے۔ بہت ہی سبق آموز کہانی ہے۔ نہ جانے آگے چل کر کیا شکل اختیار کرے
 گی۔ کہانی اچھی ہو تو اینڈ بھی اچھا ہی ہوتا ہے۔ راکھ، سیما بٹ عالم کا واقعی ایک مکمل ناول ہے۔ انہوں کی بے حس خیروں کے
 دھوکے قدم قدم پر ہر ذمہ، رسوائی مگر سب انہوں نے مال جانے اور بھائیوں نے کیا۔ گلابو پیجاری مفت میں رسوا ہوئی۔ سایہ
 اور شر، شبنم بیکل، مکمل ناول کا دوسرا حصہ بھی بہت اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ ایسے عینے، بہو ہر کسی کو دے۔ ماں، باپ کی خدمت بھی کی اپنی
 اولاد کو بھی بہتر طریقے اور اچھی تربیت سے پالا۔ عارف احمد کا اینڈ انہی نیک کاموں کی وجہ سے اچھا ہوا۔ نیک لوگوں کی میت بھاری
 نہیں ہوتی۔ (جی بالکل)۔ نار، بحر ساجد۔ سلسلے دار ناول کی دوسری قسط بھی بہت دھکی اور اپنے اندر کچھ چھپائے ہوئے ہے۔ کیونکہ یہ
 کہانی ایک راز ہے۔ سوداگری، سیما رضا دار۔ اچھی اور حقیقی کہانی لکھی ہے۔ ہمارے گاؤں میں بھی ایک عورت ہے جو بچوں اور
 بہنوں کے نام لے لے کر اچھے خاصے کپڑے ہر گھر سے لیتی ہے اور برتن بیچنے والے کے ہاتھ بچھ دیتی ہے۔ اب لوگوں نے اسے
 کپڑے دینے بند کر دیے ہیں۔ (اچھا جی)۔ شیخ ہدایت میں بدگمانی، ممانعت الہی، اختر شجاعت صاحبہ نے بہت سبق آموز موضوع
 سے پردہ اٹھایا ہے۔ بدگمان آدمی کسی کا نہیں بنتا۔ وہ ہر وقت دل میں بغض اور حسد رکھتا ہے۔ دوسرے شخص کے لیے ہمیشہ منفی سوچ
 رکھتا ہے۔ ہمیشہ شک میں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رائٹرز کو محنت دے کہ وہ اسی طرح اچھی، اچھی باتیں ہم پڑھنے اور مل کرنے والوں تک
 پہنچاتی رہیں۔ (الہی آمین) ایک دلکش شام نیلوفر عباسی کے نام آسے عامر نے بہت اچھا لکھا ہے۔ بہت اچھے سوال جواب اور بہنوں
 سے ملاقات اچھی لگی۔ تمام رائٹرز کی خوب صورت تصاویر دیکھنے کو ملیں اپنے آپ کو ان میں شامل پایا۔ رضوانہ پرنس صاحبہ کا ڈراما لوگ
 کیا کہیں گے دیکھ رہی ہوں اور بہنوں سے ملاقات بھی کر رہی ہوں۔ میرا تبصرہ، صحت کی دعا تبصرہ بڑھ کر خوش ہوئی۔ بہت بہت
 شکر ہے۔" (آپ کی ہر تحریر ہمارے لیے قابل احترام ہے فرخندہ)

☆ یاسمین مرزا، رحیم یار خان۔ ☆ انشاء علی، کراچی۔ ☆ ہما خان، کوٹ رادھا کشن۔ ☆ شمر کالپی، ڈی آئی خان۔
 ☆ عازنہ ایصال، یصل آباد۔ ☆ نصرت اقبال، سرگودھا۔ ☆ رابعہ بھری، پشاور۔ ☆ کرن خان، کوٹ رادھا کشن۔ ☆ عبدالحمید
 قصور، ڈی آئی خان۔ ☆ ثریا مہتاب، ڈی آئی خان۔ ☆ فرحت انصاری، ملتان۔ ☆ ساجد حسین، راولپنڈی..... آپ سب کا
 بے حد شکر ہے کہ پاکیزہ کے بارے میں اظہار رائے کرتے رہتے ہیں۔ آپ سب کی جو کہانیاں قابل اشاعت ہیں وہ ضرور نکلیں گی۔
 کوشش کرتے رہیں اور مراسلات بھی ضرور روانہ کریں۔

کھ فریدہ ہاشمی، کراچی سے۔ "امید ہے سب پاکیزہ ہمیں بھی خیریت سے ہوں گی۔ ویسے تو سبھی مسلمانوں کے لیے دعا

کرتی ہوں خاص کر ان لوگوں کے لیے جو تنگی کر رہے ہیں۔ تنگی کی دعوت دے رہے ہیں۔ تنگی کی طرف بلارہے ہیں لیکن سچی، خاص نام بھی زبان پر آجاتے ہیں۔ جیسے نزہت آپ کا نام۔ انہم انصار، عذراہ بن، ذکیہ، بن، اختر شجاعت، عیسرہ احمد، عمرو احمد، نگہت سیما، افشاں آفریدی..... خدا سب کو ان کی نیکیوں کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ (آمین) بہت سے لوگ ایسے ہی تنگی کے کام کر رہے ہیں۔ دعا کرتی ہوں کہ ان کے راستوں کی رکاوٹیں دور ہوں اور ان کو کامیابی ملے۔ اچھا اجر عطا ہو۔ یہ دنیا تو بہت ہی مختصر وقفہ ہے۔ کسی عمر تو آخرت ہی میں ملے گی۔ جس نے اس طرف جانے کے لیے کچھ تیاری کر لی وہی کامیاب ہوا اور ابدی آرام پا گیا۔ خدا ہم سب کو قوت عطا فرمائے تنگی کرنے اور روشنی حاصل کرنے کی، آمین۔ کچھ مصروفیات کی وجہ سے اس دفعہ رسالہ مطالعے میں نہیں آیا۔ اچھا ہی ہوگا جیسا کہ ہمیشہ ہی ہوتا ہے۔ سب بہنوں کے لیے سلام اور نیک خواہشات۔ (کوئی بات نہیں آپ تو ہمیشہ ہی تیرہ کرتی ہیں آپ کی سچی تنگی کی شاعری بھی لکھتی رہتی ہے۔ اپنا خیال رکھیں)

بھہ ہما علی..... اسلام آباد سے۔ ”ان سب بہنوں کا بے حد شکر ہے کہ جنہوں نے میری صحت یابی کی دعا کی۔ نزہت بہن، پاکیزہ کی محفل میں ایک اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ الحمد للہ اب طبیعت بہتر ہے۔ لینے، لینے بھی پورا رسالہ پڑھا۔ اس مرتبہ خولہ عرفان کی کلم عرفان رب بہت عمدہ تھی۔“ (بہت شکریہ، اب تفصیلی تبصرہ کرنا)

بھہ عصمت، ادا کاڑہ سے۔ ”پاکیزہ سے تو میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ میں سرگودھا میں ہوں ادا کاڑہ یا پھر لاہور..... پاکیزہ سے رابطہ رہتا ہے اور بہنوں کی محفل سے سب کی خیر خیریت بھی پتا چلتی جاتی ہے۔ (جی بالکل یہ آپ لوگوں کی ہی محفل ہے) میں آیا مختار کے پاس سرگودھا آئی ہوئی ان کی طبیعت خراب ہے۔ (اللہ سخت دے) اور میری بھانجیاں امیر کل اور کزنی کل بھی آئی ہوئی ہیں۔ مجھے پاکیزہ کے سارے سلسلے پسند ہیں۔ روحانی تو بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ عمل بھی کرتی ہوں اور دوسروں کو بھی بتاتی ہوں۔ اگر کسی سے فرض واپس لینا ہو تو اس کے لیے کوئی عمل ضرور بتائیں۔ (اس دفعہ بھی شامل ہے اور اگلی دفعہ بھی ضرور بتاؤں گی) مصنفات سے انٹرویو بھی بہت اچھے لگتے ہیں۔“ (پسندیدگی کا شکریہ)

✉ مہرین کنول، لودھراں۔ آپ کی یہ کہانی ناقابل اشاعت ہے دوبارہ کوشش کریں، رسالے پر اے بھی ضرور دیں۔
✉ غزالہ نیل راؤ، ادا کاڑہ۔ سیدہ، مردان۔ سیدہ شاہ طالب، لاہور۔ سیدہ ایلا طالب، گوجرانوالہ۔ آپ کی کہانیاں جلد لکھیں گی۔

✉ مہناز، جہلم۔ پاکیزہ پسند کرنے کا شکریہ۔ تبصرہ بھی ضرور بھیجیں۔
بھہ سائرہ خان لاشاری، کہوڑے۔ ”میں پاکیزہ بہت عرصے سے پڑھتی آ رہی ہوں مگر بہنوں کی محفل میں کبھی شامل نہیں ہوئی۔ جاب کی وجہ سے ہم نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میری دعا ہے پاکیزہ اور کامیابیاں سیتے، آمین۔“ (دعاؤں کا شکریہ رسالے پر تبصرہ بھی کریں)
✉ جیسا فیصل آباد۔ آپ پہلے تبصرہ تو لکھیں پھر کہانی بھی لکھ ڈالے گا۔

بھہ شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”میرے ناولٹ ہو کی چند اکو سب نے پسند کیا..... مجھے بہت خوشی ہوئی۔ سب بہنوں کی پسندیدگی میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔ رفعت سراج کا ناول ختم ہوا تو بہت دکھ ہوا۔ بڑا زبردست ناول تھا۔ ہر ماہ انتظار رہتا تھا اس کی نئی قسط کا۔ امرت بھی بہت زبردست تھا۔ امرت تو میری بہن تھی۔ میں بھی اسی طرح رشتے نبھانے میں خود کو بھلا دیتی ہوں۔ چلو اب نئے ناولوں میں دل لگائیں گے۔ (جی بالکل)۔ صفحہ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اسے اگر معلوماتی ناول کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ نزہت ویز..... ابھی شہرہ پورا پڑھا نہیں ہے سو تبصرہ نہیں کر سکتی لیکن جو کچھ پڑھا ہے ابھی تک اسی پر بات کروں گی۔ نیلوفر عباسی تو جب سے میری بیورٹ ہیں جب وہ شہزادی میں کام کرتی تھیں۔ اب یہ نہ کہنا کہ بائے شمیم..... تم اتنی پرانی ہو۔ (ارے آپ سدا بہار ہیں ویز) تب میں شہزادی کی بہادری کو رشک سے دیکھتی تھی کہ ہائے نیلوفر کتنی بولڈ ہے اور میں متقی ڈر پوک ہوں۔ رشک تو مجھے اب بھی نیلوفر پر آتا ہے وہ اس لیے کہ خدا انہیں نظر بد سے بچائے۔ (آمین) لیکن وہ وہی شہزادی والی نیلوفر ہے نہ ان کا وزن کم ہوا نہ زیادہ..... نہ ہی کوئی اور تبدیلی آئی، لگتا ہے جیسے وقت نیلوفر کو چھوٹے بغیر آگے نکل گیا ہو۔ خیر اللہ ان کی عمر دراز کرے اور بہت خوشیاں دکھائے، آمین۔ (نیلوفر بھی پاکیزہ سے وابستہ سب رازنر اور ریڈرز کے لیے بہت پُر خلوص جذبات رکھتی ہیں اور آپ کا شکریہ ادا کرتی ہیں) وہ سب ہمیں جو بیمار ہیں ان کے لیے دعا ہے صحت۔ عالیہ بخاری کے

شوہر کو خدا مغفرت نصیب کرے (آمین) خالد میری نورث رائٹر ہے۔ فیصلہ آصف خان کے بہنوئی کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہوں۔ فریدہ فری کے لیے اور ان کے بھائی کے لیے خصوصی دعائیں۔ خدا را رسول کی پوتی کے لیے بہت ساری مبارک بادیں۔“ (بہت شکریہ، مبارکبادوں اور تمبرے کا)

بھہ آسیہ عامر، کراچی سے۔ ”بزم پاکیزہ میں پہلا انعام میں اپنا نام پڑھ کر دل خوشی سے بھر گیا۔ Pakeeza is mybest friend مجھ سے کسی نے پوچھا کہ میرا بیٹ فریڈ کوں ہے کراچی میں تو میرے منہ سے یہی نکلا۔ کیونکہ جب میں اکیلی ہوتی ہوں تو پاکیزہ میرے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اس میں تو انتظار کی انتہا ہوگئی میرے شوہر اور بچوں نے تو میرا مذاق بنالیا کہ میں دیوانی ہوگئی ہوں پاکیزہ کے لیے۔ بات تو جی ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ (رسوائی کی کیوں بھی نہ تو تھرا راجا غلطی سے پیاری) سب سے پہلے مریم شہزاد کا سر براہ پڑھا۔ سری میں گزارے ہوئے دن بڑی شدت سے یاد آئے۔ رفعت سراج کو بیٹی کی شادی بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نیک نصیب کرے، (آمین) یاسمین رشید انجی کو اللہ تعالیٰ تندرستی دے۔ سحر ساجد کا نار اور افشاں آفریدی کا میرا سارا رنگ اتار دو اچھے دل شروع ہوئے ہیں ابھی تو شروعات ہے۔ آگے، آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ (اجماہی ہوگا) عقلیت حق کا حاصل لا حاصل بھی اچھا تھا لیکن عقلیہ بھی ہر کہانی میں رضای کیوں ہیرو ہوتا ہے؟ (اتفاق ہے بھئی) انٹرویو تو ایسے پڑھا جیسے سر پر گن رکھ کر کہہ دیا گیا ہو پڑھا اور پڑھ کر ہی دم لیا۔ طواف آرزو، لیبر روم میں ہی پانچ چل گیا تھا کوں ساکس کا بچہ ہے لیکن پھر بھی مجس کے ہاتھوں مجبور ہو کر دوسرے حصے کا انتظار کر رہے ہیں۔ نزہت جیوں ضیا کا یہ دل کے رشتے ہیں ہمیشہ کی طرح ایک اچھی کہانی تھی۔ شمیم فضل خالق کا گلو کی چندا جیسی بھاگوان، بھو ایک ہمارے گھر بھی آجائے تو کیا کہنے۔ (ماہا ما) اچھی تحریر ہے۔ شبینہ گل کا سایہ اور شرا بھی پہلا حصہ پڑھا ہے بڑے اچھے ذہنی طریقے سے ساسوں کو سیدھے راستے پر لایا جا رہا ہے لیکن بہن ساسیں ڈانٹت پڑھتی کب ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تو یا table ہوتا ہے پانی وی کا ریوٹ۔ ہاں عارف احمد کا کردار تو میرے شوہر سے ملتا جلتا ہے ماشاء اللہ وہ بھی ایسے ہیں۔ (اجماہی بھئی) حسین گل کا سب مایا ہے بالکل آج کل کی بچیوں کی یہی سوچ ہے وہ تو شادی سے پہلے پلاننگ کر رہی ہوتی ہیں یہاں تک کہ اگر انڈر اسٹینڈنگ نہ ہوئی تو طلاق کے لیے لگی۔ لہذا ایک سال تک بچہ نہ پیدا کیا جائے اللہ معاف کرے۔ جماعتی کی نظم پڑھ کر دل دہل گیا۔ بہن تھوڑی سی بیماری کیا آئی آپ نے تو رلا کے رکھ دیا، یہ نظم آپ کے دل کی آواز تک رہی ہے مجھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی دے اور اپنے بچوں کے سر پر سلامت رکھے۔ (اچی آمین) سلونی، فائزہ شیخ نے بہت اچھی بات کی کہ اپنے قیمتی آنسو اس لیے نہ بہائے جائیں کہ آپ سانولی بیچ میں اگر کبھی سانولی عورت سے پیار ہو جائے تو وہ بہت شدید ہوتا ہے۔ عائشہ تنویر کا تیرے آس پاس اچھی تحریر ہے۔ مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح شاندار۔“ (تمبرے کا شکر یہ، انعام تول گیا ناں!)

اجماہی بہنو۔ خطوط تو تقریباً سب ہی مرتب ہو چکے تھے بس ابتدا سے اور اختتام سے لکھنے جا رہے تھے کہ جناب معراج رسول کی وفات کی خبر آن پہنچی۔ ایسا لگا کہ اب مزید کچھ نہیں لکھا جائے گا۔ فی الحال مختلف کے صفحات پورے ہوئے۔ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے مگر نہایت دل گرفتگی کے ساتھ کہ تعزیتی اور پڑے داری کے نئے شامل ہوں گے۔ بہر حال یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے، نظام قدرت ہے، ہر بشر کو جو دنیا میں آیا ہے واپس اپنے رب کے حضور جانا ہے۔ بس ہمیں ایک سچے، کچے راست باز مسلمان کی حیثیت سے اپنے نیک اعمال کا پلڑا اپنے پروردگار کی بداداد توشتی سے ہماری رکھنا ہے۔

دلی دعا ہے کہ اللہ پاک ہر آن، ہر گزری ہمارا مددگار اور ناصر و یاور ہو۔ آمین!

آپ کی خیر خواہ
نزہت امین

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63c فیز III یکمیشنش، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500
فون نمبر 118, 107 EXT 35802552, 021-35804200, 021-3586783



حمد باری تعالیٰ

ہے حشر کا دن حاضر دربار ہیں بندے
یارب تیری رحمت کے طلب گار ہیں بندے
تو خالق عالم ہے مزا دے کہ جزا دے
مجبور ہیں، مجرم ہیں، گنہگار ہیں بندے
تو مالک و مختار ہے بخشے کہ نہ بخشے
شرمندہ ہیں، نام ہیں، خطا دار ہیں بندے
ستار ہے، غفار ہے، تو خالق کل ہے
مایوس ہیں، معذور ہیں، لاچار ہیں بندے
اک جنس گراں مایہ ہے، مولا تری رحمت
بے زر ہیں، بڑے مفلس و نادار ہیں بندے
حقا، ترا ہمد ہے، نہ ثانی ہے، نہ ہسر
کرتے تری توحید کا اقرار ہیں بندے
مایوس منور ہے ترے رحم کا طالب
ہے حشر کا دن، حاضر دربار ہیں بندے

کلام: منور بدایونی

انتخاب: صابور، لیہ

نعتِ رسول مقبول

خدا کا ہے کرم کتنا کہ اس نے آپ کو بھیجا
نہ ہوتا آپ کا سایہ تو ہم جانے کدھر جاتے
سکھائے آپ نے آدابِ زندگی در نہ
بھینکتے رہتے عالم میں ادھر جاتے ادھر جاتے
لگا دی پارِ شستی آپ نے احساں کیا ہم پر
وگر نہ بچ دریا میں ٹھہرے ہو کر ٹھہر جاتے
وہ ایک پیغامِ نبی جو دیکھا آپ سے ہم نے
وگر نہ ہم تو لڑتے اور جھگڑتے پھر بکھر جاتے
جلائے آپ نے امید کے روشن دیے ہر سو

نہ ہوتی روشنی کیسے پھر ہم جنت میں گھر پاتے
یہی روئے کی جالی ہے ایسی جس نے بخشی ہے
نہ ہوتی یہ تو سب مدھوش دیوانے کدھر جاتے
محمد آئے شمعِ بن کے اس تاریک دنیا میں
نہ ہوتی شمع یوں روشن تو پروانے کدھر جاتے

انتخاب: ممتاز خانم، کراچی

مناجات

پر دے غفلت کے نگاہوں سے ہٹا دے یارب
ہر برائی سے میرا چھچھا چھڑا دے یارب
میں گناہوں کے کھنور میں ہوں پھنسا اے مولیٰ
بار عیساں کا میرے سر سے ہٹا دے یارب
ایسی عادات عطا کر تجھے راضی کر لوں
نیک بندہ تو مجھے ایسا بنا دے یارب
مجھ کو توفیق دے کرتا رہوں میں نیک عمل
نیک رستے پہ سدا مجھ کو چلا دے یارب
ہو عطا عاصی کو اب حج کی سعادت مولیٰ
میری قسمت کے ستاروں کو جگا دے یارب

عقیدت مند: سمنل ملک، لاہور

ذرا سوچیے تو

☆ زندگی میں ننانوے درست کام کرو اور ایک
بار غلط تو لوگ تمہارے ننانوے درست کام بھول کر
تمہارا ایک غلط کام پکڑ لیں گے..... یہ انسان ہیں۔
لیکن!

☆ ننانوے بار غلط کام کرو اور ایک بار تو بہ کر لو تو اللہ
تمہارے ننانوے غلط کام نظر انداز کر کے ایک کچی تو بہ
قبول کر لے گا۔ اسے رحمان کہتے ہیں۔

دن ان ہی کے پیچھے قافلے چلتے ہیں۔
از: مجید ضیاء بخش، سیمازی

بے عیب خدا کی ذات

☆ ہم میں سے ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خامی ہوتی ہے لیکن ہماری یہی خامیاں ایک دوسرے کے لیے عجیب اور پُر تاثیر قسم کے تعلقات بناتی ہیں لہذا ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کو ان کی خامیوں کے ساتھ ہی قبول کریں تاکہ ہم ایک دوسرے کی وہ خوبیاں اجاگر کر سکیں جو اپنی خامیوں کی غجالت کے بوجھ میں دب کر ہم نہیں دیکھ پاتے۔

از: ماہین ضیاء، کراچی

عنوان بہار

پیدا نئی بہار کے عنوان ہوئے تو ہیں
شغنی سرگستاں غزل خواں ہوئے تو ہیں
گلشن میں اڑتی خاک تھی تشویش جان و دل
چرچے پڑ بہار و بہتاں ہوئے تو ہیں
پھولوں کا کھلنا، خوشبو کا چاروں طرف اثر
گلشن میں گستاں میں چراغاں ہوئے تو ہیں
راہوں میں گل اٹھے ہیں صبح چاندنی کے پھول
کتنے چراغ آج فردزاں ہوئے تو ہیں
اس کی نگاہ ناز ہے مخی خمار جاں
چہرے اسی بہار سے شاداں ہوئے تو ہیں
کلام: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

توکل..... ایک بندھن

اللہ توکل کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔
انسان سوچے کہ اگر اللہ ہی اس کا ساتھ چھوڑ دے تو
پھر دنیا کی وہ کون سی طاقت ہوگی جو اسے ذلت و
پستی کی دلدل سے بچائے رکھے گی۔ اس لیے جو
سچے مسلمان ہیں وہ صرف اللہ پر توکل کرتے ہیں۔
حضرت ذوالنون مصری کہتے ہیں کہ ”میں نے یقین

کر لیا کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والے کو کوئی
تکلیف نہیں ہوتی۔ اب آپ دو مشہور بزرگوں کی
گفتگو پڑھیے تو کل پر۔ یہ دو بزرگ ہیں حضرت...
عبدالرحمن ہمدانی اور حضرت ابراہیم الخواص۔

توکل قرآنی اصطلاح ہے اس کے معنی اللہ
تعالیٰ پر کامل بھروسہ کرنا۔ اللہ پر بھروسہ کرنے سے
انسان بھی گھانٹے میں نہیں رہتا۔ دنیا و آخرت
میں صاحب توکل کی عزت محفوظ ہو جاتی ہے۔ اللہ
تعالیٰ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے
جو یہ پسند کرے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے تو
وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اور جس کو سب سے
زیادہ دولت مند ہونا پسند ہو اس کو اپنی ملکیت سے
زیادہ اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت پر بھروسہ رکھنا
چاہیے۔ توکل (بھروسہ) دل کو امراضِ حرص سے
نجات دلاتا ہے، مہذب بناتا ہے، متوکل کو اللہ تعالیٰ
دن رات اپنی عنایتوں سے سرفراز کرتا ہے اور ایسی
جگہ سے فتوحات فراہم کرتا ہے جہاں اس کے گمان
تک کی رسائی نہیں ہوتی۔ حضرت عبدالرحمن
ہمدانی نے حضرت ابراہیم الخواص سے فرمایا کہ
میں نے ابھی تک توکل کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بیان کیے ہیں جو اپنی
جگہ اتنے جامع ہیں کہ ان پر کسی قسم کا اضافہ ممکن
نہیں۔ آپ کے بیان کی روشنی میں توکل
..... افلاس، غربت، فاقہ کشی اور... دربداری کا نام
نہیں ہے۔ لوگ مسلسل فاقوں میں توکل تلاش
کرتے ہیں۔ میرے خیال میں وہ توکل کے
ابتدائی مراحل میں کھو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”من
توکل علی کفائی یعنی جس نے اللہ تعالیٰ پر توکل یعنی بھروسہ
کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کا کام پورا کیا۔ پس توکل پر کمر
باندھ اور یقین کر لے کہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے
والے کو کبھی تکلیف اور ناامیدی نہیں ہوتی۔ حضرت
امام رازی نے سورہ یوسف کی تفسیر میں لکھا ہے۔

مصیبت میں دلچسپی رکھ کر خوش ہوتا ہے۔ (اشفاق احمد)
☆ اس معاشرے کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ
اب چار مسلمان ایک سمت میں اس وقت چلتے ہیں
جب پانچواں مسلمان ان کے کندھوں پر سوار
ہو۔ (اشفاق احمد)

☆ چھوٹے بن کے رہو گے تو بڑی، بڑی رحمتیں
اور نعمتیں ملیں گی۔ بڑا ہونے پر تو ماں بھی بچے کو گود سے
اتار دیتی ہے۔ (بانو قدسیہ)

☆ پریشان ہونے والوں کو تو کبھی نہ کبھی سکون
مل جاتا ہے لیکن دوسروں کو پریشان کرنے والے خود
ساری زندگی پریشان رہتے ہیں۔
از: فرحت احمد، گلشن حدید

غزل

محبت کی ایسی سزا سوچتے ہیں
مگر ہر کسی کا بھلا سوچتے ہیں
کوئی کر کے جائے اگر بے وفائی
کہ ہم اس کی خاطر وفا سوچتے ہیں
ہمیں تم بھلا دو مگر یاد رکھنا
تمہیں زندگی میں سدا سوچتے ہیں
جسے ہم نے چاہا، اسے زندگی میں
مری جاں مجازی خدا سوچتے ہیں
ہمیں جو ملا ہے یہ شعر و سخن میں
اے اپنے رب کی عطا سوچتے ہیں
فری یوں اندھیروں میں جو لوٹ آئے
اسے زندگی کی ضیا سوچتے ہیں
کلام: فریدہ فری، لاہور

سنہری باتیں

☆ ربہ الہی کے راستوں پر چراغاں کرنے
والے موتی انسان کے آنسو ہیں۔ ان چراغوں اور
موتیوں کی قیمت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے جن کا
خریدار خود رحیم و کریم پروردگار ہے۔
☆ دو چیزیں بڑی اہم ہیں..... اللہ کا ڈر اور اللہ

میری عمر بھر کا تجربہ یہ ہے کہ انسان جب کسی کام
میں اللہ کے سوا کسی اور پر بھروسہ کرتا ہے تو یہ شدتِ انتہا
اور مصیبت کا سبب ہو جاتا ہے اور جب مخلوق کو چھوڑ کر
اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو وہ مقصدِ عمدہ طریقہ سے حاصل
کر لیتا ہے۔

مرسلہ: فریدہ فضل، ڈالاس

غزل

ہوگی سیاہ رات نظار نہیں رہے گا
جب آسماں پہ کوئی ستارا نہیں رہے گا
اپنا پرایا کوئی بھی پیارا نہیں رہے گا
دنیا میں کوئی شخص ہمارا نہیں رہے گا
وہ تھام لے گا اس کو رب ہے عظیم تر
جب آدمی کا کوئی سہارا نہیں رہے گا
سانسوں میں گری ہوگی نہ آنکھوں میں روشنی
کہتے ہیں لوگ وقت ہمارا نہیں رہے گا
دلہیز دل کی پار نہ کر پائے گا کبھی
جب تک وہ آنکھ بن کے ہمارا نہیں رہے گا
بانٹیں گے درد و غم کو اپنے جو درمیان
غم کا کسی پہ بوجھ سارا نہیں رہے گا
آتی بہار ہے خزاؤں کے بعد ہی
یہ وقت بھی کنول جی خدا را نہیں رہے گا
کلام: یاسمین کنول، پسرور

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

تم سردیوں کی راتوں میں اپنے نرم گرم بستروں
سے اٹھ کر مجھے یاد کرو۔
میں تنگ، تاریک قبروں کی سختی میں تمہیں یاد
رکھوں گا۔

از: آسیہ عامر، کراچی

بٹے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ انسان بڑی دلچسپ مخلوق ہے۔ یہ جانور کو
تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے لیکن انسان کو

کا اور اس کو یہودیوں میں نصیب ہو گئیں۔ ڈر ہوگا تو انسان گناہوں سے بچے گا اور در نصیب ہوگا تو عبادت کی تمام لذتیں نصیب ہوں گی۔

☆ نرم مزاجی، اچھا اخلاق اور میٹھی مسکراہٹ ایمان کی علامت ہے۔ فطری ہو تو اللہ کا کرم اور کوشش سے حاصل ہو تو اللہ پاک کا انعام ہے۔

☆ انسان کی یادداشت کسی چہرے کو محفوظ نہیں رکھتی البتہ اچھے برے سلوک کو ضرور محفوظ رکھتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ ایسا حسن سلوک کرو کہ جب جب آپ یاد آئیں آپ کے لیے دوسروں کے دل سے دعائی نکلے۔

☆ اللہ کو پا کر کبھی کسی نے کچھ نہیں کھویا..... اور اللہ کو کھو کر کبھی کسی نے کچھ نہیں پایا۔

از: نصیر آصف خان، ملتان

تفصیلات حادثہ

”لیکن بیگم صاحبہ جس کا رنے مگر مار کر آپ کو نیچے گرادیا اس کا نمبر تو آپ نے ضرور دیکھا ہوگا۔“ سپاہی نے سوال کیا۔

”نہیں، میں نے نمبر نہیں دیکھا۔“ بیگم صاحبہ نے سوچ کر جواب دیا۔

”ہاں البتہ اس کار میں ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھیں جو گلابی رنگ کے سوٹ میں لباس تھیں۔ کپڑا غالباً لیڈی، مہلٹن تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس میں نعلی ہیرا تھا۔ بالوں میں سونے کا کلمپ تھا اور مصنوعی پوشین کا کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔“

خوش معاملگی

دو بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ایک دفعہ اکٹھے بیٹھے تھے اور اپنی، اپنی کمپنی کی تعریفوں کے بل باندھ رہے تھے۔ ایک اپنی کمپنی کے طریق کار اور حسن کارکردگی اور خاص کر خوش معاملگی اور رقوم کی بلاتا خیر ادا کیگی کے بارے میں بڑی خود اعتمادی سے گفتگو کرتے

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

ہوئے کہنے لگا۔ ہم لوگ کبھی اپنے موکلوں سے نہیں الجھتے، کبھی جھگڑا نہیں کرتے اور رقم کی ادائیگی وغیرہ سے جان چھڑانے کی بھی کبھی کوشش نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر اگر آج کوئی شخص سر جائے تو کل پہلی ڈاک میں ہی اس کی بیوہ کو رقم کی ادائیگی ہو جائے گی۔“

دوسرے ایجنٹ نے کہا۔ ”یہ تو کوئی کارکردگی نہ ہوئی۔ آپ نے گویا اپنی کمپنی کے حسن کارکردگی کی عظیم مثال پیش کی ہے۔ میں اپنی کمپنی کی ایک معمولی سی کارکردگی پیش کرتا ہوں۔ آپ نے مثال پیش کی ہے۔ میں آپ کو ایک امر واقعہ پیش کرتا ہوں۔ جس بلڈنگ میں ہماری کمپنی کا صدر دفتر ہے اس میں پندرہ منزلیں ہیں۔ تیسری منزل پر ہمارا دفتر ہے۔ دسویں منزل پر ہمارا ایک موکل رہائش پزیر تھا۔ انہی گزشتہ ہفتہ کا ذکر ہے کہ وہ اتفاقاً اپنی کھڑکی میں سے گر پڑا اور جب وہ گرنا ہوا ہمارے دفتر کی کھڑکی کے سامنے سے گزرا ہم نے بیمہ کی رقم کا چیک اس کے حوالے کر دیا۔“

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

عشق و محبت نے اے یارو! کب ہم کو آباد کیا دیکھے جتنے خواب سہانے اتنا ہی ناشاد کیا سوکھے بھول اور غمی کوکل پھینکا اپنی کتابوں سے جن لمحوں میں قید تھے سپنے ان کو بھی آزاد کیا پہلے تو ہمیں کیا تھا جذبہ عشق کو دنیا نے چیل اور کپٹ کے ہاتھوں پھر ہم کو بھی برباد کیا راو و فاس ہم کو ایک احساس تھا خاطر داری کا تجھ کو بھی ہم بھول گئے اور خود کو بھی نہ یاد کیا دیکھ کے دل گھبراتا ہے اے یمنی سونی گلیوں کو کون ہے جس نے اس بستی کو آ کر یوں برباد کیا

رشتہ بناؤ تو آنکھوں اور پلوں جیسا..... جب

رشتہ

کلام: یمنی احمد، کراچی

میری زندگی ہے

کاوش: اقرا جٹ، مٹین آباد

آنکھ میں کچھ چلا جائے تو پلکیں تڑپ اٹھتی ہیں اور جب پلکیں کچھ دیر نہ چمکیں تو آنکھیں رو پڑتی ہیں۔

تابع داری

ہوائیں سرد ہو جائیں یہ لہجے برف ہو جائیں
ہم اس کی یاد کی چادر کو خود پر تان لیتے ہیں
سنو درویش لوگوں کی کوئی دنیا نہیں ہوتی
ملے جو خاک رستے میں اسی کو چھان لیتے ہیں
اگر وہ روٹھ جاتا ہے ہماری جاں نکلتی ہے
یہ سانس جاری رکھنے کو ہم اس کی مان لیتے ہیں
از: فضلہ بتول، بہارہ کھو

زہر

مولانا رومی سے کسی نے پوچھا۔ ”زہر کیا ہے؟“
جواب ملا۔ ”ہر وہ چیز جو ضرورت سے زیادہ ہو
زہر ہے۔۔۔۔۔ جیسے طاقت، دولت، لالچ، نفرت، اور
محبت۔۔۔۔۔“

از: نادیا، راول پنڈی

غزل

میرے دکھ پہ شہر ستم رو پڑا
لکھے لفظ جب بھی قلم رو پڑا
یہ دل اس کے در کی طرف چل پڑا
تھی وہ شدتِ غم، صنم رو پڑا
میرے قلب و جان نے جو صدمے سہے
کچھ ایسا کیا صبر، غم رو پڑا
کوئی چیخ اٹھا میری روح میں
جو باقی تھا میرا بھرم رو پڑا
یہ جنگ و جدل ساری بے سود تھی
وجودِ بے زیاں پر عدم رو پڑا
تڑپ خانم ایسی میرے دل کی تھی
ہوا سجدہ حیراں، کرم رو پڑا

کلام: فریدہ خانم، لاہور

☆☆☆

بہتر

لوگ بدلے نہیں بس اکثر ان کی زندگی میں آپ
سے بہتر کوئی اور آ جاتا ہے۔

ہے کوئی ایسا

مجھے بہت سے ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں جو
میرے مرنے پر رونے کو تیار ہوں۔ مجھے صرف ایک
ایسے شخص کی ضرورت ہے جو میرے رونے پر مرنے کو
تیار ہو۔

بہترین جگہ

دنیا میں رہنے کی دو جگہیں سب سے زیادہ
بہترین ہیں۔۔۔۔۔ کسی کے دل میں یا کسی کی دعاؤں
میں۔۔۔۔۔

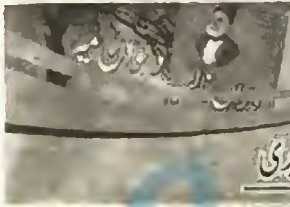
از: بدر بودلہ، پنجاب

چاہ

تیرے سنگ چلوں
ہر راستے پر
ہر مشکل میں
ہر خوشی میں
تیرے ہر پل میں رہوں
بس
اک اتنی سی چاہ ہے

زندگی

جب بھی خدا سے کچھ مانگا ہے
تجھے ہی مانگا ہے
تیرے لیے ہی مانگا ہے
تیرے سوا کوئی چاہت نہیں ہے
تیرے سوا کوئی آرزو نہیں ہے
بس اک تجھ سے جڑنا ہی



کلیب توبان

صنعتی زندگی

میں اکثر گنگناؤں ہوں

☆ ہمیں قندیل..... کمالیہ

میں دیکھ سکوں چہرے کے پیچھے بھی ہے کیا کچھ
اتنی سی عطا وہ مجھے بیٹائی تو کر جائے
ہے فرض فیکس اس پہ میرا جان چھڑکنا
پر وہ میری کچھ حوصلہ افزائی تو کر جائے
☆ سارہ دارم..... ڈوگر

میں آئینوں سے سمجھتا ہوں پتھروں کا مزاج
میں شیشہ گر ہوں مجھے یہ ہنر بھی آتا ہے
☆ حمیرا احمد..... کراچی

اہل عشق کا ہم نے معنی یہ بھی متاوا دیکھا ہے
اپنے لبو سے صحراؤں کی پیاس بجھانے آتے ہیں
☆ سارہ..... ٹوبہ نیک سنگھ

دیکھو کیسے، کیسے پھیلا، پھیلا کے ہاتھ
ماگ رہا ہے شہر سے چاہت کی خیرات
ایک ہی شہر میں اتنی بارش ٹھیک نہیں
آؤ ہم تم بانٹ لیں آنکھوں کی برسات
☆ اتراجت..... منجھن آباد

جانے کس موڑ پہ خورشید ہم سے کھو گئے
وہ جذبے جو کبھی پہچان تھے انسان کی
☆ سارہ مثل..... کراچی

ہم نے سوچا تھا کہ ایک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگب جاں میں اتر جائے گا
☆ عبدالحفیظ قصوریہ..... ڈیر اسماعیل خان

بیٹے دنوں کے اچھے موسم یاد اکیلا میں کیا کرتا
اجڑا منظر نونے پٹنے سب کچھ راگلاں تیرے بند

☆ یاسمین کنول..... پرورد

مجھ کو سوغات محبت کی عطا ہو یارب
میرے کردار کو، گفتار کو رعنائی دے
ہاتھ پھیلائے تیرے در پہ کنول بیٹھی ہے
اس کو کچھ اور نہ بھجوں توانائی دے
☆ نامہ افضل..... گجرات

یہ میرا ضبط کہیں ٹوٹ تو نہیں ہے گیا
قدم، قدم پہ میں چھالوں کی بات کرتی ہوں
وہ چاند بن کے میرے دل میں جگمگاتا ہے
میں اس کے نام کے ہالوں کی بات کرتی ہوں
☆ حمیرا انجم..... واہ کینٹ

زرد پتے جہاں سے ٹوٹے ہیں
سبز پتے دیں سے ٹپکس گئے
☆ مسرت نسیم..... ایف بی ایریا

مانا کہ اگر وہ آجائے دو چار گھڑی ہم جی لیتے
پرائی ذرا سی خواہش پر ہم ان کو پریشاں کیوں کرتے
☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

کس قدر بکھ ہے زندگانی میں
جیسے گھل جائے زہر پانی میں
کتنی صدیوں کا درد شامل ہے
ایک انسان کی کہانی میں

☆ ایمین رانی..... پنجاب

جانے کس راہ سے آجائے وہ جانے والا
ہم نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

☆ کائنات عبدالحلیم..... میر پور خاص

خود ہی ویران کیا تم نے دیارِ دل کو
اب یہاں کوئی نہیں کس کا پا مانگتے ہو
☆ فرحت احمد..... کراچی

جانے والے نے کہا تھا کہ لوٹ آؤں گا
اک اسی آس پہ دروازہ کھلا رکھا ہے
☆ شمیم کوکب..... ضلع جہلم

صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
☆ رعنا امان اللہ..... سرگودھا

رنگوں کی کوئی رست تری خوشبو نہیں لائی
یہ داغ بھی دامن بہاراں میں رہے گا
اب کے بھی گزر جائیں گے سب وصل کے لمحے
معروف کوئی وعدہ دیاں میں رہے گا
☆ فرحت..... گلشن حدید

کھلی ہوئی ہیں میری زبرِ خاک بھی آنکھیں
کسی کا آہ کہاں تک ہے انتظار مجھے
☆ نیو فرخان..... بہارہ کبو

سرد اندھیری راتوں میں دل اس سے باتیں کرتا ہے
آنکھیں جاگ رہی ہیں لیکن خواب میں چلنا اور ہنسنا
اپنی ذات کے میلے میں اب اتنا بھی کیا کم رہنا
خود سے خود کی باتیں کرتا خود سے جلتا اور ہنسنا
☆ زمرینہ خان..... بہارہ کبو

رشتوں کو اپنا دوتوں کے غم کھائے
پھر بھی اجنبی ٹھہرے پھر بھی غیر کہلائے
☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو
تمہیں غم کی قسم اس دل کی ویرانی مجھے دے دو
میں دیکھوں تو سہی دنیا تمہیں کیسے ستاتی ہے
کوئی دن کے لیے اپنی تمہانی مجھے دے دو
☆ رعنا مشتاق..... سرگودھا

زندگی سے نبٹ رہا ہوں ابھی
سوت کیا ہے میری بلا جانے

☆ سعیدہ بانو..... لوہڑیال، مری

چرچے تمام شہر میں الفت کے میری ہو گئے
گو کسی سے ذکر تو میں نے ابھی کیا نہیں
کیا خبر ہو آپ کو شام کے دکھ کی اے حضور
جامِ تنہائی کبھی تو آپ نے پیا نہیں
☆ پروین..... جنوبی پنجاب

ٹھوکر یں مار کے محفل سے اٹھاتے ہیں مجھے
اور اک پاؤں سے دامن بھی دبا رکھا ہے
☆ رانی زرناب..... کمالیہ

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شاخیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں
☆ لائبہ کائنات..... لاہور

نیا سال آیا ہے نئے غم ملیں گے
سنگرم بہت مہرباں کم ملیں گے
☆ تنسیم کوثر..... کراچی

رک جائیں اگر آنسو تو بن جاتے ہیں ناسور
اچھا ہے دو چار نکل جاتے ہیں ہر روز
☆ عرشہ حنیفہ..... کراچی

کانوں سے انگلیاں نہ نکالو تو کچھ نہیں
سننے رہو تو روزِ نئی داستان ہے
☆ فرح طاہر قریشی..... ملتان

یہ ہم ہی ہیں کہ تیرا درد چھپا کر دل میں
کام دنیا کے بدستور کیے جاتے ہیں
☆ فریدہ فری..... لاہور

رنگ رعنائی اور خوشبو
پھول اس سے ادھار لیتے ہیں
اس کے جوڑے میں جگ کے سرخ گلاب
اپنی قسمت سنوار لیتے ہیں

☆☆☆

منتخب غزلیں



ماوج نامور مقبول عام شاعر ناصر کاظمی کا ماہِ وفات ہے اسی
مناسبت اس غزلیہ شاعر کا خوب صورت کلام آپ کے ذوق کی نذر...



وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس نہیں
اس دنیا میں اپنا کیا ہے
کہنے کو سب کچھ اپنا ہے

ترپ رہے ہیں زباں پر کئی سوال مگر
مرے لیے کوئی شایانِ اتناس نہیں
یوں تو شبنم بھی ہے دریا
یوں تو دریا بھی پیاسا ہے

ترے جلو میں بھی دل کانپ، کانپ اٹھتا ہے
مرے مزاج کو آسودگی بھی راس نہیں
یوں تو ہیرا بھی ہے سنگر
یوں تو مٹی بھی سونا ہے

کبھی کبھی جو ترے قرب میں گزارے تھے
اب ان دنوں کا تصور بھی میرے پاس نہیں
منہ دیکھے کی باتیں ہیں سب
کس نے کس کو یاد کیا ہے

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں
تیرے ساتھ مگنی وہ رونق
اب اس شہر میں کیا رکھا ہے

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اداس نہیں
بات نہ کر صورت تو دکھا دے
تیرا اس میں کیا جاتا ہے

پیارے بہنو! خوش ذائقہ کے ان صفحات میں ہم آپ کے لیے معروف میزبان اور شیف شگفتہ یاسمین کے تیار کردہ کھانوں کی تراکیب بعنوان ”امی کی رپسی“ بھی لے کر آئے ہیں۔ (مدیرہ)

چٹ پٹی مچھلی

چٹ شامل کر دیں۔ اب اس میں ہلدی، زیرہ پاؤڈر، پسلی لال مرچ، وٹھیا پاؤڈر اور گرم مسالا پاؤڈر ڈال کر آج کور میا نہ کر دیں۔ اب اس میں آدھا کپ پانی بھی شامل کر دیں۔ دو منٹ پکا لیں۔ جیسے ہی پانی میں ابال آئے، نمائز کا پیسٹ ڈال دیں اور اس وقت تک مسالا بھونیں جب تک مسالا تیل نہ چھوڑ دے۔ اب اس میں دو کپ پانی شامل کریں، کٹی ہوئی ہری مرچ اور نمک شامل کر دیں۔ آج کو تیز کر دیں۔ جیسے ہی مسالے میں ابال آجائے اس میں مچھلی ڈال دیں۔ اب اسے ڈھانک دیں، پانچ منٹ کے بعد دیکھی یا کر اہی (جو بھی برتن آپ استعمال کر رہی ہیں) اسے ہلائیں۔ (یاد رکھیں مچھلی میں نیچ نہ چلائیں ورنہ مچھلی ٹکڑے، ٹکڑے ہو جائے گی)۔ اب دس منٹ تک مزید پکا لیں۔ آخر میں کنجا ہوا وٹھیا ڈالیں اور گرم چاولوں کے ساتھ نوش فرمائیں۔

بونس ٹپ، مچھلی کی بو ختم کرنے کے لیے مچھلی دھونے کے بعد سفید سر کے کے چند قطروں سے مچھلی کو تھار لیں۔

پونٹیو لیپٹا

اجزاء: آلو، چھ عدد (فریج فراز کی طرح کاٹ لیں)۔ میدہ، ڈیزھ کمپ کارن فلاور، ڈیزھ کھانے کا چمچ۔ پسلی ہوئی کالی مرچ، آدمی چائے کا چمچ۔ اور کیکیو، ایک چائے کا چمچ (پنڈ ہو تو شامل کر لیں)۔ پسلی ہوئی اورک، ایک چائے کا چمچ۔ پسلی ہوئی لال مرچ، آدمی چائے کا چمچ۔ آپجور پاؤڈر، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ بریڈ کریمز، حسب ضرورت۔ نمک، حسب ذائقہ۔

اجزاء: مچھلی، آٹھ ٹکڑے، لہسن اورک کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ پسلی ہوئی لال مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ لہسن، ایک عدد (نچوڑ کر عرق نکال لیں)۔ یہ سارے اجزاء مچھلی میں ملا لیں اور بیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔

تیل، تین سے چار کھانے کے چمچ (تیل گرم کر کے مچھلی فرائی کر لیں اور نکال کر رکھ لیں)۔

اجزاء برائے گریوی:

میتھی دانہ، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ تیز پتا..... دو عدد..... ثابت زیرہ، آدھا چائے کا چمچ۔ پیاز، دو سے تین عدد (پسلی لیں)۔ نمائز، دو عدد (پسلی لیں)۔ اورک لہسن کا پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ہلدی، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ پسا ہوا زیرہ، آدمی چائے کا چمچ۔ پسا ہوا وٹھیا، آدمی چائے کا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چوتھائی چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، تین سے چار عدد (نیچ میں سے کاٹ کر رکھ لیں)۔ ہرا وٹھیا، آدمی گڈی۔

ترکیب: مچھلی کو فرائی کرنے کے بعد بچے ہوئے تیل میں سب سے پہلے میتھی دانہ ڈال دیں۔ جیسے ہی اس میں سے خوشبو آئے اس میں تیز پتا شامل کر لیں، ساتھ ہی ثابت زیرہ ڈال کر فرائی کر لیں اور چند سیکنڈز کے بعد پسلی ہوئی پیاز بھی شامل کر دیں۔ پسلی ہوئی پیاز ڈالنے کے بعد چولھے کی آج بوا حوا دیں پھر اس میں اورک، لہسن کا

بند گردیں۔ گاجر کے حلوے کو دُش میں نکالیں، اوپر سے پھیکا کھویا ڈالیں اور مزے لے، لے کر کھائیں۔
 بونس ٹپ ۱: پھیکا کھویا، پکاتے ہوئے شامل نہ کریں کیونکہ وہ گاجروں میں شامل ہو کر کس ہو جاتا ہے۔
 بونس ٹپ ۲: اگر کنڈینسڈ ملک شامل کر رہے ہیں تو شکر کی مقدار کم کر رکھیں ورنہ پیٹھا بہت زیادہ ہو جائے گا۔
 ہمیشہ یاد رکھیں اسی کی ریسپی، کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

سسزیوں کی بریانی

اشیا: آلو، تین عدد۔ درمیانے۔ گاجر، تین عدد۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ پھول گوشت، ایک پاؤ (پھول ہوں صرف) سفید ٹیکن، دو عدد۔ شلیم، تین عدد۔ تازہ مرچ کے دانے، ایک پیالی۔ ہری مرچ، دو عدد کیوبز کاٹ لیں۔ ٹماٹر، پودینہ، حسب پسند۔ ہرا دھنیا، نمک، کئی لال مرچ اور تیل، حسب پسند اور حسب ضرورت۔ کالا زہرہ، ایک کھانے کا پیچ۔ ثابت گرم سالانہ، ایک کھانے کا پیچ۔ چاول بریانی، تین کپ۔ (جس منٹ بڑی الائچی، دار چینی، لونگ، کالی مرچ، چھوٹی الائچی، پھول) چکن کیوبز، ایک عدد۔ دہی آدھی پیالی۔

ترکیب: دہی میں حسب ضرورت تیل ڈال کا پیاز باریک کاٹ کر گولڈن کریں۔ تھوڑی سی تلی پیاز نکال لیں گارنیشن کے لیے باقی پیاز میں، لسن، اورک، پیسٹ، نمک، مرچ، زہرہ، گرم مسالا، دہی، چکن کیوب اور ٹماٹر ڈال کر تھوڑا بجھیں پھر مرچ، گاجر آلو ڈالیں اور دس منٹ بعد باقی کی سبزیاں ہر مرچ سمیت بھی ڈال دیں۔ پانی کی ضرورت ہو تو تھوڑا سا ڈال لیں اب سبزیاں گل جائیں تو اسی میں بھیکے چاول ڈال دیں اور اندازے سے پانی ڈال کر ڈھکن ڈھک دیں۔ پانی خشک ہونے لگے تو دم پر رکھ دیں۔ اندازہ کر لیں کہ اسی پانی میں چاول گل جائیں گے نہیں تو ہلکا سا چھینٹا ڈال دیں۔ تیار ہونے پر ہرا دھنیا، پودینے کی چٹاں اور پیاز چھڑک دیں۔ مزیدار سبزی بریانی چکنی، اچار یا راسخے کے ساتھ نوش فرمائیں۔
 از: مجتبیٰ زیدی، بہارہ کھو

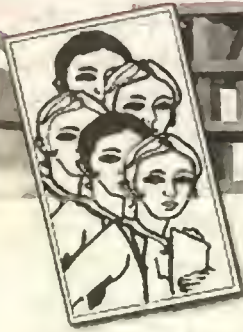
جیزس ایک پیالے میں ڈالیں اور تھوڑے پانی کی مدد سے درمیانہ کچر بنالیں۔ ایک پن میں دو کپ پانی گرم کریں، جیسے ہی پانی اگلنے لگے اس میں نمک شامل کر دیں، ساتھ ہی گئے ہوئے آلو ڈال دیں۔ ایک سے دو منٹ تک پکے دیں، اس کے بعد پانی چھان لیں، آلوؤں کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب آلو ٹھنڈے ہو جائیں تو بنائے گئے کچر میں اس کو ڈبو لیں۔ پھر بریڈ کر موز لگائیں اور ایک بار پھر کچر میں ڈالیں۔ پھر دوبارہ بریڈ کر موز لگائیں۔ اسی طرح سے سارے آلوؤں کو تیار کر لیں، ایک کڑاہی میں تیل کو گرم کریں، جب تیل گرم ہو جائے تو ایک، ایک کر کے آلوؤں کو شامل کر دیں، گولڈن براؤن ہونے تک پکائیں۔ اب اسے کچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

بونس ٹپ: اس بات کا خیال رکھیں کہ آلو پانی میں گل نہ جائیں ورنہ خستہ نہیں بنیں گے۔

گاجر کا حلو

اجزاء: گاجر، دو کلو (کدو کش کر لیں)۔ دودھ، ڈھائی گلاس۔ شکر، دو کپ۔ گھی، چار کھانے کے پیچ۔ کنڈینسڈ ملک، حسب ضرورت۔ شیش، پستہ، بادام، اخروٹ گرمی، حسب ضرورت۔ پھیکا کھویا، آدھا پاؤ یا حسب ضرورت۔

ترکیب: پھلے کڑاہی میں دودھ ڈال کر گرم کریں جیسے ہی ابال آجائے، کدو کش کی ہوئی گاجر اس میں شامل کر دیں۔ آٹھ درمیانی کر دیں اور گاجروں کو دودھ میں نرم کر لیں (بہت زیادہ نہ گلائیں)۔ جیسے ہی دودھ خشک ہونے لگے اس میں شکر شامل کر دیں، ساتھ ہی دو کھانے کے پیچ گھی بھی ڈال دیں۔ تھوڑی دیر میں شکر اپنا پانی چھوڑ دے گی، اب آٹھ تیز کر دیں اور اسے بجھوں لیں، یہاں تک کہ شکر کا پانی خشک ہو جائے۔ (اگر کنڈینسڈ ملک استعمال کرنا ہے تو اسی مرحلے پر شامل کر لیں اور دو کھانے کے پیچ گھی اور ڈال دیں)۔ اب میوہ شامل کر کے کس کر لیں اور پانچ منٹ کے بعد چولھا



پہلا انعام یافتہ سوال

☆ سائرہ مشال..... کراچی

سوال: آپنی تسلی اور اطمینان میں کیا فرق ہے؟
جواب: تسلی لوگ دیتے ہیں، اطمینان خود حاصل کرنا ہوتا ہے۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: شادی کے وقت دلہن کے چہرے پر تو نور آتا ہے دلہا کے چہرے پر کیا آتا ہے؟
جواب: ترس.....

☆ مریم بنت کاشف..... حیدر آباد

سوال: آسمان کا تھوک ہمیشہ منہ پر ہی کیوں آتا ہے؟
جواب: تم نے آڑ ماکے تو دیکھ لیا پھر بھی پتا نہیں چلا۔

سوال: آگ اور پانی میں میر کیوں؟

جواب: اللہ کی قدرت ہے۔

☆ لائیکہ کائنات..... لاہور

سوال: سانپ کو قابو میں کرنے کے لیے بین بجاتی جاتی ہے لیکن جب انسان بے قابو ہو جائے تو کیا کرتا چاہیے؟

جواب: ہدایت کی دعا۔

سوال: دل بھج جائے تو شہرِ تنہا کا چراغ کیسے روشن کیا جائے؟

جواب: دل بھج جائے تو اس کی قبر پر اسی چراغ کو جلایا جاتا ہے۔

☆ محسنی قدیل..... کمالیہ

سوال: منگنی اور نکاح کے درمیانی عرصے میں زیادہ فائدہ کس کا ہوتا ہے، لڑکی کو یا لڑکے کو؟

جواب: موبائل فون کا رڈ کمپنی کو.....

سوال: کہتے ہیں میاں، بیوی گاڑی کے دو پیسے ہیں، اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں تو؟

جواب: اسپر ویز بھی تو ضروری ہیں۔

☆ ساجدہ ظفر..... کمالیہ

سوال: عورت پہلے چن، چن کر شوہر کی ساری عادتیں بدلتی ہے اور بعد میں رو، رو کر کہتی ہے اب آپ پہلے جیسے نہیں رہے..... کیوں؟

جواب: معصوم شوہر اتنی آسانی سے بدل جاتا ہے..... حیرت ہے۔

سوال: کاش غم، ریت کے مانند ہوتے جو مٹی سے خود خود نیچے گر جاتی ہے؟

جواب: اللہ پر توکل ہر غم کو ایسے ہی مالتا ہے۔

☆ محسنی قدیل..... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: لوگوں نے اپنے چہرے پر محبت کا ایک ماسک پہنا ہوا ہے..... وہ اپنے اصل چہرے کے ساتھ سامنے کیوں نہیں آتے؟

جواب: تم بھی تو بدگمانی کی عینک پہنے رہتی ہو۔

سوال: دل کے دریا میں اگر سیلاب آجائے تو؟

جواب: نہاں آتا ہے جھٹوں کا، خلوص کا، ہمدردی کا۔

☆ افراتج..... مین آباد

سوال: اپنوں اور غیروں میں سے کسی کو چننا ہو تو ہم ہمیشہ اپنوں کو ہی کیوں جتتے ہیں؟

جواب: تم غیروں کو چن لو۔

ہوں۔ وہ بتا رہا ہے کہ میں نے تم سے محبت کی۔

میں کہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہوئی؟

جواب: چل جھولی!

☆ فرخندہ جعفری..... مہجرات

سوال: انسان کا چہرہ و حوال، دھواں کب ہوتا ہے؟

جواب: جھوٹ پکڑے جانے پر۔

سوال: منافق آدمی صرف اپنے لیے ہی کیوں جیتا ہے؟

جواب: وہ تو اپنے لیے بھی نہیں جیتا۔

☆ تسنیم کوثر..... کراچی

سوال: آپ کے نزدیک سب سے بہترین دعا کون

کی ہے؟

جواب: حفظ ایمان کی۔

سوال: ذرا یہ تو بتائیں کہ مکھن کھانے اور لگانے

کے علاوہ بھی کسی اور کام آتا ہے؟

جواب: اتنے بڑے، بڑے کام تو بیچارہ مکھن کر لیتا

ہے اور کیا کراؤ گی۔

☆ فرحت احمد..... گلشن حدید

سوال: اینٹ سے اینٹ بجانا آسان اور اینٹ پر

اینٹ رکھنا مشکل کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

جواب: محنت کے کام تو مشکل لگتے ہی ہیں۔

سوال: سر پر پیر رکھ کر کس طرح بھاگا جاتا ہے؟

جواب: باغ سے چھل تو ذکر مالی کی نظروں سے بچ

کر جب بھاگا جاتا ہے تو ایسے ہی دوڑ لگتی ہے۔

☆ سائرہ مشال..... کراچی

سوال: محبت اور نفرت دو الگ، الگ جذبے

ہیں مگر ہمیشہ ایک کی موت کے بعد دوسرا جنم لیتا ہے

ایسا کیوں؟

جواب: یہ بھی ایک دوسرے کے پیچھے رہنے کا عمل،

کب کون سا جذبہ غالب آ جائے اس لیے ساتھ، ساتھ ہی

رہتے ہیں۔

سوال: اپنے روٹھ جائے تو منالیدا چاہیے مگر اپنوں

سے دل روٹھ جائے تو؟

جواب: پہلے دل کو مناد پھر اپنوں کو ورنہ منافقت

☆ پروین افضل شاہین..... بہاول نگر

سوال: خوب صورت دہن بھی بیونی پار سے کیوں

تیار کروائی جاتی ہے؟

جواب: تیار ہونے وہ تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔

سوال: آخر میرے میاں جانی مجھے سمجھتے کیا ہیں؟

جواب: تمہارے میاں جانی ہیں کچھ بھی سمجھیں

ہمیں کیا۔

☆ سائرہ ارم..... کمالیہ

سوال: دولت عظیم رشتوں کے درمیان وراثت کیوں

بن جاتی ہے؟

جواب: یہی تو امتحان ہے انسان کا۔

سوال: ہر دماغ دو منزلہ ہوتا ہے۔ اوپر کی منزل

آخرت کے کام سرانجام دیتی ہے اور نیچے کی دنیاوی.....

آپ کی کون سی منزل بہتر کام کرتی ہے؟

جواب: یہ تو دوسرے ہی بتائیں گے..... ہم تو اللہ

تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی سرخرو کی طلب کرتے ہیں۔

☆ نسیم منظر..... کراچی

سوال: بیگانی شادی میں عبد اللہ ہی دیوانہ کیوں

ہوتا ہے؟

جواب: عبد اللہ یعنی..... اللہ کا بندہ..... وہ کوئی بھی

ہو سکتا ہے۔

سوال: مجھ کو مارنے کا آسان طریقہ کیا ہے؟

جواب: مجھ کو مارا پھرے کرو..... اور کیا بندہ وق سے

مارو گی۔

☆ تاحہ تحریم..... کراچی

سوال: اگر کسی کا اخلاق دیکھنا ہو تو؟

جواب: غصے کے وقت دیکھ لو۔

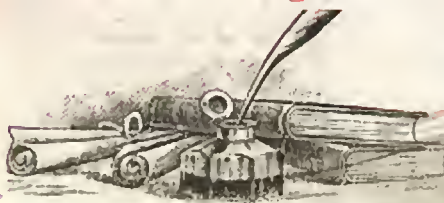
سوال: بیچ صاحبان مرنے سے پہلے مجرم سے اس

کی آخری خواہش کے بارے میں کیوں پوچھتے ہیں؟

جواب: تم کل عدالت جا کر بیچ سے ضرور پوچھ

لیتا۔ اور ہمیں بھی بتا دینا۔

☆☆☆



معاف فرمائے گا۔ (محیفہ نماز) بشرطیکہ آئندہ کے لیے تقویٰ اختیار کرے۔

عذاب قبر سے امان کی نماز

تعداد: ۲۰ رکعت ۲۲ رکعت پڑھیں، ماہ رجب کی چاند رات درمیان نماز مغربین۔
طریقہ: ہر رکعت میں سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید ایک بار۔

فضیلت: اس نماز کے پڑھنے والا، اس کی اولاد اور خاندان والے عذاب قبر اور بربادی مال سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور روز قیامت پل صراط سے بچنے کی طرح گزر جائیں گے۔ (محیفہ نماز)

ہفت ہیکل کا حصار

یہ عمل بہت مشہور ہے اور آسان ہے۔ اس عمل کے بارے میں ہر خاص اور عام خوب جانتے ہیں۔ ہمارے دینی رسالوں اور کتابوں میں اس کا ذکر ہے۔ اس عمل کی اہمیت اور قدر کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، مولا علیؑ سے فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ایسی چیز تعلیم کروں کہ ساتوں آسمان اور زمین کی خلقت مل کر تمہیں بدی پہنچانا چاہے تو کامیاب نہ ہو سکیں گے۔ یا علی جو کوئی اس ہفت ہیکل کو پڑھے اس کے نامہ اعمال میں ستر ہزار اعمال حسنہ لکھے جائیں گے۔ ستر ہزار قصر بہشت میں ہوں گے۔ جو شخص ان سات آیات کو پڑھے اور اپنے پاس رکھے تو روز قیامت اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔

مغرب نماز ادائیگی قرض

طریقہ: پہلی رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید گیارہ بار۔

دوسری رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید ایکس بار۔

تیسری رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید اکتیس بار۔

چوتھی رکعت: سورہ حمد ایک بار، سورہ توحید اکتالیس بار۔

نماز کے بعد سورہ توحید (سورہ اخلاص) 51 بار، صلوٰۃ 51 بار سجدے میں جائے اور سو بار کہے یا اللہ، یا اللہ پھر حاجت طلب کرے۔

فضائل: مرحوم علی بن طاووس فرماتے ہیں کہ حضرت مرسل اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی نے اس نماز کو پڑھا تو خدا اس کی دعا کو حتماً مستجاب فرماتا ہے۔ اگر نمازی نے پہاڑوں کے ٹلنے، بارش کے ہونے جیسی دعا کی خدا اس کو بھی قبول فرمائے گا۔

نماز بخشش گناہ

تعداد: وہی رکعت دو، دو رکعت پڑھے۔ ماہ رجب کی کسی ایک شب.....

طریقہ: ہر رکعت میں سورہ حمد ایک بار، سورہ کافرون ایک بار، سورہ توحید تین بار۔

فضیلت: حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نمازی کے تمام گناہ

سات آیات قرآنی

یہاں پر ہم صرف سورہ اور آیت نمبر بتا رہے ہیں۔

- 1- سورہ توبہ آیت نمبر 51
- 2- سورہ یونس آیت نمبر 107
- 3- سورہ ہود آیت نمبر 6
- 4- سورہ حمود آیت نمبر 56
- 5- سورہ عنکبوت آیت نمبر 60
- 6- سورہ فاطر آیت نمبر 2
- 7- سورہ زمر آیت نمبر 38

قرض کے لیے:

☆ اگر کوئی شخص قرض کے بوجھ تلے دبا ہو تو ہر روز صبح شام یہ دعا پڑھے۔ بہ طور وظیفہ ستر مرتبہ اس دعا کو پڑھا جائے۔ ہر نماز کے بعد۔

اللہم اکیفنی بحلالک عن حرامک واغننی بفضلك عن سواک

☆ ادا نیگی قرض اگر استطاعت سے باہر ہو تو سورہ تحریم کی بہ کثرت تلاوت کرنے سے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے غیب سے اس قرض کی ادا نیگی کی صورت پیدا فرما دے گا۔

☆ اگر کسی پر قرض ہو اور اس کے اترنے کا سامان نہ ہو تو ہر نماز کے بعد سورہ مزمل ایک مرتبہ پڑھی جائے۔ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی ادا نیگی کا سامان فرما دے گا۔

قرآن پاک کی ان سورتوں کی دی گئی آیات سارے جسم پر پڑھ کر چھوئیں، ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کا حصار ہو جائے گا۔ چھ دن سورہ تغابن بارہ نمبر 28 کی تلاوت بعد نماز عشاء اور (6) چھ دن مسلسل یہ حصار کریں۔

عمل برائے قضائے حاجات

تین شب متواتر غلوت میں بیٹھ کر ہر رات ایک ہزار مرتبہ پڑھیے۔
اَللّٰهُمَّ قَدْ اَفْضَعْتُ رَجَائِيْ عَنْ الْخَلْقِ وَ اَنْتَ رَجَائِيْ
اللہ پاک کے حضور اس کے حبیب پاک اور اس کی آل کے وسیلے سے دعا طلب کریں۔

کاروبار کی بحالی کے لیے

☆ اگر کسی کا کاروبار بند ہو گیا تو وہ کاروبار کی بحالی کی نیت سے سورہ جمعہ نماز تہجد کے بعد تین مرتبہ اکتالیس روز تک پڑھے۔ ان شاء اللہ کاروبار بحال ہو جائے گا۔

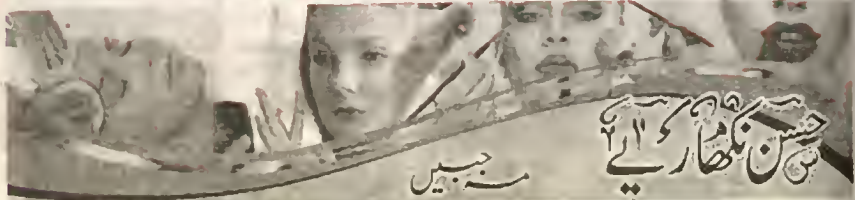
کاروبار کی حفاظت

☆ اگر کوئی شخص اسم مبارک ”یار قیوم“ کا بکثرت ورد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے مال، احوال، کاروبار، اہل و عیال اور روزگار وغیرہ کی حفاظت فرمائے گا اور اسے دشمنوں یا حاسدوں کے ہاتھوں لاحق ہو سکنے والے نقصانات سے محفوظ رکھے گا۔

قرض سے نجات:

قضائے حوائج اور ادا نیگی قرض کے لیے جمعۃ المبارک کے دن غسل کر کے قبل از طلوع شمس دو رکعت نماز بطریق نماز فجر ادا کرے اور بعد از نماز ایک ہزار پینتالیس مرتبہ پڑھے مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔ اور اللہ تعالیٰ سے گرو گزرا کر دعا مانگے۔

☆☆☆



☆ تازنین آفریدی، پشاور

☆ السلام علیکم ماہ جبین آنٹی (علیم السلام) حسن نگار یہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور اکثر آپ کے ویبے ہوئے ٹوئٹے نوٹ بھی کرتی ہوں اور اپلائی بھی..... آنٹی چہرے کے بھورے تلوں کے بارے میں بھی رہنمائی فرمادیں۔ پلیز یہ کیسے بننے ہیں اور ان سے کیسے بچا جاسکتا ہے۔ میں نے کچھ عرصہ بادام کے تیل میں لیمن ڈال کر یوز کیا، کچھ دھیمے پڑتے محسوس ہوئے لیکن یہ ایک بہت ہی سلو پروس ہے جبکہ ہم... بے مبروں کو فوری رزلٹ چاہیے۔ کیا، کیا جائے کہ چہرہ بھورے تلوں سے پاک ہو جائے۔

جواب: بکری کے کچے دودھ میں بادام بھگو کر چھلکا اتار کر باریک پیس کر چہرے پر لگائیں۔ تین ماہ روزرات کو یہ عمل کریں، صبح چہرہ نیشن سے دھو لیں۔ نیم گرم پانی استعمال کریں آخر میں ٹھنڈے پانی کے چھینے ماریں۔

☆☆☆

شہنشاہ گل

خوب صورت و خوش رنگ پھول ہمیں تازگی کا احساس دلاتے ہیں۔ انہی پھولوں میں گلاب کے پھول کو جو اہمیت حاصل ہے اور اس کی جواہریت ہے وہ دوسرے پھولوں میں کہاں۔ اسی وجہ سے اسے شہنشاہ گل کہا جاتا ہے، گلاب کی خوشبو جہاں رباغ کو معطر کرتی ہیں وہیں دل میں تازگی اور خوشی کا احساس جگاتی ہے۔

عزیز پاکیزہ بہنو..... آج گلاب کے پھول کی افادیت و اہمیت ہم آپ کو بتائیں گے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی اس حسین نعمت سے اچھی طرح فیض یاب ہوں۔ گلاب کے بے شمار خواص اور طبی فوائد ہیں۔

☆ گرمی اور جس کی وجہ سے کنبیوں سے اٹھتی درد کی ٹیسیں گلاب کا پھول بار، بار سونگھنے سے کسی حد تک کم ہو جاتی ہیں، اس کے علاوہ عرق گلاب اور خالص عطر گلاب کو سونگھنے سے یک گونہ تسکین حاصل ہوتی ہے، منگی اور چکر کی کیفیت بھی رفع ہو جاتی ہے۔

☆ غسل کے پانی میں تازہ چٹاں گلاب کے پھول کی شامل کر لیں اور اس سے نہا میں علاوہ ازیں پتیوں کو ہاتھوں میں مسل کر ز پر بازو بھی لگائیں۔

☆ گلاب کی پتیوں کو پیس کر اس کا مرہم ساینائلس اور سوزش یا درم دہانی جگہ لگانے سے آرام آ جاتا ہے۔

☆ گرم موسم میں آنکھیں دکنے لگتی ہیں۔ اس کے لیے تازہ گلاب کی پتیوں کو پیس کر ایک ملل کے کپڑے میں رکھ کر پوٹلی بنالیں اور اس کو ٹھنڈا کر کے آنکھوں پر رکھنے سے آرام آتا ہے۔ خالص عرق گلاب آنکھوں میں پکانے سے بھی آرام ملتا ہے۔

☆ مسوزھوں اور دانتوں کی تکلیف میں خشک گلاب کے پھولوں کو پانی میں جوش دے کر نیم گرم پانی سے بار، بار کلیاں کرنے سے افاقہ ہوتا ہے۔ اس کا پیسٹ دانتوں پر ملنے سے منہ سے ناگوار بو آنا بھی بند ہو جاتی ہے۔

☆ چہرے کی جلد اور ہاتھ پاؤں کی جلد کی تازگی کے لیے اس کی پتیاں اکسیر کا کام کرتی ہیں۔ گرمی کی شدت یا گر دو غبار سے رنگ سانولا ہو جائے تو خشک گلاب کی پتیوں کو پیس لیں۔ اس سفوف کو ہم وزن نیشن اور دودھ میں ملا کر پیسٹ بنالیں اور اینٹن کی طرح چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ملیں اور پھر نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ دو دن میں ایک دفعہ یہ عمل کرنے سے جلد کی رنگت ٹھہر آتی ہے۔



شواہے ہومیوپیتھک



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیار صحت بلند ہو لہذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جزل ہومیوپراپیوٹ لیمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتہ اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

ہے۔ بیٹھ جاؤں تو اعضا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہڈیوں میں جیسے طاقت ہی نہیں رہی۔ لیکور یا کا مسئلہ ہے۔ علاج کروانے سے ایک یا دو ماہ ٹھیک رہتا ہے اس کے بعد پھر شروع ہو جاتا ہے میٹمز بعض دفعہ ٹھیک ہوتے ہیں بعض دفعہ بہت درد کے ساتھ اور کبھی لیٹ ہو جاتے۔۔۔۔ ہیں۔ ہاتھ اور پاؤں کی جلد بلیک ہو گئی ہے۔ دانے نکال آتے ہیں اور پھر داغ بکے ہوتے جاتے ہیں۔ چہرے پر جھائیاں ہیں۔ بہت کرمیں استعمال کیں لیکن کوئی فرق نہیں پڑا۔ گرمیوں میں سینے کی سخت بدبو سے تنگ ہوں۔

جواب: تازہ پھل، سبزیاں اور دودھ، وہی کا استعمال بڑھا دیں۔ کم از کم 8 گلاس پانی پیا کریں، لیکن کھانے سے پہلے کھانے کے ساتھ اور بعد میں بالکل بھی نہیں پیئیں گی۔

صبح نہار منہ پہلے Sulphur 200 کی ایک خوراک یعنی 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر پی لیں۔ اس کے ایک دن بعد Calc Carb 30، Chelidonium 6 اور Pulsatilla 30 کے 5-5

جسمانی مسائل

رقیہ.....ٹیکسلا

کچھ عرصے سے میرے کھنوں میں درد بہت زیادہ

ٹوکن

برائے شواہے ہومیوپیتھک

اپریل 2019ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: _____
پتہ: _____



تیز مرجع معائنہ اور کوشش
پرہیز کریں۔ سبزیوں اور فروٹ
زیادہ استعمال کریں۔ ڈاکٹر دلمار
شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل
ادویات 2 ماہ تک استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔
Staphisagria-200 کے قطرے ہر ہفتہ ایک دفعہ
لیں۔ اس کے ایک دن بعد Agnus Cast-30 اور
Lycopodium کے 5-5 قطرے آدھے گلاس
پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

زیادتی حیض

ارمغال..... سیالگوٹ

میرے میسر ٹھیک نہیں ہوتے۔ ذرا سی گرم تاثیر
والی چیز کھالوں مثلاً انڈا، شہد، ڈرائی فروٹ یا کوئی اور چیز تو
میسر وقت سے پہلے ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے میں کوئی
اس طرح کی طاقت والی چیز نہیں کھا سکتی۔ میں نے اس مسئلے
کے لیے بہت سی ایلوپیتھک دوائیں بھی کھائی ہیں جس سے
وقت فرق پڑتا ہے۔ میرا یہ مسئلہ ابتدا..... سے ہے۔ مجھے
بہت کمزوری ہے۔ سر بھی چکر اٹا رہتا ہے۔

جواب: آپ کو شرعی ہی میں معالج خصوصاً ہومیو
پیتھ سے رجوع کر لیتا چاہیے تھا تاکہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو اس
کا فوری علاج ہو جائے۔ آپ اپنا U/S Pelvis کر کر
رپورٹ بھیجیں، اس دوران اپنی غذا کا خیال رکھیں۔ غذا
ہمیشہ متوازن ہونی چاہیے۔ ورزش بھی مفید ہوتی ہے۔
ڈاکٹر دلمار شواہے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک
استعمال کریں۔ Sabina-6, Iodum-30 اور
Pulsatilla-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی
میں دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔

ٹائفلو

ہری چندا..... ہری پور

مجھے نزلے کی شکایت تھی۔ آپ نے بتایا تھا کہ
ناک میں کوشٹ بڑھ گیا ہے۔ میں نے پائیزہ میں آپ

قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ 2
ماہ تک پیئیں اور اس کے بعد دوبارہ تفصیل سے اپنی
کیفیت سے آگاہ کریں۔ چھل قندی کی بھی عادت
ڈالیں۔ پہلے 5 منٹ کریں پھر آہستہ آہستہ بڑھاتے
ہوئے ایک گھنٹا چھل قندی کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔
یاد رکھیے گا تمام ادویات ڈاکٹر دلمار شواہے جرمنی کی
استعمال کرنی ہیں۔

پیشاب میں جلن

سحرش..... پشاور

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ برائے مہربانی حل
کریں۔ مجھے 3 سال سے یہ مسئلہ ہے وہ کسی بھی دوائی
سے ٹھیک نہیں ہوتا۔ مجھے پیشاب میں جلن کی شکایت ہے
جو کہ گرمی میں اور خاص کر رمضان میں برداشت سے باہر
ہوتی ہے۔ بہت علاج کیا مگر ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑا۔
آخری دفعہ جو علاج کرایا تھا اس کے ٹیسٹ وغیرہ بھیج رہی
ہوں۔ میں بہت مایوس ہوں۔ پلیز میرا مسئلہ حل کر دیں۔
جواب: مایوس ہونا کفر ہے۔ اللہ سے اچھی امید
رکھیں۔ ہماری کوشش ناقص ہو سکتی ہے۔ لہذا کوشش کو
جاری رہنا چاہیے۔ کم از کم 10 گلاس پانی روزانہ ضرور
پیئیں۔ لیکن کھانے کے ساتھ اور کھانے کے فوراً بعد نہیں۔
ڈاکٹر دلمار شواہے جرمنی کی Merc.cor-30 اور
Terebinth-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی
میں ڈال کر پیئیں۔ 2 ماہ بعد حال لکھیں Urine DIR کی
رپورٹ کے ساتھ۔

ازدواجی زندگی

ارسلان..... اسلام آباد

میری شادی کو 6 ماہ ہونے والے ہیں اور میں
اندرونی طور پر کافی کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ آپ کو بڑی
امید کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا کوئی بہترین
علاج بتادیں جس سے میری صحت ٹھیک ہو جائے۔
جواب: غلط قسم کی صحبت اور خمش فلموں سے بچیں۔



Phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پیئیں۔ یاد رکھیں کہ یہ تمام ادویات ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی ہی استعمال کریں۔

لیکچر یا

عروسہ حیات..... سحرات

مجھے کافی عرصے سے لیکچر یا کا مسئلہ ہے جو پچھلے 3 سال سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کی ادویات استعمال کیں لیکن بالکل بھی افادہ نہیں ہوا۔ چہرہ بے رونق اور آنکھوں کے گرد جلتے بھی ہیں۔ جب سے یہ مسئلہ زیادہ ہوا ہے چہرے پر جھائیاں بھی پڑ گئی ہیں جس کی وجہ سے مجھے بہت شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ میرا وزن بھی بہت کم ہو گیا ہے۔ تقریباً 10 کلوگی ہوئی ہے، درد اور تھکاوٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسی دوائی تجویز کریں جس سے میرے وزن میں بھی اضافہ ہو اور مجھے اس تکلیف سے بھی نجات مل سکے۔

جواب: متوازن غذا کھائیں اور ورزش کیا کریں۔ فلی دنیا، ڈراموں، ناولوں اور ڈائجسٹوں کی مصنوعی خوابوں کی دنیا سے دور رہیں۔ نماز کی پابندی کریں۔ ذکر اذکار اور قرآن پاک کی تلاوت کیا کریں۔ قرآن کے ترجمے اور احادیث کی طرف بھی توجہ کیا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Borax-30, Iodum-30 اور Calc Carb-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ ایک ماہ بعد اپنے احوال سے آگاہی فراہم کریں۔

صحت و نسوانی مسائل

رضیہ مصطفیٰ..... کراچی

لیکچر یا ابھی زیادہ ہو جاتا ہے کبھی خود ہی سیٹ ہو جاتا ہے۔ بہت کمزور ہوں جیسے ہڈیوں کا ڈھانچا۔ خوراک اثر ہی نہیں کرتی مجھ پر۔ نظر کمزور، دماغ کمزور،

کاجوز کھنڈ پڑھاؤ ادویات منگوائیں۔ ایک مہینے سے میں ادویات لے رہی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کافی فرق ہو گیا لیکن بلغم ابھی بھی ہے۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ ناسلو کا ہے جو کہ بچپن ہی سے ہے۔ منہ سے بدبو بھی آتی ہے۔

جواب: کھنڈی، کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں۔ صبح شام نیم گرم پانی میں نمک ڈال کر غرا لے کریں اور رات کو برش کر کے سویا کریں۔ ڈاکٹر ولما رشوا بے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ تک استعمال کرنے کے بعد پھر تفصیل سے حال بتائیں۔ Baryta, Merc.sol-30 Carb-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ اور Cinnabaris Pentarkan Ptk 31 کی ایک گولی دن میں 3 مرتبہ چبا کر لیں۔

چہرے پر بال

را البدر شیخ..... چیچہ وطنی

ڈاکٹر صاحب میرے ماہانہ ایام میں بے قاعدگی ہے۔ اکثر بہت زیادہ درد کے ساتھ ہوتے ہیں اور کبھی لیٹ ہو جاتے ہیں۔ میرے چہرے پر بہت زیادہ بال ہو گئے ہیں، گالوں پر اور ٹھوڑی پر بھی۔ میرے لیے اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ میرے چہرے کے بال ختم ہو جائیں بالوں کی وجہ سے میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔ ایک اور بات کہ مجھے خون کی کمی کی شکایت بھی ہے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی، اچھی سی دوا میرے لیے تجویز کر دیں۔

جواب: آپ نے علاج کروانے میں اتنا عرصہ کیوں لگایا؟ ابتدا سے ہی اس کا علاج کر لیتا چاہیے تھا۔ غذا کا خاص خیال رکھیں۔ پھل، سبزیوں اور لال گوشت کا استعمال زیادہ کریں۔ ورزش بھی کیا کریں۔ Calc Pulsatilla-30, Iodum-30



جیزیں رکھ کر بھول جاتی ہوں۔ لوگ دیکھتے ہی کہہ دیتے ہیں کہ تم کھاتی کچھ نہیں ہو۔ اور اگر رات کو دودھ پی لوں تو صبح پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ میں تنگ ہو گئی ہوں بس۔ برائے کرم کوئی اچھی دوائی تجویز کریں کہ میری ان مسائل سے جان چھوٹے اور میری زندگی میں کچھ سکون میں ہو جائے۔

جواب: متوازن غذا (دودھ، انڈے، مکھن، گوشت سبزیاں اور پھل) کا استعمال کریں۔ چہل قدمی کی ورزش بھی کیا کریں۔ گھر میں بھی کر سکتی ہیں۔ یاد رکھیں کہ رات کو سونے سے پہلے دودھ پینے کی عادت بالکل غلط ہے۔ یقیناً اس طرح خراب ہو جاتا ہے۔

جواب: کوئی مصیبت، تکلیف، پریشانی یا بیماری اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔ مایوس ہونا کفر ہے۔ فضول باتیں اور دوسو شیطان کا حملہ ہیں۔ انکو ڈالند پڑھا کریں۔ درود شریف پڑھیں۔ استغفار پڑھا کریں۔ اللہ کی ان نعمتوں کے متعلق سوچا کریں جو آپ کے پاس ہیں اور پھر اللہ کا زبان سے زیادہ شکر ادا کریں۔ پھر دیکھیں اللہ شکر کرنے والوں کے ساتھ کیا کرتا ہے؟ مدت علاج کچھ نہیں ہوتا۔ صحیح علاج کے بعد اللہ کا حکم ہوتا چاہیے۔ اچھا یہی ہے کہ آپ آکر ملیں۔ جسمانی مسائل کے علاوہ کچھ اور بھی وجوہات ہوتی ہیں جو بے اولادی کا سبب بنتی ہیں۔ ان کا تعین کرنے کے بعد ہی صحیح علاج کیا جاسکتا ہے۔ فون نمبر ڈائجسٹ والوں سے لے لیں۔ فی الحال ڈاکٹر ولمار شوابے کی Bovista-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ کسی بھی وقت پئیں۔

اولاد کی نعمت

بسمہ عیان..... کراچی

شادی کو دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ کئی جگہ علاج کروا چکی ہوں۔ ڈاکٹر کے مطابق ٹیسٹ کی تمام رپورٹس نارمل ہیں۔ لیکور یا بہت زیادہ رہتا ہے۔ ایام کے فوراً بعد سے لیکور یا کی شکایت ہونے لگتی ہے جو کہ پندرہ دن تک مسلسل رہتی ہے اور پھر ایام کے کچھ دن پہلے پھر شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مرض شادی سے پہلے سے ہے مگر بھی علاج نہیں کروایا تھا۔ میری خوراک بہت کم ہے۔ صبح ناشائیں کرتی اور دن میں بھی بھوک بہت کم لگتی ہے۔ اکثر اوقات ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے ہیں اور جسم کا ہنسنے لگتا ہے۔ بیروں اور گھر میں بھی بہت درد رہتا ہے۔ ایام وقت پر ہوتے ہیں مگر کچھ دن پہلے چکر آنے لگتے ہیں اور مٹی محسوس ہوتی ہے اور اس

شوابے کی ادویات ہی کیوں؟
اکثر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ صرف ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی ادویات ہی کیوں استعمال کرتے ہیں؟ جبکہ یہ مہنگی بھی ہیں۔

ڈاکٹر ولمار شوابے جرنی کی ادویات ہی استعمال کیوں کی جائیں؟ اس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:
(1) دوا بنانے کے لیے جس چیز (پودے معدنیات وغیرہ) کا استعمال ہوتا ہے وہ پوری فٹے داری کے ساتھ جانچ پڑتال کے بعد ہوتا ہے۔

(2) دوا بنانے کے دوران اس کی کوالٹی کو بار بار

استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔
7-6 Staphisagria-30, Calc. phos-30
قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ
پئیں۔

یادداشت کی کمزوری

تانیہ عباس..... لاڑکانہ

میں انٹری طالبہ ہوں۔ مجھے پڑھا ہوا یاد نہیں
رہتا۔ پیپر والے دن تو گھبراہٹ میں سب بھول جاتی
ہوں۔ ماہنامہ پاکیزہ میں کرٹیکس (Cratex) کے
بارے میں پڑھا۔ مہربانی فرما کر میری راہنمائی
فرمائیں۔

۱: اس دوا کے کوئی منفی اثرات تو نہیں؟

۲: ایام کے دنوں میں استعمال کر سکتی ہوں؟

۳: کرٹیکس کب سے شروع کروں اور کب تک

کھاؤں؟

۵: اس دوا کی قیمت؟

جواب: بی بی داغی صلاحیت اور جسمانی نشوونما کو
بڑھانے کے لیے کرٹیکس ڈاکٹر ولما شوا بے جرمنی کی
ایک بے مثال دوا ہے۔ اس کے اب تک کوئی منفی اثرات
مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ ماہانہ ایام کے دنوں میں بھی اس
کو لیا جاسکتا ہے اس سے کوئی خراب اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ
قوت اور توانائی برقرار رہتی ہے۔ اس کو کم از کم ایک ماہ
تک استعمال کریں۔ ایک ڈبے کی قیمت 420 روپے
ہے جس میں 20 گولیاں ہوتی ہے۔ صبح اور شام ایک
ایک گولی تھوڑے پانی کے ساتھ لیں۔ اس کے علاوہ 30
Ancardium شوا بے جرمنی کے 5 قطرے دن میں
تین مرتبہ لیں۔ 2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

☆☆☆

(3) اس کی پیکنگ خود کار کمپیوٹر آڈیشنوں سے
کی جاتی ہے جو پیکنگ کے معیار کو مسلسل چیک کرتی
رہتی ہے۔

(4) ماحول آلودگی سے پاک ہوا ہے (کارکنان
سر کے بالوں کو ڈھانپے رکھتے ہیں، چہرے پر ماسک
ہوتا ہے، ہاتھوں میں گلوڈ اور جسم پر گاون ہوتا ہے)
(5) فارمیسی کا ٹیسٹ پرچہ اور ہوائی نمی کو کنٹرول میں رکھا
جاتا ہے۔ ہر فارمیسی اور بالخصوص مقامی فارمیسی اسٹے
معیارات کا خیال نہیں رکھ پاتیں جس سے دوا کی اثر
پذیری پر بہت۔۔۔ اثر پڑتا ہے۔ لہذا ان وجوہات کی
بنیاد پر اعلیٰ معیار کی قابل بھروسہ ادویات کو استعمال کرتے
اور کراتے ہیں۔

جوڑوں کا مسئلہ

ریحانہ نصیر..... فیصل آباد

ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی کھٹنوں کے
جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ٹانگ ہلاتی تھی تو تک
تک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ اب مجھے
درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت کھٹنوں کے
جوڑوں سے تک تک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑی
دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے وقت
ایسا زیادہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا
علاج بتائیں۔

جواب: بی بی، قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔
نماز کی پابندی کیجئے۔ اور پھر اپنی صحت کے لیے دوا
کیجئے۔ غذا متوازن لیں۔ اپنے سونے جاگنے کا وقت مقرر
کریں۔ بے مصرف کاموں میں وقت نہ گزاریں۔ ڈاکٹر
شاہبے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک



Dr. Willmar Schwabe Germany

Available at All Medical & Homoeopathic Stores

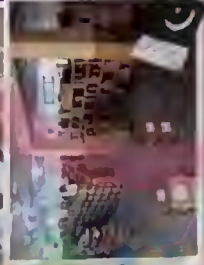
شوا بے سٹگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی

ماہنامہ پاکیزہ۔ مارچ 2019ء

<https://reading.caretel.in.net>



Dr. Willmar Schwabe
Germany
From Nature. For Health.



Importer:

Dr. Hamid
General Homoeo (Pvt) Ltd.
www.drhamidschwabe.com

مزید معلومات کے لئے رابطہ کریں

Karachi. Phone: 021-32211895
Lahore. Phone: 042-36291603

German imported
in Original Pack



شواہے ہومیوپیتھی میڈیسین کے لئے مخصوص ہے اور اس کے اثرات ملے ہوئے ہیں۔

صحّت کی جستجو۔ لازوال تحقیق
بناتے رہے شواہے کو معیارِ بے مثل
ٹھہرا ہے اپنی ادویات کے 80% سے 85% نمونہ دور کی انٹرنیشنل
ویسٹ ورنیشن باغات میں کاتا ہے۔

ہدیہ ترین تحقیقی پہنچی ایک حکمتِ سلط اور صحتِ لطیفہ کا کھڑے کے ادر ہے
فطرت کے انتہائی پیش قدمی کے لئے لکھنے کے لئے جاتے ہیں۔

دوا سازی کا مکمل اور اس کے لئے حصول سے تکمیل کے قریبی مرحلے تک
GMP کے معیار اور اس کے لئے حصول سے تکمیل کے قریبی مرحلے تک

اس طرح پتھر کی گئی ادویات کو پختی سے دیتا ہے اور پاکستان میں
یہ کام کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مانیجن مکمل محروسہ کے ساتھ
شواہے سنگل پریکٹیز کرتے ہیں۔

Homeopathy Demands only Premium Quality
شواہے سنگل ریپیڈیز
ہومیوپیتھی میڈیسین ہیئرینج
مدرفکچر۔ ٹیلیسن۔ ڈائلیکشن